ناول

جلد: ۲۶ شمارہ: ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۷ء

قیمت ۳۰/- روپے

محمود بابر فیصل کی یاد میں"

فون: ۷۷۳۶۶۱۷ / ۷۷۱۷۷۷

پبلشر و ایڈیٹر آمنہ ریاض (عمران محمود) نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا

مقامِ اشاعت: بی ۱/۹۱ علامہ اقبال ٹاؤن کراچی

محمود ریاض

سب کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ گزرتا وقت گہرے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ یادوں کے نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں۔ لیکن شاید وقت ٹھہر گیا ہے، تب ہی تو دل کے زخم ہر وقت رستے رہتے ہیں، آنکھیں نم رہتی ہیں۔ وہ میرے آس پاس رہتا ہے، کانوں میں اس کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔

وہ تیز تیز چلتا میرے کمرے میں آیا ہے اور "کرن" کا بنڈل میرے سامنے رکھ دیا۔

"پاپا! کرن آگیا ہے، آپ دیکھیے۔"

میں نے بنڈل کھول کر پرچا نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ میں ایک ایک صفحہ کھول کر دیکھ رہا ہوں ساتھ تعریف کا سلسلہ جاری ہے، وہ سر جھکائے بیٹھا ہے، پرچا دیکھتے ہوئے میں کہتا ہوں۔

"بابر! یہ بھائی جان کی نظم تم نے اچھے اور خوبصورت انداز میں لگائی ہے، بس کچھ لوگوں نے طے کر لیا ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیں گے، تم بھی ان ہی میں سے ہو ورنہ تم سے اچھا پرچا کوئی نہیں ترتیب دے سکتا۔ تم ایک بہترین ایڈیٹر ہو۔"

اس کے خوبصورت چہرے پر ایک چمک آگئی۔ ایک دم ہنس پڑا۔

وہ ایسا ہی تھا، ذرا سی بات پر خوش ہو جانے والا، بچوں کی طرح معصوم۔

پرچا آتا تو پہلے میرے پاس لے کر آتا۔ بڑے احترام اور عقیدت سے بنڈل میرے آگے رکھتا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے میں دفتر نہ آ پاتا تو وہ بنڈل اٹھا کر گھر لے آتا۔

"کرن" اب بھی آتا ہے۔ لیکن!

وہ ہر کام بڑے جوش و خروش سے شروع کرتا تھا، بڑے جذبے کے ساتھ، اس کا جوش و خروش اس کے ساتھ کام کرنے والوں میں بھی سرایت کر جاتا تھا۔ یہ اس پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

وہ خوشی سے بے قابو ایک جوش کے عالم میں میرے کمرے میں آیا ہے۔

"پاپا! مجھے اخبار کا ڈیکلریشن مل گیا ہے، پرسوں تو ڈے اسپیشل بازار میں آ جائے گا۔"

میں نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔ "آج ڈیکلریشن ملا ہے اور پرسوں اخبار بازار میں آ جائے گا، بغیر کسی تیاری، بغیر اسٹاف کے، یہ آسان کام تو نہیں ہے۔" میں نے سختی سے منع کیا۔

"بابر! یہ مذاق نہیں ہے، آج ڈیکلریشن ملا ہے اور دو دن بعد اخبار لا رہے ہو، کوئی اسٹاف نہیں ہے۔ اکیلے یہ سب کرنا بہت مشکل ہے۔"

لیکن وہ مصر تھا کہ اخبار پرسوں آئے گا۔ اس کا جوش و جذبہ دیکھ کر میں خاموش ہو گیا لیکن دل ہی دل میں پریشان تھا کہ یہ سب کیسے ہوگا؟

تیسرے دن وہ اخبار لے کر آیا تو میں حیران رہ گیا۔ ہر لحاظ سے ایک خوبصورت، معیاری روزنامہ میرے سامنے تھا، کہیں کوئی کمی نہ تھی۔ وہ اسی طرح مجھے حیران کر دیا کرتا تھا۔

آٹھ ماہ کا تھا جب پہلی بار اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھا تھا، وہ کھڑا ہوا اور ایک دم دوڑنے لگا۔ تب بھی میں حیران رہ گیا تھا۔

پھر وہ دوڑتا ہی رہا۔ ہر چیز، ہر کام میں آگے آگے، پرچے کا کام، نئے پی این ایس کی انشورانس، دعوتیں اور میٹنگز، اخبار کی مصروفیات، وہ اپنے لاابالی انداز کے باوجود ہر کام بڑی خوبی سے کرتا تھا۔

اور میں حیران رہ جاتا تھا۔ میں اب بھی حیران ہوں۔

وہ مجھے چھوڑ کر کیسے چلا گیا؟ وہ تو کبھی میری اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا، کہیں نہیں جاتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ وہ۔ میری اجازت کے بغیر اتنے لمبے سفر پر کیسے اور کیوں چلا گیا!

خواتین ڈائجسٹ میں
لکھنے والی اور
اسے پڑھنے والی

تمام بہنوں سے درخواست

ہمارے پیارے محمود بابر فیصل (ذوالقرنین) آج سے چار سال پہلے اس دارِ فانی سے رُخصت ہو گئے تھے۔ ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۹۷ء بروز ہفتہ کو اُن کی چوتھی برسی ہے، اُن کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کا انتظام دوپہر تین بجے سے نمازِ مغرب تک اُن کی رہائش گاہ B-91 "چاند نگر" ابن انشاء روڈ، بلاک ڈبلیو، علامہ اقبال ٹاؤن نارتھ ناظم آباد، کراچی میں کیا گیا ہے (خواتین اور مرد حضرات، دونوں کے لیے انتظام گھر پر ہی ہے)۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس میں ضرور شرکت کریں اور محمود بابر فیصل کے لیے مغفرت کی دُعا کریں۔

دوسرے شہروں اور ملکوں میں بسنے والی بہنوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی محمود بابر فیصل کے بلند درجات کے لیے دُعا کریں۔

نوحہ

اے دور نگر کے بنجارے کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے
یہ بارش، کیچڑ، سرد ہوا اور راہ کٹھن انجانی ہے
آ محفل چپ چپ بیٹھی ہے آ محفل کا جی شاد کریں
وہ لوگ کہ تیرے عاشق ہیں کئے روز سے تجھ کو یاد کریں
وہ معمور ٹھکانے ڈھونڈ چکے، وہ منزل منزل چھو آئے
اب آس لگائے بیٹھے ہیں کب دستک ہو کب تو آئے
اے دور نگر کے بنجارے، گر چھوڑ کے ایسا جانا تھا
کیوں چاہ کی راہ دکھائی تھی، کیوں پیار کا ہاتھ بڑھانا تھا
ہے دنیا کے ہنگاموں میں رنگینی بھی رعنائی بھی
ہر چیز یہاں کی پیاری ہے محرومی بھی رسوائی بھی
سب لوگ یہاں پر قسمت کے بے طور تھپیڑے سہتے ہیں
پر جیتے ہیں اور جینے کی اک آس سے چمٹے رہتے ہیں
اور تو تو ایک کھلاڑی تھا کیوں کھیل ہی سے منہ موڑ لیا
کیوں جان کی بازی ہار گیا، کیوں عمر کا رشتہ توڑ لیا
گو جانے کے مشتاق یہاں ہم جیسے لاکھ بچارے ہوں
وہ لوگ ہی رخصت ہوتے ہیں جو لوگ کہ سب کو پیارے ہوں

ہر سال رتوں کی گردش سے جب بیس دسمبر آئے گی
یہ اشک چھما چھم برسیں گے یہ آہ گھٹا بن جائے گی

اے دور نگر کے بنجارے

ابن انشاء

تم عرش کے ایک فرشتے تھے بس فرش کی چوکھٹ چوم گئے
تم تیس برس تک دنیا میں معصوم رہے معصوم گئے

ہم یاد کی روشن شمعوں سے اس جی میں اجالا رکھیں گے
اور سینے میں آبادی کا سامان نرالا رکھیں گے
تم اجنبی اجنبی راہوں میں جب تھک جاؤ اک کام کرو
اس دل میں آن قیام کرو، اس سینے میں بسرام کرو

اس جگ کی رات اندھیری میں اک تارا تھا وہ ڈوب گیا
اور وعدے ساتھ نبھانے کے سب بھول بھلا کر خوب گیا
یہ انشاء، ہارون، زید، بکر اشکوں کا مسیحا کوئی نہیں
سب دوست ہمارے اچھے ہیں، پر کون ہے اس سا کوئی نہیں
کیوں نازک نازک سینوں پر تم غم کا توڑ پہاڑ چلے
کیوں جگ کے کھیل تماشوں کا تم رنگ اور روپ اجاڑ چلے
پھر دیکھ زمیں پر کیچڑ ہے، پھر دیکھ فلک پر پانی ہے
اے دور نگر کے بنجارے، کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے

اکتوبر کے ناول نمبر کی

ایک جھلک

اکتوبر کا شمارہ ناول نمبر شائع ہو گیا ہے

یہی سچ ہے، نگہت عبداللہ کا مکمل ناول،
من میں لکھیا سو ہنایار، ثمرہ بخاری کا مکمل ناول
میں نے شاہ ہاری ہے، شازیہ چوہدری کا
مکمل ناول،
ستاروں سے سجا آنگن، آسیہ سلیم قریشی
کے ناول کی آخری قسط،
غزالہ نگار، زوبیہ اعجاز، سائرہ یامین راؤ اور
رُوبج چوہدری کے افسانے،

زہرہ ممتاز اور ماہا ملک کے ناول،
اندازِ بیاں اپنا، ساغر صدیقی کے کلام کا انتخاب،
مشہور مزاحیہ فنکار اطہر شاہ خان کا پہلا دُکھ،
شاعری سچ بولتی ہے، سیما منظر امکانی
کا انتخاب،
شادی مبارک ہو، نبیؐ کی باتیں اور دیگر
مستقل سلسلے،
شعاع کا ناول نمبر آج ہی خرید لیں،

دردِ دل۔ جو کبھی کم نہ ہوگا

محمود خاور

میرے بھائی، میرے دوست محمود بابر فیصل نے بچپن سے ہی محبتوں کو بانٹنے اور سمیٹنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اسکول کے زمانے میں ہی اس نے بچوں کے لیے ناول لکھنے شروع کر دیے پھر اچانک افسانوں اور کہانیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شعر کہتا تھا اور اسے اپنی ڈائری میں چھپا کر رکھتا۔

کالج کے زمانے میں ہی عمران ڈائجسٹ کی ایڈیٹری سنبھال لی۔ جس عمر میں اس وقت بھی اور اب بھی لڑکے گلیوں میں گلی ڈنڈا، فٹ بال یا کرکٹ کھیلتے ہیں۔

وقت کچھ زیادہ ہی تیزی سے گزرنے لگا اور اس نے بہنوں کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت رسالہ ماہنامہ "کرن" شروع کیا۔ میں نے اسے "کرن" کے ساتھ ہر ماہ ایک مفید کتاب دینے کا مشورہ دیا جس پر ـــــ عمل کرتے ہوئے "کرن" کو اس نے منفرد پرچا بنا دیا۔

"کرن" میں اس نے بہت سے تجربے کیے "مینا بازار" کے نام سے ایک پروگرام ٹی وی پر ہوا کرتا تھا۔ بابر نے اس پروگرام پر کرن کا مینا بازار نمبر نکالا جس میں رنگین صفحات بھی شامل کیے۔

بابر نے "کرن" کو دلچسپ بنانے کے لیے کئی جدتیں کیں۔ بہت سے خوبصورت سلسلے شروع کیے۔ ہم مل کر بیٹھتے تو ہم سے بھی ڈسکس کرتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے عمران ڈائجسٹ کے ساتھ

کرکٹ میگزین دیا تھا جو بے حد پسند کیا گیا تھا لوگوں نے اسے بہت سراہا تھا۔ بابر نے ہمیشہ کی طرح مجھ سے سوال کیا۔

"خاور! کرن کے لیے کوئی اچھا سا آئیڈیا دو۔"

تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ "کرن" کے ہر شمارے کے ساتھ ایک "کرن کتاب" مفت ہونی چاہیے۔ کتاب کا موضوع ایسا ہو جو بہنوں کی دلچسپی کا بھی ہو اور ان کے لیے مفید اور کار آمد بھی ہو۔

بابر کو یہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔ اس سے پہلے کسی بھی میگزین کے ساتھ ایسا تحفہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس نے اسی ماہ سے اس پر عمل کیا اور یوں

"کرن کتاب" کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور آج تک بے شمار مفید اور اہم موضوعات پر کتابیں دی جا چکی ہیں۔ بہنیں اس عظیم بھائی کے خوبصورت پرچے "کرن" کے ساتھ "کرن کتاب" کا تحفہ پا کر یقیناً خوش ہوتی ہوں گی۔

جہاں اس کے اس تحفے نے قارئین بہنوں تک بہت سی اہم معلومات پہنچائیں تو میں بہنوں نے دیکھا کہ اس نے ایک اور دھماکا کر دیا۔۔۔

محمود بابر فیصل، ذوالقرنین کے نام سے شعر کہتا تھا۔ اب اس نے اسی نام سے ایک ہنستا مسکراتا سلسلہ "نہلے پہ دہلا" شروع کیا۔ وہ جب ذوالقرنین (ذوقی بھیا) کے نام سے سامنے آیا۔ تو بہنوں کے کیے ہوئے سوالات کے ایسے شگفتہ جواب دینے شروع کیے کہ اس کا ایک نیا روپ سامنے آیا، مزاح کا، بھرپور اور شفاف محبت کا، رنگ کا، پھولوں اور بہاروں کا، شعروں کا اور محاوروں کا۔ لفظوں کے انبار لگے ہوتے۔ ذوالقرنین کے نام بھرمار ہوتی بہنوں کے خوبصورت سوالات کی یہاں تک کہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ بہنوں نے ذوقی بھیا کو مات دینے کے لیے مشکل مشکل سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر اس کے ہنستے مسکراتے جوابات ان کے سوالات پر حاوی ہو جاتے۔۔۔ اور بہنیں اس پر بھی اس کا شکریہ ادا کرتیں۔ سب ذوقی بھیا

سے محبت جو کرتی تھیں۔ جی ہاں محبت، قارئین بہنوں کی اپنے ذوقی بھیا سے۔

ے چاہتا ہوں کہ اسے نذرِ محبت کر دوں
زندگانی مری شاید کسی قابل ہو جائے

محبت کون نہیں کرتا تھا میرے بھیا، میرے دوست سے۔ پاپا، امی، بہن بھائی، گھر اور خاندان کے تمام لوگ، دوست احباب وہ جو ان سے ملاقات کا شرف رکھتے تھے وہ بھی اور وہ بھی جو ان سے مل نہ سکے۔ وہ ایک شخص جو ہم سے روٹھ گیا۔ کتنی ہی محبتیں بانٹ کر اور نہ جانے کتنی ہی محبتیں سمیٹ کر ہم سے جدا ہو گیا۔

ے جدائی میں یہ شرطِ ضبطِ غم تو مار ڈالے گی

ہم ان کے سامنے کچھ دیر رو لیتے تو اچھا تھا
کیسے کہوں کہ ہمارا پیارا بابر ہم سے جدا ہو

گیا ہے۔ کیسے لکھوں کہ وہ اب ہم میں نہیں ہے۔ لفظ "ہے" کو "تھا" میں کیسے بدل دوں، کس طرح بہلاؤں اس دل کو کہ تمہیں ہم سے بچھڑے چار برس ہونے کو ہیں۔

کہنے کو تو چار برس بہت لگتے ہیں مگر تمہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو مسکراتے اور پھر قہقہے لگاتے دیکھا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے تو ہم سب گھر والے تمہاری مزے دار باتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔

پھر یہ اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا کیوں چھا گیا؟ گھڑی کی سوئیاں اتنی تیز کیوں بھاگیں؟ کیلنڈر کے صفحات اتنی تیزی سے کیوں پلٹے کہ چند لمحوں پہلے کی بات کو چار سال بیت گئے۔ کتنے موسم بدل گئے، مگر تم کہاں تھے؟ کہاں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ ہاں شاید تم اب ہماری کسی بات کا جواب نہیں دو گے، وقت جو تیزی سے گزر گیا ہے۔

؎ بہت ظالم تو نے کس کس کو حیران کیا ہے
باغ سے پھول اور پھول سے بھونرا چھین لیا ہے

اور وہ چلا گیا۔

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے ایک نہ ایک دن مالک حقیقی کے پاس واپس جانا ہے۔ اللہ پاک کی ذات ہی اپنے بندوں کو دنیا میں بھیجتی ہے اور پھر اس نے واپس بلانے کا بھی وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہی صبر بھی دیتا ہے۔

مگر اس دل کا کیا کریں؟

اسے کہاں لے جائیں؟

آخر ہمارا دل اس بات پر کب یقین کرے گا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہے، وہ مالک حقیقی سے جا ملا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر درد دل کب تک لکھوں۔ وہ سمندر کی لہروں کی طرح بار بار ساحل پر آتا ہے اور پھر واپس کہیں دور چلا جاتا ہے۔ دور۔

25 اکتوبر 97ء کو اس کو گئے چار برس ہو جائیں گے۔ گھر میں برسی کا اہتمام ہوگا۔ اس کے دوست احباب چاہنے والے جمع ہوں گے اور اس تک اللہ پاک کا کلام پہنچائیں گے، اس کی مغفرت کے لیے دعا کریں گے۔

دوسرے شہروں اور ملکوں میں رہنے والے بھی اپنے پیارے محمود بابر فیصل کی اس چوتھی برسی پر اللہ پاک کا کلام پڑھ کر اسے تحفے میں بھجوائیں گے اور اسے تحفے ہی تحفے ملیں گے۔ اور اسے ہم دنیا میں رہ کر کیا دے سکتے ہیں۔

دعا کریں کہ وہ جہاں بھی ہو، خوش ہو۔

یقیناً کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد۔

اے میرے اللہ!

یہ زمیں آسماں ترے صدقے
میں ہی کیا دو جہاں ترے صدقے

★

آئی جو تیری یاد

شگفتہ سلیمان

تم پھر یاد آ رہے ہو
لیکن ہم تمہیں بھولے کہاں ہیں
تم تو ہمارے دِلوں کے اندر دُور دُور تک
بسے ہوئے ہو
تمہاری یادیں تنہائی میں اکثر رُلا دیتی ہیں
دن کی روشنی میں آنسو آنکھوں سے اُتر کر
قطرہ قطرہ دل پر گرتے رہتے ہیں
کتنا وقت بیت گیا تم کو گئے
یقین پھر بھی نہیں آتا
تم بھلائے جانے والوں میں سے نہیں
کاش کہ تم واپس آ سکتے
آ جاؤ
ایک بار صرف ایک بار
چند لمحوں کے لیے ہی
ایک بار ہم تمہیں جی بھر کر دیکھ تو سکیں
چھو کر محسوس کریں
میرے پیارے میرے ہمدم میرے دوست
میرے بھائی

میں تمہارے رازوں کی امین ہوں
تمہارے کہنے کی بات بھی کسی سے نہ کہوں گی
گزرے چار سالوں میں
ماں کے چہرے پر حسرت
باتوں میں اُداسی، دل میں تڑپ
بابا کی آنکھوں کا کرب اور آنسو
دل میں تمہارے کھو جانے کا غم
تمہاری یادیں ان کی آنکھوں میں بس گئی
ہیں
لہجے ٹوٹ گئے ہیں الفاظ بے ربط
مضبوط لامٹی ٹوٹ گئی ہے اور ہو گئی
عمارت کمزور
جانے ان برسوں میں کتنے
صفحے لکھے کتنے پھاڑے
منتشر یادیں لفظوں کا روپ نہ دھار سکیں
بس ایک کسک باقی ہے
تمہاری جگہ کوئی نہ پُر کر سکے گا

بلکتی ہیں

صرف تمہارے لیے

ہاں تم تو ایک مسافر تھے
جو شہر دل شہروں گھومتے تھے
جو ملکوں ملکوں جاتے تھے

اور جاتے تھے پھر آتے تھے
یہ شہر تو تمہارا اپنا تھا
یہ گھر تو تمہارا اپنا تھا
اب کیسے سفر پہ جا نکلے
جو واپس اب تک نہ آئے
ہاں ایک بات تو اچھی ہے
کچھ چہرے تھے کچھ لوگ بھی تھے
جو اپنے اپنے لگتے تھے
جو پیارے پیارے لگتے تھے
اب ان کے چہرے ننگے ہیں
اب ان پر کوئی نقاب نہیں
جو دھوکا تھے سراب بھی تھے
ان چہروں کی تاب نہ لا سکتے تم
وہ چہرے بڑے گھناؤنے تھے
چہرا در چہرا تھا ان کا
اور روپ بھیانک تھا ان کا

جانے سے ایک ماہ پہلے
تمہاری آنکھوں میں وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا
تمہاری باتیں، تمہارے راز، تمہارے شکوے
تمہارے دکھ، تمہارے درد
کچھ نظریں کچھ سلوک
لوگ شاید بھول گئے ہوں
لیکن میں نہیں بھولی
وہ سب میرے دل میں اتر گئی ہیں
تم سا پیارا کہاں سے لاؤں
کہاں ڈھونڈنے کو جاؤں
ماں کو بہلانا کتنا مشکل ہوتا ہے
جب وہ تمہیں یاد کرتی ہیں

ان کی صورت کو ترسے گی چشم

رابعہ بلال

؎ کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو ایک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

اور منہ پھیر کے جانے والے پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ کسی پر کیا گزرتی ہے، چاہے ان کے روٹھ جانے سے بزم کے چراغ بجھ جائیں اور دنیا اندھیر ہو کر رہ جائے اور دل و نظر کی وسعتیں دکھ سے لبالب بھر کر چھلک پڑیں، آنکھیں برسیں بھی اور ترسیں بھی۔

مگر وہ ہر تعلق کو توڑ کر، ہر رشتہ چھوڑ کر بے نیاز و بیگانہ ہونے والا کس راہ کا مسافر ہوا کہ ہر محبت بھری صدا صدائے بہ صحرا ٹھہری۔

وہ رشتوں کی مضبوط زنجیریں پیچھے رہ جانے والوں کے ہاتھوں میں محبت کے الجھے سلجھے دھاگوں کی شکل میں رہ گئیں کہ ہنساتے ہنساتے کوئی اس طرح بھی رلاتا ہے۔!!

کیوں یار صاحب! کیا کوئی اس طرح بھی رلاتا ہے۔؟

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۸۹ء دسمبر میں ہوئی تھی۔ وہ محمود ریاض صاحب کے کمرے میں فرج کے پاس والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ پہلی نظر میں وہ ایک لاابالی سے انسان دکھائی دیے۔ خوبصورت وجیہہ و شکیل شخصیت تھی۔ زیادہ تر ٹی شرٹ استعمال کرتے تھے۔ انداز کچھ بیگانہ اور لاتعلق سا تھا۔ جیسے وہ اس کمرے میں بیٹھے رہے بھی اس کا حصہ نہ ہوں۔ مجھے ان کا چہرا جانا پہچانا سا محسوس ہوا۔ جی ہاں یہ تو فوادالتمش ہیں۔ میں سمجھی کہ میں نے انہیں پہچان لیا لیکن نہیں، ان کی شخصیت کے تو بہت سے روپ تھے اور بہت سے رنگ ابھی

ان کو بھی جاننے کا دعویٰ نہ کیا جا سکتا تھا۔
وہ بظاہر لاپروا نظر آنے والا شخص انتہائی ذمہ دار تھا، بے حد حساس۔ فنکار ذہن کے مالک، خوش باش، پرخلوص ساتھی، انتھک، خلیق اور فرمانبردار بیٹے۔ ان کی شخصیت میں رنگ ہی رنگ تھے۔
کبھی وہ ہنستے ہنساتے نظر آتے۔ بذلہ سنجی بدرجۂ پر ہوتی، بات بات پر برمحل لطیفے سنانے جاتے۔
کبھی خاموش اور سنجیدہ سے۔ اپنے کام کی بات کی اور بس۔

کتنے دوست تھے۔ بڑا اخلاق اور زندہ دل!
ہمارے دفتر کی ایک خوبصورت روایت یہ تھی کہ دوپہر کا کھانا سب ریاض صاحب کے کمرے میں کھاتے تھے دوپہر کے وقت کچھ سستی سی آجاتی ہے۔ لہٰذا جب ساتھ مل کر بیٹھتے ہنستے بولتے اور مذاق کرتے تو خودبخود فریشنس آجاتی اور آدمی پھر سے تازہ دم ہو جاتا۔ یہ وقت بھی یادگار بن گیا کہ جب ٹیلیفونوں کا تعاقب ہوتا، گفتگو اشعار کے ذریعے کی جاتی۔ مزے مزے کے قصے سنانے جاتے۔
اب وہ صحبت برہم گئے دنوں کی حسین یاد بن کر

کبھی کام کرنے پڑتے تو دوسروں کے ہاتھ پاؤں پھلا دیتے۔ ہر تھوڑی دیر بعد تقاضا کہ جتنی شوائن کی ممکن ہو ڈاک بھجوا دیں۔
کبھی استل ان کے آفس کے دس چکر لگاتی کہ بار صاحب جلدی جواب لکھ دیں۔
ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا رکھ رکھاؤ اور ادب و لحاظ تھا۔ گفتگو ہمیشہ شائستہ اور برمحل شعروں سے مزین کرتے۔ درمیان میں لطیفے بھی سناتے جاتے خود بھی ہنستے جاتے اور دوسروں کو بھی ہنساتے جاتے۔ دوستوں

تا زندگی ساتھ رہے گی۔ بابر صاحب کی مخصوص جگہ جہاں وہ آکر بیٹھا کرتے تھے سونی سونی سی لگے گی۔
کئی بار بابر صاحب کے آفس میں بھی کھانا کھایا گیا۔ اس وقت وہ پورے میزبان بن جایا کرتے تھے۔ ان کے دفتر کی ہر چیز سے سلیقہ اور قرینہ جھلکتا تھا۔ سامنے ہی اشفاق جی کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی جن سے وہ بہت پیار کیا کرتے تھے۔
ایک بات ان سب میں مشترک ہے۔ وہ ہے خوبصورت آواز۔ محمود ریاض صاحب کی آواز بہت خوبصورت ہے

اور یہ خوبی خاور صاحب اور بابر صاحب دونوں میں پائی جاتی ہے۔

؎ اس نے آواز کا رشتہ بھی نہ رکھا لوگو!!
دل گماں سے خالی ہے کہ سماعت اپنی آواز کو ترسے گی

بابر صاحب کو حیرت زدہ کر دینے کا فن آتا تھا اور وہ اس سے محظوظ بھی ہوا کرتے تھے۔ زندگی میں ہزاروں سرپرائز دینے والے نے موت کا دامن بھی اس طرح تھاما کہ حیرت سے مجسم بنا کر رکھ دیا۔

؎ گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارا وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

میں لے خبرنامے میں یہ خبر جانکاہ سنی تو کتنی دیر سماعتوں کا اعتبار نہ رہا۔ اتنی جلدی کوئی اس طرح جاتا ہے اور وہ بھی بابر صاحب جیسا پارہ صفت انسان جس کے آگے مستقبل کے بڑے بڑے منصوبے تھے۔ وہ تو بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ میں اسی وقت بلال کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پر پہنچی۔ ہر شے پر اداسی کی دبیز اور دکھی دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

؎ اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

خاور صاحب باہر ہی مل گئے۔ دکھی دکھی سے نڈھال لہجے میں بولے "ابھی اس کے جانے کی عمر تو نہ تھی۔ بس پتا نہیں کیا ہو گیا" پھر مجھ سے کہا۔

"رابعہ! ذرا حوصلے سے بات کرنا بابا کی طبیعت خراب ہے۔" میں سر ہلا کر رہ گئی۔

ظاہر ہے جس کا سرمایہ حیات اس کے سامنے لٹ جائے جس باپ کا جوان، ہونہار، ذہین اور فرمانبردار بیٹا اتنا بڑا غم، اتنا بڑا زخم دے جائے لٹ اس پہاڑ جیسے دکھ کو سہنے کے لیے پہاڑ جیسا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔

ریاض صاحب بالکل خاموش، خالی خالی آنکھوں سے اس طرح بیٹھے تھے جیسے اپنی سب سے قیمتی متاع ہار گئے ہوں۔

میرے بھی حلق میں کوئی چیز اٹکی محسوس ہو رہی تھی۔ بولا مجھ سے بھی نہ جا رہا تھا۔ وہ بھی خاموش تھے جس کی کے سارے الفاظ کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے تمام حوصلے یکجا کر کے بھرائی ہوئی آواز پر قابو پا کر کہا۔
"سر! حوصلہ کریں۔"

"ہاں۔ اب یہی کرنا ہے۔ کہنے کو تو بہت آسان جملہ ہے پر سہنے کو بہت مشکل ہے۔" آواز دکھ سے کانپی اور آنسو بہہ نکلے۔

میں نے انہیں ہمیشہ ہنستے مسکراتے، جاندار قہقہے لگاتے دیکھا تھا۔ اسی شخص کو اتنا ٹوٹا ہوا، اتنا دکھی دیکھا نہ جا رہا تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر تسلی کا احساس دلایا۔ لیکن اس وقت وہ غم کے احساس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بول رہے تھے مگر بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مگر موجود نہیں تھے۔

بابر صاحب آپ نے بھی کیسے کیسے امتحان میں ڈالا ہے۔ آپ کا دکھ اتنا بڑا ہے کہ میرا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ میری ہمت ریاض صاحب کا سامنا کرنے کی نہیں پڑتی ہے۔ میں نے تمام ہمت اور حوصلہ مجتمع کرکے دفتر میں قدم رکھا۔ ہر شے مانوس تھی مگر نامانوس سی اداسی میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہر شے سے ان کی یاد وابستہ تھی۔ وہ یہاں آکر بیٹھتے تھے۔ اس ٹیلیفون کو استعمال کرتے تھے۔ ان کی اور امثل کی مزیدار نوک جھونک ہوتی تھی سب کچھ ویسا ہی تھا مگر اس شخص کے نہ ہونے سے ویسا نہ رہا تھا۔ امثل نے کہا۔

"رابعہ! سر کو یاد آ گیا کہ تم اس دن آئی تھیں۔" میں نے کہا اچھا میں ان سے مل کر آتی ہوں۔"

ریاض صاحب کا استقبال کرنے کا انداز بہت گرم جوشی والا ہوتا ہے۔ مگر اس دن وہ بالکل خاموش تھے۔ مجھے دیکھ کر رونے لگے۔

"رابعہ! امثل نے مجھے بہت یاد دلایا کہ تم آئی تھیں۔ میں نے کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ رابعہ مجھ سے ملے اور مجھے یاد نہ ہو لیکن جب انہوں نے کہا کہ وہ رات کو ہلال بھائی کے ساتھ آئی تھی تو مجھے یاد آگیا۔"

• دکھ آدمی کو اسی طرح ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ آنکھیں جاگتی ہیں اور ذہن سوتا ہے۔ ریاض صاحب بہت حساس انسان ہیں۔ وہ ابھی تک اپنے بھائی اشتیاق کا غم نہیں بھول سکے۔ یہ دکھ، یہ غم جانکاہ تو ان کی برداشت کی انتہاؤں کا امتحان ہے۔

وہ ضبط کے پہرے لگاتے ہیں اور آنسو تمام بند توڑ کر بہہ نکلتے ہیں۔

ریاض صاحب کئی بار بولتے بولتے رونے اور روتے روتے بولے۔

انہوں نے گلوگیر آواز میں بتایا "میں نے خدا کے حضور اپنی زندگی اس کے بدلے لینے کی دعا کی مگر میری یہ دعا بھی قبول نہ ہوئی۔ ابھی تو بابر کے بچے بہت ہی چھوٹے ہیں۔ اس نے خود بھی دنیا میں ابھی کیا دیکھا تھا"

وہ دوستوں جیسے باپ ہیں۔ ان کا غم بہت بڑا ہے۔ اور تسلی کا ہر لفظ بہت چھوٹا۔۔۔ لیکن دکھا ہوا دل اور دل پر ڈھیروں بوجھ لے کر اس سنسان راہداری میں نکل آئی جس کے چپے چپے پر بابر صاحب کے قدموں کے نشان ہیں۔ ان کے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے نظر ٹھہری، ٹھٹکی اور بے ساختہ زبان پر یہ شعر آگیا۔

ان صورتوں کو ترسے گی چشم جہاں کہ آج
کمیاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

★

ہم قلمکار بہت حساس اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنے اور سوچنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی غیر کا دکھ بھی ہمارے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ پھر جو لوگ ہمارے قریب ہوں جن سے اچھی طرح آشنائی ہو، ان کا دکھ برداشت کرنا عذاب جان بن جاتا ہے۔ آج سے چند دن پہلے تک میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے خالدہ اسا جیسی لکھاری کے ساتھ ساتھ ذوالقرنین کی اچانک اور بے وقت موت کا صدمہ بھی سہنا پڑ جائے گا۔

یہ غالباً نومبر کے وائل ہفتے کی بات ہے۔ میری نند کی شادی تھی۔ گھر میں ہنگامہ اور خوب شور شرابا تھا۔ میں جانے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھی کہ اچانک ہی میرے بیٹے نے مجھے نومبر کا خواتین ڈائجسٹ لا کر تھما دیا اور یہ میری پرانی عادت ہے کہ چاہے کتنی ہی مصروفیات کیوں نہ ہوں لیکن ہیں ان گزشتہ کام کیوں نہ منتظر ہی ہوں ڈاک سے آنے والا تازہ شمارہ سرسری جائزے کے لیے فوراً کھول کر بیٹھتی اور دیکھتی ہوں۔ اس کی بڑی وجہ نگہت عبداللہ کی تحریر افسانے یا ناولٹ کی صورت میں یا پھر رہا کی کا قسط وار ناولٹ اور رفعت سراج کا سلسلہ وار ناول ہوتے ہیں۔ ان

کہنا کہ مسافر تو گیا

نجمہ جبین علیمی

بہنوں کی تحریریں میں شوق اور دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ بانو تو یوں بھی کبھی کبھار ہی قلم کا جوہر تحریر کے روپ میں دکھاتی ہے۔ بہرحال جیسے ہی اداریہ پڑھا تو میں جیسے سناٹوں کی زد میں آگئی۔ دل اور آنکھوں کو قریب ڈیڑھ سے لیے بار بار وہ اداریہ پڑھا اور پھر میرے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

اس سے پہلے خالدہ اسد کی وفات کا پڑھ کر ذہنی طور پر اپ سیٹ تھی۔ ذوالقرنین کے روپ میں محمود بابر فیصل کی ناگہانی اور اچانک موت کا پڑھ کر میں کتنی دیر گم صم اور ساکت کھڑی رہ گئی۔ باہر مہمانوں کا شور تھا اور اندر کمرے میں میری آنکھیں اس ہنستے مسکراتے زندہ دل بندے کی جوان موت پر اشکبار تھیں جس کے ساتھ میرا تحریروں اور جریدے کے ذریعے گہرا رشتہ تھا جس نے چودہ برس پہلے مجھے بطور لکھاری کرن میں روشناس کرایا تھا۔ ماہنامہ حور کے بعد بابر بھائی نے ہی میری ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے میں حوصلہ افزائی کی۔ میری تحریروں کو تواتر سے کبھی افسانے اور کبھی ناولٹ کے روپ میں چھاپا۔ اور میرے لیے یہ بات بھی باعث فخر اور خوشی ہے کہ میرے زیادہ تر افسانے اور ناولٹ ان کے زیر ادارت نکلنے والے رسالے کرن میں ہی شائع ہوئے۔ وہ اکثر و بیشتر خط لکھ کر افسانہ اور ناولٹ کی فرمائش کرتے۔ کبھی عید نمبر کے لیے افسانہ منگواتے اور یقین جانیے کبھی گھریلو مصروفیات کی بنا پر میرا موڈ نہ بھی ہوتا۔ مگر خط آتے ہی مجھے لازماً افسانہ لکھنا پڑ جاتا۔

بس ایک افسوس سدا رہے گا کہ کرن میں شروع ہونے والے ایک مئی ناول سیریل کے لیے مجھ سے ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مگر میں اپنی چند ذاتی مجبوریوں اور مصروفیت کی وجہ سے اس وقت ناول نہ لکھ کر دے سکی۔ کاش کہ مجھے پتا ہوتا۔ انہوں نے اتنی جلدی اس دنیا سے چلے جانا ہے تو میں ان کی یہ خواہش ضرور پوری کرتی

سنئیے پر دہلا کی وہ خوبصورت محفل جو بابر بھائی کے چٹکلہ دار جوابوں سے سجتی تھی۔ اب کتنی بے رونق اور ویران لگے گی۔ اب ہماری قاری بہنیں کس سے اوٹ پٹانگ سوال کرکے برجستہ جواب مانگا کریں گی۔ کرن شاہین کون سجائے گا۔ میرے خدا کتنی ظالم اور ٹھوس واٹل حقیقت ہے۔ یہ بے رحم موت جو ساعتوں میں بندے کو اپنے پیاروں سے، اپنے چاہنے والوں سے جدا کردیتی ہے۔

بابر بھائی کی ڈھیر ساری یادیں تحریروں کی صورت میں ہمارے ذہن پر نقش رہیں گی۔ بقول ان ہی کے انہوں نے ناول لکھا تھا۔ جسے ڈھونڈ ڈھونڈ ہارا۔ کاش بھائی آپ ایسی جگہ نہ چھپتے جہاں اب ہمیں واقعی ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہارنا پڑ جائے گا۔ مگر آپ نہیں ملیں گے۔ آپ کے معصوم کھلونے آپ کو پکاریں گے۔ صبا بی صدائیں دیں گی۔ ماں باپ تڑپ تڑپ کر بلائیں گے مگر آپ پلٹ کر نہیں آسکیں گے۔ آپ تو بس دکھیا کے مسافر تو گیا، کی مانند کبھی نہ لوٹنے کے لیے چلے گئے ہیں۔

میری ان سے کبھی براہ راست بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ دوری کی وجہ سے بس خط و کتابت کے ذریعے ہی بات چیت ہو جاتی۔ تاہم جس انداز میں وہ اکثر و بیشتر افسانہ نگاروں کے اعزاز میں کرن شام کے نام سے محفلیں سجاتے۔ اور اپنی خوبصورت کمپیرنگ اور برجستہ جملوں کی ادائیگی کے ساتھ محفل میں شریک مہمانوں کو محظوظ کرتے وہ سب کرن میں پڑھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی۔

یقین جانیے میں تو اس حقیقت سے بھی لاعلم تھی کہ ذوالقرنین کے نام سے شہرت پانے والے محمود بابر فیصل ہیں۔ اصل میں وہ خط میں بھی ذوالقرنین ہی لکھتے تھے۔ اور کرن میں اسی نام سے مقبول تھے۔ سنئیے پر دہلا میں جس چالاکی سے شرارت آمیز روپ کے ساتھ وہ بے چاری ہماری بہنوں کو لاجواب کرتے تھے۔ وہ ان کا اپنا ہی انداز تھا۔

مجھے تو یہ پڑھ کر بھی تاسف حیرت ہوئی کہ وہ اپنی معصومیت میں اس سلسلے کے ذریعے لڑکیوں کو کیسے مزے کے جواب دیتے تھے۔ اتنے ہنس مکھ اور زندہ دل بابر بھائی نہ صرف شادی شدہ ہیں۔ بلکہ بچوں کے باپ بھی ہیں۔ شاید اتنی کم عمری میں انہوں نے اس دن کے لیے ساری خوشیاں یوں سمیٹی ہوں گی۔

وہ واقعی ایک بے مثال اور مخلص انسان تھے۔

خداوند کریم انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)۔ اور کرن کے روپ میں ان کی یادگار کاوشوں کو مزید تابانی دے (ثم آمین)۔

روبرو

رفعت ناہید سجاد

امت الصبور

آمت الصبور کی یہ کمال عادت ہے کہ وہ کسی کو سکون کی نیند سونے نہیں دیتی۔ بس ایک مرتبہ آپ کی اس سے واقفیت ہونی چاہیے۔ کتنی دفعہ دل چاہا بس اُردو ادب کی بہت خدمت کرلی۔ ایم اے کے نصاب میں اس سال تو ذرا بے ایمانی ہوگئی ہے۔ اگلے سال ہمارے افسانے شامل ہو ہی جائیں گے۔ لہٰذا پاؤں پسار کر سستا لیا جائے۔ یوں بھی رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ ہی دیا ہے۔ لیکن وہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ چار چار پانچ پانچ سال کے طویل عرصے میں بھی اس نے نہ ہمت ہاری نہ فون کی گھنٹیاں بجانی چھوڑیں۔ ہر دفعہ میں شدومد سے سوچتی کہ بہت بری بات ہے وہ اتنی مرتبہ کہہ چکی ہے اور افسانے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں، لیکن ایک دفعہ آرام کی لت لگ جائے تو مشکل سے چھوٹتی ہے۔ بہرکیف ان پانچ سالوں میں اگر امتل پیچھے ہی نہ پڑی رہتی تو لکھنا ناممکن ہوگیا تھا۔

یہاں بھی پہلا حملہ امت الصبور کی طرف سے ہی ہوا ہے۔

۱۹۸۶ء میں آپ کا پہلا افسانہ موصول ہوا تو بار بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ تب مجھے حیرانی یہ تھی کہ آپ نے اتنی دیر سے کیوں لکھا۔ کیا پہلے کہیں اور لکھتی تھیں؟

جی ہاں! لکھتی تو تھی لیکن پہلے وقفے اس سے بھی طویل ہوتے تھے اور کوئی جگانے والا بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب میں ایم اے کر رہی تھی تو لاہور ٹی وی کے لیے میں نے بہت سے ڈرامے لکھے تھے۔ کبھی ادبِ لطیف اوراق وغیرہ میں بھی بھیجتی تھی لیکن یہ شمارے اتنی دیر کے بعد آتے تھے کہ آدمی لکھ کر بھول بھی جاتا تھا اور اس کا انتظار بھی نہیں ہوتا۔ پھر ایم اے سے بھی پہلے ایف اے میں میں نے "حور" کے سالناموں کے لیے لکھا تھا

ان دنوں یہ عورتوں کا واحد چلنے والا رسالہ تھا اور اس میں صرف ڈھائی افسانے ہوتے تھے۔ پھر بار بار کیپ آتا تھا ویسے بھی وہ لکھنے کی نہیں پڑھنے کی عمر تھی۔ لاہور کالج کی بڑی وسیع لائبریری تھی پھر ہمارے پونچھ ہاؤس کالونی کی اپنی لائبریری تھی۔ لائبریریاں زیادہ تھیں، پڑھنے کا وقت کم۔ لہٰذا سنجیدگی سے لکھنے کی طرف توجہ گئی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے پڑھنا لکھنے سے کہیں زیادہ ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی لکھ نہیں سکتا۔ اتفاق میں نے ڈائجسٹ اس عمر میں پڑھنے شروع کیے جس عمر میں لوگ پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس زمانے میں بشریٰ رحمٰن اور ایم سلطانہ فخر تھیں۔ پھر ساجدہ حبیب اور آسیہ رزاقی کا دور آیا۔ سوچا ان سے مقابلہ کر کے دیکھوں۔ مقابلہ تو کر نہیں سکی، ان کی نقل مارنی شروع کر دی۔ ایم سلطانہ فخر کی کہانی تو خواب میں بھی آتی تھی۔ کہانیاں آج جس رنگ میں لکھی جاتی ہیں اس کی بانی سلطانہ فخر ہیں۔

"آپ کی ہیروئن بے حد صاف گو اور خوفناک حد تک سچ بولتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی ہیروئن میں آپ کا عکس ہے؟" (دوسرا سوال)

یہ وہ والا سچ نہیں ہے اصل! جو نرسری میں پڑھا تھا۔ سچ کہہ چھت پر جا، پل پر چڑھ در مجھے بچپن میں بھی ان گستاخانہ احکامات پر شدید اعتراض تھا) ہیروئن میں ہمارا عکس تو شاید ہوتا ہے کہ نہیں لیکن وہ ہمارا آئیڈیل ضرور ہوتی ہے۔ وہ سچ جو آپ سے بولے نہیں جاتے آپ کی ہیروئن بول دیتی ہے۔ آپ کی تسلی ہو جاتی ہے آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

سوال کا دوسرا حصہ "عملی زندگی میں لوگ آپ کی اس سچائی کو برداشت کر لیتے ہیں؟"

خوش قسمتی سے میں ایک ایسی نوکری کر رہی ہوں جہاں لوگوں کو مجھے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ بھی ہی۔

"آپ کی کہانیوں کے کردار اکثر اردگرد نظر آتے ہیں کیا کبھی کسی نے خود کو پہچان کر ناراضگی کا اظہار کیا؟"

منفی کرداروں کو اپنا آپ پہچاننے کی عادت نہیں ہوتی۔ انہیں تو شیشہ بھی ان کی مرضی کی صورت دکھاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے کسی خاندان کے بارے میں ایک ڈراما لکھا۔ خاندان کے بزرگ رات کو ڈراما

دیکھ کر صبح میرے پاس آ گئے اور بڑی رقت سے کہا تم نے یہ سب کچھ اپنے گھر کے بارے میں لکھا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا تمہارے گھر میں اتنی بندشیں ہیں۔ اتنا حساس ہونا بھی ٹھیک نہیں بیٹی۔ اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

جو کردار منفی نہیں ہیں اور میرے اردگرد بھی ہیں ان پر لکھنے کو دل چاہتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ حالانکہ جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تو طلوع سے کہا تھا۔ میں نخمی پھوپی پر افسانہ لکھوں گی، لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ میرا لکھا ہوا کوئی لفظ ان کے پڑھنے سے چوک جائے۔ پھر وہ مجھے ماریں گی بھی۔

یاسمین نشاط نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ سوال کروں۔ سوال کرنا میرے لیے بہت مشکل رہا ہے۔ میں کسی کا مواخذہ نہیں کر سکتی خواہ اس پر کتنے ہی قرض نکلتے ہوں۔"

کتنا اچھا ہوا یاسمین! آپ کی اس عادت کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے خود کو شک کا فائدہ دیا اور باعزت بری کر لیا۔

سوال تو خیر یاسمین نے کیے ہیں بس روایتی نمبر نہیں ڈالے۔ وہی سلوک جو بادشاہ، بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا "میرے افسانوں کی ہیروئن ویسے تو بڑی ایکٹو ہوتی ہے مگر دل کے معاملے میں مات کھا جاتی ہے۔"

دیکھا کمپیوٹر نے کیا نقصان کیا ہے آپ کا۔ دمیں نے ایک سروے میں پڑھا تھا کمپیوٹر اور آپ کے بارے

میں، گویا دل کا معاملہ سست اور کام چور لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

انہوں نے کہا ہے "بات کہانے کے اور بھی سو طریقے ہیں"۔

کیا کروں یا سمیں دل کو یہی والا بھاتا ہے۔

انہوں نے مزید لکھا ہے "آپ کی کہانی میں ہیرو کا کردار بہت کم ہوتا ہے۔ کیوں؟ اور پھر یہ کہ یہی کم کردار فارغ؟"

ان کا جملہ ادھورا ہے اور میرے جواب میں بھی خاموشی ہے۔ قارئین کو جواب دینا ضروری ہوتا ہے آپ کو نہ بھی دیا تو کیا حرج ہے؟ ہاں کم کردار۔ یہ بات ہے ذرا غور طلب۔

کم سے کیا مراد ہے۔ کمزور؟ مختصر بے اثر؟

پتا نہیں لکھنے والی کی غلطی ہے یا ہیرو کو پردۂ اسکرین سے دور رکھنے کا شوق ہے مجھے خود بھی پتا نہیں اور کسی نے پہلی دفعہ شکایت کی۔ اب ذرا دیکھوں گی ایسا کیوں ہوتا ہے۔

پھر آپ نے میرا خیال پوچھا ہے کہ عورت مظلوم ہے یا مرد؟ مرد کی برتری تسلیم کرتی ہیں یا نہیں؟

عورت مظلوم ہے یا مرد؟ ظلم تو ایک اضافی اصطلاح ہے۔ کبھی مل بیٹھے تو بحث کریں گے۔ آپ غالباً اسلام آباد میں رہتی ہیں کبھی تشریف لائیے۔ یہ عجیب خداداد فطرت ہے کہ جی چاہتا ہے مرد کو آپ سے برتر ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یونہی زبردستی آپ اس کو برتر تسلیم کر ڈالیں۔ شاذونادر ہی کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو برتر لگتا ہو۔ پھر بھی اس کی برتری تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی یا اس کا نہ کوئی ایسا رشتہ ہوتا ہے نہ حق۔ وہی آپ کی بات تسلیم کر کے قبول کرنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ میں کسی شخص کی کوئی بات نہیں مان سکتی جب تک اسے برتر تسلیم نہ کر لوں۔

دائمہ انور نے کسی لکھنے والے کے نام پہ پہلا خط بھیجا ہے اور ان کو شک ہے کہ خط پڑھنے کے بعد ان کا نام بھی ذہن سے محو ہو جائے گا۔

نام تو بہت مختلف ہے اور بالکل نیا۔ کبھی سنا ہی نہیں۔ محو تو بعد میں ہوگا پہلے مطلب تو بتائیے۔ اس قدر محبت کا شکریہ دائمہ۔ اور چونکہ یہ محبت آپ کے اور میرے مابین ہے لہٰذا آپ نے جو خوش کن اور اچھے الفاظ میرے لیے استعمال کیے ہیں انہیں شائع کر کے میں کسی کو اس میں شریک نہیں کرنا چاہتی۔ ٹھیک ہے ناں؟

ان کا خط پیلے رنگ کے کاغذ پر ہے اور ان کا اصرار ہے کہ پیلے کاغذ اہم ہوتے ہیں۔ یہ اچھا ہے اور ان زرد صفحات پر جو آپ نے میری ڈائریکٹری مرتب کی ہے وہ اور بھی اچھی لگی۔

انہوں نے لکھا ہے "آپ کا ہیرو اتنا اکھڑ نہیں ہوتا جتنی کہ محترمہ۔ بڑی جدوجہد کے بعد رضامندی دیتی ہیں (میرے زمانے کا ہیرو وحید مراد تھا اور اس کے زمانے میں اسی طرح ہوتا تھا)"

خاموشی سے ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کوئی میدان مارنے کی تگ و دو نہیں کرتیں پھر بھی میدان مار ہی لیتی ہیں۔ آپ کو ایسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو اپنی انا اور خودداری پہ آنچ نہیں آنے دیتیں۔

ایک طرف آپ نے دو صفحے تعریف کے بھر دیے۔ ادھر آپ کو اعتراض کرنا چاہیے کہ آخر ایک ہی کہانی آپ کیوں لکھ رہی ہیں۔ چلیے اگلے خط میں پوچھیے کہ اکھڑ ہیروئن اور خوشامدی ہیرو کی کہانی کب تک چلے گی۔ آپ کو اگر مجھ میں تنقید کی گنجائش نظر نہیں آتی تو آپ کی محبت ہے۔ بس۔ انہوں نے لکھا ہے اگر کوئی تنقیدی خط آئے تو ضرور چھاپیے گا پھر انہوں نے دعویٰ بھی کیا ہے کہ میری تحریر میں تنقید کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ہے تو پتا چلے کہ جائز ہے یا ناجائز؟

واہ بھئی وانمہ! یہ تو خود ہی فیصلہ ہو گیا کہ اگر مجھ پر کوئی تنقید ہو گی تو ناجائز ہو گی۔ ایسا تو نہیں تنقید تو آپ کو نظر آ ہی رہی ہے اور وہ ناجائز بھی نہیں۔ ہاں آپ کی فرمائش یقینی طور پر پوری کی جائے گی۔ تعریفی خطوط نظر انداز کیے جا سکتے ہیں۔ اس انداز میں کہ ان کی تفصیلات میں نہ جایا جائے، لیکن تنقیدی سوالات کی تفصیل میں ضرور جاؤں گی اور ہاں سوال کہاں ہیں بھائی!

اگلا خط ادم سلطانہ کا ہے۔

انہوں نے لکھا ہے میں آپ کی سب سے بڑی فین ہوں مگر چلانے والا نہیں۔

آپ لکھتی ہیں بہت بہت پیاری نوکیلی کٹیلی رفعت سجاد۔

آپ بے شمار تعریفوں کا شکریہ۔ اتنی تعریفیں سن کر میں جامے میں نہیں رہتی۔ آئندہ احتیاط کرنا۔

سوالوں کے سلسلے وار جواب عرض ہیں۔

"ایک موسم دل کی بستی کا آئیڈیا آپ کے ذہن میں کہاں سے آیا؟"

ایک دن فرح دیبا نے فون کیا تھا کہ ایک ناول لکھنا ہے اور یہ کہ ہم جس کی فرمائش کرتے ہیں، پوری کروا کے دم لیتے ہیں سو مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ میں نے مرعوب ہو کر اسی وقت لکھنا شروع کر دیا۔ اس ناول کی کہانی میں تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہاں ماحول خاص تھا۔ وہ بھی غزالہ نگار بتا سکتی ہیں درست تھا کہ غلط۔ کہ میں نے ان کے علاقے کے لوگوں پر طبع آزمائی کی تھی۔ میں اس علاقے میں گئی تھی اور وہاں کی خوبصورتی اور خالص پن نے مبہوت کر دیا تھا۔ کہانی وہیں بن گئی تھی۔ یہ محل دو محلے اور جھونپڑیاں تو ذہنی اختراع ہوتی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔

"آپ کا ہر ہیرو اتنا سسپنس کیوں پھیلاتا ہے؟"

(فرصت کے وقت عمران ڈائجسٹ پڑھنے کا عادی ہے۔ شاید سسپنس نہیں پھیلاتا (میں آپ کی بات غلط قرار نہیں دے رہی، اپنی وضاحت کی کوشش کر رہی ہوں) ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ پہلی مرتبہ کسی شخص سے ملتے ہیں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ پھر اتفاقاً بار بار آپ کا اس سے سامنا ہوتا ہے اور وہ بتدریج آپ پر کھلنا شروع ہوتا ہے۔ یہ جاننے کا عمل ہی دراصل تجسس ہے۔

"آپ کی ہیروئن شروع میں ہیرو سے ناراض کیوں ہوتی ہے؟"

اسے اصولاً تو ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ناراضگی بڑا محبت بھرا تعلق ہے اور یہ تو ابھی شروعات ہے۔ وہ تو اسے جانتی بھی نہیں، محبت بھی نہیں کرتی پھر ناراضگی کاہے کی۔ ایسے ہی شو آف کرتی ہو گی۔

"آپ کی ہیروئن میں انا اور خودداری بہت زیادہ کیوں ہوتی ہے؟"

آپ کو پتا ہے وانمہ! جنہیں ہم کوئی خاص پسند نہیں کرتے اور جن سے ہمارے مراسم رسمی ہوتے ہیں ان کے سامنے ہم اپنی خودداریوں کا بوجھ نہیں اٹھاتے۔ ہماری انا وہیں مجروح ہوتی ہے، جہاں ہم اپنی عزت نفس ذرا بھی نیچا پڑتی نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ ہیروئن ہے، محبت کر رہی ہے، بھیک نہیں مانگ رہی، خودداری کیوں نہ دکھائے۔

"آپ کے افسانوں کا انجام منگنی ہوتا ہے شادی کیوں نہیں؟"

واہ... واہ! بہت شاندار نشاندہی کی ہے۔ ایک بڑی پرانی بات یاد آ گئی۔ آپ کو یاد ہو گا اک موسم دل کی بستی کا انجام بھی منگنی تھا۔ آخری قسط چھپنے کے بعد بابر صاحب (خدا ان کے درجات بلند کرے) اور فرح دیبا کا فون آیا کہ ایک لڑکی کی بہن ہمارے پاس آئی بیٹھی ہے۔ لڑکی کا کہنا ہے وہ اس سارے قصے کی چشم دید گواہ ہے۔ اس لڑکی کو جگر۔۔۔ کا کینسر تھا۔ ڈاکٹروں نے سخت ناامیدی کا اظہار کیا تھا۔ شاید

ایک ماہ، وہ بھی بمشکل۔ اس لڑکی کی خواہش تھی کہ ایک قسط اور لکھی جائے جس میں شادی دکھائی جائے۔ وہ لوگ بہت سنجیدہ تھے کہ کیا حرج ہے ایک مرتے ہوئے شخص کی خواہش پوری ہو جائے تو۔ پتا نہیں مایوسی کے اس عالم میں وہ شادی کی محفل میں شریک ہو کر کس قسم کی خوشی منانا چاہتی تھی۔ ہم نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ایک قسط اور لکھی جائے اور اسے چھاپنے کے بجائے بطور خاص اسی کو بھیج دیا جائے۔ میں نے مریضہ سے رابطہ کیا تو پتا چلا وہ تو کوما میں چلی گئی ہے۔ ان کے والد صاحب نے امید بھرے انداز میں کہا تھا۔ جونہی وہ ٹھیک ہوئی آپ کی قسط پڑھ لے گی۔ اس کے بعد کیا ہوا، ان کے گھر والوں نے میرے متعدد خطوں میں سے کسی کا جواب نہیں دیا۔ ذہن پر آج تک بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

"اتنا کم کیوں لکھتی ہیں!"

یہ سوال ساری ڈاک میں موجود ہے لہٰذا جواب آخر میں۔

"شادی شدہ زندگی پر کیوں نہیں لکھا؟"

لکھا تو تھا۔ تب شاید آپ چھٹی جماعت میں پڑھتی ہوں گی۔ اس کا نام تھا "من شہر او سواس" میرے بہت پسندیدہ افسانوں میں سے ایک ہے۔ ایک اور بھی لکھا تھا "ستارے چاندنی سے پھول خوشبو" لیکن خطوں میں اس کہانی پر بہت احتجاج کیا گیا تھا۔ اور پوچھا تھا اس قسم کی کہانیاں کیوں لکھی جاتی ہیں۔ دراصل میں اور سجاد بہت غیر مداخلتی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملے میں قطعی غیر اختیار اور آزاد۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہ ثواب ہیں نہ عذاب۔ بغیر تجربے کے میں کچھ لکھ نہیں سکتی۔ اور مشاہدہ تجربے کے مقابلے میں کمزور چیز ہے۔

"ریت پر تیرتے جزیرے" کے لیے کوئی ایک آدمی ضروری نہیں۔ ہماری اسمبلیاں بھری پڑی ہیں۔

"ضرور ملیے۔ میں راولپنڈی میں رہتی ہوں۔ اور گورنمنٹ کالج فار ویمن کھوڑہ میں ملازمت کرتی ہوں۔"

ناول کے سب حصے میرے پاس ہیں۔ آپ کو بھیج دوں تو اپنے پاس کیا رکھوں۔ یہ تو میں نے بڑھاپے میں پڑھنے کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔

تصویر دیکھ لیں۔ بالکل سامنے کے رُخ کی ہے۔ چہرا دیکھنے کا شوق پورا کریں۔

ضلع مانسہرہ سے امینہ خان لکھتی ہیں۔

میں آپ کی بے پناہ محبتوں کی مقروض ہوں۔ لیکن مکمل خط کیسے چھاپا جا سکتا ہے۔ پھر تو خواتین ڈائجسٹ والے بس سر پر وہ میں رہیں گے۔ آپ کی محبت کا اظہار میرے لیے ہے۔ میں نے اسے دل میں لکھ لیا ہے۔ باقی لوگ پڑھ کر کیا کریں گے۔

لکھنے کا آغاز کیے بیس پچیس سال ہو گئے ہیں۔ کالج میگزین، ماہنامہ حور، ستارہ ڈائجسٹ، ادب لطیف، فنون وغیرہ۔ تب میرا نام رفعت ناہید فاروقی تھا۔ میں سنجیدہ کہانیاں لکھتی تھی "اچھا والا ادب"۔ جس پر معاوضہ بھی نہیں ملتا تھا اور اس کو منانے کے لیے پورے چالیس پچاس صفحوں کی مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ پھر جب ہلکی پھلکی کہانیوں پر آئی تو سوچا اپنے نام کو کیا بٹا لگانا۔ شوہر کا نام ہی کیوں نہ خوار کیا جائے۔

لکھنے پڑھنے پر ہمارے گھر میں کبھی اعتراض نہیں کیا گیا۔ نہ لکھنے اور نہ پڑھنے پر کیا جاتا تھا۔

"پسندیدہ کتابیں۔ ادیب۔ شاعر؟"

شمیم بیٹا۔ بات لمبی ہو جائے گی۔ میں اس سلسلے میں بہت جذباتی ہوں۔ مجھے تو وہ لکھنے والے بھی یاد ہیں جو شاید خود کو خود ہی بھول بھی گئے ہوں۔ شہناز گل رضوی تھیں۔ ان کے افسانے میں ایسی شدید گرفت ہوتی تھی کہ آپ افسانہ ختم کرتے ہی پھر سے صفحے پلٹ کر پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور پھر لگتا تھا آپ پہلی دفعہ پڑھ

رہے ہیں۔ اس زمانے میں اور طرح کے افسانوں کا رواج تھا۔ فرضی شہر۔ مافوق الفطرت مخلوق۔ عموماً ناکامی یا خودکشی۔ افسانے میں جس قدر شدید مایوسی ہوا سی قدر کامیاب۔ ایسے میں شہناز گل رضوی ایسے سچے اور تازہ خوشبوؤں سے بھرے افسانے لکھتی تھیں جن میں ذرا بھی غیر فطرتی بات نہیں ہوتی تھی۔ مہر تاباں کسی کو یاد ہیں، کیا بات ہے ان کی بھی۔ کم لکھنے کی شکایت ان سے کرنی چاہیے۔
ایک کشور عمر تھیں۔ ان کا افسانہ "آن" میں ہر روز دوپہر کو پڑھتی تھی۔ (میں عصمت چغتائی وغیرہ کا نام نہیں لے رہی۔ وہ مسلّمہ بڑا ادیب ہیں۔ انہیں کسی کے سرٹیفکیٹ کی حاجت نہیں)
پسندیدہ کتابیں: آواز دوست۔ آگ کا دریا۔ دشت سوس NAUSEA WORDS اور بھی بہت سی ہیں۔ پھر کبھی بتانے لگوں تو کچھ اور نام ہوں شاید۔
پسندیدہ ادیب: ورجینا وولف۔ البرٹو موراویا۔ مختار مسعود۔ مشتاق احمد یوسفی اور ایک زمانے میں شفیق الرحمٰن پر جان دیتے تھے۔
شاعر: فیض۔ مصطفیٰ زیدی۔ منیر نیازی اور اگر اس کو جانب داری نہ سمجھا جائے۔ فرض کیا سمجھ بھی لیا جائے تو کیا برج ہے۔ میری عزیز ترین دوست شہناز پروین سحر۔ وہ بھی اب قصۂ پارینہ ہیں۔

میں موضوعات کا انتخابات سن سنا کر کرتی ہوں لیکن مختلف حالتیں کیفیت وہی بیان کرتی ہوں جو مجھ پر کبھی نہ کبھی ضرور بیتی ہو۔ دوسری بات بھی آپ کی درست ہے۔ سچی کہانیوں کو افسانے میں اس طرح مدغم کر دیں کہ سچ جھوٹ کا پتا ہی نہ چلے!
"میری ہیروئن کو غم روزگار کیوں لاحق ہوتا ہے؟"
"شاید اس لیے کہ میری ہیروئن بالی عمر کی کبھی نہیں ہوئی۔ کم عمری میں اپنا دھیان عشق کرنے کے بجائے اور کسی مصروفیت میں لگانا چاہیے۔ کتابیں پڑھیے۔ نئی نئی چیزیں سیکھیے۔ تفریح کیجیے۔ اچھا ٹی وی دیکھیے۔ یہ سولہ سال کی لڑکی اور اٹھارہ سال کا لڑکا زی ٹی وی کی دین ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ ایک خاص عمر سے پہلے کی محبت دراصل غلط فہمی ہوتی ہے اور اگر انجام بخیر نہ ہو تو محبت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر صحیح عمر میں یہ ادراک ہوتا ہے کہ محبت کے لیے مناسب عمر تو یہی ہے۔ وہ جذبہ ایک عمر قائم رہتا ہے۔ اور پچھلی باتیں حماقتیں اور مزید حماقتیں ہی لگتی ہیں۔ تو بات یوں بنی کہ آپ غم عشق میں مبتلا ہونے سے بچ گئے۔ تو غم روزگار میں تو الجھیں گے ہی ناں۔ بے کار بیٹھ کر کیا کریں گے۔
ہاں ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ دعا کرتی ہوں خدا ان کی شکل نہ دکھائے۔ مثلاً بظاہر سادہ نظر آ کر مکاریاں کرنے والے۔ اور یہ فقرہ بولنے والے "ہاں۔ آپ نے اب بتایا ہے اگر مجھے پہلے بتاتے تو" یا سامنے ست تعریف کر کے اس کے روانہ ہوتے ہی عیب نکالنے والے۔ ویسے تو مجھے خود بھی برائی برائی کھیلنے میں بہت مزا آتا ہے لیکن بس اس فرق سے کہ اس کے منہ پر بھی تعریف نہیں کی جاتی۔ میرا بھائی انور کھانے کی کوئی چیز سب کے درمیان لا کر رکھ دیتا تھا۔ اور کہتا تھا: "آؤ برائی برائی کھیلیں۔" اچھے کھانے کی چیز درمیان میں رکھی ہو تو برائیاں بڑی تیزی سے کی جاتی ہیں۔
"کوئی ایسا شخص جو آپ کا آئیڈیل ہو؟"

(باقی آئندہ)

بڑی اماں اپنے پانچ پوتوں اور ایک پوتی رِبا کی ذمے داریاں تن تنہا سنبھالے ہوئے تھیں۔ ایک پوتا چاند شادی کر کے امریکہ چلا گیا تھا۔ رِبا لڑکوں کے ساتھ مہ کران ہی کی طرح بولنے کی عادی ہو گئی تھی باوجود بڑی اماں کی شدید ڈانٹ ڈپٹ کے وہ خود کو لڑکی سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔

پاشا بظاہر ایک ہینڈسم وجیہہ نوجوان تھا۔ لیکن اپنی اوباش فطرت اور ناجائز طریقوں سے دولت کے حصول کی وجہ سے بدنام تھا۔ ماہ نور اسی کے محلے میں رہتی تھی۔ ماہ نور کی صرف ایک بہن تھی ثمرہ، والد بیمار رہتے تھے۔

شاہانہ اور نفیس خواجہ ایک کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ شاہانہ سے ان کا صرف ایک بیٹا تھا سنی جبکہ دوسرا بیٹا مون نفیس خواجہ کا تھا۔ موحل اور باقی کزن کے گھر والے عزت کی وجہ سے شہر میں شاہانہ کے گھر چھوڑ گئے تھے۔ شاہانہ کا ان کے ساتھ سلوک اچھا نہیں تھا۔

رفعت سراج
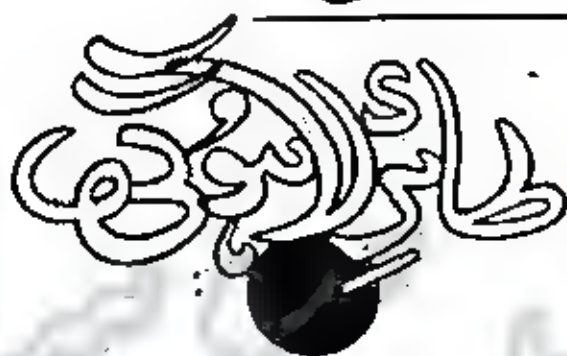
چوتھی قسط

دستک دینے کے بعد انتظار کا دورانیہ۔ جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ خاندان بھر میں جتنے کزنز تھے آج تک اس کی طرف ان سے رسمی بات چیت ہوتی تھی۔ اس میں سراسر اس کی اپنی طبیعت کا دخل تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات لکھے نظر آتے تھے کہ خواہش کے باوجود کوئی اس سے اپنے طور پر بات نہیں کر پاتا تھا۔ خوبصورت چہرے پر جمی ہوئی برف اتنی واضح ہوتی تھی کہ سامنے والے کے اپنے احساسات منجمد ہو جاتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ مظاہر نے دروازہ کھولنے کے بعد بڑی حیرت و استعجاب سے پہلے اس کی طرف پھر وال کلاک کی طرف دیکھا۔

"آؤ۔ اندر آجاؤ۔ خیریت؟" وہ کسی دھیان سے چونک کر گویا ہوئے۔

ماہ نور خاموشی سے اندر آگئی۔ مظاہر نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

ماہ نور نے پلٹ کر بیٹھنے سے قبل ان کی سمت دیکھا۔

"دروازہ بند کر دیجیے مظاہر بھائی۔" اس کی آواز سرگوشی کی طرح ابھری۔

"نہیں۔ شکریہ۔" مظاہر نے اس کی واضح تاکید پر واضح انکار کیا۔ اور واپس آکر اپنے بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئے۔ ماہ نور ایک ثقافت کا نشان قسم کی آرائشی کرسی پر پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

چند لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ مظاہر سراپا سوال بنے ہوئے تھے مگر خاموش تھے۔

"وہ۔ مظاہر بھائی!" ماہ نور نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں واضح لرزش تھی۔
"دراصل۔ ایک بہت پریشان کن مسئلہ ہے۔ اسی وجہ سے آج یہاں آئی ہوں۔" اس نے الفاظ ترتیب دینا شروع کیے۔

"ہوں۔ ہوں۔ کہو۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ کہ تم ہمیں اس قابل سمجھتی ہو۔ اطمینان رکھو مسئلہ بیان ہونے سے پہلے تمہارا ہے اور اس کے بعد جب سامنے آجائے گا تو ہم سب کا یعنی یہاں جتنے لوگ ہیں وہ سب تمہارے اپنے ہیں۔"

انہوں نے بھرپور اطمینان دلایا۔ گولڈن پھولوں والے کاٹن کے سفید نائٹ سوٹ میں وہ نیند بھری آنکھوں میں الجھن لیے بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں۔ نہیں۔ جو بات میں بتلانے جا رہی ہوں۔ وہ بس آپ تک رہنا چاہیے۔" وہ بے ساختہ گھبرا کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ ایسے ہی سہی۔ کہو۔ کیا بات ہے؟" تجسس اپنے کمال کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ماہ نور نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نگاہ اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔ وہ ادھر دیکھ رہے تھے۔ اس نے فوراً نظریں جھکالیں۔

"وہ ایسا ہے مظاہر بھائی!" وہ پھر جھجک کر رک گئی۔

مظاہر خاموش رہے۔

"ایک شخص مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ میرا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔" اتنا کہتے ہی وہ ہچکیوں سے رو پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرا چھپا لیا تھا۔

مظاہر بری طرح چونک پڑے۔ اس کے رونے کے انداز نے انہیں بے حد پریشان کر دیا تھا۔ ایک تواتر سے پریشان کن خیالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

"اوں۔ ہوں۔ رونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیا کہتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟" وہ بڑی فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

"رہتا تو پتا نہیں کہاں ہے۔ مگر روز راستے میں پریشان کرتا ہے۔ شاید بہت بڑا بدمعاش ہے۔ نہ راہ چلتوں کی پروا کرتا ہے نہ کسی اور بات کی!" وہ رک رک کر بتا رہی تھی۔ ساتھ ہی آنسو بھی صاف کر رہی تھی۔

"کیا نام ہے اس کا؟" مظاہر گہری سوچ کے پاتال سے باہر آئے۔

"پاشا کہتے ہیں۔ اس کی ماں نے اس کا پورا نام منہاج حسین پاشا بتایا تھا۔" وہ بولتی چلی گئی۔

"ماں! اس کی ماں کو تم کیسے جانتی ہو؟ جبکہ انہیں تو یہی نہیں پتا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟" مظاہر بری طرح الجھ گئے۔

وہ ساکت سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ جو کچھ منہ سے نکل گیا تھا اب اس کی وضاحت درپیش تھی۔

مظاہر ہنوز سوالیہ اور حیران نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔

اس نے جھجکتی ہوئی نظریں اٹھائیں مگر فوراً ہی جھکالیں۔ مظاہر دونوں ہاتھ جوڑ کر ہونٹوں پر رکھے بغور اسی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"وہ پروپوزل لے کر آئی تھیں۔" اس کی آواز بے حد آہستہ تھی۔

"تمہارا؟" وہ پھر چونک پڑے۔

ماہ نور نے اثبات بھری خاموشی اختیار کیے رکھی۔
"اسی کا، میرا مطلب ہے پاشا کا؟" مظاہر دھیرے سے پوچھ رہے تھے۔
اس نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
"تمہیں پسند نہیں تو انکار کر دو۔ مسئلہ کیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے۔" مظاہر نے اُلجھ کر کہا۔
"سیدھی سی بات نہیں ہے ناں۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ انکار نہیں ہونا چاہیے۔"
"اس کی ماں کے ذریعے دھمکی ملی ہے؟" مظاہر اب فکر مند ہوئے۔
"نہیں۔" وہ نہیں کہہ کر پھر خاموش ہو گئی۔
"اس نے خود دی ہے۔ مگر کہاں؟" مظاہر نے پوچھا۔ آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی۔ اب وہاں اُلجھن تھی حیرت تھی، فکر مندی تھی۔
"کیا راستے میں آتی بات کرنا ممکن ہے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
"اس کے لیے تو ممکن ہے۔" ماہ نور کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
"کیا تم شیور ہو کہ وہ بدمعاش ہے۔" وہ بہت کچھ اپنے طور پر سمجھ کر اگلے سوال کی طرف آئے۔
"تو اور کیا۔ انسان کا اسٹائل بتاتا ہے۔" وہ بولی۔
"ہو سکتا ہے اسٹائل دھوکا دے رہا ہو۔ معلومات کیے لیتے ہیں اگر نارمل ہے، ٹھیک ہے تو۔"
"نہیں نہیں۔" ماہ نور نے جیسے تڑپ کر انہیں ٹوکا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں اسی لیے آئی تھی آپ کے پاس؟" وہ برا مان گئی۔
"بہت بری شکل ہے؟" مظاہر نے پہلی بار تھوڑا شگفتہ انداز اختیار کیا۔ لہجہ معنی خیز تھا۔
ماہ نور کو ٹوٹ کر حیا آئی ان کے انداز پر۔
"انسان اندر سے اچھا نہ ہو تو کتنی اچھی شکل ہو بری ہی لگتی ہے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔
"اس کا مطلب ہے شکل اچھی ہے۔ خیر جب تمہیں ہی اچھی نہیں لگتی تو بے کار ہے۔ ٹھیک ہے میں پھوپھو کو کہہ دوں گا کہ ماہ نور کو یہ پرپوزل منظور نہیں آپ انکار کر دیں۔"
"ابا جان پہلے ہی انکار کر چکے ہیں۔ آپ بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟ انکار تو ہونا ہی ہے۔ مسئلہ انکار کے بعد کا ہے۔" اس نے گویا اپنا سر پیٹ لیا۔
"بہت دیتے ہیں لوگ گیدڑ بھبکیاں۔ کوئی ضرورت نہیں ڈرنے کی۔ تم نے پھوپھو سے یہ پرابلم ڈسکس کی ہے؟" مظاہر نے اس مرتبہ قدرے پُرسکون اور لاپروا انداز میں اس سے بات کی۔
"ان سے کہہ بھی مت دیجیے گا۔ کھانا پینا سونا سب چھوٹ جائے گا ان کا۔ میری اور ثمر کی شامت آ جائے گی۔ مجھے بھی چھوڑیے بے چاری ثمر کو کالج سے اٹھا لیں گی۔ ابا جان آل ریڈی بیمار ہیں۔"
وہ اپنی ملازمت کی اہمیت کا ذکر گول کر گئی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی نازک لمحے میں مظاہر اسے معاشی تعاون کا یقین دلا بیٹھیں اور ماں سے پہلے اسے ملازمت چھوڑنے کا مشورہ دینے لگیں۔ اس کی خوددار طبیعت کو یہ سب گوارا نہیں تھا۔
"ان سے کہہ سکتی تو پھر آپ سے کیوں کہتی؟" اس نے جتلانے کے انداز میں کہا۔
"یہ بھی ٹھیک ہے۔ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی ہو؟ مجھے اندازہ تو ہونا چاہیے۔" مظاہر کو واقعی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔
"آپ اس سے ایک مرتبہ مل لیں اور اسے ڈانٹ دیں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہے میرے آگے پیچھے کوئی

نہیں ہے۔" ماہ نور نے وضاحت کی۔
"مگر کہاں؟" مظاہر پھر اُلجھ گئے۔
"وہیں راستے میں۔" ماہ نور نے جواب دیا۔
"لیکن راستے میں تو مناسب نہیں ہے۔ بقول تمہارے وہ بدمعاش ہے۔ بات کسی انتہا تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس طرح تم سب کی نظروں میں آسکتی ہو۔ پھر تمہارے لیے ہی مشکلات پیدا ہونے لگیں گی۔"
"پھر۔۔۔؟" وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہوگئی۔
"پھر یہ کہ تم میرے فون نمبر نے لو۔ اور مجھ سے کونٹیکٹ میں رہو۔ اس کی والدہ جواب لینے کب آئیں گی؟" مظاہر نے سوال کیا۔
"پتا نہیں۔" اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔
"انہوں نے بھی اپنے بیٹے کے اسٹائل میں بات کی تھی؟ یا نارمل انداز تھا؟" مظاہر نے کچھ سوچتے ہوئے اگلا سوال کیا۔
"نارمل انداز تھا۔ وہ ہرگز اس کی والدہ نہیں لگتیں۔ بہت مختلف ہیں۔" ماہ نور نے دبے دبے لہجے میں جواب دیا۔
"ہوں۔ پھر تو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے طور پر ان کا اتا پتا اور کارگزاریاں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سائیڈ ٹیبل سے پرس اٹھا کر اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالنے لگے۔
ماہ نور ان کے آخری جملے کے بعد نہایت پُرسکون نظر آنے لگی تھی۔

"ہمارے ہاں لڑکیوں کی اتنی لمبی لمبی زبانیں پسند نہیں کی جاتیں۔ اپنے بڑے بھائیوں کو کبھی دیکھا ہے جواب دیتے ہوئے؟"
آج پھر ربیا کو جھاڑ پڑ رہی تھی۔
"لیکن بڑی اماں! آپ میری صرف بڑی اماں ہی نہیں ہیں۔ امی جان بھی ہیں۔ نانی جان بھی ہیں، خالہ جان بھی ہیں، دوست بھی ہیں، کزن بھی ہیں۔"
"ہیں۔ ہیں۔ ایں۔ کیا بولے چلی جارہی ہے۔ میں صرف تمہاری دادی ہوں۔" بڑی اماں رشتوں کی اتنی طویل فہرست سنتے ہی پریشان ہوگئیں۔
"پھر آپ مجھے میری امی لا کر دیجیے۔ کیونکہ اور رشتوں کے بغیر تو گزارا ہو سکتا ہے امی مگر بہت ضروری ہیں۔" اس نے بچکانہ انداز میں ٹھنک کر کہا۔
ظہیر باہر نکلنے کے لیے لاؤنج کا دروازہ پار کر چکے تھے۔ ایک دم پلٹ کر واپس آئے۔
"ربیا! کیوں تنگ کرتی ہو بڑی اماں کو۔ اب تم کوئی بہت چھوٹی بچی نہیں ہو۔ بڑی اماں بہت کمزور ہیں اور بہت تھک بھی چکی ہیں۔ دنیا میں بہت سے انسان ایسے ہیں جو والدین کے بغیر پروان چڑھتے ہیں۔ مت پریشان کیا کرو بڑی اماں کو۔ کیوں اپنے آپ کو یقین نہیں دلاتیں کہ تمہارے ماں باپ اب دنیا میں نہیں ہیں۔"
"اللہ نہ کرے۔" بڑی اماں نے ہول کر دل ہی دل میں کہا۔ ظہیر بہت تلخ لہجے میں کہہ کر باہر جا چکے تھے۔
بڑی اماں ربیا کو سنجیدہ اور افسردہ دیکھ کر تڑپ سی گئیں۔ انہوں نے بہت محبت سے اس کی پیشانی

پرے بال ہٹائے۔ وہ ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی تھی۔
"بڑی اماں۔ کیا ان دونوں کی ایک ہی روز ڈیتھ ہوئی تھی۔ اگر نہیں تو پہلے کس کی ڈیتھ ہوئی تھی؟" اس نے نظریں اٹھا کر بڑی اماں کا ستا ہوا پریشان چہرا دیکھا۔
ان کی آنکھوں سے چند قطرے نکلے اور جھریوں میں بھٹک گئے۔
انہوں نے جھک کر ربا کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ "اللہ تمہیں ہر مشکل ہر دکھ سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔"
"یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا بڑی اماں۔" اس کی آواز میں سنجیدگی اور الجھن تھی۔ بڑی اماں نے جواب میں مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔
"جمال اور اظہار آج صبح سے نکلے ہوئے ہیں شام ہونے کو آئی۔ اللہ جانے کہاں رہ گئے بچے؟
آج میں نے تمہارے لیے بروسٹ لانے کے لیے کہا تھا اظہر سے۔ تمہیں پسند ہے ناں؟ گوشت تو تم شوق سے کھاتی نہیں ہو۔ اسی لیے اظہر سے کہتی ہوں ہفتے میں ایک بار لے آیا کرے۔ تمہاری بڑھنے کی عمر ہے۔ دودھ تم شروع سے ناپسند کرتی ہو۔ مجھے تو یہی فکر رہتی ہے کہ کمزوری نہ رہ جائے۔ اس عمر میں تو بچوں کو ہر چیز کھانا پینا چاہیے نیا خون بنتا ہے۔ انسان اچھی ہوتی ہے۔"
ان کے لہجے کا زور ٹوٹا ہوا تھا۔ دھیمی اور ملائم آواز میں وہ اس سے یوں مخاطب تھیں جیسے ویسے ان کے درمیان یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

"مومل۔" اسے قریب سے سنی کی آواز سنائی دی۔ اور گویا اس کی روح پرواز کر گئی۔ پتھرا کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔ آواز کہیں گم ہو گئی۔
"مومل۔" اس بار سنی کی آواز تیز تھی۔
"ج۔ جی صاحب۔" اس نے بمشکل حلق سے آواز نکالی۔
"بڑھیا کہاں ہے؟" اس کا رویہ اس وقت صبح سے قطعی مختلف تھا۔
"وہ تو سو گئی ہوگی۔" وہ لرزتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"تمہاری بہن کہاں ہے؟" وہ عجیب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"وہ بھی سو گئی صاحب۔"
"تم کیوں جاگ رہی ہو؟" وہ غرایا۔
"مم۔ میں بھی سو رہی ہوں۔" اس کا رنگ خوف سے سفید پڑ چکا تھا گھوم پھر کر کمبخت رات پھر آ گئی تھی۔
"میرا بیڈروم فریج خراب ہے۔ جب تک ٹھیک نہ ہو تم روز رات کو اسی وقت میرے بیڈروم میں برف لایا کرو گی۔"
مومل تھر تھر کانپنے لگی۔ سنی اتنا کہہ کر پلٹ گیا تھا۔ مومل نے بمشکل گردن موڑ کر اس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر کھڑی اپنی سانسیں سنبھالتی رہی پھر خوف کے اس مقام سے ایک اڑان بھری جہاں انتہائی خوف یکدم بے خوفی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ بلا ارادہ بے اختیار مون کے بیڈروم تک چلی آئی تھی۔ اس نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری تیسری بار بھی خاموشی رہی تو اس نے ہینڈل گھما کر اندر جھانکا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اندر داخل ہو گئی پھر دروازہ بند کر دیا۔
اسے یاد آ گیا تھا کہ مون کی واپسی رات گئے ہوتی ہے۔ اس نے اندر سے چٹخنی لگالی تھی اور دروازے سے ٹک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا رواں رواں دعا گو تھا۔

اس کے پاس علم نہیں تھا۔ اسے کائناتی ذہن سے رابطے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ مگر روح لاشعوری طور پہ اپنے خالق سے ہمہ وقت مربوط رہتی ہے۔ اور دُعا کا تقاضا آگہی کا محتاج نہیں۔

روزِ اوّل جب خالقِ کائنات نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (پہچان لو میں تمہارا رب ہوں) کہا تو تمام ارواح نے بَلیٰ کہہ کر پہچاننے کا اقرار کیا تھا۔

اسے فاضلانہ وظائف و ورد نہیں آتے تھے مگر چلتی سانس تو خالق سے پیوستہ تھی۔ پکار کا عمل تو جاری تھا۔ اس لیے کہ خالق و تخلیق کے بیچ 'بَلیٰ' موجود ہے۔ جانے کب تک وہ غیر موجود ہو کر صرف دعا بنی رہی۔ باہر کسی کے چلنے پھرنے کی آوازیں کئی مرتبہ اُبھر کر معدوم ہوئی تھیں۔ اور ہر مرتبہ اس کا دل ڈوب ڈوب کر اُبھرا تھا۔ اسے گھڑی میں وقت دیکھنا نہیں آتا تھا مگر پھر بھی گھڑی کی سوئیوں کو ایک ٹک تکے جا رہی تھی۔ شاید اس احساس ہی سے تقویت پکڑ رہی تھی کہ گھڑی کی سوئیاں آگے کھسک رہی ہیں تو وقت گزر ہی رہا ہے۔

بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں سُن ہونے لگیں۔ تب اسے محسوس ہوا کوئی ہینڈل گھما رہا ہے۔ اس نے قدموں کی چاپ سنی تو تھی مگر ڈر رہی تھی کہ ہو سکتا ہے سنی اسے تلاش کر رہا ہو۔

اس نے بہت ہمت کر کے پوچھا تھا "کون؟"

"کون ہے اندر؟" سوال کے جواب میں بھی سوال تھا۔

اس نے مون کی آواز پہچان کر جھٹ چٹخنی گرا دی۔

مون اسے اپنے بیڈ روم میں پا کر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا کر رہی ہو ادھر، اس وقت؟" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

مومل نے جواب دینے کے بجائے دروازہ بند کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا۔

"صاحب۔ میں کہاں جاؤں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

"کیوں لگ رہا ہے ڈر اور کس سے؟" وہ تنے ہوئے انداز میں ہاتھ کمر کے دونوں حصوں پر جمائے اسے گھور رہا تھا۔ ساتھ ہی سوچ اس کی نظروں تک میں اُتر آئی تھی۔

"وہ۔ سنی صاحب۔"

مون بُری طرح چونک پڑا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔ وہ پھر مجھ سے برف منگا رہے تھے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"پھر سے کیا مطلب؟" گزری ہوئی رات کے معنی اس پر آناً فاناً منکشف ہونے لگے۔

"مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں وہ ماسی سے برف منگا لیا کریں۔" وہ بہت آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

"کیوں لگتا ہے تمہیں اس سے ڈر؟" جس سوال کا جواب خود ہی پتا ہو اس سوال میں صرف بے روح الفاظ کی قطار ہوتی ہے۔ اس لیے مومل خاموش رہی۔ سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کل رات کو جب تم بھاگتی ہوئی باہر آئی تھیں اس وقت بھی اس نے تم سے برف منگائی تھی؟" مون نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کلائی سے رسٹ واچ اتارتے ہوئے پوچھا۔

مومل خاموش کھڑی کارپٹ کو گھورتی رہی۔

مون نے رسٹ واچ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور قمیص کا اوپری بٹن کھولنے لگا۔ اسے ایک گہری سوچ لاحق تھی۔

"حالانکہ میں نے تم سے کل بھی کچھ پوچھا تھا۔ تم انتہائی احمق ہو۔ اسٹوپڈ۔ ماسی کو کیا بتایا تم نے؟" مون کوئی اسٹینڈ لینے سے پہلے ٹھیک ٹھاک باخبر ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں صاحب۔" اب اوسان قدرے بحال ہو چکے تھے۔

مون نے ایک اچٹتی نگاہ اس کی بدرنگ اوڑھنی پر ڈالی۔ جس کو اس کے ہاتھ بھی چھوڑ چکے تھے۔ کل یہ زینے پر پڑی ہوئی تھی۔ متحمل ہو چکا تھا مگر پیشانی پر لکیریں بکھر گئی تھیں۔

"تمہارے ماں باپ تم سے ملاقات کرنے کب آئیں گے؟" وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"اللہ سائیں جانے صاحب" مومل کی اداسی بڑھ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ بابا اللہ یار کل تمہیں گوٹھ چھوڑ آئے گا" مون نے کہا۔

مومل کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ گوٹھ۔ جہاں بادام کے درخت کے نیچے اس کی ڈھیروں سکھیاں اس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

"آپ بہت اچھے ہیں صاحب۔ لیکن صاحب، ماسی کوارٹر میں سو چکی ہے۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کوارٹر یہاں سے دور ہے اور میں کوٹھی میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے باہر نکل کر بہت ڈر لگے گا۔ میں ادھر قالین پر سو جاؤں گی۔ پھر صبح چاچا اور باجی کے ساتھ گوٹھ چلی جاؤں گی۔"

"نہیں بھئی۔ تم ادھر نہیں سو سکتیں۔ واٹس اے پرابلم۔" وہ جھلایا۔ "میں گھر میں موجود ہوں، کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ جاؤ کہیں بھی جا کر سو جاؤ۔ ہری اپ۔" اس نے قدرے ناگواری سے اس کے وجود کی طرف دیکھا۔ درحقیقت وہ خود بری طرح الجھ گیا تھا۔

وہ اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ مون کی موجودگی سے جو خوف کی دھند چھٹی تھی وہ ابھی اس پرسکون احساس میں دیر تک بھیگے رہنا چاہتی تھی۔

"جاؤ بھئی" وہ برہم ہو گیا۔

وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مون اپنا نائٹ سوٹ نکال کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

سفید کاٹن کے نائٹ ڈریس میں باہر آیا تو وہ ہنوز اپنی جگہ ایستادہ تھی۔ زندگی کی ناخوشگواریوں سے بوجھل اعصاب نئی مصیبت پر چیخ چیخ اٹھے۔ جی تو چاہتا تھا دھکے دے کر باہر کر دے۔ اس نے تھکی ہوئی خوابیدہ مگر قہر آلود نظر اس پر ڈالی۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اور اپنی بوسیدہ اوڑھنی سے آنسو بھی پونچھ رہی تھی۔ ناک، کان، ہاتھ، کوئی نقلی زیور بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہی سراپا زیور تھی جس کی چوری کے دھڑکے لگ گئے تھے۔ گندمی رنگ، سرخی مائل بھورے بال، بھرے بھرے پیازی ہونٹ جو اشکوں کی روانی روکنے کی کوشش میں کانپ رہے تھے۔ لوگ آج کہیں آدھا تولہ سونا بھی رہن رکھیں تو ڈھائی ہزار مل جائیں۔ اور ان کے بے بس والدین وہ تین لال نوٹوں کے عوض پورا خزانہ رہن رکھ گئے۔ جانے اگلے ہی لمحے میں اپنے اصل کی طرف پل دو پل کو متوجہ ہوا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر، اتنی بھاری ذمے داریاں۔

رات کے چند گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔ صبح مصیبت گوٹھ روانہ ہو جائے گی۔ باقی ممی کو ہینڈل کرنا رہ جائے گا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دروازے کے پاس سو جاؤ۔"

مومل کی گویا جان میں جان آ گئی۔ اس نے تشکر بھری نظروں سے مون کی طرف دیکھا۔

"سر کے نیچے رکھنے کے لیے لاؤنج سے کوئی کشن اٹھا لاؤ۔" اس وقت وہ اسے معمولی نوکرانی نہیں ایک بے بس روح نظر آ رہی تھی۔ اور کل اس نے اوڑھنی زینے پر سے نہ اٹھائی ہوتی۔ تو شاید طبیعت میں اتنی گہرائی بھی پیدا نہ ہوتی۔ اس کے اندر کوئی اسے ضرور تاکید کر رہا تھا کہ اس غریب کو بند دروازوں کے پیچھے تنہا چھوڑنا "نیوروسل بلنڈر" ہو گا اور اس کے اصول ہو گا۔

"میں لائٹ آف کر رہا ہوں۔ تم دروازہ بند کر کے سو جانا۔" وہ تو۔ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اس کی تاکید کے باوجود کچن تک لینے باہر نہیں گئی تھی۔

مومن نے لائٹ آف کی اور اپنے بیڈ پر چلا گیا۔ مومل نے دروازہ اچھی طرح بند کیا بلکہ چٹخنی بھی لگادی اور اوڑھنی کو گول مول کر کے سر کے نیچے تکیہ بنا کر رکھ دیا۔ احساس تحفظ کی تھپکیوں سے تھکے ہوئے وجود کو چند لمحوں کے اندر ہی نیند کی وادیوں میں دھکیل دیا تھا۔ وہ بالکل دروازے کے ساتھ لگی سو رہی تھی۔

مومن کو اگرچہ اس کی موجودگی کے احساس سے بہت کوفت ہو رہی تھی مگر وہ خود کو بہلا کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

مومل نے نیند سے چور آنکھوں سے، جو آخری منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ مومن باتھ روم میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ سو گئی تھی۔

پھر نیند ٹوٹی تو ایسی کہ بس ہمیشہ کے لیے قسمت کے کھاتے میں جا پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر خاموشی کے سخت پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ وہ وہم تھا، خود دوسرا سپیک وقت تھی۔ وہ بنز کار بیٹ پر لیٹی پھٹی آنکھوں سے اندھیرے میں چھت کو یوں گھور رہی تھی جیسے ادھر کوئی روزن تلاش کر رہی ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ مومن اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا۔ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر گیا تھا۔ اب اس کی خواب گاہ میں وہ تنہا تھی۔ دہشت زدہ و لب بستہ۔

"بس۔ تھوڑا سا اور پڑھ لوں پھر جی۔ پی پائلٹ بننے کی پڑھائی کروں گا۔"

"اللہ کی شان ہے جی۔ پی پائلٹ بنیں گی۔ ناسا میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ آخر ایک دن تو انشا اللہ پاکستان بھی کوئی شٹل خلا میں بھیجے گا۔ کتنی اچھی لگو گی تم شٹل میں بیٹھی ہوئی۔ ہم سب تمہیں سی آف کریں گے احمقوں کی طرح دیر تک ہاتھ ہلاتے رہیں گے حالانکہ تم تو اسٹاپ واچ کا ایک چکر پورا ہونے سے پہلے کئی لاکھ کلومیٹر طے کر چکی ہو گی۔ بلکہ کئی کروڑ کلومیٹرز۔"

"اظہار بھائی۔ آپ بھی شٹل کو کم از کم روشنی کی رفتار سے تو چلا دیں۔ زیادہ تیز اڑ رہی ہے۔ آپ تو یونیورسل فارمولے میں گڑبڑ کر رہے ہیں۔ قیامت بھی آسکتی ہے۔" مظہر نے ٹوکا۔

بیچارا جمال آنکھیں پھاڑ کر تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ ریبا تو جملا کر ان کے درمیان ہی سے اٹھ گئی۔ کتنے اہتمام سے وہ جمال کو اپنا فیوچر پلان بتلانے لگی تھی کبھی جو یہ دونوں اسے کوئی بات سنجیدگی سے کرنے دیں۔

ماہ نور دور کھڑی اپنی چادر پر استری کر رہی تھی۔ مظاہر کہہ گئے تھے کہ وہ شام چھ بجے اسے گھر ڈراپ کرنے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ بڑی بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کی نوک جھونک سن رہی تھی۔

"آپ تو ویسے ہی اتنے حاضر جواب ہیں۔ میدان کیوں چھوڑ رہے ہیں۔" جمال نے ریبا کو جانے سے باز رکھنا چاہا۔

"اور کیا ہمیں دیکھیے۔ ع حضرت داغ جہاں بیٹھے، بیٹھ گئے۔" مظہر نے ٹکڑا لگایا۔

"آپ لوگ انہیں اتنا نہ ستایا کریں۔ آخر چھوٹی ہیں یہ۔" جمال نے پھر سمجھایا۔

"نہ تو کول ٹریٹ کرتے ہیں آپ کی طرح نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔ آخر مجھے سمجھتے کیا ہیں؟"

ریبا، جمال کے انداز پر مسکراہٹ دبا کر گویا ہوئی۔

"ہمیں اکول ٹریٹ کرنے کے لیے اسپیشل لوگ آئے ہیں۔ ہندوستان سے اتنے اخلاقی تعاون کی امید تو

نہیں تھی۔ بہرحال۔"

"نہیں۔ یہ بہت باصلاحیت ہیں۔ بہت کونفیڈنٹ ہیں۔ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔" جمال نے نظریں جھکا کر تعریفی سند جاری کی۔

"جمال بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" ماہ نور استری کا پلگ نکال کر ان کے قریب چلی آئی۔

"عورت کا ووٹ تو پورا ہوتا ہے ناں گواہی کی طرح آدھا تو نہیں ہوتا۔" اظہار نے مظہر سے سوال کیا۔

"پورا ہی تو ہوتا ہے تب ہی ساری دنیا میں آج تک جمہوریت استحکام نہیں پکڑ سکی۔" مظہر نے بڑی افسردگی سے جواب دیا۔ "گن لیں۔ پورے دو ووٹ ہو گئے ہیں۔"

اسی دوران مظاہر بڑی عجلت میں لاؤنج میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم آغا جان۔" ریبا کا سلام سب سے پُرجوش اور نمایاں تھا۔

"وسلام۔ ریڈی ہیں ناں ماہ نور۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔" وہ اسی عجلت بھرے انداز میں گویا ہوئے۔

"جی میں بالکل تیار ہوں۔ نانی جان کو خدا حافظ کہہ دوں۔" وہ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے گویا ہوئی۔

"کتنی اچھی ہیں ماہ نور آپی۔ ہے ناں جمال بھائی؟" ریبا نے چور نظروں سے مظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ بہت دھیما مزاج ہے۔ ویری پولائیٹ۔" جمال نے جواب دیا۔

"ان کے لیے لڑکا دیکھنے گئے تھے ہم لوگ۔ پھوپھو، بڑی اماں، اور میں۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ مگر میری سُنے گا کون؟ تھوڑے دنوں میں موٹا ہونے والا ہے وہ۔" اس نے بڑی آزردگی سے کہتے ہوئے چوری چوری مظاہر کی طرف دیکھا۔

مظاہر قدرے چونک پڑے تھے۔ انہوں نے ابرو اٹھا کر ایک اچٹتی نگاہ ریبا پر ڈالی تھی۔ اسی لمحے بڑی اماں اور ماہ نور ایک ساتھ لاؤنج میں واپس آئیں۔

"آجایا کرو بیٹی اسی طرح۔ یقین جانو مجھے بہت خوشی ہوتی تمہارے آنے سے۔ تم تو کبھی بھی آتی جاتی نہیں ہو۔ عارفہ سے کہنا ذرا جلدی چکر لگالیا کرے۔" بڑی اماں کا الوداعی انداز خاصا طویل ہو جاتا تھا۔ مظاہر اضطراری انداز میں پہلو بدل رہے تھے۔

"اچھا نانی امی اللہ حافظ۔" بڑی اماں کے خاموش ہوتے ہی ماہ نور نے جلدی سے کہا۔ اور مظاہر کے پیچھے چل پڑی۔

پانچ منٹ کی خاموشی ذرا ٹوٹ کے بعد مظاہر نے اسے مرر میں دیکھا۔

"کوئی اور پرپوزل بھی آیا ہوا ہے ریبا بتا رہی تھی۔" انہوں نے گیئر کو حرکت دیتے ہوئے سوال کیا۔

ماہ نور ایک دم جھجک سی گئی۔ کہ کیا جواب دے اس سوال کا۔

"جی۔ ابا جان کے احباب میں سے ہیں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"ہوں۔ تو یہ اور ازی ہو گیا ہے۔ ریبا بچی ہے اس کے دیکھنے اور سوچنے کا انداز سطحی ہے۔ اگر مناسب پرپوزل ہے تو اس کے ہو جانا چاہیے۔" انہوں نے ریبا کی رائے کو قطعی غیر اہم باور کراتے ہوئے کہا۔ مبادا محض ریبا کی وجہ سے ماہ نور غور کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔

"شادی شدہ لڑکی کی پوزیشن بہرحال سوسائٹی میں بہت مضبوط ہوتی ہے۔ تمہارے لیے تمہارے اچھے پارٹنر کی بیک کافی ہوگی۔ خدانخواستہ پھر بھی کوئی بدمزگی درمیان میں آجاتی ہے تو ہم ہیں ناں۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر یہ پرپوزل مناسب ہے تو علی الفور تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ باقی باتیں پھر دیکھی جائیں گی۔ سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔" مظاہر نے پھر مرر میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔

ماہ نور خاموش رہی۔ اسے مظاہر سے بہت حیا محسوس ہو رہی تھی۔
گھر نزدیک آ چکا تھا۔ تبھی اچانک گولڈ اسپاٹ پر اس کی نگاہ پڑی۔ سارے وجود میں تھرتھری دوڑ گئی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔
ایک دم سیاہ پینٹ اور بلیک سیاہ شرٹ میں اپنے مخصوص ریڈ اسکارف اور گلاسز کے ساتھ وہ کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے ان کی گاڑی ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور نے بہت بے ساختہ انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی یہ چونکا دینے والی ادا مظاہر سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ یوں بھی اس کے علاقے میں داخل ہوتے ہوئے کانشس ہو رہے تھے۔
"کیا ہوا؟" انہوں نے گاڑی سے باہر ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔
"وہ۔ کچھ نہیں۔" وہ بوکھلا سی گئی۔
مظاہر نے گاڑی روک دی۔ "کیا کہیں کھڑا ہوا ہے؟" ان کا ذہن بہت سرعت سے کام کر رہا تھا۔
ماہ نور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
"کدھر؟۔ کہاں؟" وہ گاڑی بیک کرنے لگے۔
"آپ۔ گھر چلیں مظاہر بھائی!" اسے ڈر سا لگنے لگا۔
"میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے بھی اس کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں جواب دیا۔
"وہ۔ گولڈ اسپاٹ پر بلیک کپڑوں میں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔
مظاہر نے فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ اور ماہ نور نے وحشت زدہ ہو کر بے اختیار ان کا بازو دبوچ لیا۔
"نہیں۔ نہیں۔ بس۔ بے سوچے سمجھے ابھی کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ پلیز مظاہر بھائی!" وہ روہانسی ہو گئی۔
"میں کچھ نہیں کر رہا۔ ثمرہ کے لیے آئس کریم پیک لے کر آ رہا ہوں۔" اس کے خوف و سراسیمگی کو دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ "ڈرو نہیں ماہ نور!" وہ اپنا بازو چھڑا کر گاڑی سے اتر گئے۔
ماہ نور قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ ساتھ ہی گاہے گاہے گردن موڑ کر پیچھے بھی دیکھ رہی تھی۔ مظاہر اسپاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ باشباب سرو قد کھڑا ہوا تھا۔ وہ قدرے سر جھکائے ہوئے جلتے لائٹر سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے گرد دھوئیں کے مرغولے تھے۔ مظاہر اس کے بے حد قریب کھڑے تھے۔
مظاہر چند منٹوں بعد واپس آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ جو انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ماہ نور کو تھما دیا۔ اور کھٹاک سے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ اور گاڑی اسٹارٹ کر کے خاصی اسپیڈ سے دوڑا دی۔
انہوں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ ماہ نور نے بہت ہمت کر کے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں گہری سوچ کا عکس بہت واضح تھا۔
"میں رکوں گا نہیں ماہ نور۔ پھوپھو کو سمجھا دینا کبھی وہ کچھ خیال کریں۔" مظاہر نے کہا۔
(حیرت ہے آپ کو بھی اتنا خیال آ سکتا ہے؟) وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

اسے بہت تیز بخار تھا۔ ماسی نے اپنے ایک کمرے کے کوارٹر میں اس کو ایک پلنگ پر لٹا دیا تھا۔ وہ بڑی دلسوزی سے اس کی تیمار داری کر رہی تھی۔

اس کی اوٹ خاموشی کو وہ اس کی طبیعت کی خرابی پر محمول کر رہی تھی۔ باتی اور دوسرے بچے کئی مرتبہ آکر اس کی خیریت معلوم کر چکے تھے۔ وہ چیت لیٹی بس چھت ہی کو گھورے جا رہی تھی۔

"آج تو کوٹھی میں کوئی بھی نہیں ہے۔ سب لوگ فارغ ہیں۔ صاحب میں سے کسی کا بھی فون بھی نہیں آیا کہ کھانا تیار کرنا ہے یا نہیں؟ کوفتے اور مچھلی کے کباب رکھے ہوئے ہیں سلاد کا سالن میں بچوں کے لیے اٹھالائی تھی۔ آدھا کاکو کی ماں کو دے دیا۔ پتا نہیں کہاں سے بڑا سا کیک آیا تھا چار دن سے فریج میں رکھا ہوا تھا۔ آج میں نے شمسی کو بتا کر سارے نوکروں کے بچوں میں بانٹ دیا۔ پچھلے ہفتے بھی پیسٹریاں پڑے پڑے سوکھ گئی تھیں۔ رزق کی بربادی تو کوئی ان لوگوں کے ہاں دیکھے۔

اس سارے تو بڑے ان کے جوتے کھاتے رہتے ہیں کہ ہمارے بال بچوں کو کھلانے کو اٹھا لی جاتا ہے۔ پر تو نے تو صبح سے کچھ بھی ڈبل روٹی کا ٹکڑا بھی منہ میں نہیں ڈالا۔ کچھ کھا کر دوائی لے لے تو یہ بخار ٹوٹے۔ اللہ یار نے مجھے بیس روپے دیے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں تجھے۔ چل شاباش۔ اٹھ میری بچی۔ یہ چائے ڈبل روٹی کھالے۔" ماسی بہت محبت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

وہ اسی طرح خاموش لیٹی ماسی کو خالی خالی نگاہوں سے گھورتی رہی۔

"اس طرح تو بخار نہیں اترنے کا ضد نہیں کرتے۔ دیکھ تو سہی سارا پنڈا آگ ہو رہا ہے۔" اس نے بھی چمکارا۔

مومل کے انداز میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

"پھر میں اللہ یار کو بلا کر لے آؤں گی۔ اگر تو نے میری بات نہیں مانی۔" ماسی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

"اللہ سائیں کی قسم۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ماسی۔" بالآخر اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

"بیماری میں کس کا دل چاہتا ہے مومل۔ خالی پیٹ دوائی بھی تو نہیں کھاتے۔ ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔ تھوڑی سی ڈبل روٹی کھا کر چائے پی لے پھر یہ بخار کی گولیاں کھالے۔ نہیں تو ہمت کر میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چل۔"

"مجھے پریشان نہ کرو ماسی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ پہلے سے تم میرے ٹکڑے کر دو۔" اس نے تعلی انداز میں کہہ کر کروٹ بدل لی۔

"دکھ بیماری سب کے ساتھ۔ دوا دارو تو کرتے ہی ہیں۔" ماسی نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بہت ہمدرد طبع کی عورت تھی۔

مومل پر مطلق اثر نہ ہوا۔ ماسی کو اس کے پنڈے کی آنچ محسوس ہو رہی تھی۔ اور عمر بھر کے تحیر کی جو برف اس کے اعصاب پر جم گئی تھی۔ وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتی تھی۔ جمود کا یہ عالم تھا کہ سوچ کو ایک ہی نقطہ پر معطلی ہوئی تھی۔ خیالات کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔ نہ کوئی احساس تھا نہ خیال۔ ہر سمت ایک خلا کا احساس تھا۔

"تو نہیں مانے گی۔ رات بڑھتی جا رہی ہے۔ بلا کر لاتی ہوں اللہ یار کو۔" ماسی تنگ آ کر باہر چلی گئی۔

باہر کوئی نظر نہیں آیا۔ شمسی بھی سیکنڈ فلور پر اپنی خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ حقیقی معنوں میں پوری کوٹھی کا منتظم وہی تھا۔ اللہ یار کا کچھ پتا نہیں چل سکا البتہ مون کو اس نے پورچ سے لابی کی طرف آتے ضرور دیکھ لیا۔

"سلام علیکم صاحب۔"

"ہوں۔" اس نے اشاراتی جواب دیا۔ اور آگے بڑھتا گیا۔

"کھانا کھائیں گے صاحب؟" وہ پیچھے پیچھے چل دی۔ پوچھنا اس کا فرض تھا۔
"نہیں۔" مختصر جواب آیا۔
"صاحب۔ آپ سے ایک بات کرنا ہے۔" ماسی ملتجیانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔
مون کے قدم زینوں نے پکڑ لیے تھے۔ وہ جہاں تک پہنچا تھا وہیں جم گیا۔ مگر مڑا نہیں۔
"صاحب۔ آپ اللہ یار کو ذرا روکیں۔ دن میں بھی جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ اور رات کو بھی پتا نہیں کدھر غائب ہو جاتا ہے۔ اب مومل اور ربا بی تو اس کی ذمے داری ہیں۔ اسے ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ بخار میں جلس رہی ہے مگر نہ کچھ کھاتی ہے نہ دوائی لیتی ہے۔ ایک گھنٹے سے اس کی خوشامد کر رہی ہوں۔" عاجز آئی ماسی کو مون ہی سے کچھ امید ہو چلی۔
"کس کی بات کر رہی ہو؟" وہ کسی دھیان سے چونک کر پھر آگے بڑھنے لگا۔
"مومل کی۔ صاحب جی۔ اور کس کی۔"
ماسی اس کی تیز رفتاری کے سبب اپنے بھاری وجود کو اسی حساب سے گھسیٹ رہی تھی۔
"تو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اللہ یار کا انتظار کرو۔" وہ خشک لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"آپ ذرا سا اسے ڈانٹ دیں تو وہ شاید آپ کی مان لے۔" ماسی نے گویا درخواست کی۔
"میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ پرابلم کرتی ہے تو اسے اس کے گھر بھجوا دو۔ اور آئندہ نوکروں کی وجہ سے مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ گھر بھجوا دے۔ ممی کو میں ہینڈل کر لوں گا۔"
"جی۔ صاب۔ صاب۔ وہ۔" ماسی خود الجھنے لگی۔
"گو۔ ہیل۔ وِد۔" وہ برہم ہوا اور زینے چڑھنے لگا۔

سنی سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن گنگناتے کی رِنگ جھلاتے بڑی سرمستی میں لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ مگر ایک دم ٹھٹک گیا تھا۔
سر کے نیچے فلور کشن رکھے ہاتھ میں ریموٹ لیے مون کارپٹ پر دراز تھا اور اسکرین پر پڑے فلمٹ میوزک میں کوئی انڈین ڈوئٹ سانگ چل رہا تھا۔ خاصے عرصے بعد اس نے مون کو ٹی وی کے سامنے براجمان دیکھا تھا۔ بلکہ درحقیقت گھر ہی میں خاصے عرصے بعد وہ ایک دوسرے کے سامنے تھے۔
مون نے اس کی آمد پر صرف ایک لحظے کے لیے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں۔
"ممی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے نمبر دیا ہے۔ رِنگ کر لینا۔ فون کے پاس ایک چٹ پر لکھا ہے۔"
مون نے آواز آہستہ کر کے اسے اطلاع دی۔ اور دوبارہ آواز بڑھا دی۔
سنی نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر مون پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر زینے کی طرف بڑھ گیا۔
مون نے وی سی آر اسٹاپ کیا اور دوسری کیسٹ لگا دی اور وی سی آر دوبارہ آن کر دیا۔ اب اسکرین پر رنگ نہیں تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ سانگ ڈسپلے ہو رہا تھا۔

میں خطاکار ہوں یا مجھ کو بتانے والا

چاند کے ٹکڑے پہ بھی داغ ہے کالا کالا
جل کے دل خاک ہوا۔ آنکھ سے رویا نہ گیا

گانا ختم ہوا۔ اس نے ریوائنڈ کر دیا۔ پھر ختم ہوا اس نے پھر ریوائنڈ کر دیا۔ دوبارہ سہ بارہ۔ پھر ریوائنڈ کرنے لگا تو پیک سے سنی کی آواز آئی۔
"یار۔ اسٹاپ اٹ۔ مجھے فون کرنا ہے۔" جانے کب آ کھڑا ہوا تھا وہ۔

اس نے چونک کر سر گھمایا اور وی سی آر آف کر دیا۔ اور ریموٹ وہیں پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کی طرف جانے کے بجائے اس کے قدم لان کی سمت اُٹھ رہے تھے۔ ایک انتشار و اضطراب اس کی چال سے مترشح تھا۔

لان میں خاصی دیر چہل قدمی کرنے کے بعد اس نے سرونٹ کوارٹرز کا رُخ کیا تھا۔

ڈارک گرے لکڑی کے دروازے پر اس کی دستک بہت آہستہ تھی۔ کئی مرتبہ کی دستک کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ سامنے ڈرائیور نیند بھری آنکھوں میں حیرت سمیٹے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"سلام صاحب۔ کہیں جانا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ کہیں نہیں جانا۔ وہ ماسی" مومن اُلجھا۔

"اچھا۔ اچھا۔ وہ برابر والا دروازہ ہے صاحب۔ دراصل آپ کبھی ادھر آتے ہی نہیں ہیں ناں۔ ٹھہریے۔ میں بلاتا ہوں ماسی کو" وہ فدویانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھا اور برابر والے دروازے پر دستک دینے لگا۔

دروازہ دوسری دستک ہی پر کھل گیا تھا۔ ماسی کے انداز سے ظاہر تھا وہ جاگ رہی تھی۔ پہلی نظر ڈرائیور پر اور دوسری مومن پر پڑی تو ایک دم گھبرا گئی۔

"صاب۔ آپ۔ خیریت؟"

"ہوں" اس نے ہنکارا بھرا اور ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً مؤدبانہ انداز میں پلٹ گیا۔

"دوائی کھائی اس نے؟" وہ بے حد آہستہ آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ ابھی بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی" ماسی نے بے چارگی سے جواب دیا۔

"اچھا۔ ہٹو سامنے سے" وہ بولا تو ماسی جھٹ ایک طرف ہو گئی۔

مومن کی چال بہت آہستہ تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو وہ بان کی چارپائی پر سامنے ہی لیٹی نظر آ گئی۔ پٹ آنکھیں کھولے وہ اسی کو آتے دیکھ رہی تھی۔

مومن چارپائی کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔

"کیوں پریشان کر رہی ہو ماسی کو؟ دوا کیوں نہیں کھاتیں؟" وہ اس سے نظریں چرا کر مخاطب تھا۔

"ماسی! پہلے اسے کچھ کھلاؤ" وہ ماسی سے مخاطب ہوا۔

"جی صاب۔ آپ بیٹھیں" ماسی نے بڑے پُرجوش انداز میں موڑھا پیش کیا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ کچھ لے کر آؤ اس کے لیے" وہ اُلجھے اُلجھے انداز میں کہتے ہوئے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ اور کمرے میں نظریں دوڑانے لگا۔

ماسی کے وہاں سے جانے کے بعد ایک پُرہول سناٹا ماحول پر طاری ہو گیا۔ وہ نظریں جھکائے اپنے سلیپر کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو۔ ماسی جو کہے اس کا کہنا مانو۔ میں جلد ہی تمہیں گھر واپس بھجوا دوں گا" بالآخر اس کی آواز سے سکوت ٹوٹا۔

مومل اسی طرح بے خواب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے بے تاثر چہرے پر خوف کے اثرات بھی نمایاں تھے۔

"ماسی۔ میں جا رہا ہوں۔ اب یہ تمہیں پریشان نہیں کرے گی" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

"صاب! آپ تھوڑی دیر بیٹھ جائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں" ماسی

جہاں تھی وہیں سے بلبلا کر بولی۔
مون نے ایک غیر ارادی نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ بیٹھ گیا۔
ماسی ایک پیالے میں چائے اور ڈبل روٹی کے دو سلائس لے کر آ گئی۔
"اٹھ مومل۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "چل۔ شاباش۔ دیکھ۔ صاب آج رات کو بے آرام ہوئے ہیں تیری وجہ سے۔" ماسی نے چمکارا۔
مومل پر مطلق اثر نہ ہوا۔
"دیکھ تو صبح سے بھوکی ہے۔ اب رات کا ایک بج رہا ہے۔ چل اب اٹھ بیٹھ۔"
مومل ٹس سے مس نہ ہوئی۔
مون نے بمشکل نگاہ اٹھائی۔ مگر فوراً جھکالی۔ اور خاموش رہا۔
"صاب کی بات بھی نہیں سن رہی۔ مائی باپ ہیں یہ ہمارے۔ اٹھ بیٹھ بیٹی۔ یہ لے۔" ماسی نے ٹرے اپنے زانوں پر سیٹ کی۔
"اچھا۔ لیٹی رہ۔ میں کھلا دیتی ہوں۔" ماسی ڈبل روٹی چائے میں بھگو کر اس کے منہ کے نزدیک لے گئی۔

مومل نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا اور ساتھ ہی ٹرے پر ہاتھ مارا۔ ٹرے دور جا کر گری۔ ماسی چند ثانیے دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر بڑی شرمندگی اور غصے سے مون کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"پتا نہیں۔ کیا ہو گیا ہے۔ اچھی بھلی تھی کل تک۔ ایک آواز پر دوڑتی تھی۔ جو کہو مانتی تھی۔ آپ تو اسے گوٹھ ہی بھجوا دیں۔ مر جائے گی ورنہ یہ تو۔"
مون خود لب بستہ سا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں ڈرائیور سے کہتا ہوں۔ کسی طرح اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔ باقی ہاسپٹل میں وہ خود سنبھال لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ نہیں ٹھہرا۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مون نے کتاب الٹ کر رکھتے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دو بج کر کچھ منٹ ہو رہے تھے۔
"کون؟" جانے خوف کہاں سے در کر آئے تھے۔
"میں ہوں صاحب۔" ڈرائیور کی آواز تھی۔
مون جلدی سے دروازے تک آیا۔
"ہوں۔ کیا ہوا؟" وہ دروازہ وا کر کے بہت محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔
"کچھ نہیں صاب۔ وہ ماسی زینب نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں کہ مومل وہاں بھی بہت تنگ کر رہی ہے۔ اس نے ڈاکٹر کا آلہ (اسٹیتھو اسکوپ) نرس کے منہ پر کھینچ مارا اور جو فائل ہوتی ہے ناں صاحب۔ وہ بھی پھاڑ دی۔ ایک گلاس بھی توڑا۔ بڑی مشکل سے قابو کر کے ایک انجکشن لگایا۔ پھر کہیں جا کے ذرا آرام سے لیٹی۔"
"پھر۔۔۔؟ اور کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔۔۔؟" کیا قیامت تھی ڈرائیور تک سے نگاہ چرا کر بات کرنے کی نوبت آ گئی تھی۔
"مسئلہ تو خیر کیا ہو گا صاحب۔ پرائیویٹ اسپتال ہے۔ بل بنانے کے چکر میں شیر بھی قابو کر سکتے ہیں

وہ تو ذرا سی چھوکری ہے۔" ڈرائیور کی آنکھیں نیند سے مغلوب ہو رہی تھیں۔ خاصے بیزار کن انداز میں پرائیویٹ اسپتال کو نشانہ بنایا۔

"آپ کا نام بتا دیا تھا ڈاکٹر صاحب کو۔ میں چلوں صاحب؟" اس نے اجازت چاہی۔

"ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"عمر پوچھ رہے تھے ڈاکٹر صاحب۔ ماسی بولی تیرہ چودہ سال ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب بولے پر تو ستائیس سال ہو گئی ہے۔۔۔ ہی ہی۔ ہی۔" ڈرائیور نے انتہائی بدمزہ ماحول میں اپنی دانست میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ صاحب کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے تھے۔ "بولنے لگی تو نہیں ستائیس کی۔ اچھا صاحب اسلام علیکم۔" اس نے مون کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ پا کر جانے میں عافیت سمجھی۔

مون نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔

خزانے کی موجودگی کے احساس کے ساتھ دھڑکے بھی شروع ہوتے ہیں۔ چوری ڈاکے کے خوف بھی ستاتے ہیں۔

ابھی تو اُدھر خزانے کی موجودگی کا ٹھیک ٹھیک شعور بھی نہیں تھا اور خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ چونکہ خزانے کا احساس نہیں تھا اس لیے دُکھ کسی ڈاکے پر نہیں تھا۔

دُکھ اور صدمہ اس آواز پر تھا کہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ بے بسی کے احساس سے بس یہ احساس ہوا کہ وہ کچھ ہار رہی ہے۔

دگرنہ۔ وہ حیرت سے پتھر نہ ہوتی بلکہ بہت روتی۔ ایسا بین کرتی کہ دیواریں پسیج جاتیں۔ کتنی ہی نڈھال ہوتی۔ ایک دفعہ صاحب کی طرف دیکھ کر نفرت سے تھوکتی ضرور۔

ابھی تو بادام کے پیڑ تلے مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلنے والی سکھیاں راہ تک رہی تھیں۔ سبنی کی وحشت سے اسے ڈر ضرور لگا تھا مگر اس ڈر کے معنی اس پہ کھلے نہیں تھے۔ اگر اس ڈر کے معنی اس پر کھل جاتے تو وہ دوسرے کمرے میں بے خوف ہو کر کیسے سو رہی ہوتی؟ مون اس کی موجودہ کیفیت کا تجزیہ کر سکتا تھا اور کر رہا تھا۔

اب وہ سو نہیں سکتا تھا۔

اب اسے سونے کے لیے نیند کی گولیوں کی ضرورت تھی یا بے حسی کی۔ مستقل قسم کی بے حسی کی۔ سر دست اسے دونوں میں سے ایک بھی میسر نہیں تھی۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ آج وقت سے بہت پہلے نکل کھڑی ہو گی بلکہ روزانہ یہ معمول بنا لے گی کہ وقت سے بہت پہلے نکلا کرے گی اور اسکول سے دیر سے نکلا کرے گی۔ چند دنوں بعد وہ خود ہی انتظار سے تھک جائے گا اور نئی دلچسپی تلاش کرے گا۔ اس قسم کے لوگ یہی کیا کرتے ہیں۔ اس دوران میں ممکن ہے اس کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے اور عارفہ اسے ایک دو ماہ قبل گھر بیٹھنے کو کہہ دیں۔ اور جب تک یہ مرحلہ طے نہیں ہو جاتا کم از کم ایک ماہ تو مزید تنخواہ لے لے۔ عارفہ شمسہ سے کہہ ہی چکی تھیں کہ وہ امتحان کے بعد گھر پر بچوں کو پڑھانا شروع کر دے کہ وہ جلد ہی ماہ نور کی شادی کا ارادہ رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ بھی شمسہ کا ہاتھ بٹایا کریں گی۔

پیش بندی کے طور پر وہ عارفہ کو بتا چکی تھی کہ سسٹرز کی وجہ سے آج کل اسکول میں بہت کام ہے وہ جلدی جایا کرے گی اور دیر سے آیا کرے گی۔

اس نے دو چار نوالے لے کر برائے نام ناشتا کیا۔ نظریں مستقل گھڑی پر تھیں۔ وہ آدھ گھنٹہ قبل نکل

جاننا چاہتی تھی۔

بہت تیز رفتار تھی معمول سے ہٹ کر تھی۔ اچھا خاصا راستہ طے ہو گیا تھا اسکول سامنے آ چکا تھا یہ مرحلہ تو بالآخر طے ہوا سکون سے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا مگر سانس جہاں تھا وہیں رُک گیا تھا۔

زن سے سی۔ ڈی سیونٹی اس کے قریب راہ روکنے والے انداز میں آ کر رکی تھی۔

"تسلیم عرض ہے" اس نے پاؤں زمین پر جما کر بہت بھرپور انداز میں ورش کیا۔

"کل جس گاڑی میں آپ تھیں۔ اس کا نمبر J 003 B ہے۔ سرکاری گاڑی ہے سرکاری افسر کی۔ مظاہر موصوف کا نام ہے۔ اچھے نیک نام افسر ہیں۔ آپ کے ماموں موصوف کی ہونہار اولاد ہیں۔ رسائی بھی اچھی ہے۔ وہ آپ کے کزن ہیں میری خواہش ہے وہ قیامت تک صرف آپ کے کزن ہی رہیں۔ آپ کو تو ہوا بھی چھوتی ہے تو رقیب محسوس ہوتی ہے۔ آپ بہت احتیاط کیجیے گا۔ ایسے کزن بھی قسمت سے ملتے ہیں۔ جیسے آپ ہمیں قسمت سے ملی ہیں۔ ہماری والدہ محترمہ عنقریب آپ کے ہاں آنے والی ہیں۔ اس مرتبہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہوں گی۔ بہت شاندار ڈائمنڈ کی انگوٹھی ساتھ لائیں گی۔ اسے آرام سے پہن لیجیے گا کبھی اتاریے گا نہیں۔"

ماہ نور کی حیرت اب اشتعال میں تبدیل ہو رہی تھی۔ شریانوں میں جوار بھاٹا اُمڈ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا آگے بڑھ کے اس کے گلاسز اتار دے اور چہرا کھسوٹ ڈالے۔ اور اس بری طرح مسخ کر دے کہ وہ خود کو نہ پہچان سکے۔ مگر اسے مظاہر کی نصیحتیں فون نمبر سمیت یاد آنے لگیں۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ اور بلا ارادہ اس کی طرف دیکھا۔

وہ گلاسز کے اوپر سے بڑے شوخ انداز میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ بلا کی دلچسپی نظروں سے ہویدا تھی۔

"تھینکس یو۔ اس ایک نگاہ کے لیے۔ آپ کو بھلا اس کی ویلیو کا کیا اندازہ۔ شاعروں کی سنگدل محبوبہ والے سلسلے کی لگتی ہیں آپ بس۔" اس مرتبہ اس کی آواز سرگوشی کا انداز لیے ہوئے تھی۔ بے بسی اور حیا سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اجی لعن طعن ہی کر دیا کریں۔ اسی بہانے آپ کی خوبصورت آواز تو سنیں۔"

ماہ نور کترا کر بڑھنے لگی۔

اس نے بائیک پیچھے کی طرف دھکیل کر پھر اس کا راستہ بلاک کیا۔

"کسی ایک بات کا تو جواب دیجیے۔ اس دن کی طرح برس ہی جایئے۔" وہ شاید کل کا منظر دیکھ کر آپے میں نہیں رہا تھا۔ اتنا تنگ تو کبھی بھی نہیں کیا تھا۔

ماہ نور نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے مبادا کچھ منہ سے نکل ہی جائے۔ اس لیے کہ برداشت جواب دیتی لگ رہی تھی۔ وہ پھر ایک طرف سے آگے بڑھی۔ اس مرتبہ وہ سامنے سے گزرنے لگی تھی۔

پاشا نے بائیک دھکیل کر آگے کر دی۔

ماہ نور نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپک گئے۔ ایک تو وہ اسے اس مقام پر روکتا تھا جو عموماً سنسان ہوتا تھا۔

اس نے اپنے رخسار ہاتھ سے صاف کیے۔ مگر ضد اس کے اندر بھی اس بلا کی آ گئی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ اپنی آواز اس کی سماعت تک نہیں پہنچائے گی۔

"آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ میری امانت ہے۔ شادی کے بعد تو صرف آپ ہی بات کیا کریں گی۔ ہم تو یوں بھی بہت مصروف بندہ ہوں گے۔ بھلکڑ ہوں، آپ راستہ روک روک کر یاد دہانیاں کرایا

کریں گی۔ بہت انتظار ہے اس خوبصورت آواز میں یاددہانیوں کا۔"
اس نے چابی گھما کر لک لگائی اور یہ جا وہ جا۔

ماہ نور نے چادر سے چہرا پونچھا اور اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ دو ادھیڑ عمر مرد اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پاشا نے غالباً نوٹ کر لیا تھا کہ وہ اسی طرف آرہے ہیں۔

"کیا بات ہے بیٹی۔ تنگ کر رہا تھا، ہم خاصی دور سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں یوں اندازہ ہوا کہ آپ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ آپ کو آگے بڑھنے نہیں دے رہا تھا۔"

"وقت بہت خراب ہے۔ آپ کسی کو ساتھ لے کر نکلا کریں۔ بھائی وغیرہ نہیں ہیں آپ کے؟" ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ اسے بے اختیار رونا آرہا تھا۔

"اور آپ کے والد؟ آپ ان سے کہیں کہ وہ آپ کو پہنچایا کریں۔ یہ شخص شاید آپ نہیں جانتیں اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ بہت پیسے اور اثر و رسوخ والا ہے۔ سمجھتا ہے ساری دنیا اس کی جیب میں ہے۔"

"کہاں کام کرتی ہیں آپ؟" دوسرے شخص نے سوال کیا۔

"یہ سامنے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔" اس نے اشک پیتے ہوئے جواب دیا۔

"او۔ ہو۔ اچھا۔ اچھا۔ بتلایئے لوگ ٹیچر کو نہیں بخشتے۔ کیا احترام ہوتا تھا کسی زمانے میں استاد کا۔ غیر متعلق لوگ بھی بے حد احترام کرتے تھے۔" ان میں سے ایک نے جو نسبتاً زیادہ عمر کا تھا بہت تاسف سے کہا۔

"جاؤ بیٹی۔ اور اکیلی مت آیا جایا کرو۔ عموماً کوئی بھی اس سے اُلجھنا پسند نہیں کرے گا۔ سب کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔" وہ مزید گویا ہوا اور دونوں دوبارہ اسی سمت پلٹ گئے جہاں سے آئے تھے۔

ماہ نور آفس میں داخل ہوئی تو اس کا چہرا تمتما رہا تھا۔ آج وہ بی اماں اور ماسی ــــ کے بعد اسکول میں آنے والی تیسری تھی۔ اس نے فوراً پنکھے چلا دیے تھے۔

جی چاہ رہا تھا فوراً مظاہر کو فون کر کے تازہ ترین حالات سے مطلع کرے۔ اس نے کلاک کی طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ مظاہر نو بجے سے کچھ پہلے ہی آفس پہنچتے تھے۔ زیادہ تر کبھی انہیں جلدی جانا ہوتا تھا۔ یہ وہ اسے بتا چکے تھے۔

اسے انتظار کی اذیت سے بہر طور گزرنا تھا۔

خاصی دیر وہ آنکھیں موندے کرسی کی بیک سے ٹکی خالی الذہن بیٹھی رہی۔ بجلی کے کوندے کی طرح اس کی آنکھیں اس کے حواس پر بار بار لپک رہی تھیں۔

اسکول میں بچوں اور ٹیچرز کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ بے سروپا قسم کا شور ہو رہا تھا۔

ٹیچرز سلام دعا اور اٹھکیلیاں کرتی آفس میں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور مسکرا کر د[illegible] کرنے لگی۔

"غالباً حاکم وقت نے کسی انعام کا اعلان کیا ہے کہ جو شہر میں سب سے پہلے داخل ہوگا وہی شہزادی کے سوال کا جواب دے گا۔ مگر پھر بھی شہزادی کی شادی کا مسئلہ تو جوں کا توں رہے گا کیونکہ یہ تو خود شہزادی ہیں۔ صرف انعام ہی مل پائے گا۔"

ماسی بتا رہی تھی کہ اسکول کا تالا کھلتے ہی آج سب سے پہلے بس ماہ نور داخل ہوئی تھیں۔

"خیریت؟" وہ صبا صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"ہوں۔ خیریت ہی ہے۔ شاید میری گھڑی آگے چل رہی ہے۔" اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ

نمودار ہوئی۔
"مگر اتنی صبح کو بھی تمہارے چہرے پر تھکاوٹ ہے؟ پھر ایک بجے دوپہر تمہاری تصویر کیسی ہوگی بھلا"
وہ خود ایک دم فریش نظر آرہی تھی۔
"اچھا؟" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔
"آج پھر محسوس ہو رہا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ کوئی گڑبڑ ہے؟" صبا اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔
"ارے نہیں۔ بس۔ تم فکر مند مت ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بہت جبر کرکے پھر سے مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔
"بتانا نہیں چاہتیں تو وہ دوسری بات ہے۔ مگر کچھ ہے ضرور۔ خیر ہم بھی ہاتھ دھو کر پیچھے نہیں پڑیں گے۔ اب ذرا اُٹھ کھڑی ہو۔ اسمبلی ہو رہی ہے۔ ہری اپ۔"
"صبا۔ ایک منٹ۔" اس نے صبا کو روک لیا۔ اور آفس سے ٹیچرز کے نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔
صبا سوالیہ انداز میں اس کا چہرا پڑھ رہی تھی۔
چند منٹوں بعد آفس میں بس وہ دونوں رہ گئیں۔
"وہ تمہارا گھر تو اسکول کے بالکل پیچھے ہی ہے ناں۔ مجھے پرائیویسی میں ایک ضروری فون کرنا ہے۔ ریسس میں چلو گی ذرا۔ پرنسپل کے آفس میں بات ٹھیک سے ہو نہیں پائے گی۔"
"اوہ۔ اتنا تکلف۔ حد ہو گئی۔ مگر یہ تو بتاؤ پرائیویسی میں بات کس سے ہوگی؟" وہ شرارت سے آنکھیں نچا رہی تھی۔
"کیا انہی سے۔ پرپوزل منظور کرلیا گیا ان کا۔" وہ تنگ کرنے لگی۔
"ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایک پرابلم ہے۔" وہ ہونٹ بھینچ کر آنسو پینے لگی۔
"ارے۔ رے۔ رے۔ تم تو رونے لگیں۔ اسٹوپڈ۔ کسی کو اپنا سمجھو تو پرابلم شیئر کی جاسکتی ہے۔ مگر تم تو کسی کو اس قابل سمجھتی ہی نہیں ہو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔
"اچھا اب آنسو صاف کر دو۔ ریسس میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں گی میں۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟" وہ اس کے آنسو دیکھ کر بہت فکر مند نظر آرہی تھی۔

ساڑھے دس بجے ریسس کی بیل رنگ ہوئی اور وہ تو جیسے نشان پر پاؤں جمائے کھڑی تھی۔ بیس منٹ کی ریسس میں آنا جانا بھی تھا اور بات بھی کرنا تھی۔ صبا شاید اس سے زیادہ بے چین تھی۔ وہ برآمدے میں اس کی منتظر تھی۔ پرنسپل سے وہ صبح ہی پرمیشن لے چکی تھیں۔
تیز تیز چلتی وہ گھر تک پہنچی تھیں۔ صبا کی امی اور دادی نے آداب میزبانی کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے بے بسی سے صبا کی طرف دیکھا۔
"امی۔ ہم ایک ضروری فون کرنے آئے ہیں۔ بہت جلدی ہے۔ میں پھر کسی دن اسے گھر لاؤں گی۔ ماہ نور۔ تم ادھر آجاؤ۔ یہ امی کا بیڈ روم ہے۔ دروازہ بند کرکے آرام سے بات کرلو۔ میں تمہارے لیے کوئی ایمرجنسی اسکوائش لاتی ہوں۔" وہ باقاعدہ اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ روم میں چھوڑ گئی اور فون سیٹ کی نشان دہی اشارے سے کی اور باہر نکل گئی۔
ماہ نور نے پرس سے مظاہر کا کارڈ نکالا اور نمبر ملانے لگی۔
دوسری طرف آپریٹر نے اٹھایا تھا اور مظاہر کا نام سن کر ہولڈ کرنے کو کہا تھا۔ وہ بہت بھرے انداز میں مدھر سی میوزک سن رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ بے حد بھاری تھا۔

تھوڑی دیر میں مظاہر کی آواز ایئر پیس میں اُبھری تھی۔
"ہیلو۔" گمبھیر، مدھم اور مکلّف۔
"السلام علیکم۔ میں۔ ماہ نور بات کر رہی ہوں مظاہر بھائی۔"
"وسلام۔ ٹھیک ہو؟" وہاں اب لہجہ بہت محتاط تھا۔
"جی۔ وہ۔ بات یہ ہے۔ آج اس نے مجھے ہمیشہ سے زیادہ پریشان کیا۔ آپ کی گاڑی کا نمبر۔ آپ کا نام آپ کا آفس۔ سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ یہاں تک کہ آپ میرے ماموں زاد ہیں۔ اور مظاہر بھائی دھمکیاں بھی دے رہا تھا کہ خدانخواستہ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔" وہ جلدی جلدی بتا رہی تھی۔
"بلی۔ بہت بزدل ہوتے ہیں اس طرح کے لوگ۔ قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ بہت اطمینان سے کہہ رہے تھے۔
"پریشان کیسے نہ ہوں۔ بہت بدتمیز آدمی ہے۔ آپ کو کیا پتا۔" وہ بہت کچھ بہرحال ان کو بھی نہیں بتا یا سمجھا سکتی تھی۔
"فون کہاں سے کر رہی ہو؟"
"ایمی کولیگ کے گھر سے۔ اسکول کے پیچھے ہی گھر ہے۔" اسے یہ سوال انتہائی غیر ضروری لگا۔
"اسکول سے کیوں نہیں کیا؟"
"وہاں اس طرح کی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ سمجھیں ناں آپ۔" وہ جھلا گئی کہ یہ کیا باتیں لے کے بیٹھ گئے۔
"ہوں۔ دیکھو میری بات غور سے سنو۔ تمہاری شکل پہ لکھا ہے کہ تم بہت کم ہمت ہو۔ وہ بس اس لیے ڈرا رہا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ڈرنے کی۔"
"مجھے واقعی ڈر لگ رہا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ نے اس کی عجیب عجیب باتیں نہیں سنیں ناں آپ نے۔"
"مثلاً۔ کیا باتیں کرتا ہے؟" مظاہر نے اس کی بے دھڑک روانی کے آگے بند باندھا۔
اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ مسکرا رہے ہوں۔ معنی خیز انداز میں۔ حیا سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ نظریں یوں جھک گئیں جیسے وہ سامنے بیٹھے ہوں۔
"میری جان سولی پر ٹنگی ہے۔ کیا فائدہ سب کچھ آپ کو بتانے کا۔ آپ کو تو کچھ احساس ہی نہیں ہے۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔
"ایسی بات نہیں ہے ماہ نور! تم جتنا ڈیپ لے رہی ہو ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں کے اس طرح کے بہت سے مشغلے ہوتے ہیں۔"
"آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اس کی والدہ ہمارے گھر آ چکی ہیں پروپوزل لے کر۔" اس کا دل مظاہر سے بدگمان ہونے لگا کہ جیسے وہ اس کی مدد کرنا ہی نہیں چاہ رہے ہوں۔
"ہاں تو اصل صورت حال تو انکار کے بعد سامنے آئے گی میں کانشس ہوں۔ تم اتنی فکرمند کیوں ہو رہی ہو؟ جب بات کی ہے تو بھروسا بھی کرو۔ ایزی ماہ نور۔" وہ اس کی ناپختگی کے مقابل بہت میچیور تھے۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا۔
"ٹھیک۔ ہے۔ آپ فائل کر لیں۔ یہ آج کی رپورٹ تھی۔" وہ خاصی بشاشت سے گویا ہوئی۔ کوئی وزن سا تھا جو سرک گیا تھا۔
"تو کیا ڈیلی رپورٹنگ کرو گی؟" وہ بھی بہت ہلکے پھلکے انداز میں پوچھ رہے تھے۔
"اللہ نہ کرے کہ میرا اس سے روز سامنا ہو۔" وہ بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔
(باقی آئندہ)

آسیہ رزاقی

نہ جانے کون سی ساعت تھی وہ، جب مارے ہمدردی اور خلوص کے، اس نے فرمان سے کہہ دیا تھا۔

"بیچاری اماں وہاں اکیلی ہیں، سارے کام خود کرتی ہیں۔ ارے بڑھاپے میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے ہماری امی کو ہی دیکھو، جب سے بہوئیں آئی ہیں، ہر کام سے فرصت پا کر بس حکم چلاتی رہتی ہیں۔ ذرا سی طبیعت خراب ہو، بھائی کی ڈاکٹروں کے گھر پھیرے لگتے ہیں۔ تم اپنی اماں کو بلا لو۔ کیسے بیٹے ہو تم، اماں کا خیال نہیں کرتے انہیں تو اب تمہاری زیادہ ضرورت ہوگی کیا سوچتی ہوں گی وہ کہ میں نے تمہیں منع کیا ہوا ہے۔"

یوں تو یہ بات وہ کئی بار کہہ چکی تھی مگر اس بار زور دے کر کہنے پر جیسے وہ اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ فرمان بہت لاپروا تھا۔

"ارے، اماں کو اپنی جگہ ہی آرام ملتا ہے۔ وہ کہیں بھی گھر سے نہیں جاتیں۔ ہاں کبھی کبھی البتہ کسی خاص ضرورت کے تحت گھر سے نکلتی ہیں مگر یہاں اتنی دور وہ کبھی نہیں آئیں۔"

"پیدل تو نہیں لاؤ گے انہیں، تم کہہ کر تو دیکھو۔"

"کئی دفعہ کہا ہے بھئی۔ اعراج سراج پیدا ہوئے تھے کتنا میں نے بلایا، نہیں آئیں۔ جب اکلوتے بیٹے کی شادی میں ہی شریک نہ ہو سکیں، تو بھلا اب کیا آئیں گی۔"

"آئیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ بیٹے کے گھر آ کر تو ہر ماں نہال ہو جاتی ہے پھر پوتے انہیں خوش رکھیں گے، میں خدمت کروں گی، تم ہو گے۔"

بیلا نے آج تک اپنی ساس کو دیکھا نہ تھا۔ وہ شادی میں تو اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں آ سکیں مگر بعد میں بھی نہیں آئیں۔ یہاں فرمان کے چچا تھے، ان کی اولادیں تھیں۔ انہوں نے ہی شادی کروائی تھی اور ابھی تک تو وہی اس کی سسرال تھی۔ گو کہ بیلا کو اصلی سسرال جانے کی بھی تمنا تھی مگر نہ تو فرمان نے کبھی اسے لے جانے کی بات کی، نہ ساس نے بلایا۔ چچا کے گھر والے بھی ٹال جاتے۔

"کیا کرو گی جا کر، گاؤں ہے ذرا سا۔ دل نہیں لگے گا۔ پھر پسنجر ٹرین رُلا رُلا دیتی ہے۔ اسٹیشن سے اتر کر تانگہ کرو، گھنٹہ بھر بعد گاؤں آئے تو گندگی سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ تھکن، بے زاری الگ چپاتی ہے۔"

چچا کی بہو خاصی بیزار تھیں گاؤں کے سفر سے، جا چکی تھیں ایک بار۔ چچا تو جاب کے سلسلے میں گاؤں

طویل افسانہ

چھوڑ چکے تھے۔ وہاں اب کوئی رشتہ دار نہ تھا سوائے فرماں کی والدہ کے، پھر بھی اختر بھائی بیوی کو اپنا گاؤں اور اپنا گھر دکھلانے لے گئے تھے۔ وہ سخت بیزار ہوئی تھیں۔ فرمان نے بتایا تھا۔

• اس کی اماں بہت محنتی عورت ہیں۔ ہاتھ کی چکی پر گیہوں پیس کر آٹا بناتی ہیں اسی آٹے کی روٹی کھاتی ہیں۔ سارے مسالے ثابت منگا کر سل پر رگڑتی ہیں۔ پسے ہوئے بازاری مسالے استعمال نہیں کرتیں۔ یہی نہیں، گھر کے کچے صحن کو لیپ پوت کر سنوار کر رکھتی ہیں دیواریں بھی روز لیپا کرتی ہیں۔ کہیں کوئی داغ دھبہ نظر نہیں آتا۔"

• "کیسے بے چاری" بیلا کو خاصا ترس آیا تھا۔

"ان کی تو ہتھیلیاں گھس گئی ہوں گی۔"

اسی لیے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار وہ شہر آکر بیٹے کا گھر بیٹے کا عیش آرام اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں۔ گھر کی سجاوٹ دیکھیں۔ یہ قالین، یہ فرنیچر، خوبصورت پردے، کچن کی الماری میں سجے قیمتی برتن۔ مسالوں کے ایک رنگ کے ہولڈر، شیشے کے برتنوں میں رکھی دالیں، پھر وہ گیس کا اوون، جس پر کبھی کبھار وہ چکن روسٹ کرتی تھی اور اکثر کیک، نان خطائیاں بناتی پھر واشنگ مشین بھی تھی جو اس نے حال ہی میں قسطوں پر لی تھی ہر چیز موجود تھی ضرورت کی۔ وہ دیکھ کر کس قدر مسرور ہوں گی۔ فرمان دل کھول کر اس کے سلیقے کی تعریف کرتا تھا۔ وہ اکثر کہتا۔

• "تم نے میری زندگی کو باغ و بہار بنا دیا ہے، اور گھر کو جنت۔ کوئی گاؤں کی لڑکی ہوتی جیسا کہ اماں چاہتی تھیں کہ ان کی پسند کی پینڈو لڑکی سے شادی کرلوں وہ تو مجھے بستی میں دھکیل دیتی اور تم... تم نے بلندیوں کا راستہ دکھایا ہے۔ ساری خوشیاں میری جھولی میں ڈال دی ہیں۔"

اعراج، سراج کے آنے کے بعد تو وہ بیلا کا سچا عاشق بن چکا تھا۔ جنہوں نے اس کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے۔ مکمل گھر، گھر کا سکون، آرام، بیلا نے سب کچھ مہیا کر دیا تھا۔ وہ تعاون کرنے والی بے حد سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ پھر والدین کی بہترین تربیت

شیریں زبان، خدمت، اطاعت ان سب سے بڑھ کر اس کا حسن فرمان تو اس کے ہاتھوں بک گیا تھا۔

اس کے بار بار کے اصرار پر فرمان، اماں کو لینے چلا گیا، لیکن اگلے دن واپس بھی آگیا اکیلا۔

"دراصل میں اچانک پہنچا وہ فوراً تو نہیں آسکتی تھیں گھر کا انتظام بھی کرنا تھا۔ ویسے اس کچے گھر کا انتظام بھی کیا، مگر اماں کی فکریں، مرغیوں کے دانے پانی، گائے کے چارے، چوزوں کی حفاظت، کتا بلی بھوکوں نہ مریں، بس یہی انتظام کرنا تھا۔"

بیلا مایوس ہوگئی۔

• "اگلے ہفتے جا کر لے آؤں گا۔" فرمان نے تسلی دی، مگر اس کے جوش و خروش پر پانی پھر گیا تھا۔

اسے گھر مزید سجانے اور چمکانے کا از سر نو موقع مل گیا۔ اگلے ہفتے فرمان پھر گیا اور واپس اکیلا آیا کیونکہ ان دنوں انہیں اپنے دور افتادہ علاقے میں رہنے والے چچا کی فیملی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔ چچا کے سالے کے سالے کی بیٹی ساتھ کے گاؤں کسی شادی میں آئی ہوئی تھی اور بڑی بی کو اس سے چچا کے صاحبزادوں، صاحبزادیوں، ان کی اولاد کی تعداد وغیرہ کا معلوم کرنا تھا۔ وہ خود تو کسی کے گھر بلاوے پر بھی نہیں جاتی تھیں تو ساتھ کے گاؤں کیا جاتیں۔ شادی میں کئی دن باقی تھے اور چچا کے سالے کے سالے کی بیٹی شادی سے فارغ ہو کر ان سے ملنے آنے والی ہے اس کے علاوہ۔ کڑک مرغی کے نیچے انڈے بٹھانے ہیں۔ گائے بھی کچھ علیل ہے۔ غرض خاصے مسائل تھے۔

ہوتے ہوتے دو ماہ گزر گئے۔ بیلا اب مایوس ہو چلی تھی۔ فرمان بھی اس کے بعد گاؤں نہیں گیا۔ بلکہ اس معاملے میں قطعاً خاموشی اختیار کر لی تھی اس نے لیکن ہوا یہ کہ ایک مبارک ساعت وہ اپنے بھتیجے کے ہمراہ آن براجیں۔

موسم سرما جا رہا تھا اور گرما نے قدم بڑھا لیے تھے گرمی سے بیلا کی جان جاتی تھی۔ وہ بہت سست ہو جاتی۔ نہ کچن میں دل لگتا نہ کسی اور کام میں۔ پچھلے دنوں اس کے پاس ایک ماسی آتی تھی جو برتن دھونے

کپڑے دھونے کے علاوہ جھاڑو پوچا بھی کرتی تھی صفائی تو وہ اچھی کرتی تھی لیکن کچھ دن سے گھر کے سامان پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگی۔ بچوں کے کھلونے چھوٹے کپڑے وغیرہ نامحسوس طریقے پر غائب ہونے لگے تو بیلا نے اسے جواب دے دیا۔

اب کوئی مددگار نہ تھا اور ساس صاحبہ تشریف لے آئی تھیں۔

صبح کا وقت تھا۔ فرمان آفس جانے والا تھا۔ اماں کو دیکھ کر اس پر شادی مرگ طاری ہو گیا۔ بوکھلا گیا، ہکلا گیا۔

"اماں.... اماں.... اماں آ گئیں۔ ادھر میں .... میں....!"

وہ ان سے جا کر لپٹ گیا اور بے سر و پیر کی باتیں کرنے لگا۔

"ارے کیوں نہ آتی میں۔ ساری بات تیرے ساتھ طے ہو گئی تھی، بس موقعہ نہ تھا، اب فرصت ملی ہے بچے کہاں ہیں؟ بہو کدھر ہے؟"

بوکھلاہٹ میں اماں کو بیلا نظر ہی نہیں آئی۔ حالانکہ وہ عین ان کی ناک کے نیچے کھڑی تھی۔ اس کے سلام کا جواب دے کر بچوں کو چٹا چٹ چوما پھر فرمان کے صدقے واری ہونے لگیں۔ ان کا بھتیجا گھوم پھر کر گھر دیکھنے لگا اور بیلا کے سلیقے کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرنے لگا۔

"گھر کیا ہے، محل ہے، ارے یہ تو جنت ہے بھائی فرمان، کیسی اچھی بیوی تجھے ملی ہے بالکل حور کے جیسی۔ شکر ادا کر بھائی۔ گاؤں کی جاہل سے جان چھوٹی تیری، کیوں پھپھو؟"

پھپھو کو یہ تبصرہ پسند آیا نہ بہو کی تعریف، مگر چپ رہیں۔ ان کا بھتیجا دو دن رہا اور بیلا کی تعلیم تربیت سلیقہ وغیرہ سراہتا ہوا رخصت ہوا۔ جانے سے پہلے بیلا سے کہہ گیا۔

"میرے لیے بھی اپنی جیسی لڑکی تلاش کر لو، میں بھی گاؤں چھوڑ کر آ جاؤں گا۔"

اور فرمان کا تو بس نہ چلتا تھا کہ ماں کے آگے تارے توڑ کر رکھ دے، آنکھیں بچھا دے۔

آدھی آدھی رات تک اماں کے کمرے میں گھسا کبھی ان کی ٹانگیں دبا رہا ہے کبھی ہاتھ۔ اس کا بس چلتا تو وہ اماں سے لپٹ کر سو بھی جاتا مگر بارہ بجے تک انتظار کر کے بیلا اسے پکار لیتی۔

"صبح آفس بھی جانا ہے، نیند پوری نہ ہوئی، تو طبیعت خراب ہونے کا احتمال ہے۔"

اور وہ باول نخواستہ اماں سے جدا ہو کر آتا، سرشار سا، جیسے اماں نے اسے خزانہ بخش دیا ہو۔

شادی کے بعد اماں پہلی دفعہ آئی تھیں۔ فرمان پر تو خوشی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

"اماں کی خوب خدمت کرنا، انہیں تکلیف نہ ہو، اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلانا، انہیں خوش کرو بس کسی بھی طرح۔"

نصیحتیں بھی جھولی بھر کر لاتا۔ وہ اقرار کر لیتی کہ یہ اس کا فرض ہے۔ وہ میز پر برتن لگاتی، کھانا لا کر رکھتی، اماں کو بلاتی تو دیکھتی کہ کچن میں زمین پر بیٹھی وہ پتیلی میں لگا ہوا سالن روٹی سے پونچھ کر کھا رہی ہیں۔ پہلے دن تو وہ چیخ پڑی۔

"زمین پر کیوں بیٹھی ہیں۔ میز پر رکھا ہے کھانا تو۔"

"ارے میں زمین پر نہیں پیڑھی پر بیٹھی ہوں اور اکڑوں بیٹھ کر کھانا تو سنت رسول ہے، مگر میں کمبخت ایسی نصیب والی کب ہوں کہ سنت ادا کروں، موئے گھٹنے جواب دے چکے ہیں، بیٹھا نہیں جاتا۔"

"مگر اماں! یہ دیگچی تو خالی تھی، سالن تو نکال لیا تھا میں نے۔"

"چار طرف اتنا مسالا لگا ہوا تھا، دھو کر پھینک دیا جاتا۔ میں نے آدھی روٹی اسی کے ساتھ کھالی ہے رزق کی قدر کرنی چاہیے۔ کھانے کی چیز ضائع کرنا گناہ ہے، بس میں تو کھا چکی۔"

"اچھا، تو میٹھا ہی چکھ لیں۔" وہ مایوس ہو گئی۔

مگر اماں کا پیٹ بھر چکا تھا۔ اس کی اتنی محنت سے بنائی پڈنگ کو انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا تو وہ دیگچی میں پانی بھر دیتی۔ رات کو فرمان ہوتا تھا وہ اماں کو خوشامد کر کے کبھی گود میں اٹھا کر لاتا۔ زبردستی لقمے بنا کر کھلاتا۔

اماں نے عذر کیا کہ گھر چھوٹا ہے چلنا پھرنا ہوتا نہیں کھانا ہضم کیسے ہو؟"

"ہاں جی..... بیلا! لگتا ہے تم اماں کا خیال نہیں کرتیں۔ کبھی انہیں نیچے فلیٹوں میں لے جایا کرو، سب سے ملاؤ۔"

بیلا چپ رہی۔ نیچے کے فلیٹوں والوں سے اس کے تھوڑے بہت مراسم تھے۔ کبھی کبھار وہ لوگ آجاتے تھے۔

جب نئے نئے فلیٹ میں آئے تھے تو بیلا نے قرآن خوانی کی تھی۔ تمام بلڈنگ والوں کو بلایا تھا۔ کچھ لوگوں نے تعلق قائم کیا، کچھ نے راہ چلتے سلام دعا تک اکتفا کی۔ بیلا خود بھی بہت کم لوگوں سے ملتی تھی۔ اسے گھر سجانے سنوارنے کا بہت شوق تھا۔ آرٹسٹک ذہن تھا۔ اس کا گھر بلڈنگ بھر کے تمام فلیٹوں سے زیادہ صاف اور سجا ہوا تھا۔

خود اس کی بھابیاں معترف تھیں اور چچا کی بیٹی بھی، جن کے گھر دولت کے انبار تھے اور جو قیمتی سے قیمتی اشیاء خرید کر گھر سجاتی تھیں جب آتیں اس کے ہاتھ کے ہنر، محنت اور کاوش کی داد دیتی تھیں۔

اب فرمان نے اماں کو فلیٹوں والوں سے ملوانے کا حکم سنا دیا۔

اماں جس دن آئی تھیں اس دن نیلی شلوار کالی قمیص پہنے ہوئے تھیں اس کے بعد انہوں نے لباس تبدیل کیا تو براؤن، سفید چیک کی لنگی اور لمبا سا گیروا کرتا پہن لیا۔ اس کے بعد سرخ، سبز چیک کی لنگی کے ساتھ نیلی قمیص پہن لی۔ پتا نہیں فرمان نے کیوں نہیں نوٹ کیا۔ کبھی کہا بھی نہیں اور اب وہ اماں کو سب سے ملوانے کی فرمائش کر رہا ہے کیا کہیں گی سب یہ لنگی پوش خاتون بیلا کی ساس ہیں۔

یہاں تو تمام کام کرنے والی ماسیاں، خواہ کسی گاؤں کی ہوں، شلوار کرتا پہنتی تھیں بلکہ شہر کے تمام فیشن اپنا لیتی تھیں۔ کچھ تو گھر کی بیگمات کی نقل میں بالوں کو سنوار کر رنگ برنگے کلپ، پونی بنی ہوتی، کانوں میں بالے، اس قدر ٹیپ ٹاپ سے آتی تھیں کہ فرق کرنا دشوار ہو جاتا، کون بیگم ہے کون ماسی۔

اور خود بیلا، پوری بلڈنگ میں اس کی خوش پوشی مشہور تھی۔ میچنگ کا تو اسے اس قدر جنون تھا چپل، پرس، چوڑیاں، بندے ہر چیز اس کے لباس کے ہم رنگ ہوتی۔ وہ درمیانی قیمت کی چپل اور پرس لیتی تھی۔ اسے بجٹ کا بھی خاصا لحاظ رہتا تھا۔ سونے چاندی کی کبھی پروا نہیں کی۔ ہمیشہ لباس کے رنگوں کی جیولری، خواہ دھات کی ہو نگوں والی یا پلاسٹک کے ٹوپس کلپ وغیرہ۔ اس کے پاس رنگ دار جیولری چوڑیوں اور کلپ، پن وغیرہ کا خزانہ تھا۔ اس کے میکے میں بھی بیلا کی میچنگ اور خوش لباسی کو سراہا جاتا۔

"فیشن دیکھنا ہے تو بیلا کو دیکھو۔ ابھی ہم سوچتے رہ جاتے ہیں اور بیلا کے کپڑے فیشن کے مطابق ہو جاتے ہیں۔"

اب شلوار کے پائنچے تنگ ہیں اب اونچی شلوار ہے لٹکتے کرتے کا زمانہ ہے تو سب سے پہلے وہ پہنتی۔ فٹنگ کا زمانہ آیا تو ہفتہ بھر میں رکھے رکھائے کرتے فٹ کر لیے۔ یہ اس کا سلیقہ، تیز دستی اور ذہانت تھی۔ کروشیے کی قمیص خاندان بھر میں سب سے پہلے بیلا نے پہنی خود بنا کر۔ کروشیا ہو یا شیڈو ورک اس کے بائیں ہاتھ کا کارنامہ ہوتا۔ راتوں رات پرانے دوپٹے جھبے کنگوروں سے سج جاتے۔ یوں تو بازار میں اب ہر چیز بنی بنائی مل جاتی ہے مگر بیلا کے ہاتھ میں ہنر تھا اور شوق بھی تھا۔ اس کی امی نے بیٹیوں کو ہر کام سکھایا تھا، اسی لیے بھوؤں پر اعتراض تھا جن کو بازار سے ہر چیز لانا پڑتی۔

"لو جی۔" وہ کہتیں۔

"ہمارے زمانے میں تو بازار سے اون کی لچھیاں آیا کرتی تھیں۔ آدھی رات تک سلجھا کر گولے بناتے تھے پھر بنتے بناتے گولے آنے لگے تو اس محنت سے جان چھوٹی۔ اب تو ہر چیز بازار سے آتی ہے۔ بچوں کے نیکر چڈیاں تک۔"

سارا سارا دن عورتوں کو بازار گھومنے کے لیے تو وقت ہے مگر گھر میں خود اپنے ہاتھ سے کچھ بنانا گناہ۔ وقت بھی بچے پیسہ بھی۔ یہ سوچتی ہی نہیں کہ پیسے

کہاں سے آ رہا ہے، کون کیسے کما رہا ہے، بس لٹا دو۔ لٹاؤ۔"

"امی جی! ہمارے پاس وقت ہے کہاں کہ گھر میں بیٹھ کر کچھ بنائیں۔" بہو نے فرمایا۔

"بیٹا! کوشش تو کرو، پھر اندازہ ہوگا کہ ہر چیز میں بازار کی نسبت پیسہ کم لگتا ہے۔"

"اور گھر میں بناؤ تو وقت، اور امی وقت بھی بہت قیمتی ہے۔" ایک بہو نے کہا۔

"امی! آپ کو اندازہ ہی نہیں، وقت کتنا تیز دوڑ رہا ہے اور اس کا ساتھ دینے کے لیے ہمیں بھی بھاگنا پڑتا ہے۔ بچوں کو اسکول لے جانا، پھر لانا ہے، انہیں پڑھانا ہے، بینک سے پیسے لانے ہیں، بل جمع کرانا ہے، ڈاکٹروں کے پاس دوڑنا ہے، بسوں کے دھکے کھاتے ہیں، ہم مرد تو کمانے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔"

"تو مرد تو ہمیشہ ہی کماتا ہے، عورت گھر سنبھالتی تھی۔ اتنی افراتفری پہلے کیوں نہیں تھی۔"

امی بے چاری کی سمجھ میں بہوؤں کا فلسفہ کم ہی آتا۔ "آخر سب کام پہلے بھی ہوتے تھے۔"

"ہوتے تو تھے، مرد خود کرتے تھے، اب . . ."

"اب تم نے مرد کو پیسہ کمانے کی مشین بنا دیا ہے، وہ لائیں، تم لٹاؤ۔"

"امی جی! ہم نے کام بانٹ لیے ہیں، مرد کے لیے آسانیاں کر دی ہیں تاکہ وہ سکون سے کمائی کریں۔ وہ مشین اس لیے ہیں کہ زمانے کا ساتھ دینا ہے۔ بچوں کو بہتر مستقبل فراہم کرنا ہماری دونوں کی ذمہ داری ہے، انہیں اعلیٰ افسر، معزز شہری بنانا ہے، اس کے لیے معیار زندگی بہتر کرنا اور پیسہ کمانا دونوں ضروری ہیں۔"

"سب بہلاوے، کیا ہم نے اعلا تعلیم نہیں دلائی افسر نہیں بنایا! مگر نقل میں ہم تو پاگل نہیں ہوگئے کہ آج فلاں کے گھر ٹی وی آیا ہے تو کسی بھی طرح ہمیں بھی لے کر آنا ہے۔ فلاں نے جیسا زیور بنایا ہمیں بھی ویسا لینا ضروری رہا، ہم نے تو ہر حال میں قناعت کی زندگی گزاری۔"

"تو امی! ہم کسی سے کم تو نہیں، دوسروں کی طرح ہم کو بھی حق ہے کہ اپنے آرام کے لیے سہولتوں سے فائدے اٹھائیں۔"

بہوؤں کو ساس کے اعتراضات کی زیادہ پروا نہ تھی کہ وہ اس زمانے کا اپنے دور سے مقابلہ کرتی تھیں جو ان کے خیال میں نادانی اور کم فہمی تھی۔ بیلا اور شمائلہ بھی بھابیوں کی ہم نوائی کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں بھی سہولت کی ہر چیز موجود تھی، خواہ قسطوں کی بدولت ہو یا کمیٹیوں کی۔ بیٹے بھی سمجھاتے۔ کہ آج کا دور تیز رفتاری کا دور ہے۔ پچھلے پچیس تیس سالوں اور آج کے زمانے میں رہن سہن ہی نہیں، انسان کے مزاج ہی نہیں ذہن بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے کی قدر نہیں، چیز کی قدر ہے۔ نت نئی ایجادات اسی لیے آتی ہیں کہ لوگ فائدہ اٹھائیں۔

"بیٹا! فائدہ تو ان کمپنیوں کا ہے جو ان چیزوں کو مارکیٹ میں لا رہی ہیں۔" امی چڑ جاتیں۔

"تم کو کیا فائدہ ہو رہا ہے تم تو صبح سویرے چلے جاتے ہو دن بھر آفس میں سر کھپاتے ہو، اوور ٹائم کرتے ہو، جہاں موقع ملے دماغ کھپا کر مزید کمائی کی تگ و دو کرتے ہو۔ آرام تمہیں نہیں، نیند تمہاری پوری نہیں ہوتی۔ تھکن سے چور گھومتے رہتے ہو، صحت کب تک ساتھ دے گی، ضرورتیں محدود کی جا سکتی ہیں بیٹا! صحت افضل ہے میرے خیال میں۔ مگر جوانی کے جوش میں تم اسے فراموش کیے ہوتے ہو۔"

بیٹے جانتے تھے، یہ بہوؤں سے کد نہیں، بیٹوں کی صحت و زندگی کی فکر ہے جو امی اس قدر نصیحتوں پر کمر بستہ رہتی ہیں۔ جیسی محنت و مشقت کی زندگی انہوں نے گزاری ہے، چاہتی ہیں بہوئیں بھی اسی طرح کریں جو آج کے زمانے میں مشکل ہے۔

"بیٹا! جسم و جان کا ہم پر قرض ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں۔ اس دولت کو بے دریغ نہ لٹائیں۔ سکھ، چین اور آرام پر تمہارا بھی حق ہے بیٹا! اگر تم پیسہ کمانے میں تھوڑی سی کمی کر دو گے تو اتنا بڑا نقصان نہیں ہوگا جتنا زیادہ دماغ کھپانے میں بے آرامی اور فکر سے تم صحت میں گھن لگا لو گے۔"

امی کو جب موقع ملتا، نصیحت کرتیں۔ بہوئیں کبھی برا مانتیں، کبھی ہنس کر ٹال جاتیں۔ انہیں بھی عادت ہوگئی تھی، اس لیے پروا نہ کرتیں۔ امی کچھ نہ کرنے کے باوجود گھر کے نظام کو سہارا دیئے ہوئے تھیں۔ بہوئیں جب بھی مارکیٹ کے لیے روانہ ہو جاتیں۔ وہ بچوں اور اپنے لیے کچھ پکا لیتیں۔ خواتین جب لدی پھندی واپس آتیں تو بھوک سے بے حال تھکن سے پراگندہ۔ نوکر کو بازار دوڑایا جاتا، وہ گھنٹہ بھر بعد نان کباب اور تکے لے آتا۔ اس دوران وہ بستر پر لیٹی تھکن اتارتیں۔ امی کو جھنجلاہٹ ہوتی۔

"بازار سے کھانا منگانے کے بجائے گھر میں دال روٹی آدھے گھنٹے میں تیار ہو جاتی۔ بازار سے گھنٹہ بھر میں یہ سوکھے نان کباب آئے ہیں۔ تکے کس جانور کے ہیں، تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ بیٹا جانے سے پہلے ایک ایک کام بانٹ کر کھانا تیار کر جائیں تو آتے ہی مل جاتا۔ جب معلوم ہے کہ بازار کی محنت مزدوری میں دیر لگتی ہے تو پہلے سے کیوں نہیں کر کے جاتیں۔"

"امی! کبھی بیٹیوں کو بھی کوئی نصیحت کر دیا کریں۔"

"ضرور کروں گی جب دیکھوں گی کہ وہ روز بازار کے واری صدقے ہو رہی ہیں، بچوں کا ہوش ہے نہ میاں کی پروا تو ٹوکوں گی۔"

اور بھابیاں تو جانتی تھیں کہ بیلا اور شمائلہ بازار کی چیزوں کے بجائے ہاتھ سے خود بنا کر خوش ہوتی ہیں۔ بھتی ہے ان کے پاس فرصت۔ بیلا تو یوں بھی کئی ماہ بعد فرمان کے ساتھ ہی کسی ضرورت کے تحت بازار جاتی۔ شمائلہ ساس اور نندوں کے ہمراہ مہینے کا سودا لینے جاتی تو ضرورت اور شوق کی چیزیں بھی لے لیتی۔ اس کی بھری پری سسرال تھی۔ بازار میں گھومنے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔ بھابیوں کا نظریہ یہ تھا کہ جب ہر چیز بازار میں موجود ہے تو محنت کیوں کریں۔ خوامخواہ کی تھکن۔

بیلا پہلے پہل ساس سے خوفزدہ رہی کہ وہ بھی امی کی طرح نصیحت کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جائیں گی مگر وہ تو ہر طرف سے بے خبر جیسے آنکھ بند کیے رہتیں نہ انہیں گھر کی چمک دمک متاثر کرتی نہ سجاوٹ نظر آتی۔ وہ بیلا کو دن بھر کام میں مصروف دیکھ کر تعریف بھی نہ کرتیں نہ اسے سیتے کاڑھتے بنتے دیکھ کر داد دیتیں۔ ہاں کبھی کبھار وہ اچھے کپڑے پہن کر آتی تو دعا دیتیں۔

"بوڑھ سہاگن ہو، ایسے ہی رہا کرو، سجی بنی۔"

مگر یہ الفاظ تھے نہ لہجے میں شیرینی نہ آنکھوں میں تاثر۔ بے شمار ضرورت کی اشیاء شیشے کے شوکیس میں رکھی تھیں، کبھی سوال تک نہیں کیا۔ کسی چیز کا استعمال بھی انہیں نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ پنکھا چلانے کے لیے بھی بیلا کو آواز دیتیں۔ فرمان نے ریگولیٹر فکس کر دیا اب صرف سوئچ دبانے سے پنکھا چل پڑتا۔ اماں کو سوئچ سے بھی ڈر لگتا کہ کرنٹ نہ لگ جائے۔ وہ پلنگ پر لیٹی یا بیٹھی رہتیں۔

ایک روز سراج کو بخار تھا۔ بیلا اسے ڈاکٹر کے ہاں لے گئی۔ واپس آئی تو کچن میں سارے برتن دھلے رکھے تھے۔ دیگچیاں چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ یہ اماں کا کارنامہ تھا۔ بیلا شرمندہ ہو گئی۔

ایک دن فرمان کی فرمائش پر اماں نے سالن پکایا وہ بھی بہت لذیذ۔ فرمان نے اماں سے کہا۔

"وہ بیلا کو بھی ایسا سالن پکانا سکھا دیں۔"

گو کہ فرمان بیلا کے کھانے کی ہمیشہ تعریف کرتا تھا مگر ماں کے ہاتھ کی لذت ہی اور تھی۔ اب بیلا کو کام میں مصروف دیکھ کر اس کی مدد کر دیتیں۔ کبھی پیاز کاٹ دی، کبھی سبزی بنا دی۔ بیلا کپڑے دھوتی تو ڈوری پر ڈال دیتیں۔

بیلا آٹا گوندھ کر تسلے میں پانی ڈال دیتی۔ آسانی سے دھل جاتا تھا۔ اماں اس کے ہاتھ سے تسلے کر پانی گملے میں ڈال آتیں کہ رزق کا پانی ہے، بے ادبی ہو گی نالی میں۔ اسی طرح برتنوں میں لگے دال چاول، ہڈی، بوٹی سب چمچے سے الگ کر کے رکھ لیتیں اور اوپر والے فلیٹ کی چھت پر جا کر ڈال آتیں۔ اس طرح وہ اوپر والے لوگوں سے متعارف بھی ہو گئیں۔ ان کے ڈالے ہوئے بچے کھچے کھانے پر کوے، مینا، چڑیاں آجاتیں۔

کبھی کبھی اماں، عراج کو گود میں لے کر توتے، چڑیاں دکھلانے لے جاتیں۔ پھر ایک دن وہ نیچے جا کر سبزی والے سے سبزی لے آئیں اور بیلا سے کہا۔

"سبزی زیادہ پکایا کرو، گوشت کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی۔ ہر دوسرے ہفتے کابل ہو جاتا ہے۔"

اب وہ اکثر نیچے جا کر سبزی لے آتیں۔ بیلا کو بڑا آرام ہو گیا مگر انہیں دیر بہت لگتی تھی۔ پتا نہیں کس دکان سے لاتی تھیں، خوب تازہ چھانٹ کر عمدہ سبزی لاتیں۔

"چھانٹنے نہیں دیتا سبزی والا۔ کہتا ہے میرا سب سے اچھا مال اماں جی لے جاتی ہیں۔ اب کیا میں دن بھر باسی سبزی بیچوں! سُنا تم نے۔ تازہ، باسی ملا کر دیتا ہے مجھے ایمان کہیں کا۔ اب مجھے بھلا بنے وقوف بنا سکتا ہے۔ بھئی منہ مانگی قیمت دیتی ہوں پھر باسی مال کیوں لوں ۔۔۔ ہیں!"

ایک دن بیلا کی امی سمدھن سے ملنے آ گئیں۔ ان کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا، اس لیے وہ زینہ چڑھنے سے پرہیز کرتی تھیں۔ بیلا کے ہاں امی اسی لیے بہت ہی کم آتی تھیں مگر سمدھن سے ملنا تو ضروری تھا۔ خلاف توقع دونوں میں بہت جلد بے تکلفی ہو گئی۔ بیلا چائے لے کر گئی تو دونوں سر جوڑے باتوں میں جُتی ہوئی تھیں۔ امی نے جانے سے پہلے بیلا سے سرگوشی کی۔

"بہت اچھی ہیں تمہاری ساس، ان سے کچھ سیکھ لو۔"

وہ ہنس دی اور کیا سیکھے، جتنا کچھ امی نے سکھا دیا تھا اس کا عشر عشیر بھی دوسری لڑکیوں کو نہیں آتا تھا۔ سینا پرونا، کاڑھنا، بُننا، تورہ، پاک، برتنا، برتانا، صبر، تحمل، برداشت، عزت و وقار کی حفاظت، اخلاقِ انسانی، خودداری سب کچھ۔ وہ غور کرتی رہی۔ اماں سے کیا سیکھ سکتی ہے۔

دراصل امی بھی سمدھن سے پہلی بار مل رہی تھیں۔ شادی تو فرمان کے چچا کے توسط سے ہوئی تھی۔ امی کی جیٹھانی، بہو بیلا کو پسند کر گئی تھیں۔ چچا چچی رشتہ لائے تھے اور یہ کوئی انہونی نہ تھی۔

فرمان عرصے سے اپنے چچا کے ہاں مقیم تھا۔ برائے تعلیم پھر اسے اچھی جاب بھی مل گئی۔ چچا نے ہی اس کی شادی پر زور دیا تھا۔ ہاں بارات میں والدہ کی غیر موجودگی کو سب نے محسوس کیا تھا، مگر چچی نے ان کی بیماری کا عذر پیش کر دیا۔

اس کے بعد بھی فرمان عرصے تک اپنی ماں سے ملنے نہ گیا۔ بہانا چھٹی نہ ملنے کا تھا مگر دراصل وہ بیلا سے جُدا ہونے پر راضی نہ تھا۔

کچھ عرصہ بیلا، چچا کے ہاں ہی رہی اور فرمان اس کے گرد پروانے کی طرح گھومتا۔ سب اس کا مذاق بھی اُڑاتے، مگر اسے پروا نہ تھی۔

اس کے کافی دن بعد وہ اماں سے ملنے گیا۔ وہ بیلا کو نہیں لے کر گیا البتہ اس کی تصویریں لے گیا تھا۔ بیلا نے بار بار اپنی ساس سے ملنے، ان کی خدمت کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ مگر۔۔۔۔۔ وہاں دس بہانے۔

چچا، چچی بھی اس معاملے میں خاموش رہتے بلکہ ایک طرح سے وہ اسے گاؤں جانے سے منع ہی کرتے اور ساس کو اپنے پاس بُلانے کا اختیار اسے نہ تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اُلجھن میں مبتلا ہو جاتی۔

فرمان اسے یقین دلاتا کہ اماں خالص دیہاتی خاتون ہیں، ٹرین میں بیٹھنے سے ڈرتی ہیں اور کوئی بات نہیں۔ چونکہ چچا چچی برابر رابطہ رکھتے تھے اس لیے اس کے میکے والوں کو بھی پریشانی نہ تھی۔ اعراج، معراج چچا کے گھر پیدا ہوئے تھے۔

پھر فرمان کو فلیٹ مل گیا۔ اعراج، معراج کی خوشخبری لے کر فرمان گاؤں گیا تھا۔ اماں تب بھی نہیں آئیں اور وہ تو کچھ ڈرنے بھی لگی کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہیں مگر واقعہ آپا اور بھابی نے یقین دلایا کہ ایسی بات نہیں ہے، وہ بس عجیب ہیں۔

اس عجیب سے کچھ اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شکر ہے کہ وہ ساس کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئی اور ہر خدشہ دور ہو گیا۔

فرمان، اماں کو چچا کے ہاں لے جانے پر بھی راضی نہ کر سکا۔ انہوں نے کہا۔

"میں بیٹے کے گھر آئی ہوں، جب وہ گاؤں جا کر بلائیں گے تب ان کے گھر جاؤں گی۔"

واقعی عجیب تھیں، ناچار بچی خود آ کر مل گئے، ان کے بیٹے، بیٹی، بہو وغیرہ سب باری باری آ گئے۔

اماں نے بچوں سے تو پردہ ہی کیا، منہ موڑے بیٹھی رہی۔

بیلا کے بھائی آئے اور اماں کو دعوت کا بلاوا دے گئے۔ بیلا تو ڈر رہی تھی کہ وہ صاف انکار کر دیں گی، مگر وہ چپ رہیں۔

دعوت والے دن انہوں نے سرخ، سیاہ چیک کی لنگی نکالی۔ بیلا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، وہ دوڑی فرمان کی طرف۔

"خدا کے لیے اماں کو لنگی پہننے سے روکیں۔"

فرمان قہقہے لگانے لگا۔

بیلا نے اپنا سفید کرتا، دوپٹہ نکال کر دیا جو اس نے ابھی تک پہنا نہیں تھا۔ اماں نے سفید شلوار بھی نکال لی۔

صبح سویرے انہوں نے ہاتھ پیر میں مہندی لگائی تھی۔ دوپہر تک خوب رنگ چڑھ گیا۔ سرخ سیاہ چوڑیاں پہن کر، آنکھوں میں سرمہ لگا کر انہوں نے کپڑے پہنے اور ان کا سنگھار تمام ہوا۔

سمدھیانے میں ان کے اس جاہ و جلال والے روپ کو سب نے پسند کیا۔

کھانا بہت لذیذ اور وافر تھا۔ اماں نے خوب خوب انصاف کیا اور بیلا کی بھاوجوں کو پاس بلا کر ان کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ چومے۔ مزید لذت کے لیے دعا کی۔ بھابیاں بہت متاثر ہوئیں۔

"بیلا! کتنی خوش قسمت ہو تم، اتنی اچھی ساس ہیں تمہاری۔"

"اے کاش ہماری ساس بھی ایسی ہوتیں۔" منجھلی زیادہ ناشکری تھی۔

"اللہ میاں! ہماری ساس پر ان کا سایہ ڈال دے ثم آمین۔"

چھوٹی بھابی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

شمائلہ جو شروع سے چپ چپ تھی، ناگواری سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اللہ نہ کرے امی پر کسی کا بھی سایہ پڑے۔" وہ غصے سے بول پڑی۔

"وہ جیسی ہیں اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ کبھی کبھی شکر بھی ادا کیا کرو کہ بے ضرر ساس ہیں۔ جو ظاہر ہے وہی باطن ہے۔ جو کہتی ہیں تو وہ بھی تمہاری بھلائی میں۔ لوگوں سے پوچھو تو ذرا، کس کس فتنہ انگیز ساسوں سے بہوؤں کے سابقے ہیں۔ ناشکری کہیں کی، بس رشک کروا لو کہ فلاں کی ساس ایسی، فلاں کی ساس ویسی۔ فوراً فریفتہ ہونے کو تیار۔ اندر سے کون کیسا ہے۔ یہ جان لو تو خود کو خوش قسمت سمجھو گی۔"

شمائلہ نے تینوں بھاوجوں کی خاصی کھنچائی کر ڈالی۔ وہ دانتوں میں زبان دبا کر سر جھکا کر بیٹھ گئیں۔

شمائلہ سب سے بڑی بھی تھی اور یہ تینوں بھاوجیں اسی کی پسند اور کاوش کے نتیجے میں اس گھر میں نظر آ رہی تھیں، اس لیے بھی وہ اس سے دبتی تھیں۔ یعنی ساس سے زیادہ نند کا رعب تھا۔

امی تو خاندان سے ہی بہوئیں لانے کی خواہش مند تھیں مگر شمائلہ نے مخالفت کی کہ اپنوں میں نیا رشتہ جوڑنے سے پرانے تعلقات بھی کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ شمائلہ رشتے داروں میں بیاہ کر گئی تھی۔ شادی تو بڑے جوش و خروش سے ہوئی مگر بعد میں ساس کو بہو میں، نندوں کو بھاوج میں ہزار عیب نظر آنے لگے۔ پھر شمائلہ کی امی سے اس کی ساس عرصے تک ناراض رہیں۔ شاید جہیز ان کی مرضی کا نہ تھا یا بعد میں ان کی خواہش کے مطابق سمدھیانے سے قدردانی نہیں کی گئی۔

یہ تو شمائلہ کی ذہانت، معاملہ فہمی، دوراندیشی تھی کہ اس کے حق میں ساس، نندوں کے معاملات درست ہوتے گئے۔ وہ بہت زیادہ محنتی، خدمت گزار، مل جل کر گزارا کرنے والی تھی۔ اس کے شوہر بھی اس کے قدردان تھے اور ماں بہن کو سمجھاتے کہ شمائلہ میں کوئی خامی یا کمی نہیں بلکہ وہ گھر بنانے کی شوقین ہے۔ ہمیں شمائلہ سے

واسطہ ہے' اس کی ماں یا بھائیوں کا ہمارے گھر میں دخل ہی نہیں ہے۔ پھر ان سے کیوں بگاڑ کریں۔

شمائلہ بحث کی عادی نہ تھی۔ کسی نقصان کا احتمال ہوتا تو اختلاف کرتی، ساس ضد میں آجاتیں اور پھر کام خراب ہوتا۔ تو شمائلہ کی رائے کی قدر ہوتی۔ شمائلہ کبھی جتاتی نہ تھی کہ میں نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ بلکہ کہتی۔ کوئی بات نہیں اماں۔ قدرت کو یہی کرنا تھا۔ ہم کچھ بھی کر لیتے۔ ہونا یہی تھا۔ دراصل ساس نند خود کو — عقل کل سمجھتی تھیں اور سب یہی سمجھتے ہیں کہ ہم عقل مند ہیں۔ دوسرا احمق۔

چھوٹے چھوٹے معاملات میں، گھر کے مسائل میں اس کی رائے جب بھی مانی گئی۔ فائدہ ہوا۔ پھر بھی کوئی تسلیم نہ کرتا۔ اتفاق ہے کہہ کر ٹالا جاتا۔

ایک بار نند کی شادی کی بات چلی۔ لوگ آئے بار بار خواتین آئیں۔ لڑکا اچھا تھا جاب بھی ٹھیک ٹھاک۔ وہ لوگ فوری نکاح اور مہینہ بھر بعد شادی پر اصرار کر رہے تھے۔ شمائلہ نے دبی زبان سے کہا۔

"نکاح کے لیے اقرار نہ کریں۔ ابھی کسی اور سے بھی معلومات کرالیں۔ آخر انہیں اس قدر جلدی کیوں ہے؟"

اتفاق سے اس کی نند کو کسی سہیلی کے ذریعے معلوم ہوا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ تحقیقات کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ تو پتا چلا کہ لڑکے کی ایک شادی ہو چکی ہے بیوی سے علیحدگی بھی نہیں ہے۔ مگر وہ میکے میں ہے اور اس نے بیوی سے شرط لگی ہے کہ تم سے زیادہ حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر کے دکھاؤں گا۔ بال بال دھوکے سے بچے یہ لوگ۔ سب شمائلہ کی فہم و فراست کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد بھی بار بار شمائلہ کی سمجھ بوجھ اور مردم شناسی ثابت ہوئی۔ سسرال والے بھی اب شمائلہ سے خوش تھے

اور میکہ، سسرال پھر سے خوش خرم ایک جان دو قالب۔

"آپا! آپ کا خیال ہے کہ فرحان بھائی کی والدہ اندر سے کچھ اور ہیں۔ جیسی نظر آتی ہیں۔ ویسی نہیں ہیں!"

"میں کسی کے بارے میں رائے زنی کے حق میں نہیں میرا قیاس غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ اور یوں بھی ہوا ہے کہ پہچان میں غلطی ہو گئی۔ فرحان سچا، کھرا آدمی ہے اور اسی سے غرض ہے ہمیں۔ اس کی والدہ ہیں۔ آج ہیں تو کل چلی جائیں گی۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ... خیر چھوڑو۔ میری دعا ہے کہ بیلا کے حق میں وہ منصف مزاج ساس ثابت ہوں۔"

شمائلہ سب سے پہلے واپس چلی گئی۔ بیلا اور فرحان کافی دیر بیٹھے۔ بیلا کے بھائی اور بھابیاں فرحان کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی سادگی، سچائی اور خوش مزاجی وہ جہاں جا کر بیٹھتا۔ قہقہوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی۔ بیلا اور فرحان اماں کے ساتھ چلے گئے تو بھابیوں نے دیر تک ان کے بارے میں گفتگو کی خصوصاً شمائلہ کا انداز خاصا پریشان کرنے والا تھا۔ وہ بیلا کی ساس کے بارے میں مشکوک تھیں کہ وہ ایسی ہیں نہیں جیسی نظر آتی ہیں۔ مشفق اور نیک بی بی۔

"پتا نہیں آپا نے ان میں کیا دیکھ لیا اور پھر بتایا بھی نہیں کہ آخر ان میں کیا خرابی ہے؟"

"جب وہ اندر آئی تھیں آپا نے گھبرا کر میرا بازو پکڑ کر کہا۔ دیکھنا فائزہ کیسی عجیب آنکھیں ہیں ان کی اور سچ بھابی میں نے بھی غور کیا تو بڑی عجیب سی چمک تھی ان کی آنکھوں میں، دھندلائی ہوئی آنکھوں میں چمک جیسے سوتے سے جاگ اٹھی ہوں جیسے اندھیرے میں کوئی جگنو جھلملائے۔ میں بھی کچھ حیران تو ہوئی تھی۔"

"اور آپا جو دیر سے چہک رہی تھیں ان بڑی بی کو دیکھتے ہی چپ ہو گئیں، بلکہ پریشان سی۔"

"بھئی آپا اب مافوق الفطرت ہستی بھی نہیں ہیں کہ انسان کی شکل دیکھ کر اندر تک جھانک لیں چھوڑو یہ ذکر۔ اتفاق ہے کہ انہوں نے دو تین دفعہ جو رائے دیں وہ صحیح ثابت ہوئیں۔"

"خیر اب آپا کا امتحان ہے۔ دیکھیں گے، ان کا شک کتنا درست ہے۔ ویسے ان کی چھٹی ساتویں بلکہ آٹھویں حس بھی ہے جو کمال کی ہے' ماننا پڑے گا۔"

"اچھا اب بیلا سے نہ کہنا۔ بے چاری مخمصے میں گرفتار

ہو جائے گی۔ مجھے فکرمند تو تمہاری ماں نے آپا نے کر دیا ہے۔"
بیلا خوش تھی۔ سب کچھ بہترین تھا۔ اس کے میکے والوں نے اس کی ساس کی عمدہ طریقے پر پذیرائی کی۔ امی نے بہت قیمتی سوٹ اماں کو دیا۔ فرمان بھی مطمئن تھا۔ اماں نے اس کی سسرال کو پسند کیا تھا۔
"بیلا!" رات کے سناٹے میں فرمان کی آواز نے بیلا کی نیند اڑا دی۔ عجب اداسی تھی آواز میں۔
"ہاں، کیا ہے؟" وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔
"نہیں... نہیں، کچھ نہیں... وہ میں کہہ رہا تھا تم اماں کی خوب خدمت کرو۔ ان کا دل جیت لو۔"
"اوہ۔" بیلا پریشان ہو گئی تھی۔ پھر سے لیٹ گئی۔
"دیکھو، جس طرح بھی ہو۔ ان کو اپنی خوبیوں کا اسیر کر لو۔ بس وہ تمہارے گن گانے لگیں۔"
کیا بچکانہ خواہش تھی۔ بیلا کو ہنسی آ گئی۔ "وہ کوئی ننھی بچی تو نہیں ہیں۔ جو میرے گن گائیں گی۔"
"یہ کیا بات ہوئی۔ میرا مطلب ہے کہ۔ بس کسی طرح۔ خدمت۔ فرماں برداری۔ یہاں تک کہ چاپلوسی کرنا پڑے تو وہ بھی۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ فرمان تو نے ایسی بھولا کر مجھے خوش کر دیا۔ بہت اچھی ہے۔ اس سے اچھی تو اور ہو ہی نہیں سکتی۔"
"کیا وہ۔ مجھ سے۔ ابھی خوش نہیں ہو ئیں؟"
"بیلا! میں بہت حیران ہوں۔ انہیں ابھی تک تمہاری خوبیوں کا کیوں علم نہیں ہوا۔"
"میں تو پوری کوشش کرتی ہوں۔" بیلا کی نیند بالکل ہی اڑ گئی۔ "کیا انہوں نے۔"
"نہیں۔ یہی تو فکر ہے۔ وہ کچھ کہتی ہی نہیں ہیں میں چاہتا ہوں بیلا کہ وہ۔ یہاں سے جاتے وقت تمہارے نام کا۔ تمہاری خوبیوں کا وظیفہ پڑھتی جائیں۔ دراصل وہ ایک شرط پہ یہاں آئی تھیں۔ اور میں۔
پچھتا رہا ہوں کہ انہیں یہاں آنے پر کیوں مجبور کیا۔"
فرمان کے لہجے میں خاصی پریشانی تھی۔ بیلا نے فرمان کو کبھی اتنا فکرمند نہیں دیکھا تھا۔
"بیلا! تم بہت اچھی ہو۔ میں جانتا ہوں تم سے بہتر۔ بلکہ تم جیسی بھی کوئی لڑکی مجھے مل نہیں سکتی تھی

یہ چچا چچی کا احسان ہے کہ انہوں نے تمہیں منتخب کیا۔ اور تم نے۔ میری توقعات سے بڑھ کر مجھے چاہا۔ میرا گھر بنایا۔ گھر کو جنت بنایا۔ میرے لیے تم نے۔ خود کو مٹا ڈالا۔"
"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ فضول۔ میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔ بس آپ اب سو جائیں۔ میں اماں کی اور زیادہ خدمت کروں گی۔ اتنی کہ وہ میرے گن گانے لگیں۔ بس یہی چاہتے ہیں ناں آپ۔"
"نہیں۔ میں تمہارے سوا کسی سے۔ بیلا! مجھے اتنا نہ چاہو کہ میرے راستے کھو جائیں۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ صرف تم سے۔ تم۔ تم۔ اور کوئی نہیں۔"
فرمان بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔
بیلا نے اسے اس قدر فکرمند اتنا پریشان اور ایسا جذباتی ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"مجھے چھپا لو بیلا! اپنے وجود میں گم کر لو۔ اس طرح کہ میں سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔ بیلا۔ بیلا۔ مجھے اپنا بنا لو۔"
بیلا نے اسے بچوں کی طرح تھپک تھپک کر سلایا۔ سوتے میں بھی وہ جھرجھری لے کر بیلا کو پکارتا۔
"صبح پوچھوں گی۔" اس نے سوچا۔ یہ آخر انہیں ہوا کیا۔ وہ خود بھی مضطرب ہو گئی۔ لیکن صبح کو بچوں کے شور شرابے۔ چائے ناشتے کی ہلچل۔ فرمان کے آفس کی تیاری میں سب کچھ بھول گئی۔ اور پھر فرمان نے بھی کوئی بات نہ کی۔
اس دن بیلا نے اماں سے ان کی پسند کا کھانا پوچھ کر پکایا۔ سہ پہر کو نمک پارے تلے۔ نمک پارے فرمان اور بچوں کو بہت پسند تھے۔ فرمان کے آنے سے پہلے ہی چائے ٹرے میں رکھ کر

نمک پارے اور امی کے گھر سے آئی ہوئی برفی پلیٹ میں رکھی۔ اور ساس کے پاس آئی۔
ابھی وہ ٹرے میز پر رکھ رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ فرمان کے آنے میں تو کچھ دیر تھی۔ دروازے

پر اوپر کے فلیٹ والی محجبینی کے کھڑی تھیں۔ وہ انہیں اندر لائی۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ کچھ اخلاق برتا۔ پھر چائے لانے کے لیے کھڑی ہوئی تو انہوں نے کہا۔

"میں تو۔ دراصل تمہاری ساس سے ملنے آئی ہوں۔"

چھت پر دانا دنکا ڈالنے جاتی تھیں تو ان لوگوں سے جان پہچان کر لی تھی امّاں نے۔ اس دن کے بعد نیچے کے فلیٹوں سے بھی خواتین خالہ جی سے ملاقات کے لیے آنے لگیں۔

بیلا جو فرمان کی خواہش اور فرمائش پر ساس کا دل جیتنے کی تگ و دو میں زیادہ سے زیادہ مصروف تھی۔ ان کے مہمانوں سے دل جیتنے لگی۔ امّاں کو سبزی لانے میں اسی لیے دیر ہوتی تھی کہ وہ نیچے والوں سے مراسم بڑھا رہی تھیں۔ اب کوئی کھانے کی کسی خاص ڈش کا معلوم کر رہی ہے تو کوئی اپنے لیے دعا کرانے آ رہی ہے۔ آنے والی خواتین جو بیلا سے واقف تھیں۔ اب اسے نظر انداز کر کے خالہ جی کے گرد ہالہ بنائے بیٹھی رہتیں۔ اکثر تو کاغذ پنسل ساتھ لاتی تھیں۔ کچھ دن بیلا اخلاقاً ان کے پاس جا کر بیٹھتی۔ چائے شربت سے تواضع کرتی۔ پھر اس نے وہاں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اپنے کام میں لگی رہتی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی برقی تار سے امّاں کی شہرت پھیل رہی ہے۔ آس پاس کی دوسری بلڈنگ والیاں بھی جوق در جوق آنے لگیں۔ کوئی دم کرانے آ رہی ہے کوئی دعا کرانے۔ کسی کو تعویذ درکار ہے تو کوئی محض خالہ جی کی زیارت سے مستفید ہونا چاہتی ہے۔ پھر عجیب عجیب عورتیں آنے لگیں اور بیلا کے حسین نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں مونگ پھلی کے چھلکے بے تکلفی سے گرانے اور گندے ہاتھ قالین سے پونچھنے لگیں۔ تو وہ گھبرائی۔ فرمان کو بتایا۔ نت نئی عورتوں کی نگرانی بھی

اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ کہ اب کسی کا کوئی وقت نہ تھا۔ جب چاہا دندناتی گھس آئیں۔ کوئی نظر بد کے لیے دم کرانے بچے کو لائی ہے جو پیشاب کرنے

میں ذرا تکلف نہیں کرتا۔ تو کسی کی آنکھوں کی کمزوری کے لیے کوئی دعا درکار ہے۔ اور نظر کی کمزوری کے باعث وہ ریک پر رکھے ڈیکوریشن پیس فرش پر گرانے میں کامیاب ہو جاتی۔ غرض گھر کیا سرائے بن گیا اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

روز صبح وہ گھر صاف کرتی۔ چمکاتی۔ کشن جگہ پر رکھتی آنے والیاں کشن ادھر ادھر پھینک دیتیں۔ جگہ جگہ شربت کے گلاس لڑھکتے۔ پیالیاں۔ یہاں وہاں اوندھی پڑی ہوتیں۔ ساس کا دل جیتنے کے لیے بیلا نے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا۔ مگر آفرین ہے۔ امّاں جی نے پھر بھی اس کی کوئی تعریف نہ کی۔ آخر اس نے آنے والیوں کو ڈرائنگ روم کے بجائے ساس کے کمرے کا راستہ دکھا دیا۔ تواضع کا سلسلہ بھی ختم۔ انہیں امّاں کے پاس بھیج کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ مگر یہ ضرور تھا کہ امّاں مسرور نظر آ رہی تھیں۔ عورتوں کے جمِ غفیر میں گھری ہوئی شادماں۔ شادماں۔ نہ جانے ان کے کس جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔

بیلا سوچتی شاید امّاں یہی طرح اس کے گن گانے لگیں۔ مگر فرمان کو گھر میں پھیلی ابتری کا احساس ہو گیا تھا۔ کتنے ڈلیاں اپنی چپلوں میں مٹی کیچڑ لاتی تھیں جو سارے گھر میں پھیل جاتی۔ اور پھر آفس سے آ کر بھی آرام نہ ملتا۔ طرح طرح کی آوازیں چیاؤں پیاؤں امّاں کے کمرے سے باہر نکل کر گھر میں گونجتی وہ جھنجلا کر بیلا پر برس پڑا۔

"کیوں آنے دیتی ہو۔ کیوں کھولتی ہو دروازہ۔ منع نہیں کر سکتیں۔ اپنے گھر میں چھٹی کے بعد بھی سکون نہ ملے۔"

"امّاں کو خوش کرنا ہے۔ تو برداشت کرنا پڑے گا۔"

بیلا پرسکون رہتی۔

ایک دن دو عورتیں۔ جو ایک دوسرے کی حریف بھی تھیں۔ ایک ہی مقصد کے لیے آ گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف تعویذ مانگنے لگیں۔ پھر دونوں میں خوب ٹھنی لڑ رہی ہیں۔ فرمان اسی وقت آیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آرام سے چائے

بنائی بیلا سے پوچھا۔
"لڑائی۔" بیلا نے کہا۔
"اوہ۔ نو" اس نے غصے میں بال نوچ لیے۔ اس گھر میں جہاں بیلا کی ہنسی کے جھرنے پھوٹا کرتے تھے اعزاز سراج کی قلقاریاں گونجتی تھیں اور خود فرمان کی خوشی سے بھرپور چہکار بہار کے پھول کھلایا کرتی تھی۔ آج وہاں گالی گلوچ کے ساتھ ہاتھا پائی کی بھی آوازیں گونج رہی تھیں اور گھر میں گھستے ہی جو ناگوار بو اس کا استقبال کرتی تھی۔ وہ کب تک برداشت کرتا۔ سیدھا اماں کے کمرے میں جا گھسا۔ اور بڑے رعب سے بولا۔
"جائیے۔ آپ سب اپنے گھر جائیے۔ اور خبردار آئندہ یہاں نہ نظر آئیں۔"
عورتیں اسے گھورتی، بڑبڑاتی زینے کی طرف لپکیں۔ فرمان کا کمرے کی حالت دیکھ کر غصے سے چہرا سرخ ہو گیا۔ یہ اس کے گھر کا کمرا نہیں۔ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم سے بھی بدتر ہو رہا تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ تھی۔ فرش پر دھبے۔ قالین سکڑا ہوا کوڑے کرکٹ کا ڈرم بنا ہوا تھا۔ بے تکلفی سے کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔ کوئی بیٹھے کھا رہی ہے کوئی چنے۔ کسی کے ہاتھ میں مروڑے ہیں تو کوئی روٹی پکڑ کر چلنے میں لگی ہے۔ ایسی ہی عورتیں تھیں وہ۔ سب کے جانے کے بعد ماں بیٹے میں معرکہ ہوا۔
"یہاں یہ سب نہیں ہوگا اماں۔ یہاں میری عزت ہے۔ آپ کیوں اسے مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔ نہ معلوم لوگ کس طرح باتیں بناتے ہوں گے۔"
فرمان کمرے سے آیا تو نہایت افسردہ تھا۔
"واپس جانے کا کہہ رہی ہیں۔" اس نے جھنجھلا کر تکیہ دور پھینکا۔
"میں انہیں منا لوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔" بیلا نے اس کا غصہ اور افسردگی رفع کرنی چاہی۔
"مگر۔ اب کوئی عورت۔ یہاں قدم نہ رکھے۔"
"فرمان! اس طرح تو اماں راضی نہیں ہوں گی۔"
"نہ ہوں۔ چلی جائیں بے شک۔ مجھے نہیں پروا۔ انہوں نے کب میری پروا کی ہے جو۔"
فرمان اس وقت غصے میں تھا۔ بیلا نے ساس کی چاپلوسی تک کی۔ بچوں کو ان کے دائیں بائیں بٹھا کر تصویریں اتاریں۔ اماں کو چپ سی لگ گئی تھی۔ نہ بیلا سے بات کی نہ فرمان سے۔ بچوں سے انہیں ویسے بھی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے کھانا بھی چھوڑ دیا۔
"مجھے گاؤں جانا ہے۔" صبح ہی وہ بالکل تک سک سے درست مانگ چوٹی کیے کھڑی تھیں۔
"میں ٹیکسی لے آتا ہوں۔" فرمان نے ہتھیار ڈال دیے بیلا ہکا بکا رہ گئی۔ لاکھ اماں سے اپنا قصور پوچھتی رہی ہاتھ جوڑتی رہی۔
"آج نہیں اماں بے شک کل چلی جائیں۔ آج میری خاطر رک جائیں۔ میری پیاری اماں۔ میں خود آپ کو پہنچانے جاؤں گی۔"
اماں پر کوئی بھوت سوار تھا۔ خاموشی کا۔ ٹیکسی پر فرمان کے ساتھ چلی گئیں۔ فرمان آفس نہیں گیا۔ اسٹیشن پر اماں کو پہنچا کر گھر آ گیا۔ وہ بہت اداس تھا۔ اکیلی چلی گئیں۔ بیلا کو بہت حیرانی تھی۔
"نہ جانے راستے میں انہیں کتنی تکلیف ہو گی۔ کبھی تو ٹرین میں بیٹھی نہیں تھیں، آئی بھی بس میں تھیں۔ کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہیں لے گئیں۔ فرمان! آپ ساتھ چلے جاتے ناں۔"
"کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مرید رستے میں بنا ہی لیں گی۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
کئی دن فرمان پر اداسی اور بیلا پر پچھتاوے کا اثر رہا۔ فرمان نے ماں کو کیوں نہیں روکا۔ انہیں راضی کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ورنہ ماں اکلوتے بیٹے کی بات بھلا نہ مانتے۔
"وہ خوش نہیں تھیں۔ ایک دن بھی نہیں بیلا! یہ تم تھیں۔ تمہاری ضد تھی جس نے اماں کو بلانے کی حماقت کی۔"
"حماقت۔ کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ میں نے تو حتی الامکان کوشش کی تھی اماں کو خوش کرنے کی۔ میں چاہتی تھی وہ یہیں رہیں۔ ہمارے پاس۔ بزرگوں کی دعاؤں کی بھیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ایسی دعاؤں کی جو دل سے نہ کی جائیں۔"

"آپ بدگمان نہ ہوں۔ بھلا ماں کے دل سے دعا نہ نکلے گی۔"

"تم بہت بھولی ہو بیلا! تمہیں دنیا کا ذرا بھی تجربہ نہیں۔ اور میرے خدا۔ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ حالانکہ چچا نے کتنا منع کیا تھا۔"

وہ کمرے میں گھس گیا۔ اور بیلا حیرت سے اس کے چہرے کے تاثرات پر غور کرتی رہ گئی۔ نہ جانے فرمان اس سے کیا چھپا رہا تھا۔ ماں بیٹے میں کیا گفتگو ہوئی تھی جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے۔

چند دن فرمان خاصا پریشان رہا۔ پھر بیلا اور بچوں کی تربیت میں بہل گیا۔ مگر وہ کبھی کبھی پریشان ہو جاتا۔ جب بھی اماں کے کمرے میں جاتا۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ سر جھکائے افسردہ۔ بیلا نے کمرے کو اچھی طرح دھو کر پھر پہلے کی طرح چمکا دیا تھا۔ قالین بھی دھویا تھا۔ اور کئی دن تو اس کو سوکھنے میں لگے۔ فرمان نے ایک دن اس سے کہا۔

"بیلا! کبھی بھی تم مجھ سے بدگمان نہ ہونا۔ خواہ تمہیں کوئی میرے بارے میں کیسی ہی غلط یا صحیح خبر دے۔ یوں سمجھ لو کہ میں تم۔ اعراج سراج۔ ایک زنجیر ہے یہ۔ اور یہ کبھی ٹوٹ نہیں سکے گی۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کرم ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہماری نیت نیک ہے۔ ہم سچے دل سے ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں۔ ہیں ناں؟ بولو بیلا! تم ہمیشہ میرا ساتھ دو گی۔ وعدہ کرو۔"

بیلا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی اس نے وعدہ کر لیا۔

"آپ اور میں ایک دوسرے کے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ آپ کو کیا پریشانی ہے۔ مجھے بتائیں تو۔"

"پریشانی۔ نہیں پریشانی نہیں۔ خدشے۔ اندیشے۔ نہ جانے کیوں میرا دل اس بارے میں۔ مطمئن نہیں ہوتا۔ بس تم میرا ساتھ دو تو میں تمہارے سہارے سے خود کو مضبوط بنا لوں گا۔"

کتنی مطمئن اور سکھی زندگی تھی ان کی۔ اماں کی آمد سے پہلے۔ اور ان کے جانے کے بعد فرمان بہت پریشان رہنے لگا۔ زندگی میں دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ بیلا بھی فرمان کی ذہنی کیفیت سے پریشان رہتی۔ اس کا خیال تھا کہ ماں کو ناراض کرنے کا پچھتاوا فرمان کو پشیمان کر رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی گھبرا کر سوتے سے اٹھ بیٹھتا۔ پھر بیلا سے کہتا۔

"مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکو۔ کچھ بھی پڑھو دعا کرو میرے لیے۔"

بیلا ہر وقت دعا کرتی۔

چار پانچ ماہ گزرنے کے بعد وہ نارمل ہوا۔ بیلا نے بھی اسے بہلانے اور دنیا کی دلچسپیوں میں حصہ لینے کے لیے اکسایا۔ ہر کوشش کی۔ اسے اپنے اور بچوں کے مسائل میں الجھا لیا۔ ان کا گھر پھر سے خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ اور جیسے تفکرات تو بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ فرمان کی ترقی ہو گئی تھی۔ وہ خوشی سے کھلا ہوا گھر آیا۔ وہ بیلا اور بچوں کو ساتھ لے جا کر تفریح کے موڈ میں تھا۔ گھر میں ماموں کا تار کیا رکھا تھا۔ اماں سخت بیمار تھیں۔ فرمان کا چہرا اتر گیا۔

"جب بھی کوئی خوشی ملتی ہے۔ کوئی نہ کوئی فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے۔"

اس نے لاپروائی سے تار پھینک دیا اور منہ پیٹ کر لیٹ گیا۔ بیلا نے تسلی دلجوئی میں کمی نہ کی۔

"چلو۔ ہم ابھی چلتے ہیں فرمان۔ اس وقت اماں کو ہماری ضرورت ہے۔ یہی وقت تو ہے۔ جب اولاد کا امتحان ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس وقت ان کی خدمت کریں۔ ضرورت پڑے تو علاج کے لیے یہاں لے آئیں۔" فرمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہاں لے آئیں۔ اور پھر وہی تماشا دیکھیں۔ لوگوں کی باتیں سنیں۔"

"ارے بیمار ہیں وہ۔ کیا ان کا علاج گاؤں میں ممکن ہے۔ یہیں شہر میں اچھے ڈاکٹر ہیں۔"

"گاؤں میں معالجوں کی کمی نہیں ہے۔ ویسے بھی ماموں کو بات بڑھانے کی عادت ہے۔"

پتا نہیں فرمان اماں کی طرف سے اتنا بدگمان کیوں تھا۔ لیکن بیلا کے کہنے سے اگلے دن جانے کو تیار ہو گیا۔ بیلا نے خود بھی ساتھ جانے کی پوری کوشش کی۔ مگر اس نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی۔ بچے بھی وہاں بیزار ہوں گے۔ تمہاری صحت ابھی اتنی اچھی نہیں جو اس سفر کی تھکان برداشت کرو۔ ضرورت ہوئی تو میں اماں کو لے آؤں گا۔"

جانے سے پہلے اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"دیکھو پہلے بھی تمہارے اصرار پر اماں کو لانے کی حماقت کر چکا ہوں۔ اب بھی تمہارے زور دینے پر جا رہا ہوں۔ اپنی خوشی سے نہیں۔ یاد رکھنا۔ تم بھیج رہی ہو مجھے۔ نتیجہ بھی خود ہی بھگتنا۔"

بیلا کو حیران چھوڑ کر وہ چلا گیا۔ بیلا اس کے الفاظ۔ اور لہجے پر غور کرتی رہ گئی۔

شمائلہ آپا بہت دن بعد آئی تھیں۔ اماں کے چلے جانے کا سن کر، پھر فرمان کی کیفیت۔ اس کے بعد اماں کی بیماری کے تار کے بعد بھی فرمان کا گاؤں جانے میں تامل۔ سن کر وہ متفکر ہو گئیں۔

"آپا۔ اس روز دعوت والے دن۔ آپ کو اماں کے بارے میں کیا شک ہوا تھا۔ پلیز مجھے بتا دیں۔"

"کوئی خاص نہیں۔ بس۔ مجھے ان کی آنکھوں میں ناگواری سی محسوس ہوئی۔ اور۔ یوں لگا جیسے وہ کسی بات پر بھی متاثر ہونا نہیں جانتیں۔ ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ مگر ظاہر میں تو وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں بلکہ سب کے ہاتھ چومے لے رہی تھیں۔ احسان مندی اور انکساری ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن۔ آنکھیں بے اثر۔ بے رنگ۔"

"آپا! لیکن اس کی کیا وجہ؟"

"یا تو ان کا اسٹائل ہی یہی ہے یا پھر انہیں فرمان کی بیوی بچوں اور ان کے گھر سے کوئی دلچسپی

نہیں۔ محبت تو دور کی بات ہے۔ شاید انہوں نے تمہیں قبول ہی نہیں کیا۔ ممکن ہے یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی ہو۔ صرف چچا کی خواہش پر۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ جانتی تو ہیں کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"وہ اتنی بے بس یا بے اختیار نہیں۔ یہی تفاخر تو تھا ان کی آنکھوں کی چمک میں۔ خیر۔ اب تو سانپ گزر چکا۔ لکیر پیٹنے سے حاصل کچھ نہیں۔ فرمان تم سے زیادہ جانتا ہے اپنی ماں کو۔ تم نے اس پر زبردستی کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ جو بہتر سمجھتا وہی کرتا۔ تمہارے شور سے تنگ آ کر گیا ہے اور تم کو آگاہ بھی کر دیا کہ نقصان کی ذمے دار تم خود ہو۔"

"ہیں۔ یہ نقصان کہاں سے آ گیا۔" بیلا دنگ رہ گئی۔

کئی دن ہو گئے۔ فرمان نے کوئی خبر ہی نہ دی۔ بیلا فکر مند تو تھی ہی۔ مزید خلش میں مبتلا ہو گئی۔ گھبرا کر شمائلہ کو فون کیا۔ اس نے کہا۔

"دفتر سے معلوم کر لو۔ شاید وہاں کوئی اطلاع آئی ہو۔ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور خبر دیتا۔"

اتنی بے عقل تو وہ نہ تھی مگر گھبراہٹ میں خیال ہی نہ آیا کہ آفس سے معلوم کر لے۔

"سنو بیلا! میں اپنی بوا کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں۔ اکیلی ہو اس لیے زیادہ گھبرا گئی ہو۔ بچے بھی تنگ کرتے ہوں گے۔ اپنا خیال کرو۔ جوس دودھ وغیرہ لیتی ہو ناں؟"

اسے اپنی بھلا کیا پروا۔ آپا کی بات کا جواب بھی نہ دے سکی۔ آخر فرمان کو کون سی مشکل پیش آ گئی تھی۔ اماں جانے کس حال میں ہوں گی۔ لے ہی آتے۔ علاج بھی ہو جاتا۔ دیکھ بھال بھی۔ آفس میں چار دن کی چھٹی کی درخواست آئی ہوئی ہے۔ چار دن کی چھٹی وہ لے کر گیا تھا۔ کچھ اطمینان تو ہوا۔ مگر دل بھاگ کر ماننا ہی نہ تھا۔ آخر بیلا کو مطلع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی۔ وہ اتنا بھی لاپروا نہ تھا۔ اور آج

کل تو اسے بیلا کی صحت اور آنے والی روح کی بہت فکر تھی۔ چونکہ بوا آگئی تھیں۔ اور انہوں نے اسے مکمل آرام کا حکم دے کر خود گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔

وہ ٹی وی پہ مزاحیہ ڈراموں سے دل بہلانے لگتی۔ یا کبھی الماریاں درست کرنے لگتی۔ الماری سے برتن نکال کر صاف کر کے ترتیب بدلتی۔ وقت تھا کہ گزرتا ہی نہ تھا۔ رات اور بھی قیامت بن جاتی۔ جاتے جاتے فرمان نے اسے کس نتیجے کے بھگتنے کی وارننگ دی تھی۔ ماں بیٹے میں دوری کیوں ہے۔ بظاہر اماں شفیق اور ہمدرد۔ جیسی کہ ہر ماں ہوتی ہے۔ فرمان نے ان کے آنے پر کس قدر مسرت کا اظہار کیا تھا۔ غیر معمولی خوشی۔ پھر۔ اسے کیا خدشے تھے۔

پتا ہی نہ چلا کر مزید سات دن گزر گئے۔

ہر آہٹ پر۔ سڑک پر کسی بھی گاڑی کے ہارن پر وہ یوں چونک اٹھتی جیسے اسی کے گھر کوئی آیا ہو مگر پندرہ دن ہو گئے۔ کوئی آیا نہ پیغام لایا۔ چچا کے گھر والے بھی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ امی اور بھائیوں کو ابھی لکھ کے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ آفس فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔ کہ آفس سے ایک آدمی آ گیا۔ وہ فرمان کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور آئندہ پروگرام سے آگاہی بھی۔ بیلا کے جسم سے جان نکل گئی۔ یعنی آفس میں بھی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ اور اب کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور اسے ہی کرنا تھا۔

شمائلہ کو بھی فکر لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک دن پھر آ گئی۔ بیلا اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دی۔

"کتنی خوشگوار زندگی تھی تمہاری۔ کوئی فکر نہ غم۔ خیر۔ یہ بھی زندگی کا ایک رنگ ہے۔ مجھے یقین ہے فرمان بھی کسی دباؤ کے تحت ہے۔ جب بھی وہ اس دباؤ سے آزاد ہوا۔ واپس آ جائے گا۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے یا اس کی اماں جان کو کچھ ہو گیا ہے۔"

"اماں کو۔ کیا ہوتا۔ بیمار تھیں تو انہیں لے کے بھی کہہ کر گئے تھے۔"

"ہر ایسے لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ مرد کو زیادہ ڈھیل نہیں دینی چاہیے۔ مگر۔ ہم عورتیں اتنا اختیار ہی نہیں رکھتیں۔ کہ انہیں باندھ کر رکھیں۔ وہی ہمیں بیوقوف بناتے رہتے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ۔ فرمان تمہیں بے وقوف بنا گیا۔ یا تم نے اسے اپنی حماقت سے کسی الجھن میں پھنسا دیا۔"

"کمال ہے آپا۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں۔ فرمان اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع پر گیا ہے۔ حماقت یا بیوقوف بننے والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔" بگڑ جانے کیسے الجھ گئی۔

"سنو۔ کیا۔ فرمان کبھی بھی۔ کسی دباؤ کے تحت۔ تم سے بے وفائی کر سکتا ہے؟" شمائلہ نے تو دھماکا کر دیا تھا۔ یہ خیال ان کے ذہن میں آیا بھی کیسے۔

"آپا!" وہ بہت زیادہ جھلا گئی۔ "میری جڑیں بہت گہری ہیں اور ہماری زنجیریں بہت مضبوط ہیں۔" اس نے بچوں کو پیار سے دیکھا۔

شمائلہ کے چہرے پر اداسی کی تہ جم گئی۔ اس نے مایوسی سے چھت کو دیکھا۔

"عورت واقعی بہت احمق ہوتی ہے۔ مضبوطی کا یقین بھی مرد ہی دلاتا ہے۔ اور خود ہی اپنے یقین کو جھٹلا دیتا ہے۔ اور عورت۔ اسی جھوٹ پر تکیہ کیے بیٹھی رہتی ہے۔"

شمائلہ کے ذہن میں تو بہت ہی تلخ حقیقتوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے مگر وہ ابھی اس معصوم بہن کو زیادہ رنجیدہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اور اسے اعتماد بھی تو بہت تھا فرمان پر۔ اپنی زندگی کی اس زنجیر کی مضبوطی کا یقین بھی بہت تھا۔ اب اس سے کیا کہتی۔ ہزاروں اس زنجیر کی مضبوطی کے باوجود مرد کے فریب کا شکار ہو کر تنہائی اور مشقت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ بچوں کی خود پرورش کر رہی ہیں اور وہ۔ جو دعوے دار ہے۔ بچوں کو دنیا میں لانے کا اپنا حق کہہ کر جب چاہا انہیں ماں کی گود سے چھین لیا۔ اور جب چاہا۔ ہاتھ جھٹک کر چل دیا۔ نئی راہ پر نئے ہمسفر کے ساتھ۔ مرد کا راستہ ہمیشہ صاف ہوتا ہے۔ رکاوٹیں۔ کانٹے۔ طوفان تو عورت کے مقدر میں ہوتے ہیں۔

شمائلہ چلی گئی۔ اور بیلا کسی طوفان کی زد میں

تنے کمزور درخت کی طرح کانپنے لگی۔ پھر بچوں کے سونے کے بعد اس نے فرمان کی الماری دراذوں کی تلاشی لی۔ صبح سویرے ایک بیگ میں اپنے اور بچوں کے دو دو جوڑے ڈالے۔ اور گھر لاک کر دیا۔ بوا کو شمائلہ کے گھر کے پاس چھوڑ کر ٹیکسی کو اسٹیشن چلنے کی ہدایت کی۔ اب جو کچھ کرنا تھا اسے ہی کرنا تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ زندگی کا فلسفہ۔

اپنے راستے کے کانٹے خود چنو۔ اپنی رہ گزر سے رکاوٹیں خود دور کرو۔ اور طوفان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے پسپا کرو۔ تبھی منزل ملے گی۔

وہ حرکت میں آگئی۔ ذہن پر ایک ہی خیال حاوی تھا۔ میری جڑیں بہت گہری ہیں۔ اسی اعتماد کو لے کر وہ ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ پسنجر ٹرین۔ جو اسے اس کی منزل تک پہنچائے گی۔ خواہ راستہ کتنا لمبا ہو، راستے میں کتنی صعوبتیں ہوں۔ جسم تھکن سے جوڑ جوڑ ہو۔ مگر ہمت جواں رکھنی ہے۔ حوصلہ نہیں ہارنا۔

وہ بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ اپنی سسرال جا رہی تھی۔ پہلی بار۔ سفر توقع سے بھی زیادہ لمبا ہو گیا۔ ٹرین جگہ جگہ رکتی تھی اور بغیر کسی اسٹیشن کے بھی جنگل میں کھڑی ہو جاتی۔ بچوں نے بھی خاصا اودھم مچایا ہوا تھا۔ پھر بھی کسی طرح وہ انہیں سلانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ مگر خود اس کی نیند فرمان کے گرد نثار ہونے چلی گئی تھی۔

بس خدا کرے اماں ٹھیک ہوں۔ کوئی ایسا مسئلہ نہ ہو۔ جو فرمان کے لیے تکلیف دہ ہو۔ آخر کب فرمان نے اتنی چھٹیاں نہیں کی تھیں آفس سے۔ نہ جانے۔ وہ خود ہی بیمار نہ ہو گئے ہوں۔ اماں کی خدمت کرتے کرتے۔ بارے صبح کے دس بجے اس اسٹیشن کا دیدار نصیب ہوا۔ جہاں اُترنا تھا۔ اور جہاں سے کوئی سواری لینی تھی۔ یقیناً تانگہ۔ چچا کی بہو۔ اور فرمان وقتاً فوقتاً اسے سفر کی داستان سناتے رہتے۔ اس کی یاد کے تحت وہ بیگ کندھے پر ڈال کر دونوں چلبلے بچوں کو اسٹیشن پر اتارنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور پھر اسٹیشن سے باہر حسب توقع تانگہ موجود تھا۔

اس نے فرمان کے والد کا نام لے کر پوچھا کہ ان کا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے۔ تانگہ بان نے کچھ بتایا ضرور۔ جو اس کے تھکے ہوئے ذہن کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کھڑا رہنا بھی مشکل تھا وہ تانگے پر چڑھ گئی۔ بچے خود ہی خوشی سے چیخیں مارتے چڑھ گئے۔

"سنو۔ بابا جی۔ یہ گاؤں۔ کہاں ہے۔ کتنی دیر میں پہنچیں گے ہم؟"

تانگے والے نے مڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی اس پریشان حال تھکی تھکی سی شہری حسینہ کو دیکھا۔ دونوں بچے اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھے ایک دوسرے سے چہلیں کرنے لگے۔

"بس۔ اب پہنچے۔ کہو تو اڑا کر لے جاؤں تانگے کو جہاز کی طرح۔ اسپیڈ میں؟"

"نہ نہ۔ بس۔ نارمل رفتار۔ چلو۔ تمہیں پتا ہے وہ قربان صاحب کی بیگم کچھ بیمار تھیں؟"

"قربان صاحب کی بیگم؟" کوچوان نے گھوڑے کو چابک رسید کر کے ہنس کر اس کے الفاظ دہرائے۔

"صدقے جاواں۔" (پتا نہیں کس کو کہا) "بی بی۔ وہ اب کسی کی بیگم ویگم نہیں۔ خود ہی بیگم صاحب بن گئی ہے۔ پیرانی حضرت بیگم۔ بیمار شمار وہ نہیں ہوتی خود ہی اپنے تعویذ گھول کر پی لیتی ہے۔ بھگا دیتی ہے بیماری کے باپ کو۔ لیکن بی بی! آپ فکر نہ کرو۔ جس حال میں ہو گی آپ کو تعویذ ضرور دے دے گی۔ شہر سے آئی ہو آپ! پھر چار ہفتے تک بلائے گی۔ ہر دفعہ ڈبل فیس۔ اس کی تو موجیں ہو گئی ہیں۔" بڑا ہی باتونی کوچوان تھا۔

"ویسے ایک بات حیرانی کی ہے۔" اس نے پھر گردن کو ذرا سا خم کر کے کن انکھیوں سے بیلا کو دیکھا۔

"بچے تو اللہ کے کرم سے آپ کے ہیں۔ پھر آپ اتنی دور سے کیا لینے آئی ہو؟ خاوند۔ بے وفائی۔ دوسری شادی۔ ہائے۔ پیروں پڑنے لگا ہے؟"

اُف۔ اس کے سوالات۔ اس کی نظروں کا تجسس۔ تابڑ توڑ حملے۔ باتونی۔ جاسوس کہیں کا۔

"خاوند کے معاملات۔ بہت ٹیڑھے ہوتے ہیں۔

نیس چوگنی ہوتی ہے۔ بتا دیلے میں نے۔ وہ بھی کیا کرے بے چاری۔ کمائی کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ لوگوں کے برتن دھوتی۔ کسی کی روٹی پکاتی۔ اس نے عزت کمانے کے لیے یہ دھندا اختیار کیا۔"

"مگر۔ اس کا بیٹا بھی تو ہے۔" اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"ہاہاہا۔ بیٹا۔ وہ تو شہر میں شادی کر کے آرام سے بیٹھا ہے۔ اور اسے ماں کا یہ دھندا پسند بھی نہیں۔ اس بیٹے کو مائی میراثی نے بکریاں، مرغیاں پال کر گائے کا دودھ بیچ کر پالا۔ پڑھایا لکھایا۔ وہ چچا کے پاس چلا گیا۔ تو واپسی کا رستہ بھول گیا۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ اللہ کسی کو ایک اولاد نہ دے۔ چار چھ تو ہوں۔ جو بڑھاپے کا سہارا بنیں۔ ایک نالائق نکل جائے۔ تو دوسرا تو ہوگا تیسرا تو ہوگا۔"

"بابا! آپ کے کتنے بچے ہیں؟" موضوع بدلنے پر اس نے شکر کیا تھا۔

"بڑے۔ شکر ہے چھ بیٹے۔ دو بیٹیاں۔ ماشاء اللہ۔ بڑھیا کی تو موجیں ہیں۔"

"بڑھیا؟"

"گھر والی کا کہہ رہا ہوں۔ بیٹیاں ہاتھ دبا دیں، پیر دبا دیں۔ کھانا پکا کر کھلا دیں۔ بیٹے کمائی سے گھر بھر رہے ہیں۔ بڑھیا کی موجاں۔"

"تو بابا! پھر آپ کیوں یہ تکلیف اٹھا رہے ہیں تانگہ چلانے کی۔ آپ بھی گھر میں بیٹھ کر موج کریں۔ آپ کے بھی تو ہیں بیٹے بیٹیاں۔" توبہ کس قدر باتونی بڈھا ہے۔

"کیوں۔ میں کوئی لنگڑا لولا محتاج ہوں جو گھر بیٹھوں۔" وہ بری طرح بگڑ گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سڑک کچی تھی۔ مگر تانگہ ایک رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی گڑھا آجاتا تو جھٹکا سا لگتا۔ بیلا کے جسم کا عضو عضو فریاد کرتا۔ اف تھکن سی تھکن ہے۔ گھر پہنچتے ہی نہا کر لیٹ جاؤں گی۔ خوب گرم چائے اور پراٹھا مل جائے تو۔ بچوں کو فرمان سنبھال لیں گے۔ بھوک۔ نیند کی کمی۔ سفر کی تکان۔ فکروں کا بوجھ۔ اللہ میاں۔ اماں اور فرمان بالکل خیریت سے ہوں۔ دل سے دعا نکلی۔

"بابا! اب گاؤں کتنی دور رہ گیا ہے؟"

"بس جی۔ وہ سامنے۔" یہ بات وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔

بارے کچھ آبادی کے آثار نظر آئے۔ اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ او میرے خدا! بال تو گرد سے اٹے پڑے تھے۔ اسے کنگھا کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ نہ ہی گھر سے نکلنے سے پہلے منہ ہاتھ دھویا۔ توبہ۔ فرمان اس حلیے میں دیکھ کر کس قدر پریشان ہوں گے۔ شاید حیران بھی ہوں۔ یا شاید خفا ہوں۔ پہلی بار سسرال میں بھتنی بن کر جانا۔

گاؤں کی گلیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کچے مکانات کا ٹیڑھا میڑھا سلسلہ۔ گلیوں میں کھیلتے ننگ دھڑنگ بچے۔ نالیوں میں مکھیوں کی یلغار۔

"یہ۔ یہ۔ قربان صاحب کا گاؤں ہے، نور پور۔ بابا کہیں آپ بھول تو نہیں گئے؟"

بڈھے کو اس بات سے خاصی تکلیف پہنچی۔

"ہونہہ۔ شہر والے بڑے عقلمند بنتے ہیں! ارے اس گاؤں میں پیدا ہوا ہوں میں۔ قربان کے ساتھ کھیل کر جوان ہوا۔ میں اپنا گاؤں بھولوں گا۔ لو کر لو گل۔"

ایک پیچیدہ راستے سے وہ انہیں ایک گلی کے سرے پر لے آیا۔

"لو جی۔ آگیا میراثی حضرت بیگم کا گھر۔ گلی میں چلی جاؤ۔ کسی سے پوچھ لینا میراثی کا گھر۔"

"اف کس قدر گندی گلی تھی۔ کیچڑ سے لبریز۔ اف اللہ۔ اس گندے گاؤں میں فرمان نے پرورش پائی ہے۔ پھر فرمان کے ماموں زاد بھائی۔ جو خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ کسی کو گاؤں کی حالت سدھارنے کا خیال نہ آیا۔

"بابا۔ یہاں تو بہت کیچڑ ہے۔ ہمیں تم دروازے تک تو پہنچا دو۔"

"ناں جی ناں۔ اندر جانے کی اجازت ہمیں نہیں ہے۔ دیوار پکڑ کر چلی جانا۔"

"مگر۔ میں پھسل گئی تو۔" اور اسے جھرجھری سی

آ گئی۔ اگر یہی ہے فرمان کا گاؤں۔ اس کے گھر کی گلی۔ تو کس قدر افسوس ناک صورت حال ہے۔ ہمت کر کے تانگے سے سر اتارے۔ چھپ سے کیچڑ میں جوتا غرق ہوا۔ بیڑہ غرق۔ نیا جوتا تھا۔ بیلا کی حالت یہ تھی کہ ایک کندھے پر کپڑوں کا بیگ۔ دوسرے کندھے پر پرس لٹکا ہوا۔ مارے خوف کے قدم نہ اٹھیں۔

"بابا جی! بچوں کو تو اتار کر گھر تک پہنچا دیں۔"

اس نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ جو بابا نے بخوشی منظور کر لی۔ دونوں کو پھول کی طرح کندھے پر اٹھایا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا بڑھتا گیا اور بیلا کو قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ شلوار کے پائنچے اٹھا کر بیگ اور پرس سنبھالے وہ اسی کیچڑ میں قدم قدم آگے بڑھی۔ ہر قدم پر پھسل جانے کا ڈر۔ مگر وہاں کئی عورتیں اور بچے اسی کیچڑ میں آرام سے چل رہے تھے۔ جیسے صاف ستھرے روڈ پر ہوں۔

بابا دہلیز پر کھڑا تھا۔ وہ بھی دروازہ پکڑ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

اُف منزل پر پہنچ کر بھی تھکن نہیں اتری۔ نہ جانے گھر کے اندر کس طرح کے حالات ہوں گے۔ ڈرتے ڈرتے دستک دی تھی۔ مگر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایک وسیع صحن۔ لپا پتا۔ چکنا چپڑا سا۔ سائیڈ میں دیوار کے ساتھ بندھی بکریاں۔ بڑے سے پنجرے میں مرغیاں۔ اور کونے میں جگالی کرتی گائے۔ ایک نظر میں تو یہی کچھ نظر آیا۔ پھر اس نے قدم آگے بڑھا کر اندر جھانکا۔ ہاں۔ منزل۔

ایک کمرے سے اماں دوپٹے سے منہ پونچھتی نکلی تھیں۔ صحت مند۔ اور توانا۔ چاق و چوبند۔ اس کے ساتھ ہی سامنے کے دروازے سے ایک ہنستی کھلکھلاتی نوجوان گٹھے ہوئے جسم کی سانولی سلونی لڑکی بھاگتی ہوئی سی باہر آئی اور صحن میں ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

بیلا کی نظر اماں کی جانب اٹھی۔ ان کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹ گئی تھیں۔ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ بیلا نے سلام کے لیے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی سامنے اسی دروازے سے جہاں سے وہ لڑکی نکلی تھی۔ فرمان کو برآمد ہوتے دیکھا۔

فرمان کو بھی شاید سکتہ ہو گیا تھا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بیلا کبھی اماں کو دیکھتی کبھی فرمان کو کسی نے بھی بولنے۔ قدم بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ اعراج سراج بیلا کے آگے آ گئے تو فرمان کو ہوش آیا۔ وہ جیسے کسی طاقت کے زور پر اڑتا ہوا سا آیا۔ دونوں بچوں کو اپنے بازوؤں میں دبوچے انہیں بے ساختہ چومتا چلا گیا۔ پھر وہ انہیں گود میں اٹھائے کمرے کی طرف بڑھا۔ لحظہ بھر کے لیے اس کی نظریں لڑکی کی سمت اٹھیں لیکن اس نے صاف آواز میں کہا۔

"آؤ بیلا! کھڑی کیوں ہو؟"

اور بیلا بھی اماں سے نظر چرا کر اس کے پیچھے کمرے کے اندر داخل ہو گئی لیکن وہ دروازے پر جمی رہ گئی۔ اندر کا نظارہ۔ حیرت انگیز تھا۔ وہ جیسے کسی حجلۂ عروسی کا سماں پیش کر رہا تھا۔ دیوار پر رنگین جھنڈیاں۔ کھڑکی پر نقلی موتیوں کی لڑیاں اور جا بجا گلاب کے ہار ٹنگے ہوئے تھے۔ کمرا دلہن کی مخصوص مہک سے رچا ہوا تھا۔

"آؤ۔ کھڑی کیوں رہ گئی ہو؟" وہ بچوں کو پلنگ پر گرائے ان کو گدگدا رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہے۔ یہ سب؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"اندر آؤ تو بتاتا ہوں۔" فرمان کا مجرمانہ سا لہجہ اس کی سماعت پر کوڑے کی طرح لگا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم پہلے۔ مجھے بتاؤ کہ یہ۔ یہ؟"

اماں باہر سے اسے دھکیلتی ہوئی اندر گھسیں "یہ کیا بتلائے گا۔ مجھ سے پوچھو۔ میں بتاتی ہوں۔"

بیلا کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجی۔ فرمان۔ اماں۔ اور۔ وہ لڑکی۔

"آج دس دن ہوئے۔ میں نے اپنے بیٹے کی شادی اپنی پسند اور مرضی سے کر دی ہے۔"

گھر۔ دروازہ۔ دیواریں گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

زمین کانپی تھی۔ چھت اس کے سر پر آ گری۔ زمین قدموں تلے اکھڑنے لگی۔ اور ہر سمت اندھیرا چھا گیا۔ تو اس نے اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھایا۔ چوکھٹ تھام کر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ یہ کیا کہا تھا امّاں نے۔

"امّاں۔ امّاں! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

یہ ظالمانہ الفاظ اس کا گلا گھونٹے دے رہے تھے شادی۔ مرضی۔ پسند۔

"فرمان۔ کچھ آپ بھی تو بولیں؟" اسے لگ رہا تھا۔ فوری کوئی جواب نہ ملا تو دل بند ہو جائے گا۔ اس کے جبڑے کی رگیں کھنچنے لگیں۔ اور گردن اکڑ رہی تھی۔ حلق یکدم شدید درد سے خشک ہو گیا۔ ملت کھانسی آ گئی۔

"میری کیا خطا ہے۔ کوئی قصور۔ کوئی گستاخی؟" آنکھوں کے آگے پردے تن گئے۔ وہ کسی کا چہرا دیکھ رہی تھی نہ کسی کی حرکت۔

"میں نے پوچھا تھا تم سے کچھ؟" امّاں تیز آواز میں بولی تھیں۔ "خبر میں میرے بیٹے نے تم سے شادی کر لی۔ میں نے کچھ پوچھا تم سے؟ ماں کے بغیر بارات گئی تھی۔ تمہارے ماں باپ نے قبول کر لی۔ کسی نے کبھی نہ کہا کہ ماں کو بلاؤ۔ اب نے۔ میں تو چار سال سینے پر بھاری سِل لیے صبر سے بیٹھی رہی۔ تمہاری زندگی میں دخل نہ دیا۔ تمہارے گھر میں قدم نہ دھرے۔ تم نے تب بھی نہ پوچھا کہ آخر ماں زندہ ہے۔ تو کہاں ہے کبھی اس گھر میں آنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اب دل میں آگ لگی تو کیسے دوڑ کر آئی ہو۔ نہیں ہے تمہیں کوئی حق سوال کرنے کا۔ بہت عیش کر لیے ہیں تم نے میرے بیٹے کے ساتھ بہت دن رہ لیں۔ جاؤ بابا۔ اب ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ بہت کچھ دے دیا ہے تمہیں میرے بیٹے نے۔ اپنی قیمت تم وصول کر چکی ہو۔ دولت۔ گھر۔ عزت۔ کیا نہیں دیا اس نے تمہیں۔ اولاد بھی دے دی۔ بہت ہے تمہاری زندگی بھر کے لیے۔ اب اپنا راستہ ناپو۔"

کون تھی وہ عورت؟ کس لہجے میں بول رہی تھی کیا کہہ رہی تھی۔ وہ میٹھا لہجہ۔ وہ شیریں بیانی وہ حلاوت اور نرمی کہاں تھی۔ زبان تھی کہ انگارے۔ الفاظ تھے کہ زہر میں بجھے تیر۔ جو سیدھے دل میں پیوست ہو گئے۔ کلیجے میں آگ سی دہک رہی تھی۔ پیٹ میں لوہے کا گولہ گھوم رہا تھا۔ بھوک تھکن۔ لاچاری۔ منزل پر پہنچ جانے کی خوشی میں دور ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کیا۔

خلافِ توقع۔ جس صورت حال کا سامنا تھا۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ زور سے آنکھیں ہاتھ سے مل کر کھولیں۔ بدن تشنج کی زد میں تھا۔ دانت بھی بجنے لگے۔ سیلاب غم کے زور سے اکھڑتا ہوا وہ درخت۔ جس کی جڑیں زمین میں بہت گہری تھیں طوفان بلاخیز کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

لیکن نہیں۔ ابھی زنجیر قائم ہے۔ ابھی امید باقی ہے۔ ہمت حوصلہ۔ اور امنگیں بلند ہیں۔ ابھی پتے ہرے ہیں۔ اور شاخیں موجود۔ ہاں۔ زمین میں جڑیں گہری ہیں۔ لیکن ذلت و تحقیر ناقابل قبول ہے۔ بہت صبر تھا اس میں۔ برداشت کی طاقت بے تحمل سچ کو جھٹلانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت کچھ دیا تھا اسے فرمان نے۔ گھر۔ اشیاء۔ محبت بھروسا۔ اولاد۔ گھر اسی طرح کھڑا تھا۔ چیزیں سب موجود تھیں۔ ایک بھروسا ہی ٹوٹا تھا۔ محبت کا شیشہ چکنا چور ہوا تھا۔ پھر بھی۔ اولاد کی طاقت تو تھی۔

جسم میں جلتا ہوا لہو پھر سے شریر دوڑنے لگا۔ پھر جسم میں ناقابلِ بیان حرارت پھیلنے لگی وہ کھڑی ہو گئی۔ فرمان کونے میں سر جھکائے منہ موڑے کھڑا تھا۔ بیلا نے تیزی سے آگے بڑھ کر دونوں بچوں کو گود میں اٹھایا۔ اور مڑ کر ساس کو دیکھے بغیر جیسے اڑتی ہوئی صحن اور صحن سے دروازے تک پہنچی۔ ایک ہی راستہ تھا۔ اسی سے گزر کر آئی تھی۔ اور اسی سے واپس جانا تھا۔

نہ کیچڑ نے راستہ روکا نہ گندگی نے پھر ڈگمگائے دوپٹا لٹک رہا تھا۔ شلوار پر گندی چھینٹیں بھی پڑتی رہیں۔ پوری گلی مکمل بے خوفی سے اس طرح پار کی جیسے وہ اڑن کھٹولے پر بیٹھی ہو۔ اور گلی کے سرے پر وہ تانگہ ابھی تک اسی طرح موجود تھا۔ کوچوان سر میں کنگھا کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا

ہو گیا۔ بچوں کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر مڑ کر بیلا کو دیکھا۔

"چلیں جی؟"

بیلا نے آنکھیں بند کر لیں۔ "ہاں بابا۔ جانا تو ہے۔"

واپسی کا سفر قدرے آسانی اور تیزی سے طے ہوا۔ بابا کی زبان بھی بند تھی۔ بس کبھی کبھی وہ کوئی تان اڑاتا۔ اور پھر گھوڑے سے پیار کے لفظوں میں مخاطب ہو جاتا۔

اسٹیشن پر گاڑی ابھی موجود تھی۔ یوں لگتا تھا سب کہ جادو کے اثر سے ہو رہا ہے۔ بس گاڑی کے انجن کا رخ بدل گیا تھا۔ مغرب سے مشرق کے رخ۔ جدھر سے جاتا تھا۔ اور جدھر سے وہ آئی تھی۔ ٹکٹ کی کھڑکی پر وہ سوتے جاگتے انداز میں کھڑی تھی۔ شاید کسی نے اس کے پرس سے رقم نکال کر ٹکٹ کلکٹر کو دی تھی۔ اور ٹکٹ اس کے پرس میں ٹھونس دیے تھے۔ وہ چکرا کر گرنے لگی۔ تو کسی نے سہارا دے کر ٹرین میں سوار کیا۔

شاید اسی بڑھتے بالوں کو جوان نے۔ یا کسی فرشتے نے۔ وہ ایک حیران کن طلسم کے اثر میں تھی۔ حواس اب کچھ گم ہونے لگے تھے۔ بہادری کا مظاہرہ خاصا مہنگا پڑا تھا۔ عشق عنصر زیادہ تھا۔ تن میں بھوک۔ من میں پیاس۔ اور آنکھوں میں سیلاب امڈ پڑنے کو بے چین اور جیسے کسی فرشتے نے ہی اس کے منہ سے کوئی گلاس لگا دیا تھا۔ ٹھنڈا میٹھا دودھ۔ آب حیات کی مانند رگوں میں دوڑتا چلا گیا۔ آنکھیں کھلتی گئیں۔ حواس واپس آتے گئے۔

آج کئی برس گزرنے پر بھی بیلا اس وقت کو یاد کر کے اداس ہو جاتی ہے۔ آج سب کچھ حاصل ہے اسے۔ دولت۔ محبت۔ اولاد۔ دو بیٹے۔ ایک پیاری بیٹی۔ زمان آج بھی اس کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ اس کی پہلی اور آخری محبت ہے۔

اور اس دن۔ جب بیلا اپنے خیال میں اپنا سب کچھ ہار کر واپس جا رہی تھی۔ زمان۔ ماں کے سحر سے آزاد ہو گیا۔ اسے بیلا کے وجود نے سہارا دیا۔ طاقت دی۔ اسے وہ محبت یاد آئی۔ بیلا کی لذتیں۔ اس کی معصومیت۔ اندھا اعتماد۔ اور زمان پر اٹوٹ بھروسا۔ اگر ماں ضدی ہو تو بیٹا بھی کم ضدی نہیں۔ ذرا سی بات کا اماں نے پہاڑ بنا لیا۔ اس پہاڑ کو سر کرنا ناممکن نہ تھا۔ مشکل تھا۔

اس دن تو بیلا کو ہر جگہ جادو کے کرشمے نظر آ رہے تھے۔ جب اسے اپنے ساتھ بالکل جڑ کر بیٹھا زمان نظر آیا تھا۔ وہ اسے اپنا وہم۔ اپنا خیال سمجھی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ تو اول وقت سے اس کے ساتھ تھا۔ اسی تانگے کی اگلی سیٹ پر اپنے بچوں کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اور ساتھ ہی اسٹیشن پہنچا تھا۔ اسی نے بیلا کے پرس سے رقم نکال کر ٹکٹ لیے تھے۔ کیونکہ وہ تو خالی ہاتھ تھا۔ جو رقم لایا تھا وہ کھانا پینا کر برابر کر دی تھی۔ ماں کی کمائی کو وہ اپنے لیے ناجائز سمجھتا تھا۔ اس لیے گاؤں آ کر اپنی کمائی سے دکان پر جا کر کھاتا تھا۔

شادی۔ یہ مذاق نہیں تو اور کیا تھا۔ مگر اماں اس مذاق پر مصر تھیں۔ ماں کے حقوق۔ ماں کے ارمان۔ ماں کے پرورش کرنے کا صلہ۔ ایک شادی۔ ماں کی پسند۔ ماں کی خوشی کے لیے۔

اور وہ جنت کے احترام میں ماں کی ضد پر دیدہ جوا کھیل گیا۔ اگر بیلا بھی ضدی۔ ہٹ دھرم ہوتی تو آج وہ قسمت کو کوستا ہوا اسی ماں کی پسند کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔

یہ تو بعد میں بیلا کو اس نے بتایا تھا کہ شہر آ کر رہنے کی شرط اماں نے بھی رکھی تھی کہ اگر اسے شہری بہو پسند نہ آئی تو اسے ماں کی پسند پر گاؤں میں شادی کرنی پڑے گی۔ اور وہ قسموں۔ التجاؤں۔ خوشامد۔ دھمکیوں کے زور پر آخر کامیاب ہو گئیں۔

اس دن ٹرین میں اسے ساتھ بیٹھے دیکھ کر بیلا نے بے ساختہ کہا تھا۔

"تم۔ تم کیوں آ گئے ہو؟"

"نوکری نہ کروں؟ بھوکا مروں؟" اس نے چڑ کر جواب دیا تھا۔ اس نے کسی طرح بھی بیلا کی محبت یا اس کی قربانیوں کا یا اس سے اپنی بے پایاں محبت کو واپسی کا جواز بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اور اسی لیے بیلا چڑ گئی تھی۔

"نئی دلہن کو چھوڑ کر آ گئے۔ کتنی بری بات ہے۔"

اور وہ اس کے لیے افسردہ ہو گئی تھی۔ اس کا کیا قصور تھا بھلا۔

مگر فرمان نے تو شادی کی ہی اس شرط پر تھی کہ وہ شہر اپنے گھر رہے گا۔ اور اماں کے پاس ان کی پسند کردہ بہو۔ شاید بیلا، فرمان کو واپس بھیج ہی دیتی۔ اپنی جیسی ایک بے خطا لڑکی کے لیے اس کی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی تعبیر کی خاطر۔ مگر۔ امراج۔ سراج اور آئندہ آنے والی روح کو۔ ایک مضبوط سا نگہبان کون فراہم کرتا۔ بیلا کو۔ بچوں کو۔ فرمان کے سوا اور کچھ درکار نہ تھا۔ اسے اپنی سوکن پر ترس آ رہا تھا۔ اسے کیا ملا۔ ایک عدد ساس۔ صرف ساس۔ پیرانی حضرت بیگم۔

بیلا کبھی اپنی ساس پیرانی حضرت بیگم کو باور نہ کرا سکی کہ اسے اپنی سوکن سے کوئی نفرت ہے نہ اس پر غصہ۔ بلکہ صرف ہمدردی ہے۔ کہ وہ بھی ایک عورت ہے۔ مگر پیرانی حضرت بیگم اب عورت نہیں رہی تھیں کہ ان معصوم کومل جذبوں کا ادراک کر سکتیں۔ جو ایک عورت۔ بیوی۔ محبوبہ۔ کے سینے میں طوفان کی طرح امڈتے ہیں۔ لہر دل کی طرح رقص کرتے ہیں۔

وہ واقعی عورت نہیں۔ صرف پیرانی حضرت بیگم رہ گئی تھیں۔

شمائلہ نے سن کر کہا۔

"اب تمہاری ساس کو جانشین بھی مل گئی۔ تم تو ان کی توقعات پر پوری نہیں اتر سکی تھیں۔"

اس کے میکے میں کسی نے بھی فرمان سے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ یہ کافی تھا۔

اور اب۔ کئی سال پہلے۔ پیرانی بیگم کے انتقال کی خبر آتے ہی وہ کس قدر مضطرب ہوئی تھی۔ ٹیکسی کر کے وہ دونوں گاؤں پہنچے تھے۔ جہاں پیرانی کے آخری دیدار کے لیے ان کا جنازہ کھلے صحن میں رکھا تھا۔ راستے میں اس نے بڑے درد سے فرمان کو مخاطب کیا۔

"فرمان۔ اب تو اماں بھی نہیں رہیں۔ پلیز تم اس لڑکی کو تنہا نہ چھوڑ دینا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ اپنے گھر پر۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ میں۔ اس کے ساتھ۔ بہنوں کی طرح رہ لوں گی۔"

فرمان کو بیلا سے یہی توقع تھی۔ وہ فرمان کے ہر مسئلے کو حل کرنے اور اس کے جذبات کو سلجھانے کے لیے ہمہ تن حاضر رہتی۔ بیلا کو اس لڑکی اپنی سوکن پر بڑا ترس آیا۔ دوڑ دوڑ کر لوگوں کو پانی پلاتی ہوئی۔ مرغیوں کو دانا دیتی۔ بکریوں اور گائے کا دودھ نکالتی ہوئی۔ وہ کس قدر فرض دار لگ رہی تھی۔ اماں کے سوئم والے دن۔ دعا وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ واپسی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اور اپنی سوکن سے روانگی کی تیاری کا کہنے کے لیے اماں کے کمرے میں گئی۔ تو اس نے دیکھا۔

کمرا عورتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی سوکن بڑے اعتماد سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے گلے میں مختلف منکوں والی رنگ برنگی مالائیں تھیں۔ ہاتھ میں ہزار دانے والی تسبیح۔ پھر ایک عورت نے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ دوسری نے تقلید کی۔ پھر تیسری عورت آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر منکوں کی مالاؤں کو چوما۔ پھر مالاؤں والی لڑکی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پھر سب عورتیں اس نوجوان سنجیدگی سے کھڑی سانولی لڑکی کے ہاتھ چومنے کو ایک دوسرے سے سبقت لینے میں گتھم گتھا ہونے لگیں۔

"پیرانی چھوٹی بی بی۔" کسی نے بہ آوازِ بلند اعلان کیا۔

ایک لمبا سانس لے کر بیلا وہاں سے پلٹ آئی اماں کی جانشین۔

اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ ان منکوں کی مالاؤں کو شمائلہ آپا کے گلے میں ڈال کر کہے۔ پیرانی حضرت شمائلہ بیگم۔ اور تصور میں ہزار دانے کی تسبیح گھماتی شمائلہ آپا کا روپ۔ خاصا دلچسپ ہوتا۔

ثنا سخت غصے میں تھی۔ وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ اپنی چیزیں، اپنے کپڑے چن چن کر بیڈ پر کھلے ہوئے سوٹ کیس میں ڈال رہی تھی۔

آج وہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ وہ وقت آگیا تھا جب اسے اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے فیصلہ کرنا تھا۔ وہ اب ایک پل بھی شہباز جیسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔

کبھی وہ دن بھی تھے جب وہ اپنی آنے والی زندگی کا ہر پل، ہر لمحہ شہباز کی بانہوں میں گزارنے کی تمنائی تھی مگر اب نہیں۔ چاند صرف دور سے ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ چاندنی ہمیشہ ہی ٹھنڈک نہیں دیتی بھی کبھی جلانے بھی لگتی ہے اور پیار کی وہ چاندنی ثنا کے لیے جھلستی ہوئی دھوپ بن گئی تھی۔

اس کے اور شہباز کے درمیان یہ کشیدگی کوئی آج یا کل کی بات نہیں تھی۔ بحث و تکرار، بک بک تو چلتی ہی رہتی تھی نہ کبھی شہباز جھکنے پر تیار ہوتا تھا نہ وہ۔ شہباز کو زعم رہتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ ثنا کو صنف نازک ہونے کا مان تھا۔ دونوں ہی اپنی جگہ ڈٹے رہتے تھے۔ بحث و تکرار بڑھ جاتی تو جھگڑے کی نوبت آجاتی تھی۔ مگر پھر بالآخر صورت حال ٹھیک بھی ہو جاتی۔ دونوں اپنی منوانے یا دوسرے کی ماننے بغیر ہی معمولات زندگی میں لگ جاتے تھے مگر آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ آج شہباز نے اس پر ہاتھ تک اٹھا دیا تھا۔ اس کے نازک سے رخساروں کو طمانچوں سے سرخ کر ڈالا تھا۔ خیر بخشا تو اسے ثنا نے بھی نہیں تھا مگر شہباز مرد تھا تو توانا تھا اس لیے غالب رہا۔ تند خو اور تیز مزاج تو وہ شروع سے ہی تھا۔ بس شادی کا ایک مہینہ ہی سہانے خواب کی طرح گزارا تھا۔ وہ ہنی مون انجوائے کر کے آئے تھے پھر زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی تو شہباز کی شخصیت کھل کر سامنے آگئی۔ شہباز بے حد جذباتی، پرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد غصیلا بھی تھا۔

اس کی محبت ایک تند طوفان کی طرح تھی تو اس کی نفرت، بے رخی اور بے گانگی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس کی محبت نے دیکھتے ہی دیکھتے ثنا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ابھی ان کے درمیان چوتھی ہی ملاقات تھی کہ شہباز نے اسے شادی کی پیشکش کر ڈالی۔

ثنا تو دل سے یہی چاہتی تھی کہ اس بندے کو ہمیشہ کے لیے قابو کر لے مگر اسے خوشگوار حیرت بھی ہوئی تھی۔ ان کے حلقے میں شہباز کے بارے میں یہی مشہور تھا کہ وہ ذمہ داریوں سے دور بھاگنے والا ہے۔ صنف نازک کو لفٹ تو کراتا ہے مگر شادی کی زنجیر پیر میں ڈالنے پر رضامند نہیں ہوگا۔ نہ جانے کس آئیڈیل کی تلاش میں بھٹک رہا ہے جو گھر بسانے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ ایسے میں شہباز نے اسے پروپوز کیا تو ثنا کی حیرت بجا تھی۔ اس نے جھٹ سے ہامی بھر ڈالی اور یوں اس کے اور شہباز کے بارے میں پھیلنے والی افواہیں دم توڑ گئیں۔ یہ اندازہ تو ثنا شادی سے پہلے ہی لگا چکی تھی کہ شہباز قدرے ضدی اور سخت ہے۔ تب اس کا یہ روکھا پن ثنا کو بہت اچھا لگا تھا۔ شاید اسے ایسے ہی کسی شخص کی تلاش تھی۔ لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرنے اور ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنے والے مرد اسے سخت ناپسند تھے۔ شہباز کی

شخصیت میں بھرپور مردانگی تھی۔ وہ روٹھتا یا ناراض ہوتا تو اسے منانا ثنا کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اپنی راہ میں دیدہ ودل فرش راہ کیے ہوئے بہت دیکھ لیے تھے۔
شہباز اس کی نسوانی انا کے لیے ایک چیلنج تھا۔ سو وہ جب اس کی پروا نہیں کرتا اس کی بات ایک دم رد کر کے اپنی منواتا تو ثنا بجائے خفا ہونے کے اور بھی اس کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔ شہباز غالب ہونا جانتا تھا اور شادی سے پہلے تک تو ثنا کو بھی مغلوب رہنے میں لطف آتا تھا مگر شادی کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی تھی۔ منظرنامہ بدل رہا تھا۔ اب وہ عاشق اور محبوب نہیں بلکہ شوہر اور بیوی تھے۔ تمام عمر وہ آقا اور غلام کا کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ آخر ثنا بھی ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی باشعور اور آزاد خیال۔ اس کی اپنی ایک شخصیت تھی اور وہ تمام عمر شہباز کو اپنی شخصیت کی نفی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

شادی کا ڈنر شہباز کے پسندیدہ ہوٹل میں ہوا۔ لباس عروسی شہباز نے منتخب کیا۔ ہنی مون کے مقامات بھی سراسر اسی کی چوائس پر تھے۔ ثنا ہر بات پر ہامی بھرتی گئی لیکن آخر کب تک۔ وہ کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتی۔ اپنی رائے دیتی احتجاج کرتی تو شہباز کو شکوہ ہونے لگتا تھا کہ وہ زبان چلاتی ہے۔ مگر شہباز کے یہ شکوے باقاعدہ الزامات میں تبدیل ہو گئے اور ثنا کی زبان بھی کھل گئی۔ اب وہ خم ٹھونک کر شہباز کے مقابلے میں آ گئی تھی۔ اب وہ ہر بات میں اپنی مرضی چلاتی تھی۔ شہباز کی طرح اپنی رائے ٹھونسنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ شہباز اسے ایک سناتا تو وہ دو سنا ڈالتی۔ شہباز چیختا تو وہ اس سے بھی زیادہ قوت سے چلاتی تھی۔ پھر گھر میدان کارزار بن جاتا۔ جیسے کہ آج صبح ہی صبح بنا تھا۔ شہباز خوب شور مچا رہا تھا کہ ثنا اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی۔ اس کا خیال نہیں رکھتی جبکہ ثنا کا کہنا یہی تھا کہ گھر کے کام کرنا ملازماؤں کا کام ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ نگرانی کرے اور وہ یہ کام ٹھیک ٹھاک طریقے سے کر رہی تھی۔ گھر میں خوش سلیقگی تھی۔ ہر کام اپنے وقت پر صحیح طریقے سے ہو رہا تھا پھر شہباز خوامخواہ چھوٹے موٹے بہانوں کی آڑ میں اس سے کیوں جھگڑنے پر تلا رہتا ہے۔

”میرا دماغ خراب ہے اس لیے۔“ شہباز اپنے سوٹ کی میچنگ شرٹ نہ ملنے پر تلملایا ہوا تھا جو کہ ثنا کے خیال میں لانڈری میں کہیں ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ ایک شرٹ نہ ملنے سے کوئی قیامت تو نہیں آ گئی تھی۔ وارڈ روب میں سینکڑوں شرٹیں ٹنگی تھیں وہ کوئی بھی پہن سکتا تھا۔ اب اس قدر ویل ڈریسڈ کوئی نہ ہو کہ ذرا سی بات کو انا کا مسئلہ بنا ڈالا تھا۔ اب وہ کوئی متوسط طبقے کی عام سی عورت تو نہیں تھی جو بیٹھ کر اپنے شوہر کے کپڑے اپنے ہاتھ سے استری کرتی اور ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکتی۔ دفتر سے واپسی پر اس کے جوتے اور موزے اتارتی۔ اونہہ احمقانہ خواب۔ شہباز اگر اسے ایک ایسی سعادت مند خادمہ دیکھنا چاہتا تھا یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

”اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔“ ثنا بھلا جواب دینے سے کیوں چوکتی۔

”میرا دماغ خراب تھا اسی لیے تو میں نے تم جیسی جھگڑالو اور بد سلیقہ عورت سے شادی کی۔“ شہباز غصے میں ایسی ہی دل جلانے والی باتوں پر اتر آتا تھا۔ ثنا کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس میں ایسی جاہلانہ عادتیں کہاں سے آئی ہیں۔

”کیوں میں نے تمہیں اس کے لیے مجبور کیا تھا؟ پروپوزل تم نے ہی دیا تھا میں نے تم پر کوئی جادو تو نہیں کیا تھا۔“ وہ تلملا اٹھی۔ شہباز جب اپنے شادی کے فیصلے کو اپنی حماقت گردانتا تو اس کے دل کو سخت چوٹ پہنچتی تھی وہ بری طرح ہتک محسوس کرنے لگتی تھی خاص طور پر اس وقت جب شہباز اس کا موازنہ اپنی سابقہ محبوبہ سے کرنے لگتا تھا۔ اڑتی اڑتی خبر تو شادی سے پہلے ثنا نے بھی سنی تھی کہ شہباز محبت میں ناکامی کی وجہ سے اتنا تنہائی پسند ہو گیا ہے اس کے اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ ابھی تک اپنے

دل میں اس لڑکی کا عشق بسائے ہوئے ہے جو کسی اور کا گھر بسا چکی تھی۔ بہرحال شادی سے پہلے اس موضوع پر شہباز سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی اس کے لیے یہی بہت تھا کہ شہباز اب اسے چاہنے لگا ہے مگر شادی کے بعد جب درمیان میں کوئی تکلف کوئی پردہ نہیں رہا شہباز نے پوری سچائی سے اس بات کا اعتراف کرلیا کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں ہے وہ کسی سے عشق کرتا تھا مگر اب وہ ایک پرانی بات ہوگئی ہے اب اس کی تمام تر محبت ثنا کے لیے ہے۔

اس لمحے ثنا کا جی بھی چاہا تھا کہ وہ بھی اسے اس حقیقت سے آگاہ کرڈالے کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد نہیں ہے وہ کسی اور کے پیار میں مبتلا رہ چکی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ اسے مستقبل کے خوبصورت پیار بھرے خواب دکھا کر اپنا وقت خوب خوشگوار گزار کر وحید ایک دن اسے اطلاع دیے بغیر خاموشی سے اعلا تعلیم کے لیے لندن فلائی کرگیا۔ ثنا اس کی راہ دیکھتی رہ گئی پھر زندگی میں کئی موڑ آئے اور بالآخر اس سے شہباز آ ٹکرایا اور اسے لگا جیسے اس کی تلاش اب ختم ہوگئی ہے۔ نقش ثانی کے رنگ اتنے گہرے تھے کہ نقش اول مدھم پڑ گیا اور وہ وحید کو بھول گئی۔ بھول جانے کے علاوہ اور کرتی بھی کیا وہ بیسویں صدی کی ایک حقیقت پسند لڑکی تھی اٹھارویں صدی کی کوئی ایسی جذباتی سی سادہ تری نہیں جو جانے والے کے غم میں خون تھوک تھوک کر سل کا شکار ہو کر مر جائے۔

زندگی بہت خوبصورت تھی اور اس میں لطف اندوز ہونے کے لیے بہت کچھ تھا۔

مگر یہ صرف اس کا خیال تھا شادی کے بعد معلوم ہوا کہ زندگی خاص کر ازدواجی زندگی تو ایک نہایت ناخوشگوار امر ہے۔ جب فریقین کے مزاج میں اتنا تضاد اور اختلاف ہوجائے۔ کتنی ہی بار ان کی شخصیتوں کا ٹکراؤ ہوتا تھا تو جو جیتتا وہی سکندر ہوتا اور ہارنے والا نئے سرے سے اپنی توانائیاں مجتمع کرنے میں لگ جاتا تاکہ آئندہ لڑنے تک تازہ دم ہوسکے۔

ثنا کی کمزوری اگر تھی تو وہ شہباز کے منہ سے اس کی پچھلی محبت کا ذکر تھا اس کے زخموں پر جیسے کوئی نمک چھڑک ڈالتا تھا اب تو شہباز نے بھی یہ کمزوری بھانپ لی تھی وہ خوب ناک کرنشانے لگاتا اور ثنا تلملا تلملا جاتی مگر تب بھی کبھی اس کے منہ سے وحید کے بارے میں نہیں نکلا تھا وہ یہ سنگین غلطی نہیں کرسکتی تھی اس کی ماں نے سختی سے اسے منع کیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس بارے میں شہباز کے سامنے منہ سے بھاپ نہ نکالے چاہے وہ پیار و محبت سے یہ راز جاننا چاہے لاڑ سے یا غصے سے۔ مرد اتنا اعلا ظرف کبھی نہیں ہوتا جتنا ایسے موقع پر خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے شہباز نے اگر اس کی یہ غلطی پکڑ ڈالی تو وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا اس کی محبت پر کبھی اعتبار نہیں کرے گا۔

جب کہ دوسری طرف ثنا شہباز کے منہ سے اس کی داستان محبت سننے کے بعد بھی اسے معاف کرنے اور اس کی محبت پر اعتبار کرنے پر مجبور تھی۔

"جادو ہی تو کیا تھا اس وقت کیا کمال کی اداکاری کرتی تھیں کہ ایسی بھولی بھالی سیدھی سادی بن کر میرے سامنے آئی تھیں کہ میں سمجھتا تھا کہ تم سے زیادہ محبت کرنے والی اور پرخلوص ہستی اور کوئی ہے ہی نہیں۔"

"اور تم نے بھی تو خول چڑھایا ہوا تھا ایک مہذب پڑھے لکھے براڈ مائنڈڈ شخص کا۔ کہاں گئیں تمہاری وہ خوبیاں۔" ثنا نے تمسخر اڑایا۔

"تمہاری خامیوں نے انہیں ختم کرڈالا۔" شہباز نے ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

وہ اسی اطمینان سے طنز کے نشتر چلایا کرتا تھا اور ثنا بلبلا اٹھتی تھی۔

"مجھ میں اتنی خامیاں دکھائی دیتی ہیں تو تمہیں روکا کس نے ہے اسے لے آؤ وہ جو تمہاری من چاہی محبوبہ ہے چندے آفتاب چندے ماہتاب سگھڑ، تمہارے ناز اٹھانے والی۔۔۔ تمہیں بگاڑنے والی۔"

شہباز کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئے۔
"اسے کیوں ہر بار بیچ میں گھسیٹ لاتی ہو۔"
"اس لیے کہ وہ ہمارے بیچ سے نکلی ہی کب ہے وہ شروع دن سے ہی تمہارے دل میں ہے اسی کی وجہ سے میں تمہیں بری لگتی ہوں اسی کی وجہ سے تم مجھ سے لڑتے ہو، جھگڑتے ہو اس چڑیل نے اب بھی تمہارے دماغ پر قبضہ کیا ہوا ہے۔"
شہباز غصے سے سرخ ہو گیا۔ "فضول کی بکواس مت کیا کرو میرے اور تمہارے جھگڑے میں کسی اور کا کیا دخل ہے خواہ مخواہ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے غصہ دلانے کی کوشش مت کیا کرو۔"
"ضرور کروں گی میں کوئی تمہارے غصے سے ڈرتی ہوں غصہ تو مجھے بھی آسکتا ہے پھر مت کہتے پھرنا کہ میں تمہاری عزت نہیں کرتی اور یہ ذکر تمہیں اتنا پریشان کیوں کر ڈالتا ہے۔ تمہارے دل میں کوئی چور ہے جبھی تو، آخر تمہارا اس سے کیا تعلق ہے جو تم اس کے خلاف کچھ سن بھی نہیں سکتے۔"
"میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے اگر چور ہوتا تو میں تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتاتا اور شاید یہی میری غلطی تھی میں تمہیں کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ وہ میرا ماضی ہے اور میں اب ماضی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔"
"اور تم تو بہت عذاب میں ہو ناں میری وجہ سے، اونہہ اتنی ہی محبت کرنے والی تھی اتنی ہی باوفا تھی تو چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔" ثنا نے جل کر کہا۔ "اگر اس نے بھی تم سے بیاہ کر لیا ہوتا تو آج اپنی قسمت کو رو رہی ہوتی، عقل مند تھی اس لیے جان چھڑا کر بھاگ گئی ایک میں ہی بے وقوف تھی جو تمہاری محبت کے جال میں پھنس گئی۔"
شہباز نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخ ڈالا۔
"تو تمہارے خیال میں، میں نے تمہیں اپنی محبت کے جال میں پھانسا تھا میں تم سے مخلص نہیں۔۔۔ تمہیں فریب دیتا رہا ہوں۔"
"ہاں ہاں تم نے دیا تھا فریب، میں نے دھوکا کھایا ہے اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوتی تو کیا تم ہر بات میں یوں مجھ پر دھونس جماتے مجھ پر حکم چلاتے، میں تمہاری بیوی ہوں کوئی باندی تو نہیں۔"
"میں بھی تمہارا شوہر ہوں کوئی تمہارا غلام یا سڑکوں پر رلنے پھرنے والا بھکاری تو نہیں جو تم میری کوئی عزت ہی نہیں کرتیں۔"
"کب میں نے تمہاری بے عزتی کی؟" ثنا چلائی۔
"ہر وقت، ہر لمحہ، ہر گھڑی۔۔۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"
"اور میں بھی برداشت نہیں کر سکتی تمہاری یہ بدتمیزی اور اس لب و لہجے میں مجھ سے بات کرنا۔" ثنا تن کر کھڑی ہو گئی۔
"میں کسی گرے پڑے خاندان کی نہیں ہوں جو تم سے دب کر رہوں گی۔ تمہیں میرے وجود کو تسلیم کرنا ہو گا۔"
"اچھا وہ کس طرح سے؟ تمہاری جی حضوری کر کے، تمہاری ہر الٹی سیدھی بات پر سر جھکا کر اور تمہاری ہر بکواس خاموشی سے برداشت کر کے۔" شہباز طنزیہ ہنس پڑا۔
"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو۔ کس بات پر ناز ہے، میرے گھر میں میری بیوی بن کر رہنا ہے تو اپنی حد میں رہو ورنہ میں یہ اکڑ اور غرور ختم کرنا خوب جانتا ہوں۔"
بات بڑھتی چلی گئی آخر شہباز نے اس پر ہاتھ اٹھا لیا۔ ثنا کا دماغ غم و غصے سے ماؤف ہو گیا وہ بھی بے اختیار شہباز پر پل پڑی تھی اس نے شہباز کا گریبان نوچ کھسوٹ ڈالا اس کے چہرے پر اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے خراشیں ڈال دیں پھر شہباز کے دو چار بھاری تھپڑوں نے اسے شکست خوردہ ہو کر بیڈ پر گرنے پر مجبور کر ڈالا۔ شہباز اسی طرح چہرے کی خراشوں سے رستے خون کے ساتھ باہر چلا گیا۔
"لوگوں کو معلوم تو ہونا چاہیے کہ میری اتنی ویل

مینرڈ' ایجوکیٹڈ اور مجھ جیسی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ کس حد تک سلوک کر سکتی ہے اور ہم کس قدر قابل رشک زندگی گزار رہے ہیں۔" وہ کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہہ کر گیا تھا۔

نہ جانے ملازموں نے اسے اس حلیے میں دیکھ کر کیا سوچا باہر اس کا کس کس سے سامنا ہوا۔ ثنا یہ نہیں جانتی تھی وہ تو بیڈ پر کتنی ہی دیر بڑی غم و غصے کے انتقامی جذبات سے مغلوب جلتی کڑھتی رہی اسے شہباز سے نفرت ہو رہی تھی وہ اس جیسے وحشی مرد کے ساتھ اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی تھی آخر اس نے ہمیشہ کے لیے شہباز کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت تو وہ یقیناً" اپنا چہرہ دکھا دکھا کر مظلوم بن کر سب سے ہمدردیاں سمیٹ رہا ہو گا مگر وہ اسے یوں اپنی کردار کشی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شہباز پر کیس کر ڈالے گی قانونی جنگ لڑے گی۔ آج کے مہذب معاشرے میں کوئی مرد یوں بلاوجہ اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا وہ اس کے مہذب پن کا پردہ دنیا کے سامنے چاک کر کے سب کو دکھائے گی کہ وہ اندر سے کس قدر جاہل ہے۔

شہباز تو خود بھی قانون کے پیشے سے وابستہ تھا۔ یقیناً" وہ بھی اپنے داؤ پیچ آزمائے گا مگر ثنا نے عزم کر لیا تھا کہ وہ اسے ناکوں چنے چبوا کر ہی دم لے گی۔ شہباز کو خوب اندازہ ہو جائے گا کہ ایک عورت کی انا کو زخمی کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ اسے بے دردی سے پیٹ کر کتنے آرام سے چلتا بنا تھا۔ یہ وہی تو تھی جس سے شادی سے پہلے وہ اتنی محبت جتایا کرتا تھا اس کی ممی نے اس رشتے میں کچھ پس و پیش کی تو وہ کتنی بے تابی سے دن رات ان کے گھر کے چکر کاٹا کرتا تھا آخر اس کی ممی کو ہاں کہتے ہی بنی اب اگر ممی یہ جان لیں کہ ان کی نازوں میں پلی بیٹی اس بدسلوکی کا شکار ہے تو وہ تو شہباز کو کبھی معاف نہ کریں۔

وہ غصے میں بڑبڑاتی کھولتی ہوئی اپنی چیزیں لا کر پلنگ پر ڈھیر کرتی رہی سارے قیمتی زیورات کپڑے وغیرہ بمشکل دو سوٹ کیسوں میں پورے آئے پھر وہ حلق کے بل چلاتے ہوئے ملازم کو آوازیں دینے لگی اس کے تیور دیکھ کر وہ لرزتا کانپتا آ پہنچا صبح سے ہی ملازموں میں سراسیمگی دوڑی ہوئی تھی' بند دروازے کے پیچھے سے ساری آوازیں باہر تک پہنچ رہی تھیں یہ ڈراما تو تقریباً" روزانہ ہی اسٹیج ہوتا تھا مگر آج لڑائی بھڑائی کے ساتھ مار کٹائی کے سین بھی تھے جو کہ کم از کم نئی بات تھی صاحب کو غصے سے پاؤں پٹختے جنگلی سے حلیے میں زخمی چہرے کے ساتھ باہر جاتے بھی دیکھا تھا اور سبھی منہ میں انگلی دبا کر رہ گئے۔

"امام بخش جاؤ جا کر میرے لیے ٹیکسی لے کر آؤ ابھی اسی وقت" ثنا نے حکم سنایا۔

امام بخش نے کمرے کی ابتر حالت کو دیکھا پھر سوٹ کیسوں پر استعجاب بھری نگاہ ڈالی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی مالکن خونخوار شیرنی بنی ہوئی تھی وہ خاموشی سے ثنا نے اچکا کر پلٹ گیا۔

ثنا غصے کے عالم میں۔ ادھر ادھر ٹہلنے لگی نفرت سے شہباز کی ذاتی استعمال کی چیزوں کو دیکھا بے وجہ اس کے سلیپروں کو ایک ٹھوکر رسید کی اور دانت پیستے ہوئے سوچتی رہی۔

اونہہ کیسے کنگلے سے شادی کر بیٹھی تھی اور اتراتا اس قدر تھا جیسے کہیں کا شہزادہ ہو ایک ہی گاڑی تھی گھر میں جس پر یہ اپنے زخمی چہرے کا اشتہار چھپوانے نکل گیا تھا گھٹیا ذہن کے شخص کی گھٹیا حرکتیں جب تک تشہیر نہ کرے گا تسکین کیسے ملے گی۔ اذیت پسند نفسیاتی مریض کہیں کا۔

وہ پلٹی تو دروازے پر شہباز کو کھڑے پایا اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ثنا کے بندھے ہوئے سامان پر ڈالی اور کہا "ٹیکسی منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں گاڑی کھڑی ہے چلی جاؤ۔"

ثنا سرتاپا سلگ ہی تو اٹھی یعنی کہ اس پر بالکل اثر نہیں ہوا یہ دیکھ کر بھی کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔

"میں تمہارا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔" اس نے اطلاع دینی مناسب سمجھی شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ

یونہی کچھ دنوں کے لیے امی ای کے پاس جا رہی ہے اس لیے مزید بولی "ہمیشہ کے لیے"۔

"یہ تم نے ایک بہتر فیصلہ کیا..... بلکہ بہترین فیصلہ" شہباز کے تاثرات میں سر مو فرق نہیں آیا اس نے اپنے چہرے پر کوئی میڈیسن لگائی ہوئی تھی ایک آنکھ کے نیچے سوجن تھی شاید زخم کچھ گہرا لگ گیا تھا۔

"ظاہر ہے تم تو یہی چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح مجھ سے جان چھوٹ جائے۔" ثنا طنز سے باز نہ رہ سکی۔

"کریکٹ" شہباز کا یہ مختصر جواب ثنا کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ کس قدر سفاک اور بے حس مرد تھا وہ ذرا بھی تو اپنے کیے پر پشیمان نہیں تھا حتیٰ کہ رسماً بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی وہ اتنی بے وقعت تو نہیں تھی کہ اس کے جانے سے شہباز کی زندگی میں کوئی فرق ہی نہیں پڑے وہ کبھی اس کی کمی محسوس نہ کرے۔

آثار تو یہی کہہ رہے تھے کہ وہ اس کی کمی کبھی محسوس نہیں کرے گا بلکہ شاید وہ منتظر کھڑا تھا کہ وہ اس کے گھر سے جلد از جلد دفعان ہو اور وہ اپنے بیڈ پر آرام کر سکے۔ ثنا کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے مگر اپنی انا اور خودداری اسے بہر حال عزیز تھی اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔

"اور شہباز تم یہ مت سمجھنا کہ میں اتنی آسانی سے تمہیں معاف کر دوں گی۔ جو سلوک تم میرے ساتھ کرتے رہے اس کا تمہیں جواب دینا پڑے گا میں تم پر کیس کر دوں گی۔ تمہیں عدالت میں لا کھڑا کروں گی۔"

شہباز چونک پڑا "ایک وکیل کے لئے عدالت میں کھڑا ہونا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن تم یہ سب کیوں کرنا چاہتی ہو تمہیں طلاق چاہیے وہ تمہیں عدالت میں جائے بغیر مل جائے گی جب بھی تم کہو۔"

ثنا کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے یوں کھڑے کھڑے کر ڈالے گا اسے چکر سا آتا محسوس ہوا اپنی کمزوری اور جذباتیت پر خود کو سرزنش کرتی ہوئی وہ سوٹ کیس اٹھانے جھکی۔

"امام بخش کو آواز دے دو۔" شہباز نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں۔" ثنا نے منہ پھیر کر کہتے ہوئے دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے۔

جب سارے رشتے توڑنے پر تلا تھا تو یہ تکلف کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی اور کیا امام بخش کو وہ خود آواز نہیں دے سکتا تھا۔

اس نے ابھی بوجھ سنبھالا بھی نہ تھا کہ چکرا کر وہیں بیڈ پر گر پڑی زمین و آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے تیز تیز گھومنے لگے اسے ایسا لگا جیسے ابھی اس کی انتڑیاں الٹ کر باہر آ جائیں گی۔

نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں اسے یاد آیا کہ آج صبح اس نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا لڑائی جھگڑے میں ناشتے کا ہوش کہاں رہا تھا پھر سارا وقت اعصابی جنگ لڑتی رہی تھی ایک کمزور سا انسانی ذہن تو تھا۔ کہاں تک بوجھ برداشت کرتا۔

اس نے شہباز کو اپنی طرف لپکتے دیکھا پھر کچھ دیر کے لیے اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش لوٹا تو اس نے دیکھا وہ تکیے کے سہارے نیم دراز تھی اور سامنے ملازمہ گلوکوز کا بھرا ہوا گلاس لیے کھڑی تھی۔ شہباز بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پہ کوئی نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثنا کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"ڈاکٹر ماہرہ سے کانٹیکٹ نہیں ہو رہا اور تم کسی اور کے پاس جانا پسند نہیں کرتیں میرے خیال میں ہم لوگ خود ہی ہسپتال چلے چلتے ہیں۔"

"نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" ثنا اٹھ بیٹھی مگر وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ٹھیک نہیں ہے اس پر نقاہت اور کمزوری کا غلبہ تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" شہباز کا لہجہ حتمی تھا۔ "اپنا چہرہ دیکھو کس طرح پیلا پڑ رہا ہے سارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ممی یہ سمجھیں کہ میں تمہاری صحت کا خیال نہیں رکھتا باقی جو کچھ بھی ہمارے درمیان ہے وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔"

ثنا کو کسی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہ جلد از جلد اس گھر سے جا کر یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کرنا

چاہتی تھی ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ تھا کہ اس نے خود پر مسلط کردہ شے قبول کی ہو پھر ایک زبردستی کی زندگی کیوں گزارتی عمر کے یہ طویل سال محض کسی سمجھوتے کے تحت کیونکر کاٹتی وہ فیصلہ جلد کرنے کی عادی تھی اور فیصلہ وہ کر چکی تھی جس پر شہباز کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا اب شاید وہ اچھے دوستوں کی طرح اس سے علیحدہ ہونا چاہتا تھا۔

بادل نخواستہ اسے شہباز کے ساتھ چیک اپ کے لیے جانا ہی پڑا۔

ڈاکٹر ماہرہ نے چیک اپ کے بعد بڑی گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے اسے خوشخبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ثنا جہاں کی تہاں رہ گئی اس کے لیے یہ کوئی نوید مسرت نہیں تھی جب وہ شہباز سے یہ ناتا توڑ کر جانا چاہ رہی تھی تو اس کی یہ نشانی اپنے ساتھ کیوں کرلے جاتی۔

قسمت کی اس ستم ظریفی پر وہ حیران پریشان ہو گئی تھی وہ تو ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی۔ شہباز کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو ایک ناخوشگوار خواب کی طرح اپنی زندگی سے نوچ پھینکنا چاہتی تھی مگر اس ننھے سے وجود کو کہاں جا پھینکتی۔ شہباز سے شادی کرنا اس کی زندگی کا ایک غلط فیصلہ تھا شاید یہ بات وہ تسلیم کر چکی تھی مگر یہ بچہ تو قسمت کا فیصلہ تھا۔

"کیا بات ہے ثنا تم خوش نہیں ہوئیں۔" ڈاکٹر ماہرہ کے لیے اس کا ردعمل خلاف توقع تھا۔

"دراصل یہ اتنا اچانک ہے۔" ثنا زبردستی ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لے آئی۔

"تمہاری شادی کو تو چھ مہینے ہو رہے ہیں اور لوگ تو پہلے مہینے ہی ہمارے پاس چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔" ڈاکٹر ماہرہ ہنس پڑیں۔ "شروع شروع میں لڑکیاں یونہی گھبراتی ہیں ماں بننا اتنا آسان تو نہیں ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں میں جو ہوں تمہاری دیکھ بھال کے لیے تمہیں آرام کرنا چاہیے اور کوئی ٹینشن نہیں رکھنی۔ میں تمہارے لیے ڈائٹ چارٹ بنا دوں گی سختی سے اس پر عمل کرنا ہوگا۔۔۔۔ اور خبردار جو ڈائٹنگ کی۔" انہوں نے اس کے کندھے کو تھپکا۔

"اب میں ذرا تمہارے ہسبینڈ کو جا کر یہ خوشخبری سنا دوں۔"

شہباز کا کیا ردعمل ہوا یہ ثنا نہیں جانتی تھی وہ خاموشی سے جا کر کار میں بیٹھ گئی کچھ دیر بعد شہباز بھی آگیا۔ وہ بھی چپ چپ تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا شہباز نے خاموشی سے کار اسٹارٹ کرلی۔ وہ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

ثنا نے دزدیدہ نظروں سے شہباز کو دیکھا گہرے مہندی گرین کلر کے شلوار قمیص میں وہ اپنے ہمیشہ کے ویل ڈریسڈ سراپے سے بے حد مختلف لگ رہا تھا بال بھی بکھرے ہوئے تھے جب کہ اس کی شرٹ کو نوچ کھسوٹ کر ثنا نے اس کے سوٹ کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا۔ پھر شہباز کو سامنے جو بھی شلوار سوٹ دکھائی دیا اسے ہی تبدیل کر کے چلا گیا تھا۔ چہرے پر وہی بے نیازی تھی جو کبھی ثنا کو بہت اچھی لگتی تھی مگر اب شادی کے

بعد زہر سے بھی بدتر لگنے لگی تھی وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچنے لگی کہ جو فیصلہ وہ کر چکی ہے اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں اور شاید تب بھی گنجائش نہیں ہوتی جب شہباز اسے روکنے کے لیے اس کی منت کرتا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا مگر اس جیسا بے حس انسان ایسا کرتا ہی کیوں۔ اس نے تو اپنے باپ بننے کی خبر بھی کتنے آرام سے سن لی تھی جیسے یہ کوئی انوکھی خبر ہی نہ ہو۔ جیسے باپ بننا کوئی خوشی کی یا فخر کی بات ہی نہیں ہو جس شخص کو اپنی بیوی کی پروا نہیں تھی بیوی سے محبت نہیں تھی اسے اپنے ہونے والے بچے سے کیا محبت ہوگی۔ شاید شہباز کو اس خبر میں کوئی چارم ہی دکھائی نہ دیا ہو جبھی تو وہ اتنا شانت تھا اس نے ایک بار بھی جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ وہ اور نہیں تو اپنے بچے کی پیدائش تک رک جائے اپنے فیصلے پر نظرثانی نہ کرے مگر اسے کچھ عرصے کے لیے ملتوی تو کر ڈالے۔

وہ ہونٹ چباتے ہوئے شہباز کی بے حسی پر کڑھ رہی تھی اپنی ماں کا مزاج وہ اچھی طرح جانتی تھی انہوں نے اسے یہی مشورہ دینا تھا کہ وہ شہباز کے ساتھ ساتھ اس کے بچے سے بھی چھٹکارا حاصل کرلے مگر ثنا ایسا نہیں کرسکتی تھی اپنے وجود میں اپنے خون سے اپنی تخلیق کو سینچنا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ وہ کتنی ہی دور اندیشی سے یہ فیصلہ کریں وہ اس پر رضامند نہیں۔ وہ اپنے بچے کو ممی اور شہباز کی سپورٹ کے بغیر بھی پال سکتی تھی اتنا تو اسے یقین تھا کہ ممی اسے سپورٹ ضرور کریں گی آخر وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔

رہا شہباز تو بہت سے بچے بغیر باپ کے بھی تو ہوتے ہیں وہ بھی اپنے بچے کو بن باپ کا سمجھ کر پال لے گی اسے زندگی کی تمام خوشیاں دے گی اور کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔

کیا واقعی بن باپ کے بچوں کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہوسکتی؟ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا کیا دنیا بھر کی محبت باپ کی شفقت کی تلافی کرسکتی ہے؟

شاید نہیں اس نے پوری سچائی سے اعتراف کرتے ہوئے اپنے اندر جھانکا اس کے ماں باپ میں بھی تو علیحدگی ہو چکی تھی وہ بھی بن باپ کے پلی بڑھی تھی اور کہیں روح میں ایسا خلا رہ گیا تھا جو آج تک پر نہیں ہوتا تھا۔ شوہر سے برتاؤ کا نہ اسے اندازہ تھا نہ مشاہدہ' ماں آزادی نسواں کی حامی تھی باپ نے اسے آزاد کردیا اور خود جانے کن فضاؤں میں پرواز کرگیا۔

شاید اسی لیے وہ شہباز کو وہ کچھ نہ دے سکی جو شہباز چاہتا تھا۔ عزت محبت توجہ خدمت اور جانے کیا کچھ وہ شہباز سے برابری کا سلوک کرنا چاہتی تھی اور شہباز کی مردانہ انا یہ بات برداشت نہیں کرپائی تھی۔

اس کا ہونے والا بچہ بھی شاید قدم قدم پر باپ کی شفقت اس کے مضبوط سینے کی گرمی اور اس کے تحفظ کا طلبگار رہے گا اور اگر بیٹی ہوئی تو وہ بھی اسی کا شکار رہے گی پھر اس کی آئندہ زندگی پتہ نہیں کیسی ہو۔ تاریخ آج اپنے آپ کو دہرانے چلی تھی کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ جانے کیوں دھک سے رہ گئی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے شہباز نے چپکے سے ایک نگاہ اس پر ڈالی وہ جو آج اس کی بیوی تھی مگر کل تک شاید نہ ہو اب جب وہ ایک فیصلہ کر ہی چکی تھی تو شہباز کی انا اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اس فیصلے کے آڑے آئے وہ خود بھی انسانی حقوق کے کاز کا پرجوش حمایتی تھا کسی کو اپنی خواہشوں کے خلاف زبردستی کیوں مجبور کرتا۔

ثنا کو اس سے شکایت تھی کہ وہ ضدی ہے تند خو ہے ہمیشہ اپنی بات منواتا ہے تو وہ تو ہمیشہ سے ہی اسی طبیعت کا تھا اب اگر ثنا نے شادی سے پہلے اپنی آنکھوں پر محبت کی پٹی باندھ رکھی تھی تو اب وہی پٹی اتر کیوں گئی۔

اس کا مطلب تو یہی تھا کہ ثنا کو اب اس سے محبت نہیں رہی اور اگر ایسا تھا تو وہ بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا کہ زبردستی اسے اپنی زندگی میں شامل رکھتا اور محبت کی بھیک مانگتا یہ بات اس کے وقار کے خلاف تھی اور

اپنی خودداری بہر حال اسے سب سے زیادہ عزیز تھی ثنا کو اس سے محبت نہیں تھی تو ظاہر ہے وہ اس کے بچے سے بھی بے زار ہوگی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بچے کو ماں کی بے زاری اور نفرت کا شکار نہیں ہونے دے گا وہ اپنا بچہ اس سے لے لے گا ثنا اس امانت کی امین تھی اور کچھ نہیں۔ اور اگر اس نے بچہ دینے سے انکار کیا تو وہ عدالت کے ذریعے اسے حاصل کر لے گا وہ اس میدان کا ایسا منجھا ہوا کھلاڑی تھا کہ یہ عمل تو اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

پھر وہ اپنے بچے کی پرورش خود کرے گا اس کے لیے گورنس رکھے گا اسے ایک بھرپور اور مکمل شخصیت بنائے گا۔

مگر کیا ایک گورنس اسے ماں کا پیار دے سکے گی؟ کیا بغیر ماں کے بچہ ایک بھرپور اور مکمل شخصیت بن سکے گا؟ شاید اس کے ضمیر نے یہ سوال کیا تھا۔

شہباز چونک سا پڑا اسے اپنی گورنس یاد آگئی جو اس کے ماں باپ کی عدم موجودگی میں اس کے گال چانٹوں سے سرخ کر ڈالتی مگر ان دونوں کے سامنے کلیجے سے لگائے پھرتی تھی جوں جوں وہ بڑھتا گیا گورنس کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔

"او شہباز بابا یو آر رئیلی اے نائی بوائے" اس کے منہ پر یہی بات رہتی تھی اور پھر اس نائی بوائے کو گورنس کی شکایت پر ماں سے سخت سست بھی سننی پڑتی تھی۔

شہباز کی امی ایک سوشل خاتون تھیں اس کے والد کا حلقہ احباب وسیع تھا کسی کو اتنی فرصت ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ بچوں پر توجہ دے سکے آخر اتنی مہنگی تنخواہ پر گورنس کس لیے رکھی گئی تھی۔

شہباز بے حد حساس بچہ تھا ماں کی توجہ سے محرومی نے اس کے اندر ایک ایسی تشنگی پیدا کر ڈالی جو کبھی ختم نہ ہوئی۔

وہ بھرپور محبت بھرپور توجہ کا طالب رہتا تھا اور ثنا اس کی یہ خواہش پوری نہ کرسکی تھی ماں کی محبت سے محروم پرورش پانے والے بچے شاید اسی کی طرح غصیلے اور تلخ ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے اسے عورت جیسی نرم و نازک اور حساس شے سے برتاؤ کرنا نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر ماہرہ نے اسے سرزنش کی تھی کہ غالباً" وہ اپنی بیوی کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھتا اسی لیے وہ اتنی ویک ہو رہی ہے۔

"اسے تمہاری توجہ اور محبت کی ضرورت ہے خاص طور پر ان دنوں تو بہت زیادہ۔" ڈاکٹر ماہرہ نے یہ بات زور دے کر کہی تھی۔

ادھر وہ تو ہمیشہ اسی پر شکوہ کناں رہا تھا کہ ثنا اس پر توجہ نہیں دیتی اس کا خیال نہیں رکھتی۔ کیا میرا بچہ بھی ماں کے سائے سے دور پل بڑھ کر میری طرح جذباتی محرومیوں کا شکار بن جائے گا۔ اس سوچ نے اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار کر ڈالے۔ پاؤں بے اختیار بریک پر دب گیا کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ثنا اپنے خیالوں سے چونک اٹھی۔

"کیا گھر آگیا؟"

شہباز نے شرمندہ ہو کر دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کری۔

"کہاں اترو گی اپنی ممی کے گھر؟" اس نے پوچھا اس کا خیال تھا کہ ثنا کا جواب اثبات میں ہوگا مگر ثنا نے جواب دیا۔

"نہیں۔"

شہباز کو خیال آیا کہ وہ اپنے دونوں سوٹ کیس وہیں گھر پر چھوڑ آئی تھی۔ عقل مند تھی اس لیے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہ رہی تھی۔

"سامان اٹھانا ہے؟" وہ جانے کیوں تڑپ اٹھا۔

"نہیں" ثنا کا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

"سامان کھولنا ہے۔"

شہباز نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ثنا نے سر جھکا لیا۔ ایک نئے رشتے کی ڈور نے انہیں پھر سے باندھ لیا تھا اور اب اس قید سے رہائی کوئی آسان نہیں تھی۔

مکمل ناول

عظمیٰ نازی

بارش اچانک ہی شروع ہو گئی۔ موسم کی بے اعتباری تو یوں بھی اس علاقے کی روایت ٹھہری تھی اور اس موسلا دھار بارش میں بھی کسی نے ان کا گیٹ دھڑا دھڑ بجا دیا تھا گویا اہلِ خانہ استقبال میں تاخیر نہ کر دیں۔

"اس وقت کون آ گیا؟" اس نے جھنجلا کر سوچا۔ قہوہ تقریباً تیار ہی تھا اور وہ تقاضا بھی جن پر جم کر آئے ابا سے آج اپنا موقف واضح کرنا تھا کہ اماں بچوں سمیت اپنے بھائی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ واپسی ابھی تک نہیں ہو پائی تھی۔

چولہا بند کر کے اس نے ابا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ عشا کی نماز پڑھ رہے تھے۔ چھتری لے کر گیٹ کھولنے جاتے ہوئے وہ برآمدے میں ہی رُک گئی۔

آنے والا گیٹ کی سلاخوں سے ہاتھ اندر ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ بالآخر کامیاب ہو ہی گیا اور لمحوں میں ہی شرابور وجود لیے دوڑتا ہوا برآمدے کی حدود میں آن ٹھہرا۔ وہ ڈر سی گئی۔

"یہ عظیم صاحب کا گھر ہے ناں؟" نو وارد نے بونقوں کی طرح خود کو گھورتی ہوئی لڑکی سے پوچھا۔ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ میں گھنٹہ بھر سے دروازہ بجا رہا ہوں اور آپ یہاں برآمدے میں چھتری تانے کھڑی ہیں۔" بھیگے ہوئے لباس اور نچڑتے ہوئے بالوں کے ساتھ مضحکہ خیز سا حلیہ لیے وہ اس پر یوں گرم ہو رہا تھا جیسے اسے بھگونے میں تمام تر سازش اسی کا ہو۔

"میرے آنے تک آپ گیٹ کھول چکے تھے۔"

"خوش قسمتی ہوئی ناں آپ کی۔"

"آپ کی تعریف؟" اس کے لہجے پر کچھ الجھ کر بغور دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ صورت کچھ شناسا سی لگ رہی تھی۔

"مسافر ہوں۔" ہاتھ میں تھاما ہوا بریف کیس زمین پر رکھتے ہوئے وہ مکمل بے نیازی سے بولا۔ تو اس نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے لگی۔

"یادداشت خاصی کمزور ہے آپ کی۔ عظیم انکل سے کہیے مزمل احسان آیا ہے۔" پشت سے آواز آئی۔

نام جانا پہچانا تھا اور اب شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ انیلا پھوپھو کے سسرالی اسی انداز کی خصوصیات کے حامل تھے۔ جن کا مظاہرہ وہ کر رہا تھا۔

"ابا نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیے۔" ڈرائنگ روم کی لائٹ جلا کر اس نے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ اس ذرہ نوازی کا۔" رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ یوں ہنس دیا جیسے جتانا چاہ رہا ہو کہ جب اندر آ ہی گیا ہوں تو بیٹھ بھی جاؤں گا۔ اور وہ برا مان گئی۔ اس کے رویے کا عجیب و غریب تاثر ابھرا تھا طویل عرصے کے بعد دیکھا تھا اسے۔ گر اس دوران پھوپھو کے ہاں جانا ہوا بھی تو وہ ملک سے باہر تھا۔ پہچاننے میں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

ابا کو بتا کر وہ کچن میں چلی آئی۔ آتش دان میں رزز جلا کر وہ غالباً اس کے لیے اپنا سوٹ لے کر گئے تھے پھر وہ کچن کے دروازے تک آ گئے۔

"کہہ رہا ہے کھانا کھا کر آیا ہے۔ ایسا کرو قہوہ ہی لے آؤ۔"

نئے سرے سے کچھ بنانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ سو وہ چند لمحوں میں ہی لوازمات سمیت ٹرے اٹھائے اندر موجود تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ خاصے معقول حلیے میں نظر آ رہا تھا۔ اور شکل و صورت میں بھی اپنے چھوٹے بھائی حمزہ سے مشابہ تھا۔

"ہاں! مگر ایک فرق نمایاں ہے۔ مزاج کا۔ اس کے انداز میں سختی سرے سے نہیں ہے۔" اندر آتے ہوئے جو اچٹتی ہوئی نظر اس پر غیر ارادی طور پر اٹھی تھی۔ تجزیے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔

"تم نے پہچانا نہیں، یہ مزمل ہے۔ احسان بھائی کا بیٹا۔ بچپن سے چھوٹا والا۔" ابا تعارفی مرحلہ طے کرنے لگے۔

"اور مزمل یہ حرا ہے میری سب سے بڑی بیٹی۔"

"جی میں نے پہچان لیا تھا انہیں۔" ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر وہ دوبارہ ابا سے محو گفتگو ہو گیا۔

"تم کہیں باہر کے ملک گئے ہوئے تھے۔ دل نہیں لگا جو اچانک چلے آئے یا واپس جانا ہے۔" ابا پوچھنے لگے۔

"جی ہاں انکل، کچھ ایسی ہی بات تھی۔ گیا تو میں تعلیم حاصل کرنے تھا۔ پھر جاب بھی شروع کر دی۔ مگر مطمئن نہیں ہو سکا۔" اس نے ڈرائی فروٹ کی ڈش سے خشک میوہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنوں سے دور رہ کر آپ آسائشیں تو حاصل کر لیتے ہیں مگر ذہنی سکون نہیں ملتا۔"

قہوے کی پیالی اس کے آگے سرکاتے ہوئے حرا نے دل میں اس کے خیال کی تائید کی۔ اور پھر جب وہ ابا سے کسی کالونی کا راستہ پوچھنے لگا جہاں اسے کسی شخص سے ملنے جانا تھا۔ تو اس کا دل چاہا وہ پھوپھو، ثمن، نعمان اور باقی سب کے بارے میں پوچھے۔ مگر اس کے رویے سے ہمت ہی نہیں ہوئی۔

"انیلا بھی نے آپ کے لیے چاول کی ریوڑیاں بھجوائی ہیں۔ غالباً بہت پسند ہیں آپ کو۔" ابا اٹھ کر چند لمحوں کے لیے باہر گئے تو اس نے ٹیبل پر رکھے

چھوٹے سے پیکٹ کی طرف اشارا کیا۔
"کیسی ہیں پھپھو؟" بہانا ناما تھ آ ہی گیا تو وہ بھی جرأت کر بیٹھی۔
"یاد ہیں آپ کو وہ؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا غالباً پہلی بار کھل کر ہنسا۔
"کیوں؟"
"میں جب یہاں آ رہا تھا تو انہوں نے آپ کے لیے بہت سی دعائیں دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ گزشتہ دو برسوں سے آپ کی صورت نہیں دیکھی۔ کوئی رابطہ ہی نہیں ہے۔"
"اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں انہیں بھول چکی ہوں!"
"ہاں! مگر سوچنے کی بات ہے۔ اتنے قریبی رشتوں کو یاد کرنے کے لیے اس قدر لاپروائی۔" وہ تھرموس سے قہوہ انڈیلتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو اس قہوے کی لذت بھی برسوں یاد رہے گی۔" سبز الائچی اور لیمن گراس کی مہک نے مسحور کن تاثر فضا میں پھیلا دیا تھا۔
"انہیں کیا خبر میں نے خود کو کتنا مصروف کر لیا ہے۔" اس کی بات پر غور کیے بغیر وہ سوچتی ہوئی باہر چلی آئی۔
بارش کچھ ہلکی ہوئی تو وہ چل دیا۔ ابا اُسے ڈراپ کرنے گئے تھے۔ غالباً اُسی شخص کے ہاں جس کے بارے میں وہ ابا سے پوچھ رہا تھا۔ اُس کے رخصت ہونے کا پتا نہ چل سکا کہ وہ عشاء کی نماز پڑھنے جا چکی تھی۔ اُسے افسوس تھا تو اس بات کا کہ مدت بعد اپنے سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ہاتھ آیا جو ضائع ہو گیا۔
ابھی برتن سمیٹ رہی تھی کہ اماں، ندا، سلمیٰ اور منور بھی واپس آ گئے۔ حسب معمول ان کا بھتیجا سرفراز انہیں چھوڑنے آیا تھا۔ کچھ روز سے اس کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔
"کس خوش نصیب کی آتی خدمت ہو رہی تھی؟ کبھی ہمیں بھی پوچھ لیا کرو۔" اُسے ٹرے اُٹھاتے دیکھ کر وہ گہری نگاہ سے دیکھتا ہوا برآمدے میں جم گیا۔ جہاں سے کچن پر نظر رکھنا بھی آسان تھا۔
اُس نے بے زاری سے تھرموس میں جھانکا۔ بچا ہوا قہوہ پیالی میں ڈال کر سلمیٰ کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اور اوپر چلی آئی۔ کسی کو سر پر مسلط نہ کرنے کا آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ اُسے ہر ممکن حد تک نظر انداز کیا جائے مگر اس شخص پہ تو کوئی بات اثر انداز ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چند ماہ قبل اپنی بیوی کو میکے بٹھا کر بغیر کسی معقول جواز کے طلاق دے چکا تھا۔ بچہ بھی چھین لیا تھا اور اب اس کی خوشی منانے کا خیال آ گیا تھا۔
"پھپھو! صاحبزادی کا مزاج تو دن بدن اکڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔"
"کیوں نہ ہو۔ آخر باپ کی شہ پر ہے سب کچھ۔" حسب معمول سرفراز کا تبصرہ اور اماں کی بڑبڑاہٹ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کانوں تک رسائی حاصل کر ہی گئی۔
بڑی روایتی سی جنگ جاری تھی اس گھر کی فضا میں رشتوں کی بناوٹ کے لحاظ سے۔ اماں اور اس کے درمیان سوتیلے پن کا احساس گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھتا گیا۔ حالانکہ وہ اُس کے ہوش سنبھالنے سے قبل اس گھر میں موجود تھیں، پھر بھی اُسے ان کے طریقوں سے اختلاف رہتا اور انہیں اس کے رویے سے شکایت اور پھر بھی ہزار کوفت کے باوجود وہ بہت حوصلے سے اماں کے ناقابلِ برداشت رشتے داروں کو برداشت کر لیا کرتی تھی۔
"تم کیوں نہیں آئیں پارٹی میں؟" اُسے سونے کی جلدی نہیں تھی مگر پھر بھی بستر سنبھال لیا تھا۔ ندا اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ دونوں اسی کمرے میں سویا کرتی تھیں۔
"میں نے بتایا تو تھا کہ آج پیپر نہ ہونے کی وجہ سے اسکول میں ہی دیر ہو جائے گی۔"
"ہاں مگر ماموں، امی تو نہیں جانتے تھے۔ ان کا تو یہی خیال ہے کہ تمہیں ان کے ہاں جانا اچھا نہیں لگتا۔ سرفراز بھائی نے بھی بُرا مانا۔ آخر ان کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔"
"کسی کی سوچ پر پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی!"
"پھر بھی جن لوگوں کے ساتھ عمر گزارنی ہو ان کا کچھ خیال تو کرنا چاہیے!"
اس نے چونک کر ندا کی طرف دیکھا۔ مگر وہ واش روم میں چلی گئی۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اس کی باتیں بھی بے سروپا اور اماں کے خیالات

کی حکائیں ہوا کرتی تھیں۔ جنہیں وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتی تھی۔

"کوئی مہمان آیا تھا ہمارے جانے کے بعد؟"

"ہاں!" اس نے بتا دیا۔ "پھپھو نے ریوڑیاں بھجوائی ہیں۔"

"تمہارے لیے ہی بھجوائی ہوں گی۔" وہ طعن تا نتے ہوئے طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنا پھپھو اس سے بہت لگاؤ رکھتی تھیں مگر پھر بھی ندا کی سوچ پر اسے اکثر افسوس ہی کا سامنا رہتا تھا۔

جب ندا کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے اور نچلے پورشن سے بھی کھٹر پٹر کی آوازیں آنا بند ہو گئیں اور اسے یقین ہو گیا کہ اماں اور سلمیٰ سو گئی ہوں گی تو وہ دبے پاؤں پیچھے چلی آئی۔ ابا جاگ رہے تھے اور منور سو چکا تھا۔ کسی گہری سوچ میں گم ہونے کی وجہ سے انہیں اس کی آمد کا احساس تک نہ ہو سکا۔ کورٹ کچہری کے چکروں میں الجھا ہوا ذہن پر سکون کیسے ہو سکتا ہے۔ سو وہ بھی ان کی تھکن اور سوچوں سے مکمل طور پر آگاہ تھی۔ ابا کی زندگی میں الجھنوں کی کمی نہیں تھی کہ گزشتہ ماہ ہی انہیں علم ہوا کہ ان کی زمین کے کچھ حصے پر چند بااثر افراد نے ناجائز قبضہ کر لیا ہے اور اس جگہ پر کنسٹرکشن کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب مقدمہ چل رہا تھا۔

"ابا! میں نے ذکر کیا تھا ٹریننگ کورس کا۔ وہ جلد شروع ہونے والا ہے، مجھے راولپنڈی جانا ہوگا۔" وہ بیڈ کے کنارے ٹکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

"اتنی دور؟ ایسی کیا مجبوری ہے؟" وہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔

"ضرورت مند ہی تو مجبور ہوتا ہے۔" اس نے سوچا۔ اور پھر ایک نظر کھڑکی سے باہر برستی بارش پہ ڈالی۔ "آپ تو جانتے ہیں ٹریننگ کے بغیر ترقی کے مواقعے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گی تو کوئی اور میری جگہ سنبھال لے گا۔" اس نے وضاحت کی اور ابا کی خاموشی میں تفکر کے سائے جھلکنے لگے۔

"تمہاری ماں کیا سوچے گی۔ پہلے ہی اس کا خیال ہے کہ میں تمہاری بے جا حمایت کرتا ہوں۔" ان کے اکتائے ہوئے لہجے پر وہ مایوسی سے دیکھنے لگی۔

"میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہونے کا سوچ رہا ہوں۔ مقدمے نے ایسا الجھایا ہے کہ اس سلسلے میں تم سے بات ہی نہیں کر سکا۔"

"ابھی تو مجھے جانا ہے، دو تین مہینے لگ جائیں گے۔" اس نے جلدی سے بات کاٹی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے تم واپس آجاؤ معاملات پھر طے کر لیں گے۔ میں سرفراز کے والدین سے کچھ وقت لے لیتا ہوں۔" وہ مطمئن انداز میں کہہ رہے تھے اور وہ بری طرح چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ کیا کہہ رہے تھے وہ۔ سرفراز کا اس قصے میں کیا ذکر؟

"اپنے پھر اپنے ہی ہوتے ہیں بیٹا! وہ بھی اپنے بچے کی طرف سے فکر مند ہے۔ تمہاری توجہ اور پیار اگر اسے مل جائے تو کیا برا ہے۔ اور پھر تم سے زیادہ کون جان سکتا ہے بن ماں کے بچے کی ضروریات اور جذبات کو۔"

گھبراہٹ، بے چینی اور غصے کی کیفیات ایکدم اس پر طاری ہونے لگیں۔ ابا کے منہ میں اماں کی زبان بولنے لگی تھی۔ جن کی تمام تر ہمدردیاں اپنے بھتیجے کے ساتھ تھیں۔ اس کے لیے تو ان کے پاس کبھی تسلی کے دو بول بھی نہیں رہے تھے۔ جنہیں اب استعمال میں لا کر وہ شادی شدہ ایک بچے کے باپ کے حق میں اسے آمادہ کر سکتیں۔ مگر ان کے پاس ایک سے ایک اعلیٰ ہتھیار موجود تھا۔ ابا پر بیٹے جا رعب بٹھد سن مانی اور اس کے علاوہ اس کی بہت سی کمزوریوں سے بھی واقف تھیں۔ فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔

"اچھے لوگ ہیں، مالدار بھی۔ جو آسائشیں میں تمہیں نہیں دے سکا، وہاں با آسانی میسر ہیں۔ اس نوکری کے جھنجھٹ سے بھی نجات مل جائے گی۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "بہت خوش رہو گی تم وہاں۔"

"ابا پلیز!" شدت جذبات سے اس کی آواز کانپنے لگی۔ "میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں، کسی چیز کی خواہش نہیں رہی۔ اور نہ ہی مجھے ان کاموں میں ابھی الجھنا ہے۔" اس کے حلق میں پھندا سا لگنے لگا۔ تو وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شاید تم نہیں جانتیں، میں اس کا احسان مند ہوں ہماری زمین کے مقدمے میں اٹھنے والے تمام تر اخراجات وہی برداشت کر رہا ہے۔ میرے لیے اسے انکار کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔" ابا کی شکستہ، تھکی ہوئی سی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"بے چارے ابا! نجانے کب تک اماں کی احمقانہ حرکتوں کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے رہیں گے۔" اور اب یہ سرفراز، وہ اوپر جانے کے بجائے سیڑھیوں سے ملحق اسٹور نما کمرے میں چلی آئی۔ جہاں بچھی ہوئی اکلوتی چارپائی پر غالباً فالتو بستر پڑے ہوتے تھے۔ اندھیرے میں صحیح اندازہ نہیں ہو سکا، دروازے کے پاس رکھی بدرنگ سی کرسی پر بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔

"ابا کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ میرے لیے کیسا ماحول خوشی کا باعث بن سکتا ہے۔ سرفراز کو اس کی طرح دار بیوی سرفراز نہیں کر سکی تو میں کس شمار میں ہوں۔

اور اس شوقین مزاج بندے کی بھلا مجھ سے کیا مطابقت؟ مگر یہ بات ابا کو کیسے سمجھائی جائے اور اگر مجھے اس بیمار ذہن اور بوسیدہ خیالات کے حامل شخص کے عقل کی ڈینٹ ہی بننا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی اس قدر مجھے پڑھانے کی۔ جہاں ذہنی سطح معیار کے پیمانے تیار کرنے لگے۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے سوں سوں کرتے ناک رگڑتے ہوئے اس نے سوچوں کی یلغار سے بوجھل، جھکے سر کو اٹھایا۔ برآمدے میں جلنے والے زیرو واٹ بلب کی نیلی روشنی کے اس پار صحن میں برستی بوندوں اور اس کی آنکھوں سے بہنے والی برسات میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ گھر میں پھیلا سناٹا اس بات کا گواہ تھا۔ ابا کے کمرے کی روشنی بھی گل ہو چکی تھی۔ گویا وہ اپنی بات کہہ کر سو چکے تھے۔

"محترمہ! بارش کا شور کافی نہیں تھا، جو آپ نے بھی سریلے راگ الاپنے شروع کر دیے۔" سناٹے میں بہت قریب سے کوئی بولا تھا۔ وہ بوکھلا کر بے ساختہ مڑی تھی۔ چارپائی پر پڑے جس ڈھیر کو وہ اندھیرے میں فالتو بستر سمجھی تھی، اس پر موجود مزمل احسان نے لحاف چہرے سے ہٹا کر اسے پل بھر کے لیے دیکھا۔

اور پھر لحاف تان لیا تھا۔ وہ حیران پریشان آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

"جائیے، جا کر سو جائیں! یوں آدھی رات کو آنسو بہانا مسائل کا حل نہیں، دماغ خراب کرنے کے مترادف ہے۔" لحاف کے اندر سے آواز ابھری۔ شرمندگی اور تاسف سے اس کا ڈوب مرنے کو دل چاہا۔

"لعنت ہے میری بے دھیانی پر، جو یہاں آ بیٹھی۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور لمحوں میں اپنے بستر پر جا پہنچی۔ اسے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ابا کے ہمراہ ہی واپس آ گیا ہو گا۔ اور اسے سلایا بھی اس کمرے میں ہو گا۔ بے کار چیزوں کے درمیان۔

"کیا ضرورت تھی بھلا مجھے یوں احمقوں کی طرح رونے کی اور کیا سوچ رہا ہو گا وہ۔" خفت سے سوچتے سوچتے نجانے کب اسے نیند آ گئی۔

رات بھر ہونے والی بارش سے بہہ کر آنے والی مٹی نے گزارہ لائق سڑک کو بھی اپنی تہہ تلے چھپا لیا تھا۔ سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے گرم شال اور سویٹر کا استعمال بھی ناکافی معلوم ہو رہا تھا۔ ہر طرف موسم بدل چکا ہے اور ایک یہ علاقہ ہے۔ بارہ مہینے سردی ہی ختم نہیں ہوتی۔"

بے خیالی میں کیچڑ میں جا گھسنے والے جوتے کو سڑک کے کنارے اگی گیلی گھاس پر صاف کرتے ہوئے اس نے خاصی جھنجھلاہٹ سے سوچا۔

بیگ میں موجود ٹشو پیپرز کا سارا اسٹاک استعمال میں لانے کے باوجود اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ جوتے کی وہ شکل کہاں نکلتی، جو گھر سے چلتے وقت تھی۔

"یہ لیجیے! شاید کام چل جائے۔" ایک صاف ستھرا رومال اس کی طرف بڑھایا گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، وہی سنجیدہ سا چہرہ اور جھکی آنکھیں، اس کے جوتے پر مرکوز کیے وہ اس کے پاس کھڑا تھا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" وہ فوراً سیدھی کھڑی ہو کر سامنے دیکھنے لگی۔ اسکول وین ابھی تک نہیں آئی تھی اور اس کی موجودگی میں کھڑے ہونا اس کے لیے دشوار ترین مرحلہ بن رہا تھا۔

"اس کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایکچولی آپ

جیسے لوگوں کے لیے۔"
اُس نے بے اختیار اس کی طرف چہرا گھما کر دیکھا۔ اپنی بات کے ردِ عمل کا بخوبی اندازہ تھا اُسے، شاید اسی لیے اب لاتعلقی سے ٹہلتا ہوا سڑک کے کنارے اُگے درختوں کے پاس جا رہا تھا۔ حرا کو یقین تھا وہ ایسا محض اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے کر رہا ہے۔

"مجھے جی پی او تک جانا ہے۔ یہاں سے کوچ مل جائے گی؟" پھر اُس نے پوچھا۔

"مین روڈ تک چلے جائیے، ہر قسم کی سواری مل جائے گی۔"

"بہت بہتر۔ اوہ۔ یاد آیا۔" وہ چلتے چلتے دوبارہ پلٹ آیا۔ "ثمن نے خط دیا تھا، خصوصی تاکید کے ساتھ کہ آپ کے ہاتھ میں ہی دیا جائے۔" جیکٹ کی جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "رات بارش کے شور میں بالکل بھول ہی گیا۔ بائی دا وے! آپ سائنس ٹیچر ہیں ناں؟"

لفافہ تھامتے ہوئے اُس نے بدقت تمام سر ہلایا۔

"ذرا بتائیے تو کیسے آپ کے ہاں بارشیں اتنی زیادہ کیوں ہوتی ہیں؟"

لفافے پر لکھے نام کے آس پاس پھیلی ہوئی سیاہی کو دیکھتے ہوئے حرا کا دل زور سے دھڑکا، عام سی بات تھی مگر لہجے کی شوخی نے بہت بامعنی بنا دیا تھا۔ رات کے قصے کو تازہ کرتے ہوئے وہ جی بھر کر محظوظ ہونا چاہ رہا تھا۔ یا پھر اسی بہانے گزشتہ رویے کی تلافی کرنا چاہ رہا تھا۔ بہرحال دونوں ہی باتیں اس کے لیے غیر اہم تھیں۔

"آپ اس شہر کے مزاج سے واقف ہی کب ہیں۔ یہاں اسی طرح بارشیں ہوا کرتی ہیں۔"

غنیمت تھا کہ وین آپہنچی ورنہ شاید جھنجلاہٹ اور بیزاری کے بڑھتے ہوئے امکان کے تحت وہ پیدل ہی چل پڑتی۔

"یہاں عجیب لوگوں کی کمی نہیں تھی" جواب یہ بھی چلا آیا۔ اپنا شولڈر بیگ سنبھالتے ہوئے وہ وین میں جا بیٹھی۔ اسکول پہنچ کر پہلی فرصت میں۔۔۔ اس نے ثمن کا خط پڑھا۔ وہی شکوے شکایتیں، بے مروتی اور کبھی یاد نہ کرنے کا گلہ وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں ملاقات کی خواہش کہ وہ خود میڈیکل فائنل ایر کے ہاتھوں تنگ آئی ہوئی تھی ورنہ اُڑ کر چلی آتی۔ لہٰذا اُسے ہی ہمت کرنا چاہیے ورنہ۔ اس کے بعد دھمکیوں کا نقطۂ آغاز تھا، اس نے خط تہ کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ملاقات ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ مگر پھر بھی خاصی تاخیر سے ہوا کرتی تھی۔

چپڑاسی نے بتایا کہ پرنسپل بُلا رہی ہیں۔ وہ اُسے کورس اٹینڈ کرنے کے بارے میں رضامند کرنے کے علاوہ تفصیلات سے بھی آگاہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

"دو روز تک تو لیکچرز اسٹارٹ ہو جائیں گے۔ بہتر ہے کہ تم کل پرسوں تک روانہ ہو جاؤ۔ ہاسٹل میں روم کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" انہوں نے کہا۔ "کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے تم کس سوچ میں ہو؟"

"ہاں، فی الحال میرے پاس واحد حل یہی ہے کہ مسئلے کو ٹالنے کے لیے، چند دنوں کے لیے ہی سہی، منظر سے غائب رہا جائے۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے خود کو پُر سکون کرنا چاہا۔ رات ابا سے ہونے والی گفتگو نے اُسے واقعی بے حد اُلجھا دیا تھا۔ اگر وہ اُسے کورس اٹینڈ کرنے سے منع کر دیتے تو شاید اس کے لیے اُن کی یہ بات ماننا اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا کہ اس نئے مسئلے سے نپٹنا۔ ابا کی مجبوری اور اماں کی موقع شناسی نے اُسے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

"یہ بھی سچ ہے کہ میں نے ابا کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بننا نہیں چاہا۔ مگر پھر بھی وقت ایسے کسی نہ کسی مرحلے پر لاکھڑا کرتا ہے۔"

روانگی کے دن ان کے پریشان چہرے پر تحریر سوچوں کو پڑھتے ہوئے اُس نے سوچا تھا۔ وہ سیدھی ٹریننگ سینٹر سے ملحق ہاسٹل چلی آئی۔ کمرے اور دیگر سہولتوں کی طرف سے اطمینان پانے کے بعد اس نے پہلی فرصت میں اکیلا بھو پھو کی طرف چکر لگایا۔

"نوکری کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تمہیں۔ میں نے کہا بھی تھا عظیم سے کہ تمہیں آگے پڑھنے دے۔ آج کل کے دور میں جتنی بھی تعلیم ہو، کم ہی ہوتی ہے۔ یونیورسٹی دور تھی تو یہاں بھیج دیتا۔ اب بھی تو آئی ہو تو پھر بھو

کو اس کی ہمیشہ سے ہی بہت فکر رہتی تھی۔

"ابا نے مجھے مزید پڑھنے سے روکا تو نہیں، جاب کا فیصلہ بھی میرا اپنا ہی تھا۔ دل چاہ رہا تھا تو پڑھانا شروع کر دیا۔" اس نے رسانیت سے کہا ـــــ تب ہی گھر میں پھیلی خاموشی اور بقول اس کے بے رونقی کی فضا میں گھنٹی کی صدا گونجی۔ سب لوگ کسی عزیزہ کی شادی پر گئے ہوئے تھے اور پھوپھو اس کے منع کرنے کے باوجود جانے کے ساتھ ـــــ اس کے لیے سموسے بنا رہی تھیں۔

"تمہارے پھوپھا میرے منع کرنے کے باوجود ہی گیٹ بند کر گئے ہوں گے۔ ہوگا انہی کا کوئی دوست۔ اور بار بار نیچے جانا میرے لیے اب بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" وہ جوڑوں کے درد کے ہاتھوں پریشان رہنے لگی تھیں۔

"آپ ٹھہریں! میں دیکھ کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے جا پہنچی۔ گیٹ کے پاس گاڑی موجود تھی۔ اس نے اچک کر دیکھا۔ اب جان پہچان کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ یہ مرحلہ طے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ گیٹ کھول کر وہ ایک سائیڈ پر ہو گئی۔ اور گاڑی تیزی سے پورچ میں آن رکی۔

"واٹ اے سرپرائز! آپ جیسے مہمان یہاں بھی ہماری میزبانی کرنے لگے۔" اس نے آنکھیں پھیلا کر حیرت کا اظہار کیا۔

"میں یہاں مہمان بن کر بھی نہیں رہی۔" اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لگے ہاتھوں وضاحت کر دی۔

"کہنے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔" وہ تو جیسے اس کی ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب تیار رکھتا تھا۔ وہ سیدھی کچن میں چلی آئی۔

"تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟" پھوپھو نے اسے آتے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کے خیال سے۔" وہ ہنس دیا۔ "میں نے سوچا چچا کے بغیر نجانے کیا حال ہوگا آپ کا۔ جا ؤں کمپنی دے دوں، مگر آپ تو۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر سموسے فرائی کرتی حرا کو دیکھا۔

"خاصی مصروف ہیں، خاطر داریوں میں۔ میں ناحق پریشان رہا۔"

"خاطر داری کیسی؟ حرا تو کچھ بھی بنانے نہیں دے رہی تھی۔ اور تم کیوں خوامخواہ پریشان رہتے ہو۔ جن کو فکر ہونی چاہیے وہ منہ سے نکل گئے مجھے چھوڑ کر۔" ان کا اشارہ پھوپھا کی طرف تھا۔

"انہیں معلوم ہے چچی آپ کی فکر کرنے والے بہت سے موجود ہیں، بڑی اماں بھی سب کے ساتھ گئی ہیں!" کچن سے ملحق لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا جو اپنے ایک ہاتھ میں مگ اور دوسرے میں سموسہ تھاما اور ٹی وی کے سامنے جا بیٹھی۔ ان دونوں کی گفتگو میں اس کے لیے دلچسپی نہیں تھی۔

"ہاں! طبیعت ان کی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ مگر میرے رکنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ تمہیں تو پتا ہے۔ شادی اگر کسی کی بیٹی کی ہو تو وہ ضرور شرکت کرتی ہیں۔"

"تم اُدھر کمرے میں کیوں جا بیٹھی ہو؟" دفعتاً انہیں خیال آیا۔ "یہ سب کچھ میں نے کس کے لیے بنایا ہے؟" وہ اسے چائے کی خالی چسکیاں بھرتے دیکھ کر ناراض ہونے لگیں۔

"یقیناً آپ کے لیے۔ اندر چلی بھی۔" وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا کر اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "چچی آپ کی دوائی مل گئی تھی بالآخر۔ ڈاکٹر سے بھی بات ہو گئی ہے ابھی ایک گولی لے لیں تو خاصا افاقہ ہو جائے گا۔" وہ چائے کا خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے اندر کی طرف چل دیا۔

"بہت خیال رکھنے والا ہے، ذرا کوئی مسئلہ ہو گھر میں، ہر کسی کے لیے یونہی پریشان ہو جاتا ہے۔ صبح گھٹنے کے درد نے کچھ بیزار کیا اور پہلی فرصت میں دوائی حاضر ہو گئی۔ یہی حال اس کا کینیڈا میں بھی تھا۔ ایک سے ایک اچھی آفر مل رہی تھی وہاں۔ بڑی اماں کی طبیعت خرابی کا سنتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا۔ خیر قسمت کا دھنی ہے۔ یہاں بھی دوائیوں کی فرم میں اچھی جاب مل گئی ہے۔ شام کا وقت اپنی کیمسٹ شاپ پر گزارتا ہے۔"

اس نے نہایت عدم دلچسپی اور بے دھیانی سے ساری تفصیل کو سنا۔

"تم نے ہاسٹل میں کمرا کیوں لیا۔ یہاں رہنے میں کیا مسئلہ تھا؟" انہیں پھر یاد آیا۔

"روز آنے جانے میں دقت ہوتی۔ میں ویک اینڈ پر

آجایا کروں گی۔"

"کوئی وقت نہ ہوتی۔ مزمل کا آفس اسی طرف ہے با آسانی تمہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ عظیم نے فون ہی کر دیا ہوتا۔ ہم خود تمہیں لینے آتے۔ مگر وہ تو کوئی رابطہ ہی نہیں رکھتا۔ برسوں گزر جاتے ہیں ایک دوسرے کی صورتیں دیکھے ہوئے۔ گھر پہ فون کرو تو صغریٰ کی بے سرو پا باتوں میں ہی کال ختم ہو جاتی ہے۔ خط لکھو تو تمہیں ملتا نہیں۔ اور یہ تم اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو۔ ہمارے بھی ویسے ہی پڑے ہیں۔ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔"

وہ مغرب کی نماز پڑھنے چل دیں۔ انہیں ہمیشہ ہی اس کا اس قدر ہی خیال رہتا تھا اور وہ یونہی ہر بار خاموشی سے ان کے شکوے اور ڈانٹ سن لیا کرتی تھی اور اسے افسوس بھی رہتا تھا کہ ابا اور وہ دو ہی بہن بھائی تھے مگر پھر بھی ان کے درمیان بہت سے

گلے شکوے رہتے تھے۔ جس کی بڑی وجہ اماں ہی تھیں جو ابا کا ان کی بہن سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتی تھیں یا پھر شاید وہ پھوپھو کی سسرال سے خائف تھیں خصوصاً بڑی اماں اور ان کی تکلیف وہ حد تک سچ بولنے اور بے دھڑک مخاطب کے منہ پر صاف کہہ دینے کی عادت سے۔ مگر حرا کا خیال تھا در حقیقت وہ اندر سے ان سے خوف زدہ رہتی تھیں اسی لیے ابا کو ان سب سے بدظن کرنے کی کوشش میں مصروف عمل رہتی تھیں حرا ان کے کنٹرول سے باہر تھی اس پر کوئی پابندی لگانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنا پھوپھو جب جاتیں اسے اپنے ہمراہ لے آتیں اور وہ بھی خوشی سے چلی آتی کہ اس کی ننھیال اور ددھیال بڑی اماں کا گھر ہی تھا کہ بڑی اماں، ابا اور اس کی مرحومہ ماں کی سگی خالہ ہوتی تھیں۔ بدلتے وقت نے اس کی معذورت کو بڑھایا تو آمد و رفت کے سلسلے میں خود بخود کمی آگئی۔ پھوپھو کے جوڑوں کا درد اور ان کے ہاں کا سرد موسم انہیں وہاں نہ آنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کا دھیان انہیں اسی شدومد سے رہتا تھا۔

"ہر وقت سوچتے رہنا آپ کی ہابی (مشغلہ) ہے یا ضرورت یا لائٹ جلائے ہوئے وہ اسے سوچوں کی دنیا

سے باہر لے آیا۔ اور پھر اپنی دانست میں جگمگاتے ہوئے کچن میں گھس گیا۔ اس نے ناگواری سے اس کی چوڑی پشت کو دیکھا۔ پھر ٹی وی پہ آنے والے ٹاک شو کی طرف توجہ مبذول کر لی۔

"یہ تم ہو حرا!" لمحہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ثمن اور نعمان کمرے میں چلے آئے۔

"اوہ مائی گاڈ! مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی!" وہ اس سے لپٹ گئی۔

"اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔ اس کے علاوہ کوئی آسان حل --- نہیں ہے۔" نعمان نے بیٹھتے ہی سموسے والی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی اور انصاف کرنا شروع کر دیا۔ "اب چھوڑ بھی دو بے چاری کو! بڑی پسلی ایک ہو گئی ہوگی اس کی۔" وہ ثمن کو دیر تک اس سے لپٹا دیکھ کر بولا۔

"یوں اچانک کیسے آ گئیں تم اور کتنے دنوں کے لیے آئی ہو؟"

"سن رہے ہیں آپ مزمل بھائی! مہمان سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم واپس کب جاؤ گے، کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

"سب چلتا ہے میرے بھائی! آج کل کے مہمان بھی تو خود کو مہمان نہیں کہتے۔ پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ بے نیازی سے مسکراتا ہوا گزر گیا۔

"نعمان پلیز! تھوڑی دیر کے لیے ہمیں بخش دو۔" ثمن نے اسے گھورا۔ "اتنے عرصے کے بعد ملے ہیں، بہت سی باتیں جمع ہیں کرنے کے لیے۔"

"باتیں نہیں برائیاں کہو۔ کیونکہ دو خواتین جہاں مل بیٹھیں یہی کار خیر انجام پا سکتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے جاتے جاتے کہہ گیا۔

"تھینکس گاڈ!" ثمن نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تم نے اطلاع کیوں نہیں دی آنے کی۔ میں تمہارے استقبال کے لیے رک جاتی۔" پھر وہ اس کی طرف پلٹی۔

"سرپرائز اچھا نہیں لگا؟"

"بہت اچھا لگا۔ اسی لیے تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ خط مل گیا تھا میرا؟"

"ہاں! مگر تم نے دھمکیاں کب سے دینی شروع کر

دی ہیں۔ اگر تم نہ آئیں تو یہ کر دوں گی۔ وہ کر دوں گی۔"

"بس! مجھے پتا تھا تم سیدھی طرح قابو آنے والی نہیں ہو۔ یہ میری دھمکیوں کا اثر ہے جو تم ایک ہفتے کے اندر اندر مابدولت کے سامنے پائی جا رہی ہو۔" اس نے پاؤں سینڈل سے آزاد کیے۔

"نہیں! تمہاری دھمکیاں بے اثر ہی ٹھہریں۔ البتہ میرا ٹریننگ کورس شروع ہو گیا تو یہاں آنے کا موقع مل گیا۔"

"بہت خوب! اور میں یہاں پچھلے پندرہ منٹ سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ مس حرا عظیم میرے جذبات کا خیال کرتے ہوئے صرف مجھ سے ملنے کی غرض سے دوڑی آئی ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"مجبوری کھینچ لے جائے جس طرف چل دیتی ہوں۔ ورنہ تم تو جانتی ہو ناں۔ میں ایک فرض شناس ورکنگ وومن ہوں۔ بے مقصد گھومنا پھرنا افورڈ نہیں کر سکتی۔" وہ مسکرا کر اسے چڑانے لگی۔

"بس بس! زیادہ ڈائیلاگ نہ جھاڑو۔ پتا ہے مجھے۔ اب ہم سے ملنا بھی تمہارے لیے بے مقصد بات ہے نا۔"

"تمہاری بات کا جواب دینا ضروری تھا بے مقصد ہی سہی۔"

"اس پر بعد میں بحث ہو گی۔ یہ بتاؤ کورس کتنے دنوں کا ہے۔"

"دو ماہ۔ تقریباً۔"

"ریلی؟" اس نے خوشی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "چلو اسی بات پر تمہاری اگلی پچھلی ساری خطائیں معاف۔ خوب انجوائے کریں گے۔" وہ لباس تبدیل کرنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"انجوائے! ابھی زندگی کے اس رخ سے آشنائی ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ میرا یہاں ہونا ایک بہانہ ہے راہ فرار کا۔" اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے عادتاً سوچا۔

وہ رات رکنے کے ارادے سے ہی آئی تھی۔ راولپنڈی پہنچتے ہی اس نے اپنی خیریت کی اطلاع ابا کو دے دی تھی۔ اتنی جلدی دوبارہ فون آنے کی اسے توقع نہیں تھی۔ اور اس کے پیچھے موجود کسی بھی خاص وجہ کا تصور ہی اس کے اطمینان کو رخصت کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ پھوپھو نے اس کو پاس کھڑے پا کر اپنی گفتگو سمیٹی اور ریسیور اس کے حوالے کر دیا۔

"سرفراز کی بہن کی شادی طے پا گئی ہے اگلے ماہ کی تیس تاریخ کو۔" انہوں نے اس کی خیریت پوچھتے ہی اصل بات بیان کی۔ "ان لوگوں کا خیال ہے یہی تاریخ سرفراز کے لیے بھی رکھ لی جائے۔ تم کہو تو رضامندی دے دوں۔ سرفراز تیاری کرنا چاہ رہا ہے۔" اس نے سانس روکے ان کی تفصیل بے دلی سے سنی۔

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔" ابا نے کہا۔

"یہی میں بھی کہنا چاہ رہی ہوں ابا۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"یہ تو کوئی منطق نہ ہوئی۔ میں اپنے مسئلے کم کرنے کی کوشش میں ہوں اور تم ہو کہ۔"

"یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔" اس نے کہنا چاہا مگر لائن کٹ گئی۔

"بلکہ راہ چلتے مصیبت گلے میں ڈالنے والی بات ہے۔ ابا اچھی طرح جانتے ہیں یہ بات میرے لیے قابل قبول ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر بھی سمجھانے کیوں مصر ہیں۔" بالکونی کی سمت کھلنے والا دروازہ کھول کر وہ ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر نیچے صحن میں نظر دوڑانے لگی۔ بڑی اماں کے پورشن میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اسے صحن کے کمرے کی یہ لوکیشن بہت پسند تھی۔ سردیوں میں دھوپ اور گرمیوں میں شام کے بعد ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے موزوں ترین جگہ تھی۔ ساتھ والا کمرا پھوپھا کا اسٹڈی روم ہوا کرتا تھا۔ مگر اب غالباً وہاں نعمان مقیم تھا۔ تبھی رات گئے کھلنے کے دھیمے سُر کھڑکی سے باہر تک سنائی دے رہے تھے۔

لگا ہیں ہو گئیں پُرنم ذرا آواز دے دینا
غموں میں گھر گئے ہیں ہم

اس نے بغور سنتے ہوئے تسیم بیگم کی آواز پہچانی اور پھر آہٹ پا کر رخ موڑا۔ ثمن اس کے پاس موجود تھی۔ وہ اس ٹرانس سے باہر نکل آئی جو اس کی سوچوں اور رات کی خاموشی میں سنائی دینے والے گیت کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔

"نعمان کو کیا ہوا؟" پاپ میوزک سے کھسک کر کلاسیکل تک پہنچ گیا۔ اس نے بمشکل مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بغور دیکھنے لگی۔ "ماموں جان نے ایسا کیا کہہ دیا جو تم پریشان ہو گئی ہو۔"
"ان کے پاس آج کل کہنے کے لیے ایک ہی بات ہے۔ سرفراز سے شادی کر لو۔" ریلنگ پر قدرے جھکتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔
"واٹ؟" ثمن نے حتی الامکان حد تک اپنی آواز دبائی کہ بڑی اماں کا کمرا صحن کے رخ پر ہی تھا۔ اور وہ یوں رات گئے ان کا وہاں کھڑے ہونا شاید پسند نہ کریں۔
"مجھے یقین نہیں آرہا۔ ماموں جان بھی ایسا سوچ سکتے ہیں۔ اور اس سرفراز کو دیکھو۔ دو سال پہلے جب شادی رچانے جا رہا تھا۔ اس وقت اسے تم نظر نہیں آئیں۔ اور اب دوسری شادی کے لیے تم سے زیادہ موزوں کوئی نہیں ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق ہو چکی ہے؟" وہ فوراً غصے میں آ گئی۔

"سنا تو یہی ہے۔"
"تم نے عظیم ماموں کو کیا جواب دیا؟"
"کچھ بھی نہیں۔ اور میں کہہ بھی کیا سکتی ہوں۔"
"اف!" ثمن نے جھنجلا کر کہنیاں ٹکاتے ہوئے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ "ایک احمقانہ فیصلے کے خلاف اس قدر بزدلی کا مظاہرہ! مجھے اندازہ ہی نہیں تھا عرا! تم اتنے اہم مرحلے پر آ کر بے وقوف نکلو گی۔" اس کی آواز سے تاسف چھلکنے لگا۔
"میں خود کو ہر قسم کے جھگڑے سے بچانا چاہتی ہوں۔ تمہیں تو اماں کا پتا ہی ہے۔"
"سب جانتے ہیں حرف ہیں ہی کیا۔ ہر طرف ان کے نامناسب اور غیر منصفانہ رویے کا چرچا ہے۔ مکمل ثبوت فراہم کر رہی ہیں اب بھی اپنے۔"
"چھوڑو نا کوئی اور بات کرو۔" وہ اس کے طنزیہ لہجے سے اکتا کر بولی۔ "ہر جگہ ہر وقت اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تذکرہ سننا آسان بات کہاں ہوتی ہے۔ خواہ وہ آپ کے بہت قریبی لوگ، آپ سے اظہار محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی کیوں نہ کہہ رہے ہوں۔"

"تم کہو تو امی بات کریں ماموں جان سے۔"
"نہیں۔ فی الحال ابا کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔ زمین کے مقدمے نے انہیں خاصا الجھایا ہوا ہے۔" اس نے مختصراً ثمن کو پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔
"تو یہ بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ماموں جان نفسیاتی دباؤ کے تحت اس رشتے کے حق میں فیصلہ دینا چاہ رہے ہیں۔ اس سارے قضیے میں سرفراز صاحب کے اثر و رسوخ نے عظیم ماموں کو جکڑ لیا۔" وہ دونوں کھڑے کھڑے تھک گئیں تو بالکونی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنا شروع کر دیا۔
"یہی بات تو پریشان کن ہے۔"
"پھر بھی میرا مشورہ ہے تمہیں اپنا شرعی حق استعمال کرنا چاہیے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے تمہی۔ صاف صاف اپنی رائے سے سب کو آگاہ کر دو۔"
"شرعی حق۔" نعمان کے کمرے سے اٹھتی میوزک کی صدا میں بھی خاموش ہو چکی تھیں۔ لائٹ البتہ جل رہی تھی۔ پردوں سے چھن کر آنے والی روشنی میں اس نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے رک کر ثمن کو دیکھا۔ "کیسا حق ہے یہ۔ جو نکاح سے محض چند منٹ پہلے دیا جاتا ہے۔ جب والدین کی عزت و حرمت کی تلوار سر پر لٹک رہی ہوتی ہے۔ اور اس کے پیچھے ان کی مجبوریوں کی لمبی لسٹ موجود ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کون پوچھتا ہے۔"
"چلیے! میرا وعدہ ہے کم از کم آپ دونوں سے پہلے ضرور پوچھا جائے گا۔"
وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی۔ پردہ ہٹانے تیز روشنی میں انہیں چونکتا ہوا دیکھ کر وہ خفیف سا مسکرایا اور پھر ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔
"ایسا کون سا ضروری مسئلہ ہے جو اندر بیٹھ کر طے نہیں ہو سکتا۔ یا پھر بڑی اماں کی ہدایت کا انتظار ہے۔" اب اس کا لہجہ قطعی سنجیدہ تھا۔ سرزنش کے احساس سے بھرپور۔
"سوری مزمل بھائی، بالکل خیال ہی نہیں رہا۔" ثمن نے معذرت کرتے ہوئے اسے گم صم کھڑے دیکھ کر آگے کی طرف دھکیلا۔

"یہ یہاں بیٹھے جاسوسی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔" کمرے میں آتے ہی اس نے کوفت سے کہا۔
"جاسوسی! بے چارے مزمل بھائی۔" ثمن اس کے تاثرات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اپنے کمرے میں بیٹھے تھے بھئی۔ نچلے پورشن میں گنجائش کم ہو گئی ہے۔ تجمل بھائی کی شادی کے بعد۔ ابو نے اسٹڈی روم ختم کرتے ہوئے یہ کمرا مزمل بھائی کو دے دیا ہے۔ ہم اپنی باتوں میں اتنے مگن تھے۔ ان کی ڈسٹربنس کا دھیان ہی نہیں آیا۔"
"انہیں سوائے ڈسٹرب ہونے اور غصہ کرنے کے اور آتا ہی کیا ہے۔"
"ہائیں! تم نے کہاں دیکھ لیا ان کا غصہ۔" ثمن بستر کی شکنیں نکالتے ہوئے چونک کر پلٹی۔ "اتنے سوئٹ ہیں وہ تو۔ نرم دل۔ ہمدرد اور پُرخلوص۔ بس ذرا سنجیدہ رہتے ہیں۔"
"پھر بھی ہر معاملے میں اپنی رائے دینا ضروری سمجھتے ہیں۔" اس نے ثمن کی بات سن کے جواب میں جھنجلا کر سوچا تھا۔ اور پھر کروٹ بدل کر سونے کی بھرپور کوشش کرنے لگی کہ اس وقت طبیعت پر طاری ہر قسم کی اُلجھن سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہی تھا۔

"بڑی اماں صبح سے کئی بار تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ جاؤ ان سے مل آؤ۔" پھوپھو نے بالآخر سارے دن کے انتظار کے بعد اسے یاد دلایا۔ یاد تو اُسے تھا۔ اُن سے ملنا بھی ضروری تھا مگر اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ بظاہر وہ ثمن کے پاس پڑے فلور کشنز پر براجمان فیشن میگزین کے صفحات الٹ پلٹ کر رہی تھی۔
"کیا مطلب! تم بڑی اماں سے ابھی تک نہیں ملیں!" ثمن نے کتاب سے نظریں ہٹا کر حیرانگی سے اُسے دیکھا۔
"تم چھوڑو گی اسے تو وہ کہیں اور بھی جائے گی ناں۔ سارہ بھابی آئی تھیں صبح۔ تم دونوں کے خراٹے کمرے سے باہر تک سنائی دے رہے تھے۔ کیا کرتیں، چلی گئیں۔" نعمان نے تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔
"چلیں! ویک اینڈ پہ بھی بندہ آرام نہ کرے۔ تمہاری طرح سارا ہفتہ بے کار بیٹھے نہیں گزارتے ہم لوگ، چلو اُٹھو فوراً۔" وہ نعمان کو بات کا حسب عادت جواب دے کر اس سے کہنے لگی۔ حرا سعادت مندی سے اس کی بات مانتے ہوئے نچلے پورشن میں چلی گئی۔ پرانی طرز کے بنے اس کشادہ نشیمن میں بڑی اماں اپنے تین بیٹوں کی فیملیز کے ہمراہ مقیم تھیں۔ گھر کی فضا میں موجود اتفاق و محبت کو برقرار رکھنے میں بڑی اماں کے مزاج اور معاملہ فہمی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ذیشان انکل کی لو میرج اس کا واضح ثبوت تھی۔
"ذیشان انکل اور غزالہ چچی کہیں گئے ہوئے ہیں؟" ان کے پورشن کے آگے سے گزرتے ہوئے دروازے پر لگے تالے پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں، مگر ہیں اسی شہر میں۔"
"ویری اسٹرینج!" اُسے اچنبھا ہوا۔ "بڑی اماں نے جانے دیا انہیں؟"
"بڑی اماں کیا کرتیں۔ ان کی شرط ہی بہت کڑی تھی۔ اور وہ بھی مزمل بھائی کے لیے، عاصمہ کا رشتہ

دینا چاہ رہی تھیں۔"
"پھر؟" اُسے اپنے سوال پر خود بھی حیرت ہوئی۔ اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھی وہ۔
"پھر کیا، مزمل بھائی کو قابو کرنا کون سا آسان کام ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کریں گے۔ جبکہ عمرانہ چچی کا خیال یہ تھا کہ اس قدیم طرز کے مکان میں رہتے ہوئے ان کی بچی اچھے رشتوں سے ہمیشہ محروم رہے گی۔ بڑی اماں نے نہ ان کی خواہش رد کی اور نہ ہی مزمل بھائی کو مجبور کیا۔ دراصل عاصمہ ان کے منع کرنے کے باوجود ماڈلنگ کرنا چاہ رہی تھی۔"
بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے اصولوں کو جذبات پر ترجیح دی۔" ان کے پورشن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔ برآمدے میں ہی مجتبیٰ بھائی کی بیوی سادہ بھابی اپنے بڑے صاحبزادے کو قابو کیے ہوم ورک کروانے کی تگ و دو میں مصروف نظر آئیں اور وہ بڑا سا۔ "مسز بلکہ ان کی ہر بات چٹکیوں میں اڑا رہا تھا۔ "آئی ایم گوئنگ ٹو اے پارٹی (میں ایک پارٹی میں جا رہی ہوں) انہوں نے ڈکٹیشن دی۔
"تو جائیے ناں! میں نے روکا ہے آپ کو؟" کلاس ٹو میں پڑھنے والے شریر سے عثمان نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ دونوں ہنس دیں۔
"آؤ حرا۔ بجائے تمہاری برادری اس خرم کو کیسے قابو کر لیتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"ہوتے ہیں کچھ خفیہ گُر ہمارے پاس۔"
"اور محترمہ ان ہی میں مزید مہارت حاصل کرنے کے لیے آج کل یہاں پائی جا رہی ہیں۔" ثمن نے لقمہ لگایا۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آج کل ہر فیلڈ میں ایکسپرٹ ہونا ضروری ہو گیا ہے۔" وہ انہیں لیے لان میں چلی آئیں جہاں بڑی اماں کے پاس بیٹھا حمزہ، انہیں سیب چھیل کر پیش کر رہا تھا۔ وہ سلام کرکے خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"اوہو! آج تو بہت خدمت ہو رہی ہے بڑی اماں کی۔" ثمن نے چھیڑتے ہوئے حمزہ کو چھیڑا۔
"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اکلوتی دادی ہیں ہماری، نئی ملنے سے تو رہیں۔ تمہیں توفیق نہیں ہوتی۔ مجھے ہی خیال کرنا پڑتا ہے۔"
"اچھا خیال کرتے ہو میاں! پورے دو ہفتے کے بعد اس وقت تمہاری شکل دیکھ رہی ہوں۔ بجانے کہاں غائب رہتے ہو۔" بڑی اماں نے شکایت کی۔
"یہی تو حیرت ہو رہی ہے۔ اس وقت تو انہیں فلم دیکھنے جانا تھا۔ کل نعمان کے ساتھ یہی پروگرام بنا تھا ناں؟" وہ شرارت سے پول کھولتے ہوئے حمزہ کی گھوریوں سے بے نیاز مسکراتی ہوئی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
"کیسا پروگرام؟ کون جا رہا ہے فلم دیکھنے؟" بڑی اماں نے چونک کر اُسے دیکھا۔
"فلم نہیں بڑی اماں! قلم کہہ رہی ہے۔" حمزہ نے دانت پیستے ہوئے قہر بار نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اور سادہ بھابی بے ساختہ ہنس دیں۔
"اچھا تو جلدی کیا ہے۔ ٹھہر کر چلے جانا، ذرا میری ٹانگ تو دباؤ۔" وہ جو فرار ہونا چاہ رہا تھا، ثمن کو گھورتا منہ پر ہاتھ پھیرتا دوبارہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ ٹانگ دبانے لگا۔
"بڑی اماں! اب کیسی طبیعت ہے؟" ثمن نے اسے چڑاتے ہوئے پوچھا۔
"تم سب کے تجربوں سے جان چھوٹے تو بہت سکون میں رہوں۔ ہزار بار کہا ہے بے موسم زکام ہے، خود ہی ٹھیک ہو جائے گا مگر تمہاری ماں جوشاندہ پلا جاتی ہے۔ تو یہ بڑی بہو چھوہ۔ اور یہ حمزہ ہے۔ اسپتال میں آنے والی ہر نئی دوائی پہلے مجھ پر ہی آزماتا ہے۔" حمزہ مقامی اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔
"بڑی اماں! یہ میرے ساتھ زیادتی ہے۔" حمزہ نے احتجاج کیا۔ "اتنا ذلیل تو نہ کریں مہمانوں کے سامنے۔"
"لو بھلا! یہاں کون مہمان بیٹھا ہے۔ جو تو ذلیل ہو گا۔"
"عینک لگا کر دیکھیں، حرا آئی ہیں۔" وہ ان کا دھیان بٹاتا تیزی سے باڑھ پھلانگ کر اس طرف پہنچ گیا جہاں

نعمان اس کا منتظر کھڑا سوکھ رہا تھا۔

"یہ حرا بیٹی ہے بڑی اماں!" سارہ بھابی نے انہیں عینک لگا کر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پا کر تعارفی انداز اپنایا۔

"ہاں، ہاں پہچان لیا ہے میں نے اسے، ہو بہو اپنی ماں کی تصویر نکلی ہے ایسی ہی دبلی پتلی ہوا کرتی تھی اس عمر میں، خوش مزاج اور ملنسار۔ آہ! نظر ہی لگ گئی اسے بھی اور عظیم کے نصیب کو بھی۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ماضی کی تکلیف دہ یادوں میں گم ہو گئیں۔ اور یہ موضوع جس کا تذکرہ سننا بھی اب اس کے حوصلے اور ہمت کا امتحان ہوا کرتا تھا۔ وہ ان کے لفظوں میں ڈوبتی ابھرتی رہی، آنکھوں میں آئی نمی پر قابو پاتے ہوئے اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ نگاہ کے عین سامنے گلابوں سے بھری کیاری کے پاس کھڑا وہ پودوں کی کانٹ چھانٹ کا کام ادھورا چھوڑے اس کے تاثرات پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے توجہ ہٹائی۔ آس پاس بڑی اماں کے علاوہ اور کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ کب شاہدہ آنٹی اندر گئیں اور کس وقت سارہ بھابی۔

"بڑی اماں! اب آپ آرام کریں۔ زیادہ بولنے سے کھانسی بڑھ جاتی ہے۔" وہ اس کی کیفیت بھانپ کر گویا موضوع بدلنا چاہ رہا تھا۔

"لو اس کی بھی سنو! بیٹا تمہارا بس چلے تو میرے سانس لینے پر بھی پابندی لگا دو۔" بڑی اماں اپنی دھن میں اس سے مصروف گفتگو تھیں، مگر نعمان کی مداخلت کا برا مان گئیں۔

"اتنی دور سے آئی ہے وہ، دو گھڑی بات بھی نہ کروں اس سے!"

"ضرور کریں، مگر موسم کا بھی کچھ خیال کریں۔ ایسا نہ ہو بارش شروع ہو جائے اور آپ کو پتا ہی نہ چلے۔" وہ آستینیں فولڈ کرتا ہوا سامنے ہی براجمان ہو گیا۔

"یہ میری حماقت کا بار بار احساس دلا کر کیا جتانا چاہتا ہے؟" ایک ناراض اچٹتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اس نے سوچا۔

"آسمان صاف ہے، بارش کہاں! حرا تم یہاں آ کر بیٹھو میرے پاس!" بڑی اماں نے اپنی قریب ترین کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بلایا۔ شاہدہ آنٹی اور احسان انکل بھی آ گئے تھے۔

"مجھے اب خود کو بدل لینا چاہیے، یوں ہر کسی کے سامنے ایکسپوز ہو جانا سراسر حماقت ہے اور وہ بھی ایسے شخص کے سامنے جس کے بارے میں مجھے صرف اتنا علم ہے کہ وہ ثمن کا کزن ہے اور بس۔"

اس نے خود کو سرزنش کی اور بڑی اماں کے پاس جا بیٹھی۔ سارہ بھابی اور ثمن جب چائے لائیں تو وہ بہت اعتماد سے بڑی اماں اور شاہدہ آنٹی کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ شام کو وہ یوسف پھوپھا کے ہمراہ ہاسٹل چلی آئی۔

وومن ہاسٹل کا ماحول اچھا تھا۔ شام کو اکثر ہی سب لان میں اکٹھی ہو کر گپ شپ لگاتیں تعارف ہوتا، اپنے اپنے تجربات دہرائے جاتے۔ اس کی زیادہ تر ساتھی ٹیچرز بہت سینیئر تھیں۔ کورس کا باقاعدہ آغاز ہوا تو اسے احساس ہوا کہ محض محدود قابلیت کے ساتھ تدریس کا آغاز کر دینا اسٹوڈنٹس کے ساتھ ناانصافی ہے، تجربہ اور ٹریننگ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ غلطیوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور اصلاح کا موقع ملتا ہے۔

"وقت کا بہترین مصرف شاید میرے لیے اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔" اس نے اپنی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے تحت سوچا تھا۔

اس کی روم میٹ اسریٰ بھی آ چکی تھی مگر — اس کی کم گوئی اور سنجیدہ طبیعت سے وہ جلد ہی تنگ آ گئی۔ مگر ان چند روز میں ان کے درمیان گفتگو سلام دعا اور حال احوال پوچھنے سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ حالانکہ وہ اسے بظاہر خاصی دلچسپ لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ لیکچر اٹینڈ کرنے کے بعد، فارغ وقت میں وہ ناول پڑھتی، میوزک سنتی اور کبھی کبھار مارکیٹ، بازاروں کے دورے پر بھی نکل جاتی۔ اسے رشک آتا، کتنی بے فکر زندگی ہوتی ہے کچھ لوگوں کی۔ حرا اسے واک مین لگائے سر دھنتے ہوئے دیکھ کر سوچتی رہ جاتی۔

"شام کو باہر نکلنا، ہم جیسوں کی صحت کے لیے بہت مفید ہے، تمہیں اچھا نہیں لگتا؟" ایک روز وہ باہر سے گھوم کر آئی تو حرا کو مسہری سے بیٹھے کتاب پڑھتے دیکھ کر

تنگ آ گئی۔
"میری کسی سے واقفیت ہی نہیں ہے۔"
"باہر نکلو گی، کسی سے ملو گی تب ہی تو شناسائی بڑھے گی۔" وہ مسکرائی۔ "لگتا ہے تمہیں پڑھانے کا بہت شوق ہے۔"
"کہہ سکتے ہیں۔ وقت گزاری کے لیے یہ جاب بُری نہیں ہے۔" وہ سلیپر پاؤں میں اڑستے اس کے ہمراہ باہر چلی آئی۔
"ابھی میرے بیٹے کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اب تک تو آپ کی بہت سی سہیلیاں بن چکی ہوں گی۔ شریر کہیں کا، میرے بولنے کی عادت سے واقف ہے نا۔ اُسے کیا پتا کہ میری روم میٹ کس درجہ سنجیدہ خاتون ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"آر یو میریڈ؟ (کیا تم شادی شدہ ہو؟)" حرا نے حیرت سے اُسے دیکھا، دیکھنے میں وہ اس سے بھی کم عمر محسوس ہوتی تھی۔
"کبھی تھی۔ اب تو طلاق یافتہ ہوں۔"
"ویری سیڈ۔"
"زندگی میں کتنے لوگ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے ہیں۔" حرا نے شدید دُکھ سے سوچا۔
"مختصر سے عرصے میں سارے تجربے کر کے دیکھ لیے۔ ایک یہ ٹریننگ رہ گئی تھی سو وہ بھی کرنے چلی آئی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔
"اور بیٹا؟ وہ تو بہت مِس کرتا ہوگا تمہیں آج کل؟"
"کس حد تک!" اس نے ہاتھ میں پکڑا چیونگم کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا، "مگر وہ اپنے نانی نانا سے بہت اٹیچ ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ جتنا ان کے قریب رہے گا، اتنا ہی مجھے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔"
"ایک لحاظ سے ان کی سوچ غلط بھی نہیں۔"
"ہاں، مگر اب میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جب میں نے اس شخص کے نامناسب رویے کے باوجود دل کو عمر بھر کے سمجھوتے پر راضی کر ہی لیا تھا۔ کوئی بھی عورت طلاق کا ٹائٹل خوشی سے قبول نہیں کرتی۔ اگر اس مرحلے پر مجھے بھی چوائس کا حق دیا جاتا تو شاید میرا جواب — نفی میں ہوتا۔" اس نے وہ خوشبو کی جھکی ٹہنیوں کو ہٹاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "تو پھر اب تو تیرے پاس بہت معقول جواز ہے بیٹے کی صورت میں، تجھے کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"
"بدنصیب ہوتے ہیں کچھ لوگ۔ دنیا کی سب سے قیمتی نعمتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ بھی اُن میں سے ایک ہوگا۔" حرا نے اس کے افسوس کو کم کرنا چاہا۔
"احساسِ کمتری میں مبتلا لوگوں کی سوچ کا انداز ہی مختلف ہوتا ہے۔ آپ جتنا ان سے لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں اتنی ہی ان کی یہ محرومی اُبھرنے لگتی ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ جیسے میں ہر وقت اپنی قابلیت اور زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا اس پر رعب جماتی ہوں۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"میرے معقول مشورے پر بھی وہ اپنے نقصان کو ترجیح دیتا تھا۔ ہر بات محض اس لیے رد کر دیتا کہ کہیں میں رتبے میں اس سے بڑھ نہ جاؤں۔ عمر، ماحول اور مزاج کا تفاوت، ایسے کمپلیکس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔"
اس کی داستان سنتے ہوئے حرا کو لگا کہ آیا جو تعلق سرفراز اور اس کے درمیان قائم کرنا چاہ رہے ہیں اس کا انجام بھی بالکل ایسا ہی ہوگا۔
"تم اتنی سنجیدہ کیوں رہتی ہو؟" اچانک وہ تاثرات بدلتے ہوئے اس کی طرف پلٹ گئی۔
"اچھا، مگر اب لگتا ہے کہ تمہاری موجودگی میں یہ عادت خراب ہو جائے گی۔" وہ مسکرائی۔
"خراب نہیں کہو سدھر جائے گی۔ لائف انجوائے کرو، آنے والا وقت نجانے کیسا آئے۔"
وہ دونوں ہی ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئیں۔ اس روز حرا کو احساس ہوا کہ وہ ایک اچھی دوست کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ راہ چلتے بھی بعض اوقات آپ کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کی سنگت میں وقت اچھا گزر سکتا ہے۔

"اٹھو حرا! آج کہیں باہر چلتے ہیں۔" تولیے سے منہ پونچھتی ہوئی وہ اس سے کہنے لگی۔
"خیریت! یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی۔ لنچ ٹائم ہے

ہم تو نہیں جانے والے ہیں۔"

"آج وہاں جانا بیکار ہے۔ باخبر ذرائع سے علم ہوا ہے کہ آج کی ڈش میں آلو پالک کے علاوہ کوئی دوسری ورائٹی موجود نہیں ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"تو چلو وہی کھا لیتے ہیں۔" وہ کسی قدر اطمینان سے بولی۔

"کیوں کھا لیں بھئی، اس سے تو بہتر تھا گھر پہ رہ جاتے۔ روز روز سے آلو پالک، کریلے وغیرہ کھا کر منہ کا مزہ خراب ہو گیا ہے۔"

"باہر جا کر کیا کریں گے، کریم بخش کو بھیج کر کچھ منگوانا ہے منگوا لو۔"

"کیوں ہماری ٹانگیں موجود ہیں، ہم کسی کو کیوں بھیجیں۔ اور تم ڈرو مت ہمارے ساتھ سامنے والی نگہت باجی اور ان کی ہمسائی بھی جا رہی ہیں۔" اس کی شناسائی کا سلسلہ سارے ہاسٹل تک پھیلا ہوا تھا۔ مجبوراً وہ ان تینوں کے ہمراہ نکل کھڑی ہوئی، قریبی مارکیٹ کی چاٹ اور دہی بڑے گول گپے وغیرہ کھاتے میں مزہ تو بہت آیا مگر یہ عیاشی اُسے تاخیر سے ہضم ہوئی، گرمی اور کھٹی چیزیں کھانے سے اس کا گلا بری طرح خراب ہو گیا۔

"تمہیں تو آلو پالک ہی سوٹ کرتی ہے۔ یہ چسکے تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔" اگلے روز امبر اس کی سونگھی آواز سن کر ہنسنے لگی۔ اس روز دوپہر کا کھانا دل نہ چاہنے کے باعث گول ہو گیا اور اُس نے صرف چائے بسکٹس پر ہی گزارہ کر لیا۔ لائبریری سے لائی ہوئی کتاب سے نوٹس تیار کرتے ہوئے اُسے پشت پر کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلنے کی آواز آئی۔ اور پھر کسی نے اس کی آنکھوں پر آہستگی سے ہاتھ رکھ دیے۔ وہ مسکرا دی۔

"نیم حکیم خطرہ جان، یعنی کرشن!" اس کے پروفیشن پر چوٹ کرتے ہوئے وہ بولی۔

"تھینکس فار دی کمپلیمنٹ لیکن میری جدائی کے چند ہی دنوں میں تمہارا یہ کیا حال ہو گیا۔ بخار کس خوشی میں چڑھا لیا بھئی؟"

"تمہاری خوش فہمی کا کیا علاج!" اُس نے کتاب بند کی اور ٹیبل سے ہٹ گئی: "تمہارے شہر کی چٹ پٹی چیزیں کھا لیں اور یہ حال ہو گیا۔"

"اٹھو فوراً، میرے ساتھ گھر چلو۔!"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، معمولی سا بخار ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بگڑ بھی سکتا ہے، تمہیں اپنا خیال رکھنے کی بالکل عادت نہیں ہے۔ دوا لی تم نے؟"

"کہا ہے کریم بخش سے، لا دے گا تھوڑی دیر میں۔ اچھا یہ بتاؤ تم اس وقت یہاں کیسے؟" اُس نے دھیان ہٹایا۔

"فائنل ایئر کسی عذاب سے کم تو نہیں ہے۔ ہاسپٹل اور کالج کے چکروں میں انسان گھن چکر بن جاتا ہے۔ تم اچھی ہو جو اس فیلڈ میں آ گئیں، میڈیکل پروفیشن تو نرا دردِ سر بن گیا ہے۔ حمزہ نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ سیدھے سیدھے ایم ایس سی کر لوں، مگر اس وقت مجھ پر بھی تو قوم کی خدمت کا بھوت سوار تھا۔" وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی: "یہاں سے گزرتے ہوئے تم سے ملنے کا سوچ لیا۔"

"چلو، ابھی نکل گیا ہے دم، جیسی ہوئی ہے، فکر کی کیا بات ہے۔" اس نے تسلی دی۔

"جی نہیں، غلط کہہ رہی ہیں آپ۔ دم نکل گئی ہے اور سر ابھی پھنسا ہوا ہے۔ فائنل ایئر اور اس کے بعد کے سلسلوں کے لیے اس مثال کا الٹا ہونا زیادہ موزوں لگتا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"اوہ، سارے گئے باہر گاڑی میں ندرت میرا انتظار کرتے ہوئے سوکھ گئی ہو گی، میں چلتی ہوں۔ کچھ چاہیے تو نہیں؟" وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اونہوں!" اُس نے نفی میں سر ہلا دیا: "ابا کا فون تو نہیں آیا؟"

"نہیں!" وہ چپ ہو گئی۔ "شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں وہ!" اس نے مایوسی سے سوچا تھا۔

"ویک اینڈ پر آؤ گی تو خود بات کر لینا۔ خیال رکھنا اپنا۔"

"پھوپھو کو میری طبیعت، بخار وغیرہ کا مت بتانا۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔" اُس نے جاتے جاتے کہا۔

"سوچوں گی!" ثمن اُسے تنگ کرنے کے انداز میں مسکرائی اور فوراً باہر نکل گئی۔
اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ بے صبرا پن ثمن کی طبیعت

میں حد سے زیادہ شامل ہے۔ سو وہی ہوا۔ شام کے بعد جب زیادہ تر کولیگز کامن روم میں ٹی وی دیکھتے ہوئے گپ شپ لگانے میں مصروف تھیں، وہ کریم بخش سے سنگوائی ہوئی چیز کھا کر تقریباً سونے ہی والی تھی کہ ماسی مختار نے دروازہ بجاتے ہوئے "ملاقات ہے" کا نعرہ لگایا۔

"نعمان ہوگا!" اُس نے سوچا اور سلیپر پاؤں میں اڑسی، دوپٹہ اوڑھتی ہوئی وزیٹنگ روم میں چلی آئی۔ بخار کی حدت سے چہرہ لال ہو رہا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی نرمل کو سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ کے سے انداز میں وہ اُٹھ کر چلی آئی تھی۔ بے ساختہ ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے اُس نے بالوں کی بکھری لٹوں کو سنوارنے کی کوشش کی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ اُسے دیکھتے ہی گویا ہوا۔

"ٹھیک ہوں!" بڑا بیزار کن جواب تھا۔

"ثمن نے بتایا تھا آپ کی طبیعت خراب ہے بارے میں اور یہ کچھ میڈیسن بھی آپ تک پہنچانے کی تاکید کی تھی۔" اُس نے براؤن کاغذی لفافہ اُس کی سمت بڑھایا۔ جو اُس نے تھام لیا۔

"ناحق تکلیف دی ثمن نے آپ کو، معمولی سا بخار ہی تو تھا۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔" شاید نیند ٹوٹنے کا اثر تھا یا پھر اس کی بے وقت آمد پر بیزاری، لہجہ اس قدر ناگواری لیے ہوئے تھا۔ وہ ایکدم چونکنے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ شاید لوگوں کے خلوص کو پرکھنے میں بہت وقت صرف کرتی ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ آپ ہمارے شہر میں مہمان ہیں۔ کچھ فرض ہمارا بھی بنتا ہے۔ اور اگر اس بات کی بھی اہمیت نہیں تو پھر اتنا تو جان لیں، جہاں کوئی خیال رکھنے والا نہ ہو، وہاں اپنا خیال خود کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔"

حرا کا سویا ہوا دماغ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ شپٹا کر اس کی طرف دیکھا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ کر جا چکا تھا۔ کمرے میں پھیلا سناٹا اس کے احساس ندامت میں اضافہ کرنے لگا۔ وہ اپنا فرض نبھانے آیا تھا اور اُس کی بات پر بُرا ماننے کا پورا حق رکھتا تھا۔

"واپس آجاؤ بھئی! وہ تمہارا مہمان تو جا چکا ہے۔" امبر اسے ڈھونڈتی ہوئی اُسی لمحے اندر آئی تھی۔ "اسٹار پر ڈرامہ آ رہا ہے ٹی وی پر۔ چلو تم بھی آجاؤ۔"

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"طبیعت کو ایسی کی تیسی۔ تم چلو تو سہی۔ کیسے ایکدم پھیل گئی۔" وہ اُسے دھکیلتی ہوئی کامن روم میں لے آئی۔ ٹی وی پر آنے والے خصوصی کھیل کو وہاں موجود خواتین بہت انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہا ہوگا؟" دل نے پھر اسی ایک بات کی گردان شروع کر دی۔ "مگر تمہیں اس کی سوچ کی اتنی پرواہ کب سے ہونے لگی؟" دماغ کی سرزنش نے دھیان بٹایا۔

"کیا بہت ناراض ہو کر گیا ہے؟" اُس کی توجہ اسکرین سے ہٹتی دیکھ کر امبر نے سرگوشی کی۔ "ڈونٹ وری! اتنے اچھے خیالات کے مالک لوگ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے!"

"آپ مجھے لگ رہا ہے کہ میرا بخار تمہارے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو۔" وہ اُسے گھورنے لگی۔

"چلو تم کہہ رہی ہو تو میں مان لیتی ہوں۔ اِدھر دیکھو۔ عتیقہ اوڈھو کس قدر ڈوب کر ایکٹنگ کر رہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک کر ٹی وی کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

"کتنی منزل کلاس میں جینا اس کی؟" اُس نے چڑ کر سوچا۔ "اور نجانے کیا کچھ رہی ہے!" وہ دل میں کڑھتی خود سے نجانے کون کون سے عہد باندھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

آنے والے دن بہت مصروفیت لیے ہوئے تھے۔ کورس اٹینڈ کرنے کے بعد دن کا بقیہ حصہ لائبریری میں پلاننگ کرنے اور اسائنمنٹ تیار کرنے میں گزر جاتا۔ ویک اینڈ پر نعمان لینے آیا تو اُسے وقت گزرنے کا احساس ہوا۔

"تمہیں اتنی جلدی کس بات کی ہے؟" وہ گاڑی اڑاتا ہوا لایا تھا۔ اُس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"ہے نا بھئی! کیرم کی زبردست بازی چل رہی تھی۔ تجمل بھائی کو اپنی جگہ بٹھا کر آیا ہوں۔ حمزہ سر پیٹ رہا ہوگا

ان کی پارٹنر شپ میں۔" گاڑی کے دروازے لاک کرتے ہوئے وہ عجلت میں بولا۔

"ادھر جانا بیکار ہے۔ سب لوگ بڑی اماں کے پاس بیٹھے ہیں۔" وہ اُسے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر بولا اور پھر سوچنے کی مہلت دیے بغیر برآمدہ کراس کر گیا۔ وہ سست روی سے چلتے ہوئے مجبوراً ادھر ہی چلی آئی۔ خود سے باندھا ہوا عہد پہلے مرحلے پر ہی ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر موجود صوفے پر وہ اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔

وہ بے نیازی سے سلام کرتے ہوئے اتیلا پھپھو اور شاہدہ آنٹی کے پاس جا بیٹھی۔ کیرم کی بازی بھی ہو رہی تھی۔ اور وسیع لاؤنج کے دوسرے سرے پر اک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ نعمان کا خدشہ بالکل درست تھا۔ تجمل بھائی کے کھیل پر حمزہ کا جھنجلاہٹ کے مارے بُرا حال تھا۔ شمن اور سارہ بھابی کی ہنسی آؤٹ آف کنٹرول ہو رہی تھی۔

"آجاؤ حرا! تم میری جگہ پر بیٹھ جاؤ۔" سارہ بھابی نے فراخدلانہ آفر کی۔

"نہیں بھابی! مجھے کہاں آتا ہے کھیلنا۔" اُس نے معذرت چاہی۔

"تو یہاں کون سے ماہر بیٹھے ہیں!" تجمل بھائی ہنسے۔

"اُٹھیے تجمل بھائی! بس اب میری جگہ خالی کر دیں۔" نعمان اُن کے سر پہ جا پہنچا۔

"یار! کھیلنے کا مزہ تو اب آنا شروع ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو میدان چھوڑ دوں۔ اپا سیل! تھوڑی دیر صبر کرو۔"

"آپ تو ساری بازی اُلٹ کر رکھ دیں گے۔ اور جرمانہ بہت بھاری ہے آپ کی جیب ساتھ نہیں دے سکے گی۔"

"یار اچھے بھائی ہو تم! میری بیوی کے سامنے ذلیل کر رہے ہو۔" وہ احتجاجاً بولے۔ تو بہت زوردار قہقہے بلند ہوئے، حرا کو بھی ہنسی آ گئی۔

"شاہدہ! تم تو بالکل ہی ذہن کو فارغ کیے بیٹھی ہو اور مزمل کو بھی آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ گی تب ہی تو بات بنے گی۔"

بڑی اماں کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا کروں بڑی اماں! پتا نہیں کیسی لڑکی چاہیے اُسے۔ پچھلے ہفتے صبیحہ نے جو لڑکی ہمیں دکھائی تھی، اس کی تصویر تک نہیں دیکھی اس نے۔ کہتا ہے فکر کرنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"بیوقوف ہے وہ تو۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہمارے انتظار میں رہے گا تھوڑی۔ مزمل یہاں آؤ بیٹا!" انہوں نے اپنی بات پوری کرتے ہی اسے پکارا۔

"جی بڑی اماں! کیسے یاد فرمایا!" وہ ان کے قریب ہی فلور کشن پر بیٹھ گیا۔

"یہ تم کیا ہر روز ایک نیا شوشہ چھوڑ دیتے ہو۔ ایک بار ہی تفصیل سے بتا دو کیسی لڑکی پسند ہے تمہیں؟"

"کیا کہوں بڑی اماں آپ سے! پہلے آپ کی دور کی نظر کمزور ہوا کرتی تھی اور اب نزدیک کی بھی ہو گئی ہے۔" وہ شوخی سے گویا ہوا۔

"ہائیں! تم پر بھی حمزہ کا اثر ہو گیا ہے۔ اُلٹی سیدھی ہانکنے لگے ہو۔ صاف بات کرو۔"

"بات صاف ہو تو کچھ کہوں بھی! ابھی تو۔" وہ کہتے کہتے رُکا۔ "اب سب کے سامنے کیا وضاحت کروں! مجھے کچھ مہلت چاہیے، جلد ہی بتا دوں گا۔"

یقیناً سب سے اس کی مراد وہی تھی، اُسے اپنا آپ اچانک اُس ماحول میں اجنبی سا لگنے لگا۔

"کوئی مہلت نہیں ملے گی اب۔ صبیحہ جو لڑکیاں دکھا رہی ہے، ان میں سے مجھے جو بھی پسند آ گئی بات طے سمجھو!"

"کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ یہ کوئی شاں پیس تو ہے نہیں جو آپ لائیں گی میں سجا لوں گا۔" وہ ہنسنے لگی تھیں۔

فون کی گھنٹی بجی تو وہ ریسیو کرنے چل دیا۔

"حرا! آپ کا فون ہے۔" لاؤنج کے دوسرے سرے پر اعلان ہوا۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ شور میں گھنٹی کی آواز اُسے تو سنائی نہیں دے سکی تھی۔ تیزی سے فون کے ریک تک جا پہنچی۔

"ہیلو، ہیلو!" آواز صاف نہیں آ رہی تھی۔ اس پر ٹی وی کا شور۔

"پلیز! فوراً ٹی وی کا والیوم تو کم کر دیں۔" پلٹ کر اُسے مخاطب کرنا پڑ ہی گیا۔ اور اس کی درخواست پر

دوبالا بھی ہو گیا۔
"جی ہاں! حرا بول رہی ہوں۔ آپ کون؟" سماعت تک پہنچنے والی آواز ابا کی ہرگز نہیں تھی۔
"سرفراز عرض کر رہا ہوں، کیسی ہو؟" وہ ششدر سی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔
"بہت دنوں سے تمہاری کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی، اداسی ہو رہی تھی۔" وہ ہنسا۔ "میں نے سوچا خود ہی بات کر لیتے ہیں۔" اس کا پارہ ہائی ہو گیا۔
"آپ کو یہ نمبر کہاں سے ملا؟" غصے میں اوٹ پٹانگ سوال جڑ دیا۔
"لو بھلا نمبر لینا کون سا مشکل کام ہے۔ سچی بات ہے تمہارے ابا کو تمہاری اتنی فکر نہیں ہو گی جتنی مجھے ہے۔ اور مجھے تو یہ تک پتا ہے کہ تم ٹھہری کہاں ہو، یہ فون کس نے اٹھایا تھا۔ کون ہے یہ لڑکا؟"
"ان باتوں سے آپ کا مطلب؟ میری جاسوسی کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے۔ رہی بات ابا کے فکر کرنے کی تو وہ جانتے ہیں میں کہاں اور کن لوگوں کے درمیان ہوں۔" غصے کی شدت کو دباتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کسی حد تک تلخ اور بلند ہو ہی گیا تھا۔ ریسیور تھامے ہوئے حیران اس کی جرأت ——— پر حیرت ہو رہی تھی۔
دل تو پھر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس کی فضول گفتگو سننے سے پہلے ہی فون بند کیوں نہیں کر دیا۔ کھولتے ہوئے دماغ کو قابو میں لاتے اور خود کو سنبھالتے ہوئے چند پل ہی سرکے ہوں گے کہ معاً خیال آیا وہ کہاں کھڑی ہے۔ اگرچہ ہال میں سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے مگر وہ تو سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اپنے خدشے کی تصدیق کی خاطر ——— اس نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ اخبار کے اوپر سے جھانکتی آنکھوں میں کئی سوال مچل رہے تھے۔
"دنیا میں کیسے کیسے عجیب لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کی جان تکیں کہ ان کی چھوٹی سی تفریح دوسروں کے لیے کتنی اذیت کا باعث بنتی ہے۔" اپنی ہی نظروں میں چور سی بن گئی تھی وہ۔
نامعلوم اداسی اس کے اندر اترنے لگی، واپس اپنی جگہ پہنچ گئی۔ بڑی اماں اور انیلا پھوپھو آپا کا حال پوچھنے لگیں، ہوں ہاں میں جواب دے کر وہ ٹی وی وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پارٹنرز بدل چکے تھے، حمزہ کا ساتھ

اب نعمان دے رہا تھا۔ جیتی ہوئی بازی ہارتے دیکھ کر حمزہ نے بورڈ الٹ دیا۔ گیم ادھوری رہ گئی تھی، اور اب ثمن اور سارہ بھابی کے ہمراہ، تحمل بھائی بھی۔
"بے ایمانی ہے۔" اور پھر ساز باز کرو کے نعرے لگا رہے تھے، ان کا اصرار تھا آئس کریم کھلائی جائے۔
"کتنے خوش اور مطمئن رہتے ہیں یہ لوگ۔" اس خوشگوار سی فضا میں اپنے اندر بڑھتی ہوئی تشنگی کو اس نے شدت سے محسوس کیا۔
"جاؤ بیٹا! لے جاؤ، جو کہہ رہی ہیں کھلا دو!" بڑی اماں کہہ رہی تھیں۔
"بڑی اماں! یہ ناانصافی ہے! ہمارے بے وقت باہر جانے پر بے جا پابندیاں اور ان لاڈلیوں کا اتنا خیال۔" حمزہ نے صدائے احتجاج بلند کیا۔
"کیوں نہ ہو، چار دن کی چاندنی ہے اور پھر!"
"پھر جب لائسنس سے آ گئے آپ فقط فکر نہ کریں۔" نعمان نے بڑی اماں کی بات اچک لی۔ سب ہنس پڑے، اسے بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔
"حرا تم ہی سمجھاؤ انہیں، موسم بدل رہا ہے گلا خراب ہو جائے گا آئس کریم کھانے سے۔" نعمان اس کی طرف پلٹا۔
"اور کچھ نہیں تو ہم غریبوں کی جیب کا ہی کچھ خیال کریں۔" حمزہ نے فریاد کی۔
"یہ سب تو پہلے سوچنا چاہیے تھا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ بھی پوری طرح انوالو ہو گئی۔ ثمن نے تالی بجا کر داد دی۔
"یعنی کہ آپ بھی!" حمزہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ "اچھا! چلیں کیا یاد کریں گی!" وہ اٹھا اور فوراً ہی مزمل کے سر پر جا کھڑا ہوا۔
"مزمل بھائی! ذرا جیب ڈھیلی کریں۔ حرا ضد کر رہی ہیں آئس کریم کھانے کی۔" اس کے سنجیدہ معصوم سے انداز پر بڑی اماں سمیت سب ہی کھلکھلا کر ہنس دیے۔ حرا نے سٹپٹا کر اسے دیکھا۔
"چلو، میں بھی چلتا ہوں۔" مزمل مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔
"یہ ہوئی نا بات! چلو بھئی لڑکیو! جلدی سے گاڑی میں لد جاؤ۔" حمزہ کی آواز میں شرارت کا رنگ

نمایاں تھا۔ وہ ایکدم سنجیدہ ہوگئی۔ انکار کی گنجائش قطعاً نہیں تھی لہٰذا وہ سب ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔

"تم نے میرا نام کیوں لیا؟" باہر آتے ہی اس نے البتہ حمزہ سے خفگی کا اظہار کیا۔

"تو اب کیا ہے حرج؟ ان بچیوں کی دعائیں لی ہیں کسی اور کے نام پر یہ عنایت کب ہونی تھی؟"

وہ شرارت سے کہتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔ کسی خوش فہمی سی سوچ نے اس کے قلب و ذہن کو پل بھر کے لیے جکڑ سا لیا۔ مگر دوسرے لمحے وہ اسے جھٹکتی ہوئی نشن کی طرف بڑھ گئی جو اسے بلا رہی تھی۔

"اور ان لوگوں کی مسرت کا راز یہی ہے کہ یہ سب خوش رہنا جانتے ہیں۔" بی 63 کے خنک ماحول میں ان سب کے ہنستے مسکراتے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے خود کو ان کے درمیان بہت ان ایزی محسوس کیا۔

"غور و فکر کرنا اچھی بات ہے۔ اگر آئس کریم کا شوربہ نہ بن جائے۔" وہ غالباً اسی سے کہہ رہا تھا۔ مگر اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے نگاہ نہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

"یہاں کی رونقیں مجھے حقیقت سے دور لے جاتی ہیں۔ اور سراب کے پیچھے بھاگنا عمر بھر کے لیے عذاب خریدنے کے مترادف ہے۔" ہاسٹل پہنچ کر اس نے بڑی دیر تک سوچتے ہوئے تجزیہ کیا تھا اور پھر اپنے دل کی بدلتی ہوئی کیفیت کے ہاتھوں تنگ آکر بالآخر تہیہ کیا کہ آئندہ ویک اینڈ وہ ہاسٹل میں ہی گزارے گی۔ اگلے چھ روز مصروفیت کے باعث پر لگا کر اڑ گئے۔ ویک اینڈ قریب آیا تو اس نے سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ایک روز قبل ہی پھوپھو سے فون پر ضروری کام کا عذر تراشا لیکن ان کی سمجھ میں یہ کب بات آنی تھی۔ اور وہ بھی یہ سوچ کر پرسکون ہوگئی تھی کہ اطمینان سے اپنا کام مکمل کرے گی اور فرصت کے لمحات کے لیے اسپرنگ کینٹین ہی کافی تھی۔ مگر یہ سب سوچتے ہوئے وہ بھول گئی تھی کہ پھوپھو کو بہلانا آسان تھا اور نشن کو قائل کرنا مشکل۔ سو چھٹی والے دن اس کا فون آگیا۔

"کون سے ایسے اہم کام لاحق ہیں تمہیں جو اس بار شرفِ ملاقات نہیں بخشا؟" وہ سخت ناراض تھی۔

"تم بھول رہی ہو، میں یہاں کورس کے لیے آئی ہوں۔ اتنے ڈھیر سارے نوٹس جمع ہو جاتے ہیں — اسائنمنٹس وقت پر مکمل ہی نہیں ہو پاتے۔"

"زیادہ رعب مت جھاڑو اپنی پڑھائی کا۔ میرا بھی ٹیسٹ ہے کل۔ مگر میں نے سارا دن تمہارے انتظار میں گزار دیا ہے۔" اس نے غصے سے بات کاٹی۔ "اچھا سنو! شام کو آجاؤ، تھوڑی دیر کے لیے ہی۔"

"مشکل ہے اگلی بار سہی۔" اس نے ہنس کر ٹالا۔

"خیر، میں بھی دیکھتی ہوں یہ مشکل کیسے آسان ہوتی ہے۔" اس نے مبہم سا جواب دے کر فون بند کردیا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کا غور کرنے کا ارادہ تھا۔ شام کو وہ عاصر کی منتظر تھی جو دور گھومنے کا کہہ کر کسی رشتے دار کے ہاں گئی تھی۔ مگر ابھی تک واپس نہیں آئی تھی کہ دوبارہ اس کا فون آگیا۔ دوسری طرف کمل بھائی سا اشتمان تھا۔

"آنٹی! آج میرا برتھ ڈے ہے۔ اور آپ انوائیٹڈ ہیں۔ اگر نہیں آئیں گی تو میں بھی سیلیبریٹ نہیں کروں گا۔"

"ارے!" وہ ہنسی۔ "مجھے پتا ہے آپ یہ سب گفٹ لینے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ چلیں آپ کا تحفہ ادھار۔"

"جی نہیں! مجھے گفٹ نہیں چاہیے۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔ "بس آپ تیار رہیں۔ حمزہ چاچو آپ کو لینے کے لیے آرہے ہیں۔"

"عشمان سنو تو!" اس نے کہنا چاہا مگر — لائن بے جان ہوچکی تھی۔ غالباً اس کو ہدایات جاری کرنے کے لیے آس پاس سب موجود تھے۔ اس کے لیے ابھی خاصی مشکل کھڑی ہوگئی تھی۔ سوچنے کی بھی مہلت نہیں تھی، بہر پل بھر کے سادہ سے مارل شیفون کے کرتا دوپٹہ سوٹ میں ملبوس اس کی شخصیت کتنی نکھری نکھری اور منفرد سی لگ رہی تھی یہ کون اس سے پوچھتا جو اس وقت گاڑی سے ٹیک لگائے اسے خراماں خراماں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید اپنی شخصیت کے اس اہم اور طاقتور پہلو کا احساس نہیں تھا۔ وگرنہ گردن میں ہلکی سی اکڑاہٹ کا آجانا بڑا فطری سا عمل ہوتا ہے۔ جس سے وہ قطعی مبرا تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس کی تعریف کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ مگر حسن و خوبصورتی

کے معاملے میں اس کا فلسفہ ہی مختلف تھا۔ جس میں انسان کا اختیار ہی نہیں اس پہ اترانا کیسا۔ یہ بات کچھ دیر پہلے اس نے امبر کے ستائشی کلمات کے جواب میں کہی تھی۔
"مگر تم جا کہاں رہی ہو؟" پھر اس نے پوچھا تھا۔
"پھوپھو کے ہاں! جمیل بھائی کے بیٹے کا برتھ ڈے ہے۔"
"تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "جاؤ مزے کرو۔ یوں بھی سارا دن اس کمرے میں بیٹھ کر تم نے ضائع ہی کیا ہے۔ سوائے یہ چار پانچ سنے کلمے کرنے کے!" اس کی زائل اشارہ دیکھتے ہوئے روادار تھی۔
"میں گھر سے اتنی دور اسی مقصد کے لیے آئی ہوں، ظاہر ہے میری اولین ترجیح بھی یہی ہونی چاہیے۔" وہ اپنے پلان کے بری طرح فیل ہو جانے پر یوں بھی فرسٹریشن کا شکار تھی۔
"مائی گاڈ رائٹ! اور غالباً اس شخص کی اولین ترجیح بھی اس وقت تمہارا انتظار ہے۔"
حرا نے سینڈل کا اسٹریپ باندھتے ہوئے چونک کر سر اٹھایا۔ امبر بے نیازی سے کھڑکی سے باہر یقیناً ڈرائیو وے کی طرف متوجہ تھی۔ وہ خاموشی سے شولڈر بیگ لٹکائے نیچے چلی آئی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق فروک کے بجائے مزمل اس کا منتظر تھا۔ نشست سنبھالتے ہی اس نے بے اختیار ہاسٹل کی بالائی منزل کی طرف دیکھا۔ امبر اپنی جگہ پر موجود اور "بائے" کا اشارہ دیتے ہوئے ہنس رہی تھی۔
"کیسی عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔ زندگی کو کس کس انداز سے انجوائے کرنے کے ڈھنگ جانتی ہے۔" اسے اب امبر سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔
"گاڑی یہاں روکیں پلیز۔ مجھے عثمان کے لیے گفٹ لینا ہے۔" گفٹ شاپ کے آگے سے گزرتے ہوئے اس نے جھٹ کہا۔
"چھوڑیے آپ کون سا دل سے شریک ہو رہی ہیں۔" اس کے جواب اسی قسم کے ہوتے تھے پھر بھی حرا کو غیر متوقع سی بات محسوس ہوئی اس نے جھلا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔
"فی الحال مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"
"مجھے آپ کی کسی ضروری بات کو نہیں سننا ہے۔" اس نے بھی رکھائی سے جواب دے دیا۔
"چلیے یونہی سہی۔ مگر اتنا تو بتا دیں کہ آخر سرفراز صاحب کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"
بے اختیار اس کا چہرہ گھوما اور وہ اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ دل میں عجیب سے خدشات نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ وہ پورے انہماک سے ڈرائیونگ میں مگن تھا۔
"گزشتہ کئی روز سے موصوف مسلسل فون پر آپ سے بات چیت کے خواہاں ہیں۔ کوئی عام فہم زبان ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں ہے۔"
اس نے تاسف سے بوجھل گہرا سانس آزاد کیا اور دوبارہ رخ موڑ لیا۔
"حیرت کی بات ہے کہ تمام تر کالز ہمارے ہی نمبر پر آتی ہیں۔ اور یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ سب میں نے ہی ریسیو کی ہیں اور اس کی نفسیات کو بھی کافی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ کیونکہ آپ کے ساتھ اس کی گفتگو کا رنگ دیکھا ہے۔ اب باقی لوگ کیا رائے قائم کریں گے اس میں کچھ کہہ نہیں سکتا خصوصاً بڑی اماں!" اس نے ایک نظر گم صم بیٹھی حرا پر ڈالی۔ "شاید آپ نہ جانتی ہوں کہ اگر انہیں اس قصے کی بھنک بھی پڑ گئی تو پہلی فرصت میں اس کو بلا کر..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور پھر فوراً ہی بولا۔ "اور غالباً وہ چاہتا بھی یہی ہے۔"
"اس کے چاہنے یا نہ چاہنے پر بات ختم نہیں کی جا سکتی۔" اس نے تلخی سے کہہ کر گویا اپنی برداشت کے خاتمے کا اعلان کیا۔
"تو پھر آپ کی زندگی میں اس کا رول کیا ہے؟" وہ ششدر رہ گئی۔
"کوئی رول نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اماں کا بھتیجا ہے۔"
"آر یو شیور، کہ کوئی اور وجہ نہیں ہے جو..."

"کیا سننا چاہتے ہیں آپ!" وہ اس کے تفتیشی انداز پر چڑ گئی۔ "میں اس قسم کی لڑکی ہوں جو ایک میرڈ بچے کے باپ میں انٹرسٹڈ ہو جائے؟ آپ کے خیال میں ایسی کیا مجبوری آئی ہے؟"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں حرا!" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے دھیرے سے ہنس دیا۔ "کسی کی مجبوری ہی اس کی کمزوری بن جاتی ہے، دوسرے فائدہ اٹھاتے ہوئے ناحق حق جتانا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی حوالے سے مضبوط پشت پناہی اسے بھی حاصل ہوگی جو وہ اتنی بڑی جرأت کر رہا ہے۔"

"ہاں، یہ اندازہ تو کوئی بھی لگا سکتا ہے۔" اس نے گویا جتایا کہ تمہاری بات سے مجھے اتنا متاثر نہیں کیا۔ "اور نجانے کب تک یہ مضبوط لوگ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اور ان کی حرکتیں مجھے کہاں اور کس کس کے سامنے شرمندہ کرتی رہیں گی۔"

ونڈ اسکرین کے پار ٹریفک کے ہنگامہ کو دیکھتے ہوئے اس نے گہرے دکھ سے سوچا۔

اس کے ذہن میں تھا کہ وہ سرفراز کو سختی سے ڈانٹ چکی ہے بعد دوبارہ ایسی حرکت کی جرأت نہیں کر سکے گا اور یہی اس کی غلط فہمی تھی جواب حقیقتاً پریشان کن صورت حال سے دوچار کر چکی تھی۔ مزمل نے گاڑی ایک گفٹ شاپ پر روک دی۔ اسے سوچوں میں گم لاتعلقی سے بیٹھا دیکھ کر، ڈسٹرب کیے بغیر خود ہی گفٹ خرید لایا۔ گاڑی دوبارہ چل پڑی، وہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"مسائل کا بہترین حل تب ہی نکل سکتا ہے جب کسی پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی پلاننگ میں شریک کیا جائے!"

"میں اس مسئلے کو خود ہی ہینڈل کر لوں گی۔" اس نے اس موضوع پہ مزید بحث ختم کرنا چاہی۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے، میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بروقت امداد کے لیے آپ کے آس پاس اور بھی قابل اعتبار لوگ موجود ہیں۔" ایک لمحے کے لیے حرا کو تمام تر پریشانی کے باوجود اپنا وجود ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہوا۔

"جن کے خلوص کو آپ وقت بے وقت آزما سکتی ہیں۔ بغیر آنسو بہائے!"

اور دوسرے ہی لمحے وہ پھر زمین پر لا پٹخی گئی تھی۔ اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے چلتی ہوئی گاڑی سے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ اس کی مسکراہٹ جلتی پر تیل کا کام دے رہی تھی۔

سب لوگ برابر نہیں ہوتے، بدلتے حالات نے اسے یہ سبق سکھایا ضرور تھا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھار اندازہ لگانے میں گڑبڑ ہو ہی جاتی تھی۔

"یہ لیجیے مشان کے لیے آپ کا گفٹ۔" گاڑی رکی تو اسے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ بولا۔

"میرا نہیں ہے یہ، آپ نے خریدا ہے اس لیے آپ ہی دے دیجیے گا۔" وہ پلٹ کر دیکھے بغیر بولی تھی۔

"بہت بہتر، بات بھی صحیح ہے۔" اس نے نہایت تابعداری سے جواب دیا۔ جو اس نے اترتے اترتے سن لیا۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تم سے ناراض ہی رہوں، مگر تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ خواہ مخواہ ہی معاف کرنے کو دل چاہ رہا ہے!" مشن ادھر ادھر میں ہی مل گئی۔ اندر اک ہنگامہ برپا تھا۔ سارے اپنے ہی فیملی ممبرز تھے۔ باہر کے لوگ بہت کم تھے، مگر پھر بھی کان پڑی آواز سنائی نہ دینے والا معاملہ تھا۔ اس کے دل و دماغ پارٹی میں کم اور تازہ ترین پریشانی میں زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ "کیا پتہ ویک اینڈ پر ایک نئی خبر میری منتظر ہوا کرے گی۔"

کیک کٹتے ہی مشن اپنی دوستوں اور سارہ بھابی کی بہنوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ان کے درمیان بیٹھی رہی۔ پھر شاید اس کی بے چین طبیعت نے تنگ کیا جو وہ ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹیبل پہ رکھ کر دوبارہ وہاں جانے کے بجائے عمرانہ چچی کے برابر آ بیٹھی۔ وہ بہت دیر سے ان کی نظروں کے حصار میں تھی۔ قریب آئی تو انہیں بھی بات چیت کا موقع مل گیا۔

"اکیلی آئی ہو؟" احوال پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جانے کیسے عظیم بھائی تمہیں یہاں وہاں تنہا بھیج دیتے ہیں، میری عاصمہ تو ہمسائے میں جاتے ہوئے

بھی گھبراتی ہے۔" ان کا اندازِ گفتگو شروع سے ہی ایسا تھا، پھر بھی اُسے حیرت تھی کہ وہ بڑی اماں کے پاس اتنا عرصہ کیسے گزار پائی تھیں۔ شاید کسی مصلحت کے تحت یا پھر کسی غرض کے پورا ہونے کے امکان کے ہاتھوں، وہی غرض جو ثمن نے بتائی تھی۔ وہ ان کے لفظوں پر غور کرنے کے بجائے الفاظ اور باتوں پر سوچتی رہی۔

"سنا ہے عظیم بھائی تمہارا رشتہ سرفراز کو دینا چاہ رہے ہیں؟" وہ ایک دم سنّاٹے میں آگئی۔ اس بات کی شہرت کہاں تک جا پہنچی ہے۔ اس رُخ پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ وہ عقب سے چائے کی دو پیالیاں تھامے برآمد ہوا۔

"یہ لیجیے چچی! چائے۔ اور حرا آپ کی چائے ٹیبل پر رکھی ہے۔" اس نے ایک کپ عمرانہ چچی کو تھماتے ہوئے کہا تو اس نے بھی فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دوسرا کپ وہ غالباً اپنے لیے لایا تھا۔ اور اب اس کی خالی کردہ جگہ پر بیٹھ گیا تھا۔

"میری زندگی میں سرفراز کا رول اور نام نہاد تعلق اب اس کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔" اُسے یقین تھا وہ عمرانہ چچی کی بات سن کر ہی ان کی طرف آیا تھا۔ اس نے اپنی توجہ حمزہ کی طرف کی، جو سارہ بھابی کی مدد کرواتے ہوئے چائے پیش کر رہا تھا۔ ایک کپ اُسے بھی پیش کرنے لگا۔

"شاباش! سارہ بھابی کو تمہاری موجودگی میں نند کی کمی محسوس ہو ہی نہیں سکتی۔" ثمن نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"یار! کچھ خیال کرو، کیوں دو شیزاؤں کے درمیان میری پوزیشن خراب کرنے پہ تلے ہوئے ہو!"

"کوئی پوزیشن خراب نہیں ہوگی تمہاری۔ جاؤ ذرا اپنا گٹار لاؤ۔ اچھا سا گانا سنتے ہیں تم سے۔" ثمن نے کہا۔

"سوری یار! پہلے ہی تمہاری گرین سوٹ والی دوست مجھے بہت غور سے دیکھ رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو میرا گانا سن کر۔" وہ شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے رکا۔

"بے ہوش ہو جائے۔" ثمن نے جل کر لقمہ لگایا۔

"چلو حمزہ! آج تمہارا مظاہرہ دیکھ ہی لیتے ہیں۔" حرا نے اکسایا اور وہ گٹار اُٹھا لایا۔

"کمال ہے، بڑی اماں نے اسے گانے کی اجازت دے دی۔" عمرانہ چچی نے حیرت سے شاہدہ آنٹی سے پوچھا۔

"جو شوق حد میں رہ کر پورے کیے جائیں، خامے بے ضرر ہوتے ہیں عمرانہ! شکر ہے خدا کا، میرے بچے بڑی اماں کی بات سمجھ لیتے ہیں۔" انہوں نے رسانیت سے کہا اور عمرانہ چچی خاموش ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر اُبھر آیا تھا۔ حرا کو وہ اس لمحے قابلِ رحم محسوس ہوئیں۔ ایسی محبتیں اور رونقیں تو قسمت والوں کو ہی ملا کرتی ہیں۔ وہ آج ان سب سے کس قدر فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔

"شام سے پہلے آنا

دھوپ ساری ڈھل رہی ہو

پھول سارے کھل رہے ہوں

موسم سارے لے آنا"

حمزہ بڑے جذب سے گا رہا تھا۔

"تم تو چھپے رستم نکلے، بہت اچھا گا لیتے ہو!" اس نے پاس سے گزرتے ہوئے روک کر کہہ دیا۔

"آپ کی قدر نوازی ہے حرا جی! ورنہ بندہ کس قابل۔" وہ نہایت عاجزی سے گویا ہوا۔ "حالانکہ جب میں میڈیکل کالج میں تھا تو باقاعدہ ایک میوزیکل گروپ جوائن کر لیا تھا۔ مگر پھر بڑی اماں کا قول سامنے رکھ کر پوری طرح دل بھر گیا۔" اس نے منہ بنایا اور وہ ہنس پڑی۔

عمرانہ چچی اور ذیشان انکل کھانا کھاتے ہی روانہ ہو گئے، دیگر لوگ بھی باری باری چلے گئے۔ تو حمزہ اور عثمان گفٹس کھولنے لگے۔ ڈھیروں کھلونے اور اپنی دلچسپی کی چیزیں پا کر عثمان انہیں اُلٹ پلٹ کرنے میں مگن ہو گیا۔

"ارے! یہ گفٹ کس کی طرف سے ہے، رائٹنگ تو مزمل بھائی کی ہے مگر۔" اس کے ہاتھ میں اب وہی پیکٹ تھا جو مزمل اس کی طرف سے خرید لایا تھا اور اب وہ پڑھتے پڑھتے رک کر مسکراتے ہوئے حرا کو دیکھ رہا تھا۔

"حرا جی! غالباً پین کے ساتھ ساتھ آپ نے رائٹنگ بھی اُدھار مانگ لی۔" وہ شوخی سے بولا۔
اور وہ سمجھ گئی کہ اس کے منع کرنے کے باوجود مزمل نے گفٹ اس کی طرف سے ہی پیش کر دیا ہے۔
"تمہیں اعتراض کس بات پر ہے، قلم اُدھار لینے پر یا ہاتھ؟" مزمل نے سنجیدگی سے جواب پیش کیا۔
"اہم! کسی پر نہیں، ہم بھلا اعتراض کر سکتے ہیں؟" اس نے سو وٹ بننے کا ناکام مظاہرہ کیا۔
"اور یہ گفٹ تو عثمان کے لیے بھی سب سے زیادہ اہم ہوگا۔ پیکٹ سے برآمد ہونے والی ویڈیو گیم دیکھ کر وہ بولا۔
"یار عثمان! کتنے فائدے میں رہتے ہو تم چند گھنٹوں میں کتنا مال جمع کر لیا۔"
وہ اس ساری گفتگو سے بے نیاز ثمن کے ساتھ بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس بھی یکدم اُجاگر ہونے لگا تھا، اُسے واپس بھی جلدی پہنچنا تھا۔ پھوپھو کو خدا حافظ کہنے کے لیے وہ ان کے پورشن میں چلی آئی۔
"جا رہی ہو بیٹھو! زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" وہ اُسے عجلت میں دیکھ کر ہاتھ میں پکڑی چیزیں ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔
"آج صبح عظیم کا فون آیا تھا، بہت پریشان تھا۔" اُن کے تاثرات پڑھتے ہوئے اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ اب پھوپھو بھی اُسے ہی قائل کرنے کی بات کریں گی، سب راستے بند نظر آنے لگے تھے۔
"معاملہ اتنا ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ جائیداد کے جھگڑے تو یونہی طول پکڑ لیتے ہیں۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ نہ ہی تم نے کوئی ذکر کیا، نہ عظیم نے۔" وہ شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھنے لگیں۔
"مجھے اصل معاملے کا علم ہی نہیں تھا، میں آپ کو کیا بتاتی؟"
"احسان بھائی کے ڈھیروں وکیل دوست ہیں۔ بروقت پتا چلتا تو معاملہ یقیناً بہتر طریقے سے حل ہو جاتا۔" انہوں نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں، اپنی ہی کہتی رہیں۔
"چلو اگر مسئلہ آن ہی پڑا تھا تو اس قدر لالچی لوگوں کا احسان لینے کی ضرورت ہی کیا تھی جو فوراً ہی بدلے میں اتنا مہنگا مطالبہ کرنے لگیں۔" اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا، سوائے ان کے حصے کی ڈانٹ اور شکوے وہ چپ چاپ وصول کرتی رہی۔
"میں نے عظیم سے صاف کہہ دیا ہے، جس بات پر خود میرا دل راضی نہیں ہے۔ اس پر تمہیں کیسے آمادہ کر سکتی ہوں، بہرحال تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔" وہ اس کے کندھے تھامتے ہوئے بولیں۔ اور حرا کو محسوس ہوا جیسے سارا بوجھ اس کے شانے سے ان تک منتقل ہو گیا ہو۔ سکون بھرا گہرا سانس آزاد کر کے اُس کا دل خوشی کے احساس سے بوجھل ہونے لگا کہ اگر وہ انہیں اپنا بڑا حامی تصور کرتی ہے تو یہ کوئی غلط بات نہیں تھی، وقت نے مختلف مرحلوں پر اس کا ثبوت پیش کیا تھا۔
"تھینک یو پھوپھو!" وہ ممنونیت سے انہیں دیکھتی الوداع کہہ کر نیچے چلی آئی۔
"چلو نعمان! مجھے [ہاسٹل چھوڑ آؤ]۔" نیچے محفل اُسی طرح جمی ہوئی تھی۔
"تمہیں اتنی جلدی کیا ہے، تھوڑی دیر بیٹھو، چھوڑ دیں گے۔" ثمن فوراً بولی۔
"لو بھلے کا کہہ کر آئی تھی وارڈن سے، وعدہ خلافی بُری بات ہے، چلو اچھو بھی۔" وضاحت کرتے ہوئے اُس نے باری باری اُن دونوں کو گھورا جو ٹی وی ڈرامے میں مشغول تھے۔
"ہم دونوں پر شام سات بجے کے بعد ڈرائیونگ پر پابندی عائد ہے جس کے ساتھ آئی ہیں انہی کے ساتھ جانا پڑے گا۔" حمزہ کا انداز معنی خیزی لیے ہوتا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"ٹھیک کہہ رہے ہیں، بیچارے بڑی اماں نے ان کی رش ڈرائیونگ کے پیش نظر یہ پابندی لگائی ہے۔ تمہیں مزمل بھائی ہی چھوڑیں گے۔ بلکہ چلو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔" ثمن جلدی جلدی جوتے پہننے لگی اور وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر اُس کے ساتھ باہر آ گئی۔
"دو روز کے لیے آپ کے شہر جا رہا ہوں، عظیم انکل کو کوئی میسج دینا چاہیں تو دے دیں۔" راستے میں

سے زیادہ کٹ گیا تو وہ ان دونوں کی گفتگو میں مخل ہوا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی، جی میں آیا کہ ابا کے زمین کے جھگڑے سے اُسے آگاہ کرے شاید یہ اُن کی کوئی مدد کر سکے، مگر پھر خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی۔

"ہر چند کہ یہ پہلے دن کے تاثر کی نسبت بہت مختلف نظر آنے لگا ہے، پھر بھی یہ ضروری تو نہیں کہ میرے ہر مسئلے کا حل بھی اسی کے پاس ہو۔"

"کوئی مشکل بات ہے تو بلا تکلف کہہ دیں۔" ہاسٹل کے باہر گاڑی روکتے ہوئے وہ اُسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر مسکرایا۔

"گڈ آئیڈیا!" وہ ہنس ہنسی۔

"ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں جو فوری طور پر آپ تک پہنچانا ضروری ہو۔" اُس نے ہاتھ ہلایا اور بیگ سنبھالتی گیٹ عبور کر گئی۔

رات بہت دیر تک وہ دن بھر کے حالات کا تجزیہ کرتی رہی۔ اور پھر اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ سرفراز کی حرکتیں برداشت ناقابل ہی سہی، مگر وہ فی الحال ابا کو مزید ڈسٹرب نہیں کرے گی۔ اُس کی سوچ میں یہ تبدیلی پھوپھو سے آج ہونے والی گفتگو کے بعد رونما ہوئی تھی۔

"واقعی میرے اس پاس بہت سے لوگ موجود ہیں، جن کے خلوص کو آزمایا جا سکتا ہے بغیر آنسو بہائے۔" اپنی سوچ پر وہ خود ہی بے اختیار ہنس پڑی۔

"اردو بازار تک جا رہی ہوں، چلو گی؟"

امبر نے آفر کی تو وہ بھی تیار ہو گئی، کہ سٹیشنری کی چند چیزیں چاہیے تھیں۔

"تمہیں یہاں کے سب راستوں سے واقفیت ہے؟"

اُس نے راستے میں امبر سے پوچھا۔

"نہیں، مگر بے فکر رہو تم، ہم گم نہیں ہو سکتے۔" وہ ہنسی۔ "ہمیں اپنی بہت سی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وقت آنے پر نمایاں ہوتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں وہی لڑکی ہوں، جو کبھی تنہا گھر سے نہیں نکلی تھی۔ اور جس نے یہ شہر پہلی بار دیکھا ہے۔" پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔

"ان چار سالوں نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اعتماد شرط ہے۔ اپنی ذات پر اعتماد۔ پھر آپ دنیا بھی فتح کر سکتے ہیں۔"

اُداسی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی پُرعزم بات حرا کے دل کو چھو گئی۔

"ہر شخص اپنی ذات میں کوئی نہ کوئی خلا لیے پھرتا ہے۔ محرومی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔" اُس نے دین کی کھڑکی سے باہر تیزی سے پیچھے رہ جانے والے مناظر پہ نگاہ ڈالتے ہوئے یاسیت سے سوچا۔ اور اچانک اُسے شبہ سا ہوا کہ ابھی گزرنے والے اسٹاپ پر جس شخص کی جھلک نظر آئی ہے، وہ سرفراز سے کافی حد تک ملتا جلتا نظر آ رہا تھا۔ مگر پھر اُس نے سوچا کہ یہ اس کا وہم بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل دماغ پہ اس کا بھوت سوار ہے۔

کورس کا اختتام تھا۔ سبھی دلبری معاونات کے تمام تر لوازمات کے ساتھ لیکچرز تیار کیے جاتے، جو اپنی باری آنے پر ماہرینِ تعلیم کے سامنے ڈس پلے کیے جاتے، اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی، پڑھاتے ہوئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ آواز کس حد تک بلند ہو، اور کیسا لہجہ اختیار کیا جائے۔

"اسٹوڈنٹس کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا ہر ٹیچر کی اولین ذمہ داری ہے، اس انداز میں پڑھائیں کہ ان کی دلچسپی برقرار رہے، آپ خود کو ایک ماڈل کی حیثیت سے ان کے سامنے لائیں۔" سر امین نے حسبِ معمول ہدایات جاری کرنا شروع کیں۔

"سچ سچ! ہم جانے کی بے چاری ٹیچر ماڈل بنتے بنتے آج کل کے اسٹوڈنٹس کسی سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔" امبر نے توقع کے عین مطابق اس کے کان میں ہولے سے تبصرہ پیش کیا۔

"جیسے کہ تم۔ اور اب خاموشی سے سنو!" وہ اُسے یونہی ڈپٹ دیتی تھی۔

اسی روز حرا کو اپنا لیکچر ڈسپلے کرنا تھا۔ پہلے سے تیار شدہ چارٹس اور ماڈلز کی مدد سے اُس نے متعلقہ ٹاپک نہایت خوش اسلوبی سے پڑھانا شروع کیا۔ اس کا متاثر کُن انداز اور پُراعتماد لب و لہجہ ساتھی ٹیچرز کے علاوہ پچھلی نشستوں پہ موجود منتظمین نے بھی بے حد سراہا۔

"سکا لگر ہیجولیٹنز مس حیرا! آپ کی لکھائی بہت اچھی ہے اور بلیک بورڈ کا استعمال کرتے ہوئے الفاظ بہت خوبصورتی سے ترتیب دیے ہیں، اپنی پروگریس کو آپ مزید بہتر بنا سکتی ہیں۔" سر امین نے فراخدلی سے اس کی محنتوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ مگر وہ جانتی تھی یہ بھی ان کا ایک انداز ہے، دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا، ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا۔

"یاد رکھیے اسٹوڈنٹس! اس پروفیشن میں آتے ہی آپ کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داری آجاتی ہے، آپ کی توجہ اور لگن اس کام کو آسان بنا سکتی ہے۔" انہوں نے ہر روز کی طرح کلاس کے اختتام پر نصیحت کی۔

"یہ تم نے سر امین کو رشوت دے رکھی تھی، ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تعریف کر گئے آج تو؟" امبر نے ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے اس کے پُرمسرت چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"کیوں نہ کرتے، حقدار تھی آخر، محنت کا صلہ مل جاتا ہے۔"

"اور یہ احتصر۔۔؟"

"چلو کینٹین کی طرف۔" وہ اس کی بات سمجھ کر ہنس پڑی۔

"تم بھی کیا یاد کرو گی، اچھی سی چائے پلواتی ہوں۔"

"یاد تو مجھے بہت کچھ آئے گا۔ یہاں گزرا ہوا وقت، مصروفیت، خوشگوار ماحول اور سب سے بڑھ کر تم۔" سبزہ زار میں لگے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھتے ہوئے امبر نے اداسی سے کہا۔ اس پاس بہت رونق تھی۔

"مگر کتنی عجیب بات ہے، میں تمہارے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جان سکی کہ تمہارا تعلق شمالی علاقہ جات سے ہے، اور یہ اندازہ بھی میں نے تمہارے رنگ و روپ کو دیکھ کر لگایا تھا۔ جو بعد میں ٹھیک نکلا۔"

"اچھا۔" وہ ہنسی۔ "میرے پاس بتانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں، سوائے اس کے کہ میری دو بہنیں اور ایک بھائی ہے، جو آپس میں خوب انجوائے کرتے ہیں۔" وہ بتاتے بتاتے رکی کہ کینٹین والا لڑکا ان کے لیے کوک اور برگر لے آیا تھا۔ امبر نے فرمائش میں چپس بھی شامل کرائی تھی۔ چائے رد ہو گئی۔

"میں بقول تمہارے خاموش طبع جو ٹھہری، پھر میری بہت سی فرینڈز ہیں۔ جن میں میری کزن ثمن سر فہرست ہے، اس نے مجھے بہنوں سے بھی بڑھ کر چاہا ہے، در اصل اس کا پھوپھو کی فیملی سے مجھے شروع سے ہی بہت لگاؤ رہا ہے۔ شاید اسی لیے انہیں بھی میرا بہت خیال رہتا ہے۔"

"اور اس شخص کو بھی، جو تمہیں اکثر لینے آتا ہے۔" کتنی عجیب بات کہہ دی تھی امبر نے۔ وہ بڑی طرح چونک کر اسے دیکھنے لگی، جو اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

حرا نے پھر وہی بے تاثر سا خول چہرے پر چڑھا لیا۔ لاتعلقی کا مظاہرہ کرنے میں تو وہ یوں بھی ماہر ہو چکی تھی۔

"شاید تم نے غور نہ کیا ہو، مگر یہ سچائی اس کے چہرے سے جھلکتی ہے، کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"تمہارا سر۔۔!" وہ جھلا کر بولی۔ "فضول باتیں کرنے میں تمہارا مقابلہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔"

"سچ سچ، سر امین اگر اس وقت تمہاری گفتگو سن رہے

ہوتے تو سارے ستائشی کلمات واپس لے لیتے۔" اُس سے اپنی ہنسی دبانا مشکل ہو رہا تھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا، میں جو ہوں، سو ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ہاں! یہ کہہ دینا آسان ہے، مگر برداشت کرنا اتنا ہی مشکل، دوسروں کی رائے ہماری زندگی پہ بہت اثرانداز ہوتی ہے۔" اُس نے بوتل سے آخری سپ لیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کچھ لوگوں سے اپنے بارے میں صرف اچھا سننے کی آرزو رہتی ہے، ان کی موجودگی لاشعوری طور پہ سکون کا باعث ہوتی ہے، میں نے محسوس کیا ہے، تمہارے اندر کوئی خوف پاؤں جمائے بیٹھا ہے، جو اس شخص کی موجودگی میں بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔"

امبر بڑی بے رحمی سے اُس کے بارے میں اپنے کئی روز کا مشاہدہ پیش کرنے میں مصروف عمل تھی۔

"قیافہ شناسی۔ ہونہہ۔ ہے کچھ لوگوں کو اس میں مہارت۔" اپنے اندر پھیلی افسوسناک حیرت کو کم کرتے ہوئے اُس نے سوچا۔

اس حقیقت کا ادراک تو اُسے بہت پہلے ہو چکا تھا، مگر وہ خوش فہم دل کی ہر بات جھٹلانے پر عمل پیرا تھی۔ اُس نے کہیں پڑھا تھا کہ "ہر انسان کے اندر بند دریچے اور کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ وقت، ماحول اور آگاہی کے مرحلے طے ہوتے ہی ان بند کھڑکیوں پہ دستک ہونے لگتی ہے۔"

وہ بھی بڑی شدومد سے اپنے اندر کھلنے والے بند دریچے کو بند کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ یہ انکشاف اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کہ وہ اپنی کوشش میں بری طرح ناکام رہی ہے، اور یہ بات تو اُس کے چہرے پر صاف لکھی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔

"جب کبھی موقع آئے تو دل کی بات ضرور سننا، ساری عمر خود کو آزمائش میں ڈالنے سے بہتر ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے وقت اتنی مہلت شاید ہی دے۔" اُس نے تھک کر سوچا۔

"میں بہت حقیقت پسند لڑکی ہوں امبر، آئیڈیلز کی دنیا میں رہنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اُس نے گویا آہستگی سے اعترافِ شکست کر لیا۔

"لیکن کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں، بعض اوقات خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے، ہو سکتا ہے، خدا تم پر بھی مہربان ہو جائے۔"

جہاں سچائیاں اپنے تمام تر بھیانک روپ کے ساتھ ہر پل آنکھوں میں کھبی رہتی ہوں۔ ان آنکھوں میں کوئی جنین، خوش آئند خواب کیسے اتر سکتا ہے، اُسے حیرت ہوئی تھی، اتنے تلخ تجربے کے باوجود امبر اتنی پُرامید باتیں کیسے کر لیتی تھی، وہ الفاظ تھے یا انگارے جو آج بھی اس کی سماعت کو سلگاتے رہتے تھے، جو اماں نے اپنی بھابی کو اس کا عندیہ بتاتے ہوئے کہے تھے۔

"چار لفظ زیادہ پڑھ لکھ جانے سے حیثیتیں نہیں بدلا کرتیں۔ عظیم کی صاحبزادی کو کون کھلائے گا اس کے ناز اٹھانے کے لیے یہاں کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔"

سطحی سوچ کے حامل لوگ، ایک مفلس دل کی خوشی کا اندازہ جان ہی نہیں سکتے۔ میرے لیے اس سے پُرمسرت بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں خود کو نامناسب ماحول میں ضائع ہونے سے بچا لوں۔ جو ہو سو ہو، یہ تو طے ہے کہ سرفراز کسی بھی صورت قابلِ قبول نہیں ہے، شاید امبر ٹھیک کہتی ہے، ساری عمر خود کو آزمائش میں ڈالنے سے کہیں بہتر ہے کہ بروقت صحیح فیصلے تک پہنچا جائے۔ کئی راتوں سے سوچ کا دراز سلسلہ بالآخر اسی نتیجے پہ آ کر رُک گیا تھا۔

"تھینک یو امبر!" اس نے دوسرے بیڈ پہ بے خبر سوئی امبر کو مشکور نظروں سے دیکھا اور سرہانے ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں آنکھوں سے بہت دور بھاگی نیند کو واپس لانے کے لیے کتاب تھام لی۔

وہ اپنی کئی روز سے بکھری چیزیں سمیٹ کر بیگ اور سوٹ کیس میں جمع کر رہی تھی، جب وزیٹرز روم سے اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر عجلت میں چلی آئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ گمان تک نہیں تھا کہ اس کا منتظر شخص وہ ہوگا، جس کا نام سننا ہی اس کی برداشت کا امتحان تھا۔ سرفراز کی شکل دیکھتے ہی اعصاب تن گئے، وہ طمانیت کا

کو آخر جو وہ بمشکل اپنے چہرے پر قائم کر سکی تھی، یکدم غائب ہو گیا۔
"عظیم پھوپھا نے کہا تھا تم سے ضرور مل کر آؤں۔"
"خیریت؟" ماتھے پہ بل ڈالے خاصی ناگواری سے پوچھا۔
"ہاں! وہ تمہارا کوئی کزن آیا تھا ادھر، کیا نام تھا اس کا۔ ہاں، مزمل! کہہ رہا تھا تم بڑی اداس ہو رہی ہو۔ لیکن تم تو بڑی خوش ہو یہاں۔ پتا نہیں تم نے اسے اور کیا کچھ بتا دیا ہے مقدمے کے بارے میں، کچھ سے کو سیدھے منہ بات نہیں کی، اور پھوپھا کو بھی بجائے کیا پٹی پڑھا گیا ہے۔ کہتے ہیں، پہلے مخالف پارٹی سے ملاقات کر دوں گا۔ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔ اور جو پیسہ میں نے پانی کی طرح بہایا ہے، ضائع ہو جائے گا۔"
"یہ ابا کے مسائل ہیں۔ انہیں جا کر بتائیں میرا ان باتوں سے کیا تعلق؟" وہ اس کی لمبی چوڑی فضول کی حکایت سنتے سنتے تنگ آ کر رکھائی سے بول پڑی۔
"معاملہ تمہاری وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔ آپس کی رشتہ داری میں خوامخواہ کی رنجش آئے گی۔ مجھے تمہارا اس شخص سے میل جول بالکل پسند نہیں ہے۔"
"سرفراز صاحب! میں آپ کے کسی حکم کی پابند نہیں ہوں۔" شدتِ برداشت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"نہیں ہو۔ تو چند دنوں کی بات ہے ہو جاؤ گی، تمہارا کورس کب ختم ہو رہا ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے جا کر شاپنگ کروانا چاہ رہا تھا۔" وہ ــــ حد درجہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔
"مجھے آپ کے کسی فضول کام میں شریک نہیں ہونا ہے۔ اور براہِ مہربانی آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہیں کیجیے گا۔"
"اس وقت تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں پھر آؤں گا۔" وہ کمالِ اطمینان سے مسکرایا۔ اور وہ اس کے رویے پر کھولتی ہوئی باہر نکل آئی۔
کس قدر گھٹیا انسان ہے یہ، کتنی بے وقوفی سے ناحق، نام نہاد تعلق کی بنا پر حق جتانا چاہتا ہے، نہ میرے پاس اتنے پیسے ہوتے کہ اس کا احسان اسی کے منہ پر مارتی اور یہ مزمل نے کیا کچھ کہہ دیا وہاں جا کر۔ میری تو اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی اس سارے سلسلے میں۔ خیر اسے بھی دیکھ لوں گی۔"
اس کے بس میں محض جلنا اور کڑھنا رہ گیا تھا، سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اگلے دو تین دنوں میں ماسی مختار "ملاقات ہے" کا اعلان کرتی رہی، مگر اس نے حیلے بہانوں سے ٹال دیا۔ جو کوئی بھی ہے کہہ دو بہت مصروف ہوں۔ ان ہی دنوں میں گیٹ ٹو گیدر پارٹی کا اہتمام کیا جا رہا تھا جس میں تمام ممبرز کو کورس اٹینڈ کرنے کے صلے میں سرٹیفکیٹ دیے گئے، اسی روز وہ چند دن اپنا پھوپھو کے ہاں گزارنے کے ارادے سے چلی آئی۔ چھٹی بھی ختم ہونے والی تھی بلکہ واپس بھی پہنچنا تھا۔

"آپ ابا سے ملے تھے؟" آتے ہی اس نے سوال داغ دیا۔
پھوپھو نے کچھ دیر قبل ہی مزمل کے لیے چائے کا کپ لے جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ بخوشی اس لیے چلی آئی تھی کہ اس سے چند باتیں صاف صاف پوچھنا تھیں۔ وہ غالباً ستانے کے ارادے سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آمد پہ اٹھ بیٹھا اور خاصی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا۔
"جی ہاں! آپ کا سوال پوچھ رہے تھے، تشریف رکھیے۔" اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے سامنے بچھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
"شکریہ! میں صرف یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ کی ابا سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟"
"مجھے اگر ذرا سا بھی شک ہوتا کہ آپ کو جواب دینا پڑے گا، تو میں ساری باتیں لکھ لیتا۔" یہ تو طے تھا کہ وہ اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ مجبوری بھی اس کی ہے، سوا نا کا یہ عم تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی اسے ہی جھکانا پڑے گا۔ اس کی شوخ مسکراہٹ پہ وہ اپنی جھنجلاہٹ پہ بمشکل قابو کر پائی۔
"کیسے تھے وہ؟" اس نے مختصراً پوچھا۔
"بظاہر تو ٹھیک ہی تھے لیکن مقدمے نے پریشان تو کر رکھا ہے، یقینی بات ہے۔"

"اور آپ انہیں مزید غلط مشورے دے آئے۔"

"مثلاً۔؟" وہ چونکا۔

"مثلاً۔ یہ کہ مخالف پارٹی سے مل کر مقدمے کو اور بڑھایا جائے۔ ان لوگوں سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بہت خطرناک لوگ ہیں وہ۔" اُس نے خالی دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بہت انفارمیشن ہیں آپ کو۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "پھر تو بتانے والے نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں نے یہ مشورہ انہیں کیوں دیا ہے۔"

"میں ابا کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی۔ مگر پھر بھی چاہوں گی کہ انہیں مزید پریشانی نہ ہو۔"

"جن مسائل سے آپ کا تعلق ہی نہیں ہے' ان کے لیے آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔"

"تعلق بنتا ہے: ابا جتنا اس ذلیل شخص کے احسانات کے بوجھ تلے دبتے چلے جائیں گے' وہ اتنا ہی سر پہ چڑھتا جائے گا۔" اُسے غصہ بہت کم آتا تھا مگر اب بات بے بات آنے لگا تھا۔ بے ساختہ اُسے گھورنے لگی۔

"تو چڑھ جائے۔ ہم بھی اتارنا جانتے ہیں۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"یہ ضروری ہے کہ آپ خوامخواہ کے اندیشوں میں دبلی ہوتی رہیں۔ بائی دی وے! یہ اطلاعات آپ کو کس نے دی ہیں۔"

"آپ کا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے اُلٹا سیدھا جواب دے کر باہر آگئی۔

"تعلق تو بنتا ہے' مگر آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" وہ با آواز بلند بولا تھا۔

"خیر دیکھ لیں گے اس رقیب روسیاہ کو۔" چائے کا کپ ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنسا تھا۔ وہ سیدھی شمس کے پاس چلی آئی۔ بے چاری نائلہ ایم اور وہ ہاسپٹل ڈیوٹی کے چکروں میں اُلجھی رہتی تھی۔ اور اکثر ہی معذرت کرتی کہ وہ اُسے اتنی توجہ اور کمپنی نہیں دے پا رہی' جس کی وہ حق دار ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے سوفٹ ٹیسٹ کی تیاری کی غرض سے کچھ دیر قبل ہی اناٹومی کی کتاب لے کر بیٹھی تھی کہ نعمان اور حمزہ تھکے ہارے ان کے پاس آ بیٹھے۔ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی' کوئی بورسا پروگرام چل رہا تھا۔

"یہ تم لوگ آج سارا دن کدھر آوارہ گردی کرتے رہے ہو؟" اُس نے باری باری ان دونوں کو گھورا۔

"چھوڑ دوست' یہ پوچھ' تم جل کر کباب ہو جاؤ گی۔" نعمان نے چھیڑا۔ "فشنگ کرنے گئے تھے منگلا ڈیم پہ۔ حمزہ نے لائسنس بنوایا تھا۔ سوچا چلو یہ کام بھی کر دیکھتے ہیں۔"

"بڑا تیر مارا ہے جو اتنا اترا رہے ہو اور ذرا خیال نہیں آیا ہمیں بھی لے چلتے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"بری بات ہے' پڑھنے والے بچے ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔" حمزہ نے انگلی سے ٹہیں کا اشارہ کرتے ہوئے اُسے تاؤ دلانا چاہا۔

"تو اور کس طرف دھیان دوں؟ جیسے جیسے فائنل ایگزام قریب آ رہے ہیں' پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اس لیے تو کہتا ہوں۔ اس بار تمہارا پاس ہونا مشکل ہے۔"

"مسٹر اچھا نہ ہو تو بات ہی ایسی کر دیا کرو جیسے تمہیں الہام ہوا ہے ہو!" وہ اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

"یہی سمجھ لو۔ توجہ چاہیے ہوتی ہے ہر کام کے لیے۔"

"مثال کے طور پہ ادھر دیکھو' کس قدر توجہ سے قوالی سنی جا رہی ہے۔" نعمان نے اٹھ کر حمرا کی طرف اشارہ کیا جو اسکرین پر نگاہیں جمائے بظاہر ان کی گفتگو سے بے نیاز تھی' مگر سب سن رہی تھی۔

"کیوں! کیا کہنا ہے تم کو مجھ سے' کہیں باہر لے جا رہے ہو؟" نعمان کو گھورتے دیکھ کر اُس نے کہا۔

"لو اور سنو! ایک نہ شد دو شد۔" حمزہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے وہ!" شمس نے بڑے اشتیاق لہجے میں کہا۔ "جب سے آئی ہے بے چاری' ہم کہیں آؤٹنگ پہ نکل ہی نہیں سکے۔ چلو کہیں بھی چلتے ہیں۔ واپسی پہ آئس کریم میں کھلا دوں گی۔"

"معاف رکھو تم مجھے اپنی عنایت خاص سے [illegible] روز ہی ڈبل ہرجانہ وصول کر لیتی ہو۔ یوں بھی ہم لوگ تھکے ہوئے آئے ہیں' اور کل تک کہیں جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔"

"پھر یہاں کیوں آ بیٹھے ہو' اس وقت تو تمہیں بیڈ پہ ہونا چاہیے تھا۔" وہ جل کر بولی۔

"اطلاعاً عرض ہے کہ کچھ ہی دیر میں بڑی اماں یہاں آنے والی ہیں، کھانا سب اکٹھے تناول فرمائیں گے۔ آج کی خاص الخاص ڈش "فرائیڈ فش" کے اعزاز میں۔ اور جاؤ کچن میں! اسلامی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر بننے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خواتین چولہا چوکا کرنا ہی بھول جائیں!"

"چولہا چوکا کرتے ہیں میرے دشمن!" وہ کتاب سنبھالتے بھنا کر کمرے سے نکل گئی۔ حمزہ کے قہقہے نے اس کا پیچھا کیا۔

"کیوں تنگ کرتے ہو اسے اتنا۔ آج کل وہ یوں بھی پڑھائی کی وجہ سے بہت ڈیپریس ہے۔" حرا نے ثمن سے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اسی ڈیپریشن سے تو میں نے اسے بچانا چاہا تھا۔ مگر اس وقت میرے قوم کی خدمت کا بھوت سوار تھا۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "ایک خالی خولی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈگری کی دیلیو ہی کیا ہے۔ اتنا پڑھ کر بھی جب آپ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں، تو سوائے فرسٹریشن کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"پھر تو تمہیں اس کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وہ باآسانی اسپیشلائز کر سکے۔" اس نے رسانیت سے کہا۔

"حرا جی! آپ کے خیال میں وہ پڑھ پڑھ کر خرچ ہو جائے، پھر میرا دھیان کون رکھے گا۔" اس نے پینترا بدلا، اور اسی شوخی سے گویا ہوا، جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔

"اوہ! آئی سی۔" حرا نے حیرانگی سے ہونٹ سکیڑے۔ "گویا خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" ثمن کو خبر ہے اس سادے قصے کی۔"

"نہیں! اتنی سمجھدار ہے نہیں جتنی نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔" اس نے سر کھجایا۔

"اور اگر اس کی سمجھداری میں تھوڑا سا اضافہ میں کر دوں تو۔؟" وہ شرارت سے اسے چھیڑنے لگی۔

"بے کار ہے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "ویسے حرا جی! دھیان رکھنے کے معاملے میں آپ بھی اتنی سمجھدار نہیں نکلیں۔" وہ سناٹے میں آ گئی۔

"کیسا دھیان اور کس کا دھیان؟۔ یہ ہر وقت مجھے کیا سمجھانا چاہتا ہے، یہی کہ میں بے حس ہوں، بہت مضبوط اعصاب کی مالک جس پر کوئی جذبہ کوئی رنگ اثر ہی نہیں کرتا؟" وحشت ایک دم اس کے اوپر سوار ہو گئی۔ بلاشبہ وہ بہت بہادر بھی نہیں تھی۔ مگر اس قسم کا مظاہرہ تو کر سکتی تھی، مگر اس مرحلے پر بھی ناکام رہی تھی۔

ثمن کی پکار پر وہ بادل نخواستہ اٹھی اور کھانے کی میز تک جا پہنچی۔ اس گھر میں روز ہی دعوت کا سماں دکھائی دیتا تھا۔ چار بندے مجڑ کر بیٹھ جاتے تو محفل جم جاتی۔ آج تو سب جمع تھے آوازیں ہی آوازیں تھیں، شور تو اس کے گھر میں بھی اکثر برپا رہتا تھا، مگر اس کا انداز جدا ہوا کرتا تھا۔

کھانے کے بعد سب ادھر ادھر ہو گئے تو وہ کچن میں بکھری چیزیں سمیٹنے میں پھوپھو کی مدد کرنے لگی۔

"جاؤ تم! تھوڑی دیر کے لیے بڑی اماں کے پاس بیٹھو، پھر آ جانا۔" انہوں نے زبردستی اسے بھیجا۔ اور وہ سعادت مندی سے چلی آئی۔ بڑی اماں تسبیح پڑھنے میں مشغول تھیں۔ وہ قریبی صوفے پر بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"مہمان! مزمل بھائی کے ساتھ کوئی آ رہا ہے۔" بالکونی میں ٹہلتے نعمان نے سر اندر نکالتے ہوئے نعرہ لگایا۔

وقت بے وقت مہمان آنا اس گھر کا معمول تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ مہمان اوپر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کا کچھ تعلق براہ راست اسلام پھوپھو سے بنتا ہو گا۔ وہ کمرے کے نیم تاریک گوشے میں سعادت مندی کا مظاہرہ کرنے آ بیٹھی تھی۔ اگر مہمان پر نگاہ پڑتے ہی بدحواسی طاری نہ ہوتی تو شاید وہ اس کمرے سے بھاگنے میں دیر بھی نہ لگاتی۔ مگر اس سے صرف اتنا ہو سکا کہ پاس پڑا اسٹار بار کا دیکھا ہوا میگزین چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"سلام اماں جی!" وہ دروازے کے پاس والے صوفے پر ٹھیر ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"جیتے رہو! مگر! میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

"یس! ہمارا تعارف ہی نہیں کروایا کسی نے اب تک!" وہ یوں کہہ رہا تھا، جیسے اہل خانہ سے زبردست غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ "عظیم صاحب میرے بھیا ہوتے ہیں جی۔ سرفراز نام ہے میرا۔"

"اچھا اچھا۔ خیریت ہے، کسی کام سے آئے تھے۔"

"جی! شہر تو میں کام سے آیا تھا، واپس جا رہا تھا، سوچا! حرا لئے جانا ہوگا، لیتا جاؤں۔"

حرا کے ساکت وجود نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اور اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب تک اس کی تمام تر فضول حرکتوں کی پردہ پوشی کیوں کرتی چلی آئی ہے، یہ ڈھیٹ شخص جانے کیا کیا فضول باتیں کہنے لگا، اب بڑی اماں سے۔

"دیکھو میاں! حرا جیسے آئی ہے، ویسے ہی چلی بھی جائے گی، یوں بھی ابھی اسے یہاں رہنا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں جی! مگر میں کچھ چیزیں لینا چاہ رہا تھا۔" سرفراز جھنجلا گیا۔ "دیکھیں ناں! جس نے استعمال کرنی ہیں، پہننی ہیں، اس کی مرضی ہونی چاہیے۔"

"ہاں! تو میاں تم اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آتے ہوتے، حرا کا کیا کام یہاں!"

"اسے تو میں چھوڑ چکا ہوں، حیرت کی بات ہے اماں جی! آپ کو خبر ہی نہیں ہے کہ اب تو میری شادی حرا سے۔"

"یہ سکینڈ! اس وقت پڑھنا بہت ضروری ہے کیا؟"

اس کے چہرے پر سے نقاب جھپٹ لیا گیا، اس کی تمام تر توجہ بڑی اماں اور سرفراز کے درمیان ہونے والے مکالمے کی طرف تھی۔ مزمل کی آمد کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا، وہ بھونچکا سی رہ گئی۔ "اسے کیا ہوا!"

"کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلا ٹل جاتی ہے؟ اٹھیے، اینلا چچی کو بلا رہی ہیں۔"

وہ حیرانی سے اس کے درشت لہجے پر غور کرتی، خجل سی ہو کر سیدھی کچن کی طرف بھاگی۔ سرفراز نے تیوری چڑھائے خاصی ناگواری سے باری باری دونوں کو گھورا، اس نے پھوپھو کو باہر بھیجا اور خود دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔

"میاں! اتنے بے خبر نہیں ہم، جتنا تم سمجھ رہے ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ جب دوسری شادی ہی کرنی تھی، تو پہلی والی کو کیوں چھوڑا۔ اور عظیم نے کون سا رشتہ تمہیں دے دیا ہے، جو تم حرا کو شاپنگ کے لیے لے جانا چاہ رہے ہو؟" بڑی اماں کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔

"اماں جی! حرا کو میرے ساتھ بھیجنے سے عظیم پھوپھا بھی منع نہیں کر سکتے۔" وہ بھنا گیا۔ "یہاں پر بھی تو ان

لڑکوں کے ساتھ پھرتی ہے وہ، پھر میرے ساتھ کیوں نہیں؟" بڑی اماں کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اس درجہ گھٹیا پن پر اتر آئے گا، حرا لرز کر رہ گئی۔

"میں عظیم کی بھی ماں جیسی ہوں، میں حرا کو منع کر سکتی ہوں، اور یہ جو تم نے کہا کہ ان بچوں کے ساتھ آتی جاتی ہے، تو اس لیے کہ ان پر مجھے اعتماد ہے، انہی کے درمیان اس کا بچپن گزرا ہے اور ان سب کی پرورش میرے سامنے ہوئی ہے، جس کام سے آئے ہو، اس طرف دھیان دو، ادھر ادھر کے اندیشوں میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، وقت آئے گا تو اس کے لیے شاپنگ بھی ہو جائے گی۔" انہوں نے حتمی انداز میں موضوع ختم کر دیا۔

"چلیں! جیسے آپ کی مرضی! مقصد تو چیزیں خریدنا ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو بھی کوئی بات نہیں، یہ پچاس ہزار رکھ لیں۔ باقی۔"

"سرفراز!" بڑی اماں اشتعال میں آگئیں۔ "بہت پیسے ہیں تمہارے پاس! نوٹ دکھا کر کبھی اس کے باپ کو پھنسانا چاہتے ہو اور کبھی بچی کو، جاؤ میاں اپنا کام کرو، اپنا۔ عظیم نہ تو خود اکیلا ہے، اور نہ ہی اس کی بچی بے آسرا ہے۔ ابھی میں موجود ہوں، اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہوں۔ تم ناحق اپنا وقت اور پیسہ ضائع مت کرو۔" بڑی اماں کی صاف گوئی برداشت کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی، سرفراز تک غالباً ان کی شخصیت کا صحیح شعور رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا، اس کی پھنے خانی کی یہاں دال گلنے نہیں دی تھی۔ وہ چلا گیا تو کمرے میں سکوت چھا گیا۔ جیسے کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو، پھر بڑی اماں کی ہی آواز ابھری۔

"حرا کہاں ہے۔ بلاؤ اسے۔" انہوں نے کسی کو اس کی طرف بھیجا تھا۔ وہ جلدی سے انگلی کے پوروں سے نمناک آنکھیں صاف کرتی اسی کمرے کی طرف چلی آئی۔ لیکن اسے آتا دیکھ کر دوبارہ پلٹ گئی۔ اینلا پھوپھو، حمزہ، نعمان اور مزمل سب ہی اپنی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو، میں خود عظیم سے بات کروں گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر بڑی اماں کے پہلو میں بیٹھی تو انہوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے سارے قصے کا زرا دیر سے پتا چلا، لیکن

”ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ عظیم بے چارا اپنی سادگی سے مار کھا جاتا ہے، کیا میں نہیں جانتی یہ سرفراز اور اس کا باپ کس طبیعت کے لوگ ہیں۔؟ اور جہاں معاملہ عمر بھر کا ہو بیٹا! تو بڑوں سے دل کی بات صاف کہہ دینی چاہیے۔ نااتفاقی نہیں ہوتی۔“ وہ اس کے اترتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”چلو اٹھیلا! عظیم کا نمبر ملا دو۔ اس قصے کا ابھی فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔“ وہ انہیں لیے فون والے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ شاید وہ اس کے سامنے یہ ساری گفتگو کرنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

”اصل خرابی ہی یہی ہے کہ کوئی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہتا۔“ بڑی اماں کے جاتے ہی حمزہ کی زبان حرکت میں آ گئی، اور اب اس کے بامعنی انداز سے اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

”یہ کوئی“ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ ثمن نے جرح کی۔

”عقل مند کے لیے اشارا کافی ہوتا ہے، لیکن یہ بڑوں کی باتیں ہیں، تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ اسے تنگ کرنے کے معاملے میں نعمان بھی حمزہ کا ساتھ دینے لگتا تھا۔

”بس یار! بے اعتباری بڑھ گئی ہے، اور سمجھ داری گھٹ گئی ہے۔“ حمزہ نے گہرا سانس لے کر آہستگی سے کچھ اس انداز میں کہا کہ ثمن کے ساتھ ساتھ اسے بھی ہنسی آ گئی۔

”ویسے حراجی!“ اسے مسکراتا ہوا دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ”سرفراز صاحب کا تو قصہ پاک ہوا، آپ اس خوشی میں ہمیں بھی شریک کرتے ہوئے کچھ خیال نہیں کریں گی۔ مثلاً کوئی ضیافت! کوئی دعوت وغیرہ؟“ وہ مزمل کو ٹی وی پہ آتے کرنٹ افیئرز کے پروگرام میں منہمک دیکھ کر سنا سا دھیمی آواز میں بولا۔

”شرم کرو تم! حکومت نے بھی فضول خرچی پہ یعنی دعوتوں پہ پابندی لگا دی ہے۔ تم کوئی موقع ہاتھ سے جانے مت دینا۔“ ثمن نے اسے آنکھیں نکالیں۔

”موقع ہی بہت خاص الخاص ہے، لیکن بات وہی سمجھ سکی ہے، جو تمہارے پاس ہی نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”تمہیں ادھار تو دے رکھی ہے۔“ بڑی اماں کے بلانے پہ وہ اندر جاتے جاتے جواب دینا نہیں بھولی۔

اس کے جاتے ہی محفل برخاست ہو گئی۔ ٹی وی کا شور اور مزمل ہی باقی تھا۔ اس نے بھی گھٹنوں پہ سر ٹکا کے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں موندتے ہوئے اٹھنے کا ارادہ کیا تب ہی ٹی وی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

”آپ غالباً مت جگانے کے موڈ میں ہیں۔ اس شخص سے اظہار ہمدردی کی خاطر!“ وہ گزرتے ہوئے اس کے قریب ٹھہرا حسب عادت بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔

”یہ تو میرا مسئلہ ہوا ناں! آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ ادھار رکھنے کی وہ بھی قائل نہیں تھی۔ جل کر جھکے سر کو ذرا سا اٹھایا اور جملہ داغ کر پھر گرا لیا۔

”درست فرمایا آپ نے اور یوں بھی میری ساری فکریں تو خود بخود ہی دور ہو گئی ہیں۔“ وہ معنی خیز سی ہنسی بکھیرتا ہوا اسے جھونکے کی مانند گزر گیا۔ بے زاری کے شدید حملے کے زیر اثر اس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ اسے روک کر پوچھے آخر وہ کس حیثیت سے اسے تنگ کرتا ہے، اور کیوں؟ کہ اس کا دل کئی روز سے خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے اور نہ رہنے کے چکر میں ہر لرز نار رہتا تھا۔

زندگی پہلے بھی اس قدر ساکت و جامد نہیں تھی۔ مگر جو شور ان چند ہفتوں سے برپا ہو گیا تھا، وہ اسے ایک صبر آزما مرحلے سے آزاد کرا کے نئی کشمکش کا شکار کر گیا تھا۔ وہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے خواب دیکھنے والوں میں سے بھی نہیں تھی۔ اور اس نے اپنے دل کی آواز کو بھی نہیں سنا تھا۔ ان سب حدود کا تعین ہو جانے کے باوجود بے سکونی کیا معنی رکھتی ہے۔

سہ جانے اس حسن تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے ان خوابوں کی قسمت میں تعبیر ہے کہ نہیں
جانے وہ کون ہے میں نے اسے سمجھا کیا ہے
جانے اس کو بھی میرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

اس نے تھکے تھکے انداز میں لفظوں کی بازگشت سنتے ہوئے قدم ثمن کے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

اگلے ایک دو روز یونہی تمام ہوئے۔ ابا نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، بجانے ادھر کے حالات کیا تھے، اور ادھر

تھی اب لوریت اس پر سوار ہو رہی تھی کہ ثمن کے پاس بالکل فرصت نہیں تھی۔ وہ رات دیر تک پڑھتی اور آدھا دن کالج اور سا سپشل ڈیوٹی کی نذر ہو جاتا۔ وہ پھپھو اور پھوپھا سے کتنی باتیں کرتی۔ ثمن کے انتخاب میں موجود ہر قسم کے ناولز اور مختلف نوعیت کی کتابیں بھی چاٹ چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی پھوپھا اسے بازار لے گئے تھے، ضروری چیزیں خریدنے کے بہانے وہ اُسے ملتے روٹ سے گھر واپس لاتے ہوئے، اپنی دلچسپ گفتگو سے اس کے چہرے کی رونق کافی حد تک بحال کر چکے تھے، پھپھو چیزیں سمیٹنے میں مشغول ہو گئیں۔ ثمن بتانے کہ مصر غائب تھی، رات کھانے کے لیے پلاؤ بننا تھا، جس کی ذمہ داری اُس نے سنبھال لی۔ تب ہی وہ ہانپتی ہوئی چلی آئی ــــ ہمیشہ کی طرح، دو دو سیڑھیاں پھلانگنے کے مظاہرے کے نتیجے میں۔ آتے ہی وہ دھپ سے کچن اسٹول پر براجمان ہو گئی۔

"کہاں غائب تھیں تم اتنی دیر سے؟" اُس نے پیاز کاٹتے ہوئے اُسے گھورا۔

"پہلے تم بتاؤ، تم کہاں گئی ہوئی تھیں۔ دو بار تمہیں بلانے آئی تھی، مگر تم ہر بار غائب۔"

"پھوپھا مجھے سیر کرانے لے گئے تھے!" وہ اترائی۔ "اور تمہیں مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔"

"حمزہ بتا رہا تھا۔ مزمل بھائی کے لیے کوئی دوشیزہ پسند آ گئی ہے۔ سارہ بھابی کے جاننے والے ہیں۔ وہ تصویر لائی تھیں۔ میں نے سوچا تم بھی دیکھ لیں۔ اُف خدا! اتنی پیاری لڑکی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔"

ثمن کی پُرجوش آواز اُسے بہت دور سے آتی سنائی دی۔ چند روزہ خوش فہمی میں مبتلا دل مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

"پہلی نظر میں ہی سب کو اچھی لگی ہے۔ شاہدہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ بس چند دنوں میں ہی سارے معاملات طے کر لیں گی۔ کل امی، وہ اور سارہ بھابی اُن لوگوں کے ہاں جا رہی ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے جانے کے لیے۔ مگر چھٹی کرنا مشکل ہے۔ اور یہ تم اتنی ڈھیر ساری پیاز کس لیے کاٹ رہی ہو؟"

وہ منہ بناتی۔ آنکھیں مسلتی ہوئی پونچھنے لگی۔

"اوہ! خیال ہی نہیں رہا!" وہ چونکی۔ آنکھوں سے مسلسل بہتے پانی نے ہر منظر دھندلا دیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یکدم پھیکے پڑتے چہرے پر بکھرے اداسی کے تاثرات کو بھی چھپا لیا تھا۔

"اوہ! میں بھول گئی تم بتانے آتے ہوئے پانی لانے کو کہا تھا۔" ثمن ماتھا پیٹتے، پانی کا گلاس لینے باہر بھاگی۔ اور اس کا دل بھی شدت سے چاہا کہ وہ بھی سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ اس کے قدم بوجھل ہو گئے تھے۔ اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

حالانکہ اُن آنکھوں سے جھانکتے رنگوں کو بار بار دیکھ کر بھی اُس نے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر یہ احتجاج کس لیے۔ اُس نے فرصت پاتے ہی بڑے دھیان سے سوچا۔

"اچھی چیز بہت سے لوگوں کو بیک وقت پسند آسکتی ہے، مگر یہ ضروری تو نہیں کہ وہ آپ کو حاصل بھی ضرور ہو جائے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بڑی اماں ہر بار میرے دل کی بات جان لیں۔ میری بہت سی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ بھی سہی۔" بجانے کس کس انداز سے اُس نے دل کو سنبھالا۔ اور اگلی صبح جب کہ سب اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں گھر سے روانہ ہو گئے تو اُس نے بھی اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سوٹ کیس لاؤنج میں کھڑا کرتے ہوئے واپسی کا اعلان کر دیا۔ اپنا پھوپھو اور پھوپھا نے اپنے اپنے ہاتھوں میں تھامے چائے کے مگ میز پر دھرتے ہوئے خاصی حیرت سے اُس کے چہرے کو دیکھا۔

"ہائیں! یوں اچانک؟"

"مگر! کیسے جاؤ گی بھئی!" وہ ہنس پڑی، یہ سوال تو آتے ہوئے کسی نے اُس سے نہیں پوچھا تھا۔

"جیسے آئی تھی، اور آپ لوگ تو یوں حیران ہو رہے ہیں جیسے مجھے واپس جانا ہی نہیں ہے، چھٹی ختم ہو گئی ہیں۔" اُس نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے بہت اطمینان سے کہا۔

پھوپھو پھر بھی رُکنے پر اصرار کر رہی تھیں مگر اس کے پاس سو بہانے تھے۔ بڑی اماں سے ملنے گئی تو وہ آرام کر رہی تھیں، سارہ بھابی اور شاہدہ آنٹی سے ہی مل کر وہ واپس چلی آئی۔ باقی ماندہ افراد کی ناواقفی کا خدشہ ضرور تھا

مگر اُسے عادت تھی ایسے گلے شکوے سُننے کی، جس میں شمن پیش پیش ہوتی تھی۔ راستے بھر ابا کا پُرتفکر چہرا اور اماں کے بیٹھنے کا تصور اُسے واہموں کا شکار کرتا رہا۔ سفر تمام ہوا تو ابا اس کے استقبال کے لیے موجود تھے، انہیں بروقت اطلاع مل چکی تھی۔ خلافِ توقع ان کے چہرے پر پھیلے اطمینان اور مہربان مسکراہٹ نے اس کی ساری تھکان اتار دی۔ وہ ان کی اُلجھنوں پہ باوجود خواہش کے گفتگو نہ چھیڑ سکی۔ اماں البتہ توقعات سے بڑھ کر خاموش تھیں۔ اُسے حیرت ہوئی، دو تین دن گزر جانے کے باوجود انہوں نے کوئی ذو معنی بات، کسی طنزیہ جملے سے اس کی تواضع نہیں کی حالانکہ بڑی اماں نے مداخلت کرتے ہوئے ان کے بھتیجے کو بُری طرح رد کر دیا تھا۔

"جانے میری غیر موجودگی میں یہاں کیسے کیسے معرکے سرزد ہوتے رہے ہیں۔" اُس نے ماحول پہ چھائے سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے سوچا ضرور تھا، مگر کُریدنے کی نہ تو اُسے عادت تھی، اور نہ کوئی از خود اُسے کسی بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

اور اُس کے اپنے مسائل بھی کم نہ تھے، ایسے میں ایک انجانی سی کسک کا اضافہ، کسی شے کے کھو جانے کا احساس بار ہا اس کا دھیان اُڑا لے جاتا پھر اس کے آس پاس آوازیں اور سرگوشیاں گونجنے لگتیں۔ راتوں کی نیندیں اُڑنے لگتیں۔ تب وہ اپنی حماقتوں پر خود کو خوب کوستی۔

"اس کہانی کو عام سا انجام دے کر وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گا اور تم...؟" وہ سوچتی رہ جاتی۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو، اب تو سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں؟" ندا نے اُسے گہری سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر بالآخر ایک رات پوچھ ہی لیا۔

"کیسے مسئلے؟" وہ چونکی اور پھر حیرت سے ندا کو بستر سنبھالتے ہوئے دیکھا۔ "آج تو تم لوگوں کو فرزانہ کی مہندی پر جانا تھا۔" صبح ہی تو کارڈ اس کی نظروں سے گزرا تھا، جس کے مطابق سرفراز کی بہن کی شادی کا آغاز ہو چکا تھا۔

"نہیں جا رہے۔" وہ چادر تان کر مختصراً بولی۔

"ابا نے منع کر دیا ہو گا۔"

"ابا بے چارے کیوں منع کرنے لگے، اماں کی آنکھیں ہی اب کھلی ہیں۔" حرا کا لہجہ افسردہ تھا۔ وہ پوری طرح چونکتی ہو گئی۔

"سرفراز بھائی نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا، یقین کرو حرا! اماں کو بھی اب پتا چلا ہے کہ انہوں نے۔" وہ رُکی۔ "شکیلہ بھابی کو بغیر طلاق دیے میکے بٹھائے رکھا تھا۔ ابا کو بھی باقاعدہ پلاننگ کے تحت جعلی مقدمے میں اُلجھوایا گیا۔ یہ سارا چکر تو دراصل سرفراز بھائی کا چلایا ہوا تھا۔ ساتھ ماما، مامی بھی ساتھ مل گئے۔" حرا دنگ رہ گئی۔

"تم تو سب کچھ جان چکی ہو گی۔"

"نہیں، مجھے کچھ علم نہیں ہے، یہ جعلی مقدمے کا کیا چکر ہے؟"

"ہماری زمین کا وہ حصہ انہوں نے بذاتِ خود مخالف پارٹی کے ہاتھ بیچ ڈالا، اپنے ہی آدمیوں کو ابا کے سامنے مخالف پارٹی ظاہر کرتے ہوئے مقدمہ ہوا ڈالا۔ رقم اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے لیکا پھر ابا کی اپنا مقروض بھی بنا ڈالا۔ خدا کا شکر ہے، مزمل بھائی کی بروقت مداخلت نے ساری حقیقت واضح کر دی۔" وہ دم بخود سن رہی تھی۔ اس کے ذکر پہ چونک گئی۔

"مزمل نے انہیں کیسے حل کر لیا یہ سارا معاملہ؟" بہت سے سوالات دل میں مچل گئے۔ مگر وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"اماں نے ان سب کی خوب خبر لی ہے، اس لحاظ سے تو کوئی غیر دل کو بھی نہیں تو ڑتا۔ بڑی اماں اور پھوپھو ہم سے خوب ناراض ہوں گی۔" وہ اُسے دیکھنے لگی۔

"نہیں، وہ سب لوگ بہت اچھے ہیں، بہت چاہتے ہیں ہمیں۔ خصوصاً بڑی اماں کو ہمارا بہت خیال رہتا ہے۔" وہ رسانیت سے بولی۔

"تم کتنی خوش قسمت ہو حرا! اتنے بہت سے لوگ تمہیں چاہتے ہیں، تمہارے مستقبل کے لیے فکر مند ہوتے ہیں، سنو حرا! وہ جو مزمل بھائی ہیں۔"

"لگتا ہے نیچے کوئی مہمان آیا ہے۔" نچلے پورشن سے اُٹھتی رنگ برنگی آوازوں پر اس نے ندا کی بات کاٹی۔ وہ اب اس کے قصیدوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"آیا ہو گا کوئی اماں سے میکے سے، مگر اب وہ ان کی باتوں میں آنے والی نہیں ہیں۔" اُس نے منہ بناتے ہوئے کروٹ بدل کر نہایت لاتعلقی کا مظاہرہ کیا۔ حرا کو خوشگوار حیرت نے آن لیا۔ یہ وہی ندا تھی جو انہی لوگوں کی خاطر

اس پر تنقید کرنے کے معاملے میں اماں کے ساتھ مل جایا کرتی تھی۔ اس کایا پلٹ پر اُسے دِلی خوشی کا احساس ہوا۔ حقیقی معنوں میں ابا کی زندگی میں اب خوشگوار تبدیلی آئے گی۔ اس نے نیچے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔

اس کی آنکھ معمول سے کچھ پہلے ہی کھل گئی تھی۔ گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پشم پشم تیار ہو کر باہر بھاگی۔ ناشتا تیار تھا۔ اماں آوازیں ہی دیتی رہ گئیں۔ مگر اس کے پاس وقت کم تھا۔ خدشہ تھا وین نہ نکل چکی ہو۔ کہ آج اسے اسکول وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچنا تھا جہاں ہونے والے ورائٹی شو کے منتظمین کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل تھا۔ مخصوص جگہ تک کا فاصلہ اس نے بڑی تیزی سے طے کیا۔ گز بھر کے فاصلے پر درخت سے ٹیک لگائے کوئی کھڑا تھا۔ عین اسی وقت اس نے رخ موڑا۔ حرا کی نگاہ گویا منجمد ہو کر رہ گئی۔ اُسے اپنی بصارت پہ دھوکے کا گمان ہونے لگا تھا کہ وہ مسکراتا ہوا دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آ ٹھہرا۔

"کیوں یقین نہیں آ رہا! حالانکہ یہ سچ ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ حرا نے جھینپ کر نگاہیں جھکا لیں۔

"میں پچھلے بیس منٹ سے آپ کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ مبارک ہو!" وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"عظیم انکل ایک فضول مقدمے سے فارغ ہو گئے۔ غلطی ان کی بھی ہے۔ اس حد تک کسی پہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے کہ بے خبری میں کوئی لوٹ کر چلا جائے۔"

"ہم آپ کے مشکور ہیں۔ آپ نے ہم سب پر۔"

"رہنے دیجیے یہ تکلفات! کیوں خود کو مشکل میں ڈالتی ہیں؟" وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے فوراً بولا۔

"سچ بولنے کی عادت ڈالیں۔ میں تو آپ کو بہت عقل مند سمجھتا تھا۔ مگر آپ تو سادگی میں عظیم انکل سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئیں۔ کوئی اور لڑکی سب کیسے پسند کر سکتے تھے۔ ممی اور حمزہ کی ملی بھگت کو سچ جان کر آپ فرار ہو گئیں کہ بڑی اماں تک کو خبر نہ ہو سکی۔" حرا بے وقوفوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"فرار سے کیا مطلب؟ مجھے واپس آنا ہی تھا اور میں گئی تھی بڑی اماں سے ملنے۔ مگر وہ!"

"یہ ساری وضاحتیں تو آپ بڑی اماں کو دیجیے گا۔ ان کی طبیعت کے پیش نظر اتنے دنوں کی تاخیر ہوئی، وگرنہ آپ کی آمد کے اگلے روز ہی وہ یہاں ہوتیں۔"

"بڑی اماں یہاں آئی ہوئی ہیں۔ میں نے جلدی میں آتے ہوئے غور ہی نہیں کیا۔" وہ حیرت و مسرت سے ملے جلے تاثرات لیے بے ساختہ بولی۔ اُسے افسوس ہوا وہ رات کو ہی ان سے کیوں نہیں ملی۔

"غور نہ کرنا آپ کی پرانی عادت ہے۔" وہ ہنسا۔

"میں ان مرحلوں سے بہت پہلے فارغ ہو چکا ہوں۔ تب آپ کے پاس وقت کم ہے۔ گھر پر بڑی اماں اہم اجلاس کی صدارت کر رہی ہوں گی۔ ساری کارروائی فی الحال ہم دونوں کے بغیر مکمل ہو جائے گی، مگر میں یہاں اتنی دیر سے صرف اس عہد کو نبھانے کے لیے کھڑا تھا جو مذاق میں باندھا تھا۔ کہ آپ سے پہلے ضرور پوچھا جائے گا۔ تو پھر آپ کا کیا خیال ہے اس تاخیر کے بارے میں؟" وہ لاپروائی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بے اختیار ہنس دیا۔ اس کے شوخ انداز پر اسے کچھ اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے، جب وہ اور ممی بالکونی میں ٹہلتے ہوئے شرعی حق پہ بات کر رہی تھیں، حرا کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ جسے چھپانے کے لیے اس نے چہرا موڑ لیا۔

وقت کا کھیل ہی سہی، مگر اُسے اپنی خوش بختی پہ واقعی یقین آ گیا تھا۔ بڑی اماں کی محبتوں پر وہ ہمیشہ سے ہی تہہ دل سے مشکور تھی، اب مقروض بھی ہو چکی تھی۔

"وہ! آج وین نہیں آئی۔" وہ جیسے تصور سے حقیقت میں پلٹ آئی۔

"وہ تو کب کی گزر چکی ہے، چلیے مین روڈ سے ٹیکسی پکڑتے ہیں۔" وہ مسکرایا تو اس نے بھی خود اعتمادی سے اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے منزل کی جانب سفر کا آغاز کر دیا۔ واہموں سے بے نیاز ایک یقین صبح طلوع ہو چکی تھی۔

"لینڈ کروزر" ہموار پختہ سڑک پر ہوا کے دوش پر گویا تیرتی چلی جا رہی تھی۔ نارنجی کرنیں بکھیرتا سورج سڑک سے پرے ریت کے اونچے ٹیلوں میں یوں چھپ رہا تھا جیسے کوئی گوری ساجن کی شوخ نگاہوں سے محجوب ہو کر اپنا گلنار مکھڑا اسی کے سینے میں چھپا لے۔ سڑک کے دونوں جانب ایک مخصوص فاصلے پر موجود شیشم کے درخت سہمے ہوئے سر جھکائے کھڑے تھے۔

کہیں کہیں کیکر کے درخت بھی تھے صحرائی علاقوں میں گرمی کے موسم میں دن بھر غضب ناک دھوپ کی شدت برداشت کرنے کے بعد شام کو پیڑوں، پودوں میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ ہوا کی نرم

دیکھا۔ اور گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "اچھا سائیں! آپ خوش رہیں، آپ کی خوشی کی خاطر ہمیں مونجھ مونجھاری (اداسی) بھی قبول ہے۔"

"اتنا چاہتی ہو مجھے؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن سوچتی ہوں آپ کا اور میرا کیا جوڑ ہے۔ کہاں میں ریت کے سینے پر اگنے والی چھوٹی سی کھمبی اور کہاں آپ جیسا کھجور کے درخت کی طرح اونچی شان والا آدمی۔"

"واہ، بڑی بڑی مثالیں دینے لگی ہو۔ کھمبی اور کھجور کا درخت، واہ۔" میں سرشاری کے ساتھ ہنس دیا تھا۔

سعدیہ بتول گوندانی

سرگوشیوں کے جواب میں ہولے سے ہنس سکیں۔ بس ایک اداس مسکراہٹ نمودار ہو جاتی ہے حدت سے کملاتی ہوئی ان پتیوں پر۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مسکراہٹ وہی دل کو چھوتی ہے جس میں اداسی کی آمیزش ہو۔ پری سے ایک دن میں نے یہی کہا تھا۔

"سنو پری! جب تم اداس ہوتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ دھیمی دھیمی اداس مسکان جب تمہارے لبوں پر آتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پیاسے صحرا پر سے گزر جانے والے بادلوں کو دیکھ کر ہوا دھیرے سے مسکرا دے یا جیسے تپتی دھوپ کے سامنے کوئی ہلکی سی بدلی آ جائے اور قدرے سکون کا احساس دے۔"

"اچھا تو اسی لیے مجھے اداس رکھتے ہیں تا کہ میں آپ کو اچھی لگتی رہوں۔" اس نے مجھے شکوہ کناں نظروں سے

"کھجور کا درخت۔" میں نے زیر لب دہرایا۔ واقعی اونچا ہو کر دنیا کو دیکھنے میں لذت ہے، عزت ہے، اور سرخوشی بھی۔ بلندی پر ہونے اور نمبر ون بننے کا لطف ہی اور ہے، جو محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے کبھی کھجور کا درخت دیکھا ہے؟ اپنی بلند قامتی پر نازاں و فرحاں کس قدر رعونت و تکبر سے آسمان کو گھورتا ہے۔ شان و کر و فر سے جیتا ہے موسم کی حدت انگیز بے مہری بھی اس کے پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب بازوؤں کو سمٹنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اس دراز قامت درخت کے حوالے سے جو بات مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ یہ کہ اس میں اگر انا و خودداری ہے، بلندی کا نشہ ہے تو وہ اس نشے کے سرور میں اضافے کے لیے اپنے ارد گرد لوگوں کا ہجوم رکھنے کا ہنر بھی جانتا ہے، حاجت مندوں

کی پھیلی ہوئی جھولی میں اپنا پکا ہوا پھل گرا دیتا ہے اور پھر ان کی ممنون نظروں کے جواب میں بے نیازی سے مسکرا کر دوبارہ آسمان کی وسعتوں میں اپنی نظریں گاڑ دیتا ہے۔

شیریں دہن کر دینے کی صلاحیت لوگوں کو کیسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے اس کو میرے سوا اور کون بہتر جانتا ہے۔ سرائیکی وسیب کی ایک مثال ہے "گڑ نہ ڈے، گڑ جیسی مٹھی گال تاں کر" (گڑ نہیں دے سکتے نہ سہی گڑ جیسی میٹھی بات ہی کر لو۔)

آج دوپہر کو میرا دوست علاقے کا ڈی۔ سی احسان گورچانی بھی یہی بات کر رہا تھا۔

"یار تم کمال کے ہو، اور اتنے میٹھے لہجے میں بات کرتے ہو کہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا، تمہارے ذہن میں کیا ہے تلخیوں کو چھپانے میں ماہر ہو۔"

دراصل گورچانی بھی میرے ساتھ اس مذاکرے میں شریک تھا جو ریڈیو پاکستان ملتان نے "معاشرتی عدم مساوات اور حصول انصاف کی ضرورت" کے موضوع پہ ریکارڈ کروایا تھا۔ اسد خاکوانی نے بھی

گورچانی کی بات دہرائی۔

"یار شہناز! یہ جادو کہاں سے سیکھا ہے تم نے۔ عام سی بات کو بھی اتنے خوبصورت پیرہن میں لپیٹ کر کرتے ہو کہ وہ سننے والے کے سیدھے دل میں جا پیوست ہوتی ہے۔ ہماری پارٹی میں آ جاؤ۔ ایمان سے جس پر انگلی رکھو گے، وہی وزارت دلوا دوں گا۔ گورنمنٹ کی پالیسیوں کی جتنی مؤثر وضاحت تم کرو گے، کوئی اور کر ہی نہیں پائے گا۔ تو پھر بولو کیا خیال ہے؟"

یہ بھی تعریف کا ایک انداز تھا۔ میں اس کے شائستگی کلمات پہ ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔

"اسد یار! سیاست کی منڈی میں وفا کے سکے کھوٹے کہلاتے ہیں۔ اس شہر بے وفا میں نہ دوستی کا قیام ہے، نہ دشمنی کو دوام۔ کل کے دشمن آج کے دوست بن جاتے ہیں، اور آج کے دوست کل کے دشمن۔ خود غرضیوں کی رسم جانے کب اور کیوں چلی کہ اب یہی چلن عام ہو کر رہ گیا ہے۔ میں ناانصافیوں کے اس سلگتے ہوئے صحرا سے پہلے ہی بے زار ہوں۔ میں ذاتی طور پر سیاست کے اکھاڑے میں خود اترنا کبھی بھی پسند نہیں کروں گا۔"

اسد خاکوانی ذاتی طور پہ میرا حریف نہیں تھا لیکن ان دنوں میں جس سیاسی پارٹی کا وفادار تھا وہ اس کا مخالف ضرور تھا۔ دراصل میں باقاعدہ طور پر کسی بھی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کرتا میری وفاداریاں عوام کے ساتھ ہیں۔ لوگ جسے اپنا رہبر بنانا پسند کرتے ہیں، میں اس کو سپورٹ کرتا ہوں۔ مورل سپورٹ کے ساتھ ساتھ مالی تحفظ بھی فراہم کرتا ہوں۔ میں وہ ہاتھ بننا زیادہ پسند کرتا ہوں، جو خود تاریکی میں رہ کر دوسروں کو روشنی کی سمت دھکیلتا ہے۔

سیاست کی دنیا میں بالکل فرنٹ پہ آ جانے میں بہت سی قباحتیں ہیں۔ جو لوگ "طاقت" میں آتے ہیں، ان کی پشت پر بھی تو ہمارے ہی بازوؤں کی توانائی ہوتی ہے۔ پھر کیوں خوامخواہ خود آگے آ کر دردِ سری مول لی جائے۔

میں نے بڑھ کر گاڑی میں نصب ریڈیو آن کر دیا۔ غالباً اسی وقت مذاکرہ نشر ہونا تھا۔ لیکن

ابھی سرائیکی گانے براڈکاسٹ کیے جا رہے تھے۔

"عشق وچ رُلدی وے راسندیاں نازک نازک جُتیاں" مغنی اپنی سریلی آواز کا جادو جگا رہا تھا۔

"نازک نازک جُتیاں!" زیرِ لب میں نے کہا اور ریڈیو بند کر دیا۔ میرے تخیل کی اسکرین پہ نازک نازک سی کومل پیروں کی تصویریں چلنے پھرنے لگیں۔

میں نے گاڑی پختہ سڑک سے نیچے کچے میں اتار دی۔ اونچے نیچے راستے پہ گاڑی مسلسل جھٹکے کھا رہی تھی۔

"سائیں جی! مجھے اتار دو، مجھے نہیں کھانے تمہاری گاڑی میں جھولے۔ اتنے ہچکولے کھا رہی ہے، اس سے تو اچھی ہمارے اونٹوں کی سواری ہے، ہچکولے آتے ہیں تو اس میں بھی مزا آتا ہے اور ترتیب سے آتے ہیں۔ تمہاری گاڑی تو یوں بار بار جھٹکے کھاتی ہے جیسے مرنے سے پہلے کوئی آخری

بچکی لے۔"
پری منہ بسورے کہہ رہی تھی، اُسے میں بصد اصرار اپنی گاڑی میں سیر کروانے لایا تھا۔ لیکن شرارتاً جان بوجھ کر ناہموار کچے راستے پر لے آیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ بہت جلد ان ہچکولوں سے پریشان ہو اٹھی۔

"تم تو کبھی بھی سسّی کی طرح اپنے خان کے پیچھے تپتے تھل میں ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ لیکن ذرا سے ہچکولوں کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی ہو۔ بھئی کیسی سسّی ہو تم؟" میں نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

"ہونہہ۔ سا میں! بے شک سسّی ہوں، لیکن اتنی سسّی نہیں۔ تم اس طرح مجھے ستاؤ، اور میں شکایت بھی نہ کروں۔ بے شک سسّی کی طرح محبت کی راہ میں گرم ریت پر تو چل سکتی ہوں، شرط یہ ہے کہ تم بھی پنوں کی طرح سسّی کی خاطر گھر بار، قبیلہ، عیش و آرام چھوڑنے کا حوصلہ رکھو، یوں بغیر کسی وجہ کے گاڑی میں بیٹھ کے جھٹکے کھانا تو محبت نہیں۔ بس اُتار دو مجھے، رہنے دو گاڑی۔ میرا تو کھایا پیا حلق سے نکلنے والا ہے۔"

وہ حقیقتاً بدمزہ ہو رہی تھی، مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آ گئی، وہ پڑھی لکھی نہیں تھی، لیکن باتیں دلچسپ کرتی تھی۔ اسی لیے تو مجھے اچھی لگتی تھی۔

کچی سڑک اب ریتلے علاقوں میں مدغم ہو چکی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد گاڑی کے پہیوں نے ریت میں پھنس کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ یہی میری منشا تھی۔ میں نے انجن بند کیا، چابی اگنیشن میں ہی رہنے دی۔ اور خود نیچے اتر آیا۔

شام کے سائے پھیل چکے تھے آسمان پر سرمئی بادل کجلانے لگے تھے، ریت کے سینے میں بھڑکتا تن جوار بھاٹا اب ہوتے ہوتے سرد ہو رہا تھا۔ میں ریگستان کی اس نرم گرم آغوش میں قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ میرے پاؤں ریت پر اپنا نقش چھوڑتے جا رہے تھے۔ سامنے ٹیلے ریت کے ٹیلے کے پاس خود رو جال کا درخت زنگار رنگ "پیلو" سے لدا قدرے حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا، لیکن اس حیرت میں بھی محبت تھی۔ حیرت شاید اس لیے کہ میں اس کی مہربان دوست کی طرح پھیلی ہوئی شاخوں پر دمکتے رنگ برنگے "پیلو" چننے کے بجائے ادھر ادھر بغیر کسی وجہ کے نظریں بھٹکا رہا تھا۔ میں جب بھی بہت خوش ہوتا ہوں، یا اداس تو اسی طرح باڈی گارڈز کے بغیر تنہا لانگ ڈرائیو کرتا ہوں، فطرت کے اس دلفریب حسن سے آنکھوں کو سیراب کرتا ہوں۔

اس وقت بھی میں یہی کچھ کر رہا تھا۔ لیکن مجھ پہ یہ واضح نہیں ہو پایا تھا کہ میں خوش تھا (اداس) ہوں یا خوش۔ بس ایک اضطرابی سی کیفیت تھی۔ میں نے بڑھ کر ٹہنی سے پیلو توڑ کر درخت کی حیرت دور کر دی۔

پیلو کوئی شیریں ذائقہ پھل نہیں ہے مگر صحرائی لوگوں کے پیاس سے بے تاب خشک حلق تر کر کے کچھ تسکین ضرور پہنچاتا ہے۔

"پچھلی بار میں نے تمہیں ڈیرے میں آنے کو کہا تھا۔ معلوم ہے کتنی دیر ہم کام چھوڑ کر تمہارا انتظار کرتا رہا۔ کچھ احساس ہے تمہیں۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو دبا کر شکایتی انداز میں بات کی تھی۔ جو لوگ بے حد قریب آ جائیں۔ بہت عزیز ہو جائیں، اُن کی ناراضگی کا خیال کیسے روح تک کو سہما دیتا ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں۔ جو کسی سے محبت کرتے ہیں۔ میں اسی ڈر سے کہ کہیں پری مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ اُس سے بہت سنبھل کر اور لہجے کو کنٹرول کر کے گفتگو کیا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ ہمارے خاندان کی روایات کے بالکل خلاف ہے کہ عورتوں سے اس طرح بغیر رعب و دبدبے کے اکھڑ پن سے ہٹ کر خوشامدانہ انداز میں بات کی جائے۔ اسے مردانگی کی توہین سمجھا جاتا ہے۔

پری نے جب مجھے یعنی قبیلے کے سردار خان اللہ نواز گورچانی کے اکلوتے فرزند خان شہناز گورچانی کو اپنی خاطر، ایک عام سی لڑکی کے لیے یوں بے بس، مجبور لہجے میں شکوہ کناں دیکھا تو سرخوشی سے، فخر سے، اترانے

ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"او سیڈا سائیں آ۔ بے شک آپ قبیلے کے نئے نئے سردار بنے ہیں۔ بہت اہم ہیں، لیکن عیز اہم ہم بھی نہیں۔ ہمیں بھی کوئی کام پڑ سکتا ہے۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیا کام پڑ گیا تھا؟" میں نے اس کے سلونے ملیح چہرے پہ نظریں ٹکائے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"پیلو چننے گئی تھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ بتایا ہے ہم سب نے خواجہ فرید سائیں کی کافی بھی مل کر گائی تھی، آ چنڑوں رل یار۔ پیلو پکیاں نی" (آؤ میرے دوست مل کر پیلو چنتے ہیں۔ اس لیے کہ پیلو کا پھل اب پک چکا ہے۔)

"اچھا تو تمہیں گانا بھی آتا ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اور نہیں تو کیا۔" وہ فخر سے بولی۔ "زرینہ کہہ رہی تھی تمہاری آواز بالکل ریڈو (ریڈیو) میں گانے والی عورت کی طرح ہے، بہت خوبصورت!"

"تو اے مہربان پری! ہمارے کانوں میں بھی تو اپنی سریلی آواز کا رس گھولو نا۔"

"ہائے سائیں، آپ کے سامنے کیسے گا سکتی ہوں؟ وہ تو میری سہیلیاں تھیں۔"

وہ کچھ شرما کر بولی۔ سانولی سلونی جگمگاتی آنکھوں والی دبلی پتلی لڑکی بے ہی اتنی دلنواز اور معصوم ادا کہ بندہ اپنا آپ ہارنے پہ مجبور ہو جائے۔ دیکھتا ہی رہ جائے اس کے ملیح چہرے سے دلکش خدوخال کو لونج بہ لونج عادتوں اور دل نشین اداؤں کو۔ پری ہر ملاقات میں مجھے نئی اور پہلے سے مختلف محسوس ہوتی تھی اسے اپنے سامنے پا کر میں بجانے کیوں اپنا اختیار کھونے لگتا ہوں۔

اس وقت بھی میری والہانہ نظروں سے لجا کر سمٹ گئی۔ اس کے سلونے عارض حدتِ حیا سے دہک سے گئے۔ "میکوں ایویں نہ ڈیکھا کرو۔ میکوں شرم آندی اے" (مجھے ایسے نہ دیکھا کریں، مجھے شرم آتی ہے)۔

"کیسے نہ دیکھا کروں، تم اتنی خوبصورت جو ہو۔" میں کوشش کے باوجود نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹا نہیں پا رہا تھا۔

"سوہنا سائیں! خوبصورت تو آپ کی حویلی کی خان زادیاں ہیں۔ ہر ایک اتنی سوہنی، جیسے دودھ بھرا کٹورا۔ اور میں سادہ مایوس کن لہجے میں بولی۔" میں تو غریب کی جھگی سے نکلتا ہوا دھواں ہوں، چولہے کی راکھ۔ کالی کونج۔"

پگلی: "پری کا چہرا میرے تصور میں روشن ہوا، اور میرے لب خودبخود مسکرا دیے۔" اسے کیا معلوم کہ وہ کتنی حسین ہے۔" میں نے سوچا اور ریت میں دھنسی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

پری کی طرح سانولی سلونی حسین شام صحرا میں اتر آئی تھی۔ میں گہری نظر سے بہت دلچسپی کے ساتھ منظر کی دلکشی میں کھو گیا۔ جانے کیسے لوگ ہوتے ہیں جو ریگستان کو محض ویرانیوں کا ڈھیر قرار دیتے ہیں، انہیں کیا معلوم کہ قدرت نے ان ویرانیوں میں بھی حسن کے کیسے کیسے خزانے پوشیدہ کر رکھے ہیں۔

لق و دق صحرا میں اکا دکا نظر آنے والے درخت حسن۔

سبزے کے نام پہ اگنے والے جھاڑ جھنکار میں حسن۔

زمین کے سینے پہ نشان ثبت کرتے اونٹوں کی قطار۔ حسن۔

جرس کارواں۔ حسن۔

ڈار سے بچھڑی کونج کی کرلاہٹ، صبح سویرے کارڈ کرتی اور گھنگھوڑں (پرندوں کے نام) کے بولنے کی صدا۔ حسن۔

پیلو چنتی روہی کی جٹیاں۔ حسن۔

ریت کے سمندر پہ اترتی اداس شام۔ حسن۔

یہاں کی غربت، پیاس اور دھوپ کی شدت تکلیف دہ سہی۔ لیکن اس تکلیف میں بھی ایک اطمینان ہے اور یہ اطمینان ہی۔ حسن۔

کس کس خوبصورتی کا ذکر کروں یہ محض رعنائی خیال نہیں، حقیقت ہے، اسے تو بس محسوس کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب خوبصورتیاں اس وجہ سے ہیں کہ قدرت نے ان سب کو ایک خاص میزان سے بنایا ہے، ایک نامعلوم سا توازن ہے۔

جو شے جس جگہ ہے، جیسی ہے، جہاں مناسب ہے، اپنے مقام پر ہے۔ کسی کے مقام کو، اس کی حقیقت کو، اس کی قدرتی ترتیب و ترتیب کو تبدیل کرنا درحقیقت توازن کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔ اور اس کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ مجھے حسن سے بے پناہ محبت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کی سحر انگیز خوبصورتیاں ماند پڑیں۔

اچھا خاصا ٹائم فطرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھتے ہوئے گزر چکا تھا۔ اور اب میں حسب توقع خود کو بشاش، تازہ دم اور آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ طبیعت کا وہ نامعلوم سا اضطراب، وہ بے چینی اور شاید ہلکی سی اداسی اب دور ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ سرمئی شام گہری تاریکی کی چادر اوڑھ کر رات میں تبدیل ہوتی، میں نے واپسی کے لیے گاڑی ریورس کی اور چل پڑا۔

ابھی میں اپنے علاقے "خفوک نواز" سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک کوئی شخص کھجوروں کے جھنڈ میں سے نکلا اور اچھل کر میری گاڑی کے سامنے آ گیا۔

اگر میرا پاؤں ایکسیلیٹر پر نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ شخص یقیناً اب تک کچلا جا چکا ہوتا۔ میں برق رفتاری سے باہر نکلا اور سڑک پہ گرے اس شخص کو کھڑے ہونے میں مدد دی۔

"دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تمہارا، کیا خودکشی کرنے نکلے تھے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"خان سئیں میکوں بچا گھنو۔ اللہ دا واسطہ ہے میکوں بچا گھنو۔ میں بے قصور آں۔ میں کچھ نی کیتا۔" وہ میرے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔

"ارے ارے۔ کیا ہو گیا۔ اٹھو۔ یہ کیا کر رہے ہو۔" میں نے اسے اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ میری ٹانگوں سے چمٹا رہا۔

"سائیں! میں بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ اللہ کے واسطے میرا فیصلہ انصاف سے کر دیں۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ آؤ تفصیل سے بات کرتے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا، اور بڑی مشکلوں سے اٹھا کر اسے گاڑی میں لا بٹھایا۔

وہ لانبا، پتلا، گہرے سانولے رنگ کا نوجوان سخت غم زدہ و وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ آنسو بار بار اس کے گالوں پر ڈھلک آتے تھے۔ جنہیں وہ اپنی پگڑی کے پلو سے صاف کر رہا تھا۔ عام حالات میں تیکھے نقوش کا وہ نوجوان شاید پرکشش دکھائی دیتا ہو، لیکن اس وقت دکھ اور خوف کے تاثرات نے اس کے نقوش بگاڑ کے رکھ دیے تھے۔

"اب بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے؟" چند لمحوں کے بعد میں نے پوچھا۔ اس نے جو تفصیل بتائی اس کے مطابق راول نام کا یہ نوجوان تین چاپ کا رہائشی تھا۔ اس کا باپ ایک ملازم تھا جو میرے علاقے کے ایک جت وال (اونٹ بان) کا رشتے دار تھا۔ مستو نام کے اس جت وال کو میں جانتا تھا، اس کی بیوی مر چکی تھی، اور وہ اپنے اونٹ پر جھونسہ لکڑیاں اور دیگر ساز و سامان شہر لے جاتا تھا۔ بقول راول کے تقریباً پندرہ دن پہلے وہ اپنے باپ کے کہنے پر اپنے ماموں کے گھر قیام کرنے آیا، تاکہ اپنی ماموں زاد کو دیکھ پرکھ سکے اور

اس سے شادی کرے۔
آج سہ پہر کو اس کی ماموں زاد گھر سے نکلی۔ اسے کچھ شک سا تھا۔ یہ اس کے پیچھے گیا۔ بقول اس کے وہ اسے چکمہ دے گئی تھی، اس لیے یہ فوراً ہی اس کے پیچھے نہیں جا سکا۔ کچھ دیر بعد یہ اس تک پہنچا تو دیکھا لڑکی قتل ہو چکی ہے۔ اب قتل کا شبہ راول پر کیا جا رہا تھا اسی لیے یہ اس قدر خوف زدہ تھا۔ قتل "چھوک نواز" میں ہوا تھا اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔

میں نے متاسف انداز میں کہا۔ "انسانی جان اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے یوں بے دردی سے ضائع کر دیا جائے۔ جس کسی نے بھی یہ جرم کیا ہے اسے عبرت ناک سزا ملنی چاہیے۔"

"خان! اللہ پاک کی قسم۔ میں نے اپنی منگیتر ماموں زاد کو نہیں مارا۔ وہ تو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں اسے مار کیسے سکتا ہوں۔" راول دلگرفتگی سے بولا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں کی نمی خشک ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ لڑکی مر چکی ہے؟"

"وہ جھت (کھجوروں کے جھنڈ) کے پاس آڑی ترچھی پڑی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر لوگوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ پھر سب اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے مجھے ہی قاتل سمجھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مجھے پکڑ بھی لیا تھا اور شاید پولیس کے حوالے کرنے والے تھے، بڑی مشکل سے خود کو چھڑا کے بھاگا۔ ابھی بھی وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے میں "چھوک نواز" سے نکل بھاگا ہوں گا، مگر میں یہیں آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آپ سردار ہیں، آپ کے انصاف کی ہر کوئی گواہی دیتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے انصاف دلا دو۔"

"آلۂ قتل کیا تھا؟ کیا تم نے اسے چھوا تھا؟"

"اسے اس کے دوپٹے سے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ میں دوپٹے کو چھوؤں یا نہ چھوڑوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہوں!" میں نے سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ قاتل ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ کیونکہ گفتگو کے آغاز میں اس نے کہا تھا کہ لڑکی پر شک کر کے وہ اس کے تعاقب میں گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں اس نے لڑکی کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر غیرت میں آکر اس کو ہلاک کر دیا ہو۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے وہاں کسی اور کو بھی دیکھا؟ میرا مطلب ہے لڑکی کے ساتھ۔"

"بالکل نہیں۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ یا کم از کم مجھے نظر نہیں آیا۔"

"تمہیں اپنی ماموں زاد پہ شک کیوں ہوا تھا، بلکہ کیا شک ہوا تھا۔ اس کی نوعیت بتاؤ۔"

میرے اس سوال پہ وہ کسمسا کر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"وہ جی اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ اسے کوئی اور پسند کرتا ہے۔"

"کون پسند کرتا تھا؟"

"یہ تو مجھے پتا نہیں۔ میں یہی دیکھنے تو اس کے پیچھے گیا تھا کہ وہ کس سے ملنے جا رہی ہے۔ وہ بہت بھولی تھی، معصوم تھی۔ اسے کسی نے پھنسا لیا تھا۔ کاش وہ میری بات سمجھ جاتی۔"

"کیا سمجھایا تھا تم نے اسے؟"

"میں نے کہا تھا تم جسے پسند کرتی ہو۔ بے شک اسی کا گھر بساؤ۔ میں اپنے دل پہ پتھر رکھ لوں گا لیکن یوں کسی کے ہاتھ کھلونا مت بنو۔ عزت کے ساتھ اس کے گھر میں رہو۔ پہ وہ بھی یہی چاہتی تھی، مگر مجبور تھی۔"

"کیا مجبوری تھی اسے؟" میں نے گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کہتی تھی وہ مجھے نہ اپناتا ہے، اور نہ چھوڑتا ہے، کہتا ہے اگر کسی اور سے شادی کا ارادہ بھی کیا تو مجھے مار ڈالے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔" ایک بار پھر وہ آبدیدہ ہو گیا۔

"یعنی وہ تم سے شادی کی خواہشمند تھی مگر اس کی وجہ سے راضی نہیں ہو رہی تھی؟"

"ہاں جی۔ یہی بات ہے۔" راول بولا۔ "میں نے اُس سے کہا تھا۔ میں ہر حالی میں تمہارا ساتھ خوشی سے دوں گا۔ لیکن جو شخص نقاب چڑھا کر تمہیں دھوکا دیتا رہا ہے، پہلے اس کے چہرے سے نقاب اترنا چاہیے۔ لوگوں کو اس کا اصلی چہرا دکھانا چاہیے۔ میں نے اُسے کہا یا تھا کہ کسی غلطی کے نتیجے میں ہمیشہ عورت ہی لعن طعن کا نشانہ کیوں بنے۔ اصل مجرم تو مرد ہوتا ہے، اُسے سزا ملنی چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے اس آدمی کا نام تو پوچھا ہو گا، جس سے وہ اس قدر ڈرتی تھی؟"

"پوچھا تھا، لیکن وہ کہتی تھی اُس نے کسی کو اپنا نام بتانے سے بہت سختی سے منع کیا ہے لیکن ایک دن باتوں باتوں میں اس کے منہ سے اچانک اس شخص کا نام نکل گیا تھا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟" میں نے جلدی سے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

کافی دیر تک ذہن پر زور دینے کے بعد وہ مایوسی سے بولا۔ "سرکار، نام مجھے بھول گیا ہے؟"

"نہیں، یاد کرو نام۔ شاباش۔ ذہن پر زور دو۔ ہو سکتا ہے یاد آجائے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ اُسے اگر نام یاد آجاتا تو ساری اُلجھن ہی رفع ہو جاتی۔ مسئلہ سلجھانا آسان ہو جاتا، مگر اُسے نام یاد نہیں آیا۔ بہت سوچنے کے بعد بالآخر وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"خان سیں! مجھے اس آدمی کا نام یاد نہیں آیا، اور ویسے بھی میری منگیتر نے اس کا وہ نام لیا تھا۔ جو اس کے گھر والے پیار سے پکارتے ہیں۔ بس اتنا یاد ہے، اس کے نام کے ساتھ "خان" لگا ہوا تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اس علاقے میں بلوچ قبائل آباد ہیں۔ بلوچ عموماً "خان" کہلائے جاتے ہیں۔ "جھوک نواز" میں جانے کتنے خان ہوں گے۔ اب کیا معلوم اصل مجرم کون سا خان ہے۔ خیر تم اطمینان رکھو۔ اگر تم گناہ گار نہیں ہو تو تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔ میں انصاف کی سچائی پر یقین رکھتا ہوں، اور اس کی سربلندی کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ فی الحال تم میرے ڈیرے پر چلو۔ وہاں تم بالکل محفوظ رہو گے۔"

رات کو ڈیرے پر میں نے لوگوں کا عمومی تاثر معلوم کیا۔ اکثریت راول کو قاتل سمجھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ بہت جلد مشتعل ہو جانے والا نوجوان تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ شدتِ غیض و غضب میں اس سے قتل جیسا فعل سرزد ہو گیا، اور اب وہ پچھتا رہا تھا۔ اپنے جرم پر پردہ ڈال کر انصاف کی بھیک مانگ رہا تھا۔

لیکن خیر میں اتنی جلدی کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرتا۔ جب تک ٹھوس شہادتیں نہ مہیا ہوتیں، راول کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اگلے دن میں قبیلے کے سرکردہ افراد کے ساتھ مستو جت وال کے گھر گیا۔ جس کے ساتھ یہ سانحہ ہوا تھا۔ مستو کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے دور کر دی گئی تھی۔ اس کے کرب اذیت، غم و اندوہ کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کی گریہ وزاری اور اشکوں کا سیلِ رواں دیکھ کر ہم سب بھی اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے نہ روک سکے۔ وہ مسلسل مجھ سے انصاف کا تقاضا کرتا رہا۔ اُس نے بتایا، راول اس کی مرحومہ بہن کا بیٹا ہے، اُس نے تو یہ سوچ کر اُسے گھر میں مہمان رکھا تھا کہ لڑکی لڑکا دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں، بعد میں وہ ان دونوں کی شادی کر دے گا۔ اُسے کیا معلوم تھا۔ وہ ظالم اس کی بیٹی کی جان ہی لے لے گا۔

"لیکن آپ کو یہ اندازہ کیونکر ہوا کہ آپ کی بیٹی کو راول ہی نے ہلاک کیا ہے؟" میں نے پوچھا، مگر وہ جو کچھ بتانا چاہ رہا تھا وہ غریب، غم زدہ مظلوم جت وال لبوں سے ادا نہ کر سکا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

تیسرے دن پر ساہ (جرگہ، پنچایت، اکٹھ) بٹھائی گئی۔ قبیلے کے تمام اہم افراد اس میں شریک تھے، گو کہ قبیلے کا سردار میں خود ہوں، اور حتمی فیصلہ میرا ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن میں نوجوان ہونے کے ناتے جرگہ

سے بزرگ افراد کا بے حد لحاظ کرتا ہوں۔ انہی کی آراء کو اہمیت دیتا ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فیصلہ دراصل جرگے کے بزرگ افراد کا ہوتا ہے، میں صرف اس کی تائید کرتا ہوں، اس کی توثیق کر دیتا ہوں۔

اہم سوال یہ تھا کہ راول کو ہی قاتل کیوں سمجھا گیا، اور وہ کیا شواہد تھے جن کی وجہ سے اس خیال کی تصدیق ہوئی۔

سب سے پہلے علی بخش خان کو کھڑا کیا گیا۔ وہ اس واقعے کا عینی شاہد تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اور عمر خان بلوچ دونوں پاری جتوال سے کھجوروں کی بوریاں اونٹ پر لاد کر شہر پہنچانے کا معاوضہ طے کر رہے تھے کیونکہ مستو جتوال صبح سویرے ہی بھوسا لے کر شہر جا چکا تھا اور شام سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔

بقول علی بخش کے ورنہ وہ مستو سے معاملہ طے کرتے۔ پاری اور مستو کی جھگیاں برابر میں ہیں۔ اس وقت وہ پاری کی جھگی کے سامنے کھڑے تھے جب راول غصے میں مستو کے گھر سے نکلا۔ راول سے تقریباً پانچ منٹ پہلے مستو کی لڑکی پروین بھی گھر سے باہر نکلی، ان دونوں نے کوئی توجہ نہ دی، کہ یہ ایسی اہم بات تھی ہی نہیں پھر اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد اتفاقاً ہی ان کا گزر کھجور کے باغ میں سے ہوا، یہ بھی محض اتفاق تھا کہ ان دونوں کی نظر راول پر پڑ گئی۔ وہ کھجوروں کے جھنڈ کی اوٹ میں تھا اور پروین پر جھکا ہوا تھا۔ یہ اس کے قریب پہنچے تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ پروین کو کسی نے قتل کر دیا۔ حالانکہ اس وقت دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بقول علی بخش خان کے راول اس وقت جھک کر پروین کے گلے کے گرد دوپٹہ کس رہا تھا۔

"نہیں... میں دوپٹے کے بل کھول رہا تھا۔" راول بے اختیار چیخا۔ وہ سخت دہشت زدہ تھا۔ "بدرجہ خالق... میں نے جب پروین کو اوندھے منہ گرے ہوئے پایا تو اس خیال سے شاید کہ کسی کیڑے مکوڑے یا سانپ کے ڈسنے سے یہ بے ہوش ہوئی ہے، بیدھا کیا۔ ابھی میں پروین کے گلے کے گرد کسے دوپٹے کی گرہ کھول رہا تھا جب یہ دونوں اصحاب میرے سر پر آ پہنچے۔ ان کے آنے سے پہلے تو مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ پروین مر چکی ہے یا زندہ ہے۔ میں بدحواس ہو گیا تھا، پریشان تھا۔ میں نے پروین کو نہیں مارا۔ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ قتل اسی نے کیا ہے جو پروین کو دھمکیاں دیتا تھا۔"

اس کی آواز رندھ گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس نے پھر وہی کہانی سنائی جو مجھے سنا چکا تھا۔ لیکن اس کی تردید یا تصدیق ممکن نہیں تھی۔ راول کو اس کا نام ہی یاد نہیں آیا جو اس کے خیال میں پروین کا قاتل ہو سکتا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے فرضی قصہ گھڑا ہے کیونکہ لڑکی کے بارے میں گوٹھ کے اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ وہ ایک شریف لڑکی تھی، وہ کسی کے ساتھ رہ و رسم نہیں بڑھاتی تھی۔

راول اپنی بے گناہی پر مصر تھا، لیکن علی بخش خان، عمر بلوچ اور چیخ و پکار پر پہنچنے والے دو تین اور لوگوں کے بیانات اس کی تردید کر رہے تھے۔

علی بخش اور عمر خان کی گواہی پر نہ صرف میں بلکہ قبیلے کے باقی افراد بھی یقین کرنے پر مجبور تھے، دونوں با اعتماد تھے۔ شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ خاص طور پر لڑکی کی لاش کی حالت، چہرے پر خراش، زخم اور پھٹا لباس کچھ اور ہی کہانی کہہ رہے تھے، لاش کے پوسٹ مارٹم کا مشورہ میں نے دیا ضرور لیکن میری طرح اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اب لاش کی مزید بے حرمتی مناسب نہیں۔ یہ قبیلے کی عزت کا سوال ہے۔

بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔ لڑکی زمین پر گری کھجوریں چننے باغ میں گئی ہو گی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ غریب عورتیں اور بچے پیچھے گری ہوئی کھجوریں اٹھا لیتے ہیں، انہیں بیچتے ہیں۔ ان کے عوض انہیں چند سکے، روپے مل جاتے ہیں۔ مقتولہ پروین راول ہی سے بچنے کے لیے گھر سے نکلی ہو گی، کیونکہ باپ کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے وہ راول کی طرف سے خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہو گی۔

راول لڑکی کے پیچھے گیا اور باغ میں اسے تنہا دیکھ

کر اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہوگا۔ مقتولہ کی مدافعت پہ طیش میں آ کر اس کا گلا گھونٹ دیا ہوگا۔ راول کے بہت جلد غصے میں آنے اور غصے کی حالت میں ہوش و حواس کا ساتھ چھوڑ دینے کی عادت کے بہت سے لوگ گواہ تھے۔ اپنے علاقے میں بھی کسی معمولی سی بات پر اس نے بہت دوستوں سے شدید جھگڑا کیا۔

یہاں تک کہ نوبت مار کٹائی تک پہنچ گئی۔ اسی لیے اس کے باپ نے شاید ماحول تبدیل کرنے یا پھر اس کے مشتعل دوستوں سے بیٹے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی نظروں سے دور یہاں بھیجا تھا۔ راول پہ قتل کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ اور اس کی سزا کا فیصلہ بھی ہو گیا۔

قبائلی رسم و رواج کے مطابق جرگے کے فیصلے پر فوراً عمل درآمد ہو سکتا تھا۔ حکومت پاکستان جرگہ کے فیصلہ پہ مداخلت بھی نہ کرتی لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اب ہم ایک آزاد وطن کے شہری ہیں اور پاکستان کے قانون کے پابند ہیں۔ اب ہمیں اپنے طور پر قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔

یہ جس کی ذمہ داری ہے وہی پوری کرے چنانچہ میرے مشورے پر راول کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

کتنا عرصہ ہو گیا تھا پری سے ملنا تو درکنار اس کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی نہیں مل سکا تھا، گو کہ میں پہلے بھی اس سے روزانہ ملنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ہماری ملاقاتیں کئی کئی دنوں کے فاصلے پر محیط ہوتی تھیں۔ ابتدا میں تو تعلیم کے سلسلے میں اپنے علاقے سے دور رہا۔ لیکن بابا سائیں کی وفات سے چھ مہینے پہلے تعلیم مکمل کر کے جب آیا تو یہاں کے رسم و رواج، عادات و خصائل اور لوگوں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں تو پری سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں بابا سائیں بیمار تھے۔ ان کے حکم پر میں اپنی زمینوں کے معائنے پر نکلا تھا۔

ہمارا زیادہ تر رقبہ ریتیلی زمین پہ مشتمل تھا، جو تھوڑی بہت زمین زرخیز تھی، اسے بھی سیم چاٹ رہی تھی تا حد نظر سفید سفید پاؤڈر میں زمین کی خاکی رنگت چھپتی نظر آتی تھی۔ کچھ قطعات زرخیز زمین کے بھی تھے۔ میں ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک کھجوروں کے اس باغ میں جا نکلا جہاں پری ڈھلتے سورج کی سنہری کرنوں میں نہائی اچانک میری نظروں کے سامنے آ گئی۔

اس نے اپنے دوپٹے کا ایک پلو تو اپنے سر پہ رکھا ہوا تھا اور دوسرے پلو کو ایک خاص انداز میں کمر کے گرد باندھ کر اسے تھیلے یا ٹوکری کی سی شکل دے دی تھی۔ اس میں وہ بڑی پھرتی سے نیچے گری ہوئی اکا دکا کھجوریں ڈالتی جا رہی تھی۔

"کون ہو تم؟ اور یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے کھردرے لہجے میں رعب سے پوچھا۔

"پنڈ کھجوریں اچن رہی ہوں۔" وہ سہمی ہوئی بولی۔

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، مگر کس کی اجازت سے۔"

"کسی کی بھی نہیں، سائیں! آپ کہیں تو میں آپ کو واپس کر دیتی ہوں۔"

اس کی معصوم سی پیش کش پہ میرے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے کسی حد تک نرمی سے کہا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں نے تم سے پوچھا تھا کون ہو تم؟"

"جی میں پری ہوں۔ میرا مطلب ہے پ ر ی۔"

"ہاں۔ ہو تو واقعی ایک پری۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ وہ اس وقت میرے سامنے ایسے رخ پہ کھڑی تھی کہ سورج کی کندنی کرنیں اس کی سانولی رنگت کو اور دمکا رہی تھیں۔ شوخ رنگوں کے بڑے بڑے پھولوں والے شلوار سوٹ میں ملبوس، کانوں میں جھولتے آویزے، سیدھی مانگ نکال کر کس کے چوٹی کی ہوئی تھی۔ ماتھے کے اوپر بالوں کی ہینڈ چھیاں جو اس کی دوشیزگی کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس کی غزالی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ اور پریشانی کا تاثر بہت واضح اور بہت دلفریب لگ رہا تھا۔

میں نے پوچھا، "کس کی بیٹی ہو؟"

"وہ آپ بابا سے میری شکایت لگائیں گے؟" وہ

روہانسی ہو کر بولی۔

"تم کس کے بابا سے خوف زدہ ہو؟ میرے یا اپنے بابا سے؟" میں نے دلچسپی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ڈرتی میں کسی سے نہیں ہوں۔" وہ ایک دم اکڑ کر بولی۔ اس کے چہرے کے تاثرات فوراً ہی بدل گئے تھے۔ "جو میرے دل میں آتا ہے کر گزرتی ہوں۔ میں تو ذرا اپنے بابا کی ناراضگی کے خیال سے پریشان ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے باہر زیادہ گھومنے سے منع کیا تھا ناں۔"

"تو پھر کیوں اس طرح گھومتی پھرتی ہو؟"

مجھے اس مقامی لڑکی سے گفتگو کرنے میں خلاف توقع مزا آرہا تھا۔ اس کا چہرا پل پل تاثر بدلتا تھا، اور ہر تاثر اتنا واضح اور بھرپور ہوتا تھا کہ دیکھنے والا بے اختیار اپنی پوری دلچسپی اور توجہ اس کی طرف مبذول کر لینے پہ مجبور ہو جاتا تھا۔ میرے پوچھنے پہ وہ سادگی سے بولی۔

"کیا کروں، اپنے گھر میں میرا دل ہی نہیں لگتا۔"

"کیوں کیا کہیں اور لگ گیا؟" میری اس بات پہ اس کے چہرے پہ سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لڑکی ذہین تھی۔ فوراً بات سمجھ گئی تھی۔ سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"میں اپنے گھر میں اکیلی ہوتی ہوں اس لیے بابا کہتا ہے زیادہ باہر نہ نکلا کروں۔ گھر میں بیٹھ کر کام کروں۔ مگر میں بابا کے کام پہ جانے کے بعد سکینہ، رقیہ یا چاچی جندن کے گھر چلی جاتی ہوں، کبھی کبھی وہ بھی میرے پاس آجاتی ہیں۔ مل کے بیٹھتے ہیں تو باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے، ساتھ ہی ہم سب کھجور کے پتوں سے اپنی اپنی چٹائیاں بھی بُنتی جاتی ہیں۔"

"اچھا تو تم چٹائیاں بھی بُن لیتی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔ چاچی جندن کہتی ہے چٹائی بُننے میں میرے ہاتھ ساری لڑکیوں سے زیادہ تیز چلتے ہیں۔ مجھے تو کھجی کے پتوں سے چارپائی کا بان، ٹوکریاں اور چنگیریں بنانا بھی آتی ہیں۔ میں ان پہ بڑے خوبصورت ڈیزائن ڈال لیتی ہوں۔"

اس کا لہجہ بے حد فخریہ تھا۔ وہ اس طرح دلو طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، جیسے کھجور کے پتوں کو مختلف کارآمد شکلوں میں ڈھال لینا صرف اسی کا کمال فن ہو۔ یہ ہنر تو یہاں کی ہر لڑکی اور عورت کے پاس ہوتا ہے۔ اسی ہنر کو کام میں لا کر وہ مشقت کے اس کٹھن سفر میں مردوں کے شانہ بشانہ قدم بڑھاتے ہوئے بھوک اور غربت کے عفریت کی خوفناکی کو قدرے کم کر لیتی ہیں۔ پیرکاں سے میری دوسری ملاقات بابا کی وفات کے بعد ہوئی۔ جب سرداری کی دستار میرے سر پہ رکھی جا چکی تھی۔

وہ بھوک سے باہر دور ایک کھلے میدان میں اپنے اونٹ کو چرا رہی تھی۔ کبھی ہش ہش کر کے اونٹ کا رُخ کسی سبز کانٹے دار جھاڑی کی طرف کر دیتی۔ کبھی خود پتے توڑ کر کھلاتی اور کبھی اس کی گردن اور پشت پہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگتی۔

میں گاڑی روک کر دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود میری یادداشت میں نہ صرف اُس کا چہرہ بلکہ نام تک محفوظ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میری طرف آئی، اور مودب ہو کر سلام کیا۔ میں نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور مسکرا کر کہا۔

"اونٹ کی سیوا ہو رہی ہے مہربان پری۔"

"ہاں جی۔ بابا کہتا ہے جو روزی کا وسیلہ ہو، اس کی خدمت کرنی چاہیے، اور عزت بھی!"

"بس یہ ایک ہی اونٹ ہے تمہارے باپ کا، یا اور بھی ہیں؟"

"پہلے ہمارے تین اوٹھ (اونٹ) تھے۔ ایک تو بیمار ہو کر مر گیا۔ دوسرے کو اماں کی بیماری کی وجہ سے بیچنا پڑا۔ اب صرف یہی ایک ہے۔ مگر ہماری گزر بسر کو یہ ایک بھی کافی ہے۔"

"تم تو کہتی تھیں کہ تمہارا بابا تمہیں گھر سے نکلنے نہیں دیتا۔ اب بستی سے باہر اتنی دور ویرانے میں یہاں اکیلی ہو۔ آج تمہارے باپ نے منع نہیں کیا؟"

"کمال ہے آپ کو اس دن کی ہر بات یاد ہے؟" وہ تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ویسے بابا نے مجھے اونٹ چرانے کو نہیں کہا۔ وہ

تو شہر گیا ہوا ہے' بڑی چاچا کے ساتھ۔ میرا اپنا دل سیر کرنے کو چاہ رہا تھا، اس لیے ادھر اٹ کے ساتھ چلی آئی ہوں۔"

"ڈر نہیں لگتا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں۔ اپنے علاقے میں ڈر کیسا۔"

"مجھ سے بھی نہیں ڈرتیں؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"ڈرتی نہیں ہو تو آؤ میرے سامنے بیٹھو۔ اس طرح دھوپ میں کھڑی ہو کر باتیں کرتی رہیں، تو اور بھی کالی ہو جاؤ گی۔" میں نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

"میں بیٹھوں؟" اس نے حیرت سے کہتے ہوئے قدرے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"نہیں جی مہربانی آپ کی یہ دھوپ ہمیں کالا نہیں مضبوط اور بہادر کرتی ہے۔

سخت موسموں سے مقابلہ کرنا سکھاتی ہے' دھوپ تو ہماری گہری سہیلی کی طرح ہے۔"

"تو کیا مجھے بھی اپنا گہرا دوست بننے دو گی؟"

"یعنی آپ ہمارے لیے تیکھی دھوپ بننا چاہتے ہیں، جو جھلسا کے رکھ دے۔"

وہ مدبرانہ لہجے میں بولی۔ اپنے پچھلے جملے کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے اس نے خاصی گہری بات کی تھی۔ بہت خوبصورت انداز میں اس نے مجھ جیسے مرد و عورت کی اس ناجائز دوستی پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی۔ یہ جتا یا کہ ایسی دوستیاں کسی لڑکی کے لیے آفات کا دروازہ کھول سکتی ہیں۔ معصومیت میں بھی اس کی ذہانت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ واقعی سوچنے والی لڑکی تھی، سمجھ دار تھی، مجھے بے حد پسند آئی۔

پھر میں آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں اسے اپنے ڈھب پہ لے ہی آیا۔ اس کے لیے مجھے کچھ روایتی اور کچھ غیر روایتی طریقے بھی اپنانے پڑے، لیکن بالآخر گہبر گھاٹ سے بہلا پھسلا کے، اتنا جتا کے میں اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ وہ میری محبت کی بانہوں میں آ چکی ہے، جی ہاں کچھ عرصے بیتے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ محض وقتی ابال نہیں ہے میں اسے کچھ زیادہ ہی پسند کرنے لگا ہوں۔

پری کے مزاج کے مطابق چلنے کے لیے اس سے ملتے ہوئے کبھی میں نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جو شروع میں کچھ سہمی سہمی سی دکھائی دیتی تھی، اب مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی۔

حویلی میں تقریب تھی، میرے چچا زاد کی منگنی تھی۔ میں باہر کی بھیڑ بھاڑ میں سے چپکے سے نکل آیا تھا، اور اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ خواتین جب رسم کرنے لڑکی والوں کے ہاں چلی گئیں تو کنگنوں کی کھنک کے ساتھ مجھے پری کی کھنکتی آواز سنائی دی۔

"اٹھیں خان جی! چائے کے ساتھ سر درد کی گولی لے آئی ہوں۔"

"پری تم!" میں اٹھ بیٹھا۔ وہ اس وقت ہاتھوں میں چاندی کے کنگن، کانوں میں چاندی کے آویزے اور شاید پاؤں میں پازیب کے ساتھ خاصی بنی سنوری نظر آ رہی تھی۔ لباس بھی نسبتاً قیمتی تھا، عام دنوں سے زیادہ پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

"تم یہاں کیسے؟" میں نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"آپ کو معلوم تو ہے۔ وڈی خانم نے بلوایا تھا۔ میرے ساتھ اور بھی لڑکیاں آئی ہیں۔ شادی کا گھر ہے ناں۔ کام بڑھ گیا ہے۔ حویلی کی نوکرانیوں کا کام ہاتھ بٹانے کے لیے وڈی خانم نے بابا سے کہہ کر بلوایا تھا۔ کام تو کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن مزا بھی آ رہا ہے حویلی کی چہل پہل میں۔"

اس کے چہرے پہ بچوں جیسی معصوم خوشی تھی میں نے دلچسپی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مزا آ رہا تھا، تو رسم کے لیے خواتین کے ساتھ چلی کیوں نہیں گئیں؟"

وہ حیرت سے بولی، "کمال ہے خود ہی تو نواز سے کہہ کر مجھے رکنے کی ہدایت کی تھی۔ اسی نے چپکے سے مجھے آپ کا پیغام دیا کہ منگنی کی رسم کے لیے سب کے ساتھ نہ جاؤں۔ حالانکہ کہہ تو سب رہی تھیں کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں۔

اصل میں سکینہ، رقیہ اور شبنو نے سارا دن کو بتا دیا کہ مجھے گانا بھی آتا ہے۔ سب پیچھے پڑ گئے

تو مجھے مجبوراً گھونٹ، گنوار (دولہا، دلہن) کے لیے سہرے گانا پڑے۔ آپ کی اماں جان اور بہنوں کو میری آواز بہت پسند آئی۔ انہوں نے بھی کہا کہ لڑکی والوں کے گھر چلوں۔ میں وہاں جا کر گاتی، تو رونق اور بھی زیادہ ہوتی۔"

"لیکن تم نے یہاں کی رونق بڑھانے کا فیصلہ کیا۔" میں کھل کر مسکرایا۔ وہ بھی خوشدلی سے ہنس پڑی۔

"ہیں نے بہانا بنا دیا کہ بہت تھک چکی ہوں یا کہ افسردگی کے ساتھ آرام کروں گی، اور بوا ماہ بلے بھی نہیں گئیں۔ وہ دونوں بوڑھی ہیں ناں، اس لیے رک گئیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی کوٹھڑی میں آرام کر رہی ہیں۔"

"بڑی مہربانی سرکار! تم نے میری خاطر تقریب کو چھوڑا۔" میں نے کہا اور نیم دراز ہو کر گہری نظر سے اس کے سراپے کو دیکھتا رہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"پری! کیا واقعی تمہیں میرا بہت خیال ہے؟"
وہ شرمائی "کیا نہیں ہونا چاہیے؟"

"کیوں نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہے تو۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔

یہ کیا ہو گیا تھا مجھے لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ اتنی اچھی جو لگ رہی تھی اور میں بہکا۔ وہ بھی آمادہ ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس کی حالت دیکھ کر میں مضطرب ہوا۔

چھلکتی کومل پری اس سانحے کے بعد غم و اندوہ کی تصویر بن گئی تھی۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا اس پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا تھا۔ ازالے کی بھی میرے نزدیک معقول صورتیں تھیں۔ وہ میں نے پیش کر دیں۔ لیکن ان میں سے وہ کسی پر راضی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا جو پری نے مجھ سے کہا تھا۔

"سائیں! عزت سب کی برابر ہوتی ہے، امیر ہو یا غریب۔ بہتر یہی ہے کہ جلد از جلد مجھے عزت سے اپنے گھر لے جاؤ۔ ورنہ تمہارا مکروہ چہرا دنیا کو دکھاتے ہوئے میں ذرا نہیں ہچکچاؤں گی۔ تمہارا پول کھول دوں گی۔ تم جو آج کل کسی بڑے وزیر کی بیٹی سے شادی کے ارادے باندھ رہے ہو، تمہاری اصل بدصورتی دیکھنے کے بعد وہ وزیر اپنی بیٹی، چالیس مربع زمین اور فیکٹریاں وغیرہ، تمہیں دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا۔ دیکھو خان! مجھے تم اپنا لو۔ بے شک پھر اپنی نوکرانیوں میں ہی شامل کر دینا۔ پھر چاہے امیر کبیر لوگوں میں ایک نہیں، دو دو شادیاں کر لینا۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ مانا کہ میں بہت غریب، بہت حقیر سہی، ہو سکتا ہے میری سچی بات پہ زیادہ لوگ یقین نہ کریں۔ لیکن پھر بھی سب کو ضرور بتاؤں گی۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اپنی اس محبت کا ثبوت دو جو تم ہر ملاقات میں مجھ سے جتاتے تھے۔ میں ابھی تم سے اتنی مایوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے تمہارے اندر ذرہ برابر انسانیت کی رمق باقی ہو۔"

"یار پری! کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ سب کچھ تو بس اچانک ہو گیا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے ہی شادی کروں گا۔ لیکن ذرا صبر تو کرو۔"

"نہیں، اب اور انتظار نہیں کیا جا سکتا۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"تم نے جو میرے کردار پر داغ لگایا ہے عنقریب پھیل کر وہ لوگوں کی نگاہوں میں آجائے گا۔ اگر

واقعی مجھ سے مخلص ہو تو پھر جلدی کرو۔ ورنہ یاد رکھو۔ اب مجھے اپنی رسوائی کی بھی فکر نہیں رہی۔ راول نے کہا ہے۔ وہ ہر حال میں میرا ساتھ دے گا۔"

"راول کو تم نے میرے متعلق بتا دیا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں بتایا۔ وہ اتنا ذہین ہے کہ میری حالت دیکھ کر اُسے میرے اوپر گزرنے والی قیامت کا خود بخود علم ہو گیا۔ وہ اس آدمی کا نام جاننا چاہتا ہے جس نے مجھے تنہائیوں کے تپتے تھل میں ننگے پیر دھکیل دیا ہے۔ مگر میں نے ابھی اُسے کچھ نہیں بتایا۔ یہ فیصلہ اب تم کو کرنا ہے کہ تمہیں اپنی اور میری عزت کا بھرم قائم رکھنا ہے یا اپنی حماقتوں کی شہرت کروانا منظور ہے۔"

میں پری کا یہ انداز دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک غریب اور کمزور لڑکی کی طرف سے ایسا ردعمل میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ اُس کے غضب ناک لہجے میں ارادوں کا استحکام جھلک رہا تھا۔ وہ غصے اور نفرت کی انتہا میں ساری حدوں کو پھلانگنے کے لیے تیار تھی۔

بالآخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے ہار مان لی۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔ میں تم سے نکاح کر لیتا ہوں۔ ارادہ تو میرا پہلے بھی یہی تھا مگر میں کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جب تک میں خود تمہارے بابا سے بات نہ کر لوں، تم میرے متعلق کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ راول کو بھی نہیں۔ اور ہاں کل کھجوروں کے اُس جھنڈ میں آنا جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے؟ ابھی کر لو۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ مجھے ابھی اس حوالے سے کچھ معلوم کرنا ہے۔ تمہارے لیے وہ بات بہت اہم ہے۔ ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گا۔"

"لیکن کھجوروں کے اسی جھنڈ میں ہی کیوں؟ کہیں اور کیوں نہیں؟"

"او ہو بھئی بحث کرتی ہو۔" میں ہنسا۔ "میں اپنی محبت کو آخری مرتبہ وہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں جہاں پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔ تم جواب میرے لیے ایک محبوب ترین ہستی ہو۔ شادی کے بعد صرف ایک بیوی بن جاؤ گی۔ ظالم اور حاکم بیوی، جس کے آگے تمہارا یہ غریب خادم بھی دم نہیں مار سکے گا۔ میں چاہتا ہوں تمہارے بیوی بننے سے پہلے اپنی پری کا معصوم چہرا اور خوبصورت باتوں کو ہمیشہ کے لیے دل میں قید کر لوں۔ کیا اپنے مستقبل کے شوہر کی یہ چھوٹی سی درخواست بھی نہیں مانو گی؟"

میں نے مسکین صورت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"اچھا آجاؤں گی۔ لیکن راول کو کیا بتاؤں گی کہ کہاں جا رہی ہوں۔ وہ بہانے بہلنے سے مجھ سے تمہارا نام پوچھتا ہے۔ میں نے اُسے بتائے بغیر گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ چھپ کر ہم دونوں کو دیکھ لے گا۔"

"دیکھ لینے دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن کوشش کرنا وہ یہاں تک نہ آئے۔ صرف پانچ منٹ کے لیے ہی آجانا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ رضامند ہو گئی۔

میں واقعی پری سے محبت کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی کے بہکاوے میں آکر جبر کے متعلق ایسی باتیں کرے جس سے میرے دل سے اس کی محبت ختم ہو جائے۔ میں اس سے ہمیشہ محبت کرتے رہنا چاہتا تھا۔ اس محبت کو امر کرنے کے لیے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ فیصلہ کرنا پڑا۔ میں نے علی بخش خان اور عمر خان بلوچ سے کہہ دیا تھا کہ وہ بس راول کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور بروقت موقع پر پہنچیں۔ باقی کام میرا آدمی خود سنبھال لے گا۔

راول کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد ڈی ایس پی پولیس کو میں نے فون کر کے تمام حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ تفتیش کے لیے پولیس کا اپنا کوئی سائنٹیفک طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہی گواہ اور شواہد پیش کیے گئے جو جرگہ کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔

لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت نہیں...

دی ہی نہیں تھی۔ پولیس کو تیلیے خصوصاً میرے تعاون کی وجہ سے راول کو سزا دلوانے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس پر وہ میرے شکر گزار تھے۔ لیکن یہ تو میرا فرض تھا۔ میں انصاف کی سربلندی پر یقین رکھتا ہوں۔ انصاف نہ ہو تو ہر شے کا توازن بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

جس دن راول کی سزائے موت پر عمل درآمد ہوا، اس دن میں نے سکون کا سانس لیا۔

گو کہ راول کو اس شخص کا نام یاد نہیں آیا تھا۔ جو اس کی ماموں زاد کو دھمکا تا تھا۔ لیکن کسی بھی وقت یاد آسکتا تھا۔ تب یقیناً معاملہ سنگین ہو جاتا۔ پری یعنی پروین کے باپ کی زندگی کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی تھی۔ میں تو اس کا بندوبست کروانے کا سوچ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ پری کی شادی خود اپنی سرپرستی میں کسی کمی کمین کے ساتھ کروا دوں۔ اس طرح وہ حویلی میں رہ سکتی تھی اور میری دسترس سے دور بھی نہ ہوتی۔ لیکن یہ سب کچھ پری کے باپ کے مرنے کے بعد ممکن ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا۔ راول نے آ کر گڑبڑ مچا دی۔ ہو سکتا ہے اپنی حیثیت اور حالات کا تقاضا سمجھتے ہوئے وہ کسی سمجھوتے پر راضی ہو جاتی۔ مگر راول کے بہکانے پر وہ میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ مجھ سے ٹکرانے پر تل گئی۔ راول نے ہی درحقیقت مجھ سے پری چھینی، میرا پسندیدہ چہرا مجھ سے دور کر رہا۔ وہ میری خوشیوں کا قاتل تھا۔ اور قتل کی سزا ہے موت۔ یہی انصاف ہے۔

آپ جانتے ہیں انصاف کہتے ہیں وزن کے برابر ہونے کو۔ اعتدال و توازن۔ زندگی اور حسن کو۔ پری نے یہ انصاف ختم کرنے اور توازن کو بگاڑنے کی شعوری کوشش کی تھی۔

مجھ جو ایک معزز، شریف اور منصف مزاج، نوجوان سردار کے طور پر متعارف ہوں، نہیں چاہتا کہ میرے کردار کے خلاف کوئی ایک حرف بھی کہنے کی جسارت کرے اور پری کا بیوقوفی کی حد تک جرأتوں اور جسارتوں کا مظاہرہ کرنے پر تل گئی تھی، اس کی یہ خواہش کہ اسے حویلی میں لایا جائے پوری کی جا سکتی تھی لیکن جس حیثیت سے وہ آنا چاہتی تھی وہ ممکن ہی نہیں تھا، اس صورت میں حویلی کے وقار و عظمت میں اضافہ نہیں کمی ہوتی۔

بے حد کمی، کہاں دودھ اور نور میں نہائی ہوئی حویلی کی شان و شوکت والی خان زادیاں۔ کہاں وہ سانولی اداس شام جیسی پروین۔ حویلی کا سارا حسن غارت ہو جاتا۔

وہ جھگی کی زینت تھی اُسے وہیں رہنا چاہیے تھا۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے، ہیروں کے درمیان کوئلہ اور سچے موتیوں کے ہار کے بیچ بدرنگ بے قیمت پتھر لگا دیا جائے تو کیا دلکشی باقی رہے گی؟ حالانکہ ٹاٹ ہو، کوئلہ یا پتھر۔ ان سب کی اپنی جگہ اہمیت بھی ہے اور خوبصورتی بھی، لیکن یہ اپنے سے زیادہ قیمتی چیزوں کے درمیان آ کر بدنمائی کا سبب بن جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ناں۔ میں بہت حسن پرست ہوں، زندگی میں ہر جگہ، حسن و توازن کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ میرے نزدیک جو شے جہاں ہے، ویسی ہے مناسب ہے کسی کی حیثیت بدل دینا، اسے اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا توازن بگاڑ دینے کے مترادف ہے۔ اور توازن میں بگاڑ پیدا کرنے والوں کو میں کسی صورت۔ برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک یہ ایک سنگین ترین، ناقابل معافی جرم ہے۔

کیا خیال ہے آپ کا؟ مجرموں کو ان کے جرم کی سزا ملنی چاہیے ناں۔؟

نگہت عبداللہ

عجب کھیل عشق کا

عجیب پاگل لڑکی ہے، خواہ مخواہ ایک اجنبی سے اُلجھنے کھڑی ہو گئی ہے۔ جبکہ غلطی بھی سراسر جاری تھی کس اطمینان سے بیچ سڑک پہ یوں چل رہے تھے جیسے ہمارے باپ کی جاگیر ہو۔ اب اس طرف سے آنے والے کو کیا پتا پھر بیچارے نے موڑ کاٹنے سے پہلے ہارن بھی بجایا تھا۔

یہ الگ بات کہ ہم نے اپنی باتوں میں دھیان نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گاڑی کی ٹکر کم اپنے حواس کھونے سے زیادہ شمائلہ دور جا گری۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ گاڑی بھگا لے جاتا۔ شامت اعمال اتر کر پوچھنے لگا۔

”آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟“ اور شمائلہ اُسے بیچ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

”گاڑی چلانے کی تمیز نہیں ہے تو چلاتے کیوں ہیں۔ اور یہ آپ جیسے اندھوں کو لائسنس دیتا کون ہے؟“

”دیکھیں مس! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ غلطی سراسر آپ کی ہے۔“ شمائلہ کے تیز بولنے کے باوجود اس نے نرمی سے ٹوکا جس پر شمائلہ اور شیر ہو گئی۔

”میری کیا غلطی ہے، کیا میں جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آئی تھی۔“

”آپ بیچ سڑک پر چل رہی تھیں۔“ اس نے ہماری غلطی کی نشاندہی کی جسے تسلیم کرتے ہوئے شمائلہ ڈھٹائی سے بولی۔

”ہاں چل رہی تھی بیچ سڑک پر لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ ہمیں ٹکر مار کر ہٹائیں۔ ہارن بجا سکتے تھے۔“

”میں نے ہارن دیا تھا۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”اور میں بہری ہوں کیا جو مجھے سنائی نہیں دیا۔“ اور مجھے اس اجنبی پر رحم آنے لگا جو شمائلہ کی اتنی بدتمیزی کے باوجود اتنی عاجزی دکھا رہا تھا۔

میں نے وہیں سے اشارا کر کے شمائلہ کو اپنی طرف بلایا لیکن اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ تب مجبوراً مجھے آگے آنا پڑا۔ اور اس کا بازو تھام کر میں نے قدرے سختی سے ٹوکا۔

”بس ختم کرو شمائلہ۔“ اور اس عرصے میں پہلی بار اجنبی کی نظر مجھ پر پڑی۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

”آپ ان کے ساتھ ہیں؟“ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا اور شمائلہ کے بازو میں چٹکی کاٹ کر سرگوشی میں بولی۔

”کیوں خود کو تماشا بنا رہی ہو۔ چلو۔“ اور غالباً شمائلہ کو احساس ہو گیا پھر بھی اُسے جتا کر بولی۔

”اس کے کہنے پر معاف کر رہی ہوں۔“

”تھینکس گاڈ۔“ وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔

”کسی کی بات تو آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شمائلہ پھر تیز ہوئی تو وہ فوراً بولا۔

”کوئی مطلب نہیں۔“ پھر ایکدم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔ ”شکریہ، آپ کا احسان یاد رکھوں گا۔“

”بڑے آئے احسان یاد رکھنے والے ہونہہ!“ شمائلہ نے اُسے دیکھ کر سر جھٹکا تو میں جلدی سے اس کا بازو کھینچ کر کنارے لے آئی۔

”بس اب چپ چاپ چلو، خبردار ایک لفظ بھی کہا تو۔“

"اچھا میرا بازو تو چھوڑو اور دیکھو میری چیزیں سلامت ہیں کہ نہیں۔" شمائلہ میری گرفت سے اپنا بازو چھڑا کر شاپر میں جھانکنا چاہتی تھی کہ میں نے اُسے آگے دھکیل دیا۔ کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ اس کی کسی ایک چیز کو بھی نقصان پہنچا ہوگا۔ تو وہ پھر اُس سے لڑنے کھڑی ہو جائے گی۔

"تمہیں جلدی کس بات کی ہے۔" میرے دھکیلنے اور تیز قدم اٹھانے پر وہ جھنجھلا کر بولی اور میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ گاڑی ہمارے قریب لا کر بولا۔

"او کے پھر ملاقات ہوگی۔" اس کے ساتھ ہی گاڑی بھگا لے گیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ جبکہ شمائلہ جواب دینے کا موقع نہ ملنے پر تلملانے لگی گھر آکر بھی وہ اسی بات کو بیٹھ رہی تھی۔

"ذرا دیر رک جاتا۔ ایمان سے وہ مزہ چکھاتی کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔"

”میرا خیال ہے جو کچھ تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے اُسے وہ بھی نہیں بھولے گا۔“ میں نے کہا تو وہ جوش سے بولی۔

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایسے لوگوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی ہوں۔“

”مجھے پتا ہے لیکن اس بیچارے کو تم نے ناحق لتاڑا کیونکہ غلطی ہماری تھی۔“ میں نے بالکل غیر جانبداری سے کہا۔

”اوہو بیچارہ۔ ذرا اِدھر دیکھو میری طرف۔“

”غلط مطلب نہیں لو، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اور بس اب یہ موضوع ختم۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے مزید بولنے سے باز رکھا تو وہ میرے ہی انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔

”ہاں خبردار۔ اب کوئی اُس بیچارے کا نام نہیں لے گا۔“ اور میں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پائی تھی۔

شمائلہ اور میری دوستی کی عمر بھی اتنی ہی تھی جتنی ہم دونوں کی۔ ساتھ ساتھ گھر ہونے کے باعث ہمارا شروع ہی سے ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ اس لیے اُس کا زیادہ وقت ہمارے گھر گزرتا اور جب اُس کی امی اُسے بلاتیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔

اسکول میں بھی ہم ساتھ داخل ہوئیں اور کالج میں بھی۔ ہمارا خیال تھا ہم انٹر کے بعد یونیورسٹی جوائن کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ہی شمائلہ کے ابو کا سیالکوٹ ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ ایک سیمی گورنمنٹ ادارے میں ملازم تھے۔ میں نے اور شمائلہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اتنی دور چلی جائے گی۔ اُس وقت ہم دونوں کا ہی رو رو کر بُرا حال تھا۔ اس کی امی اُسے بہلا بہلا کر تھک گئیں کہ وہ ہر سال چھٹیوں میں اُسے کراچی لے آیا کریں گی، اور میرے گھر میں امی، آپی اور بڑے بھیا بھی مجھے ایسے ہی بہلا رہے تھے۔

”بھئی سیالکوٹ کون سا دور ہے۔ تم جب کہو گی میں تمہیں لے جاؤں گا۔“ بڑے بھیا نے مجھے بہت یقین دلایا تھا۔

بہرحال یہ سب بہلاوے تھے۔ دو سال ہو گئے تھے شمائلہ کو سیالکوٹ گئے ہوئے نہ تو اُس کی امی چھٹیوں میں اُسے لے کر آئیں نہ بڑے بھیا مجھے سیالکوٹ لے کر گئے۔

گزشتہ سال آپی کی شادی پر مجھے یقین تھا کہ شمائلہ ضرور آئے گی اور وہ آنا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اتفاق سے انہی دنوں اُس کی امی بیمار ہو گئی تھیں۔ بہرحال ہمارے درمیان خط و کتابت باقاعدگی سے جاری تھی، جس سے ہماری دوستی اب بھی اسی طرح قائم تھی۔

اور جب میں بی اے کے امتحانوں سے فارغ ہوئی تو شمائلہ اچانک اپنے امی ابو کے ساتھ آگئی، اور میں جو فراغت کے تصور سے ہی پریشان ہو رہی تھی۔ اُس کی آمد پر بے انتہا خوش ہو گئی۔ اصل میں اُس کے امی ابو عمرہ کرنے جا رہے تھے اور وہ ضد کر کے اُن کے ساتھ آئی تھی کہ اتنے دن وہ میرے ساتھ رہے گی، سچ مچ میری تو عید ہو گئی تھی۔ پوری رات ہماری باتیں کرتے گزر جاتی اور دن میں کسی پرانی دوست سے ملنے کا پروگرام بنتا۔ یا ساحل پر جانے کا یا پھر شاپنگ۔ آج بھی ہم شاپنگ کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اور اس وقت سے تو شمائلہ مان نہیں رہی تھی۔ رات میں اچانک جانے کیا خیال آیا کہنے لگی۔

”سنو، غلطی واقعی ہماری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ اُسے اتنا بُرا بھلا کہہ دیا۔“

”کسے؟“ میں فوری طور پر سمجھی نہیں اور وہ شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی۔

”اُس بیچارے گاڑی والے کو۔“

”اوہو بیچارہ! ذرا میری طرف دیکھو۔“ میں نے اسی کی بات دہرائی لیکن پھر خود ہی شپٹا گئی۔ کیونکہ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اور وہ بھی معنی خیز مسکراہٹ اور نظروں سے۔

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“ مجھے غصہ آگیا۔

”لو میں نے تم سے کچھ کہا ہے؟“

"ایسے دیکھو بھی مت ورنہ۔" میں نے تکیہ اٹھا کر اُس کے سینہ پر دے مارا۔ پھر کتنی دیر تک ہمارے درمیان تکیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔

اُن دنوں امی، بڑے بھیا کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں۔ یوں تو آپی کی شادی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن درمیان میں وقفہ آجاتا کیونکہ بڑے بھیا ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے جس سے امی کا جوش سرد پڑ جاتا اور تنگ آکر وہ بڑے بھیا پر چھوڑ دیتیں کہ وہ خود ہی جب کسی لڑکی کو پسند کریں گے تب امی بات آگے چلائیں گی۔ اور بڑے بھیا پتا نہیں کیا سوچے ہوئے تھے۔ نہ خود پسند کرتے، اور ہماری پسند کو بھی ریجیکٹ کر دیتے۔ بہرحال ان دنوں امی کو پھر سے بھیا کی شادی کے لیے فکرمند دیکھ کر مجھے شمائلہ کا خیال آیا۔ اگر بھیا راضی ہو جائیں تو شمائلہ ہمیشہ اس گھر میں رہ سکتی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں اسی وقت بھیا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ یقیناً اس وقت میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ جبھی بھیا مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"لگتا ہے، تمہارے بانڈ پر انعام نکل آیا ہے۔ کتنے لاکھ کا ہے؟"

"کوئی بانڈ وانڈ نہیں نکلا۔ بس ابھی ابھی مجھے ایک خیال آیا ہے۔ اگر آپ میرے خیال سے متفق ہو جائیں تو۔" میں نے تجسس پیدا کرنے کی خاطر بات ادھوری چھوڑ دی۔ تو بھیا اونچے ہو کر بیڈ کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔

"گویا تمہاری خوشی کا دارومدار میرے متفق ہونے پر ہے اور اگر میں متفق نہ ہوا تو؟"

"نہیں بھائی ایسی بات نہیں کریں۔" میں نے پہلے ہی سے خوشامد شروع کر دی تو وہ ہنس کر بولے۔

"اپنا خیال تو بتاؤ۔"

"وہ آپ کے لیے شمائلہ کیسی رہے گی، میرا مطلب ہے۔" میں شوق سے اپنا مطلب واضح کرنے لگی تھی کہ بھیا نے سختی سے ٹوک دیا۔

"سمیعہ!"

"آپ میری پوری بات تو سنیں!"

"شٹ اپ، جاؤ تم اپنا کام کرو۔" بھیا کے ڈانٹنے پر میں کچھ ڈر کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ بھیا نے میرا ہاتھ پکڑ کر پھر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔

"بہت غلط بات کہی تم نے سمیعہ، شمائلہ تمہاری دوست ہے اور میں نے اُسے ہمیشہ تمہاری طرح ہی سمجھا۔ تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

"اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔" میں نے منہ پھلا کر کہا۔

"پھر بھی میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اور دیکھو اداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ موڈ ٹھیک کرو اور جاؤ کھیلو۔" بھیا نے یوں کہا جیسے میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں۔ میں ہنستی ہوئی اُن کے کمرے سے نکل کر آئی تو شمائلہ پر نظر پڑی۔ وہ ریلنگ پر جھکی نیچے دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے اُس کے قریب آکر کہا تو وہ چونکتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"کہیں نہیں، بھیا کے کمرے میں تھی۔ چلو نیچے چلتے ہیں۔"

"صرف نیچے نہیں کہیں باہر چلو۔ میں بور ہو رہی ہوں۔" وہ ریلنگ چھوڑ کر میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولی۔

"امی سے تم اجازت لو۔ مجھے تو ڈانٹیں گی۔" میں نے اُس کے ساتھ نیچے آتے ہوئے کہا تو وہ فوراً مجھے چھوڑ کر امی کے پاس چلی گئی اور اُن سے آپی کے گھر جانے کی اجازت لے کر آگئی۔

پھر آپی کے گھر ہم صرف پندرہ منٹ بیٹھیں۔ وہ بیچاری روکتی رہ گئیں کہ رات کے کھانے تک رک جاؤ۔ اس کے بعد وہ اور دولہا بھائی خود ہمیں گھر چھوڑ آئیں گے اور میں بھی رکنا چاہتی تھی لیکن شمائلہ جانے کیا سوچ کر آئی تھی۔ آپی کے اتنے اصرار پر اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر لجاجت سے بولی۔

"پلیز آپی، مائنڈ نہیں کریں۔ ہم پھر آئیں گے۔"

"اس وقت کہیں اور جانا ہے کیا؟" بالآخر آپی کچھ کہیں۔ ماؤں میں منع کرنا چاہتی تھی لیکن شمائلہ فوراً بول پڑی۔

"جی آپی! وہ ہماری دوست صبیحہ ہے ناں اُس سے ملنے جانا ہے۔ لیکن آپ خالہ جان کو نہیں بتائیے گا۔ کیونکہ انہوں نے صرف آپ کے ہاں آنے کی اجازت دی ہے۔"

"ہاں مجھے پتا چلا ہے کہ تم دونوں بہت آوارہ گردی کرنے لگی ہو۔" آپی نے کہا تو میں چیخ پڑی۔

"اُف آوارہ گردی۔ کوئی اچھا لفظ استعمال کریں آپی۔!"

"اس کا متبادل اچھا لفظ تم ہی بتادو۔"

"وہ کیا کہتے ہیں!" میں نے شمائلہ کو دیکھا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔

"راستے میں سوچ لینا۔ اچھا آپی ہم چلتے ہیں۔" وہ آپی کو خدا حافظ کہہ کر مجھے اسی طرح کھینچتے ہوئے باہر لے آئی۔

"یہ صبیحہ کون ہے؟" بس اسٹاپ پر آکر میں نے اچانک یاد آنے پر اُس سے پوچھا۔ تبھی وین آکر رکی تو وہ میری بات نظر انداز کرکے وین میں سوار ہوگئی، اور مجھے بھی جلدی چڑھنے کا اشارہ کیا۔ وین کچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تبھی راستے میں مجھے اُس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ساحل کے قریب اترتے ہی میں اس پر چڑھ دوڑی۔

"ابھی پرسوں ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ تمہارا دل نہیں بھرا۔ اگر امی کو معلوم ہوگیا تو!"

"میں تو نہیں بتاؤں گی۔" میرے بگڑنے کا نوٹس لیے بغیر وہ لہروں کی شوخیاں دیکھتی ہوئی لاپروائی سے بولی تو میں نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کردیا کیونکہ اس پر کچھ اثر نہیں ہونا تھا۔

"چند دنوں کی بات ہے، پھر تو میں چلی جاؤں گی۔" میری خاموشی محسوس کرکے وہ کہنے لگی۔ "اور پتا ہے سمیعہ! مجھے تمہارے ساتھ گزرے یہ سارے لمحات بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں رو پڑتی ہوں اور کبھی ابو سے بہت ضد کرتی ہوں کہ دوبارہ کراچی ٹرانسفر کروالیں۔ لیکن اب امی نہیں مانتیں کیونکہ وہاں میری خالہ اور ماموں وغیرہ ہیں۔"

"ظاہر ہے اب وہ اپنے بہن بھائیوں کے قریب رہنا چاہتی ہوں گی۔"

"ہاں لیکن مجھے وہاں بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ میرے دن کتنے بور گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے اڑ کر تمہارے پاس آجاؤں۔" اس کی اتنی محبت پر میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"مجھے پتا ہے شمائلہ کیونکہ میں خود تمہاری دوری کو شدت سے محسوس کرتی ہوں۔" میری آواز کے بوجھل پن نے اُسے چونکا دیا پھر میری لبریز آنکھیں دیکھ کر وہ ایکدم میرے گلے لگ گئی۔

"خبردار رونا نہیں!" اس کی پیار بھری وارننگ پر میں ہنس پڑی۔

"میں رو نہیں رہی اور پلیز مجھے چھوڑو سب لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔"

"ہونے دو۔" اس نے پہلے زور سے مجھے بھینچا پھر الگ ہوئی۔

"توبہ۔ تم نے تو میری ہڈیاں چٹخادیں۔" میں نے گہری سانس سینے کے اندر اتارتے ہوئے کہا پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر گیلی ریت پر چلنے لگی، باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر پہلے مجھے ہی احساس ہوا، شام اُتر رہی تھی اور ہم دونوں اکیلے تھے جب میں نے اُسے احساس دلایا تو وہ بھی پریشان ہوگئی۔

"بس اب فوراً چلو اور دعا کرو یہیں سے وین مل جائے ورنہ اتنی دور چلنا پڑے گا۔ کچھ دیر پہلے جتنا اچھا لگ رہا تھا اب اتنا ہی ڈر لگنے لگا تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے میں نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک وین کا نام و نشان نہیں تھا۔

"پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قسمت میں ڈانٹ لکھی جاچکی ہے لہٰذا اب آرام سے چلو۔" اس نے کہا تو مجھے غصہ آگیا۔

"تمہیں کیا، تم تو صاف بچ جاؤ گی۔"

"نہیں تمہارے حصے کی مار میں کھالوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔ اب خدا کے لیے ذرا دم لو، میرا سانس پھول گیا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم روک لیے اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تبھی ایک گاڑی ہمارے بالکل قریب سے گزری۔ ہم دونوں اُچھل کر پیچھے ہٹیں اور ابھی سنبھل بھی نہیں تھیں کہ وہی

گاڑی ریورس ہو کر پھر ہمارے قریب آ کر رکی اور اُس میں بیٹھا اُس روز والا شخص شیشے میں سے سر نکال کر بولا۔

"ارے آپ دونوں وہی ہیں ناں!" اُف میری تو جان نکل گئی جبکہ شمائلہ اُسے دیکھتے ہی تیز ہو کر بولی۔

"ابھی تک آپ کو گاڑی چلانی نہیں آئی؟"

"سیکھ رہا ہوں۔" وہ ڈھٹائی سے کہہ کر ہنسا اور میں نے شمائلہ کے بازو میں چٹکی کاٹ کر سرگوشی میں اُسے چلنے کو کہا تو وہ سمجھ کر فوراً کہنے لگا۔

"بیٹھیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔"

"فی الحال ہمارا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" شمائلہ اُسے جواب دے کر میرے ساتھ چل پڑی تو وہ بھی گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ چلانے کے ساتھ مسلسل اصرار کرنے لگا کہ وہ ہمیں چھوڑ دے گا۔

"کیا حرج ہے بلکہ اچھا ہے جلدی پہنچ جائیں گے۔" شمائلہ نے قدم روک کر مجھ سے کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ شکل سے شریف آدمی نظر آ رہا ہے۔" اور ہمارے رکنے پر ہی وہ سمجھ گیا تھا جبھی فوراً فرنٹ ڈور کھول دیا۔

"فکر مت کرو۔ میں سنبھال لوں گی سب۔" شمائلہ نے مجھے اطمینان دلانے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں آہستہ سے بولی۔

"میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھوں گی۔"

"اچھا پیچھے مرو۔" وہ مجھے دھکیل کر خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"شکریہ!" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا بولا۔

"جی نہیں۔ شکریہ ہمیں آپ کا ادا کرنا ہے اگر زندہ سلامت منزل مقصود پہ پہنچ گئے تب۔" شمائلہ ذرا بھی نروس نہیں تھی۔

"خیر اب اتنا اناڑی بھی نہیں ہوں میں۔ خصوصاً خواتین کی موجودگی میں تو بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ اب ذرا اسپیڈ بڑھا دیں تاکہ ہم آج کی تاریخ میں گھر پہنچ سکیں۔" شمائلہ نے بڑی خوبصورتی سے اُسے احساس دلایا جس پہ وہ محظوظ ہو کر ذرا سا ہنسا پھر اسپیڈ بڑھاتا ہوا پوچھنے لگا۔

"کس طرف جانا ہے آپ کو؟"

"فی الحال سیدھے چلتے جائیں آگے میں راستہ بتا دوں گی۔"

"جیسے راستہ تو بتا دیں گی۔ اب نام بھی بتا دیجیے اللہ یہ کہ کیا کرتی ہیں آپ؟" اُس نے شمائلہ سے پوچھتے ہوئے ویو مرر میں ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈالی تو میں اپنی جگہ کچھ اور سمٹ گئی۔ حالانکہ میں کوئی دقیانوسی قسم کی لڑکی نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں کسی بھی غیر مرد سے بات کرتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ ابھی بھی میں یہی سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں وہ مجھے مخاطب نہ کرے۔

"نام بتانا ضروری ہے کیا؟" شمائلہ نے اُلٹا اُس سے پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

"کوئی ضروری نہیں۔" پھر قدرے توقف سے کہنے لگا۔

"ویسے مجھے ابرار احمد کہتے ہیں۔ غمِ روزگار کے سلسلے میں کویت میں مقیم ہوں آجکل چھٹی پہ آیا ہوا ہوں۔"

"یقیناً شادی کرنے آئے ہوں گے؟" جواب نہیں تھا اُس لڑکی کا، اُس نے بھی بے ساختہ سراہا۔

"بہت ذہین ہیں آپ؟"

"شکریہ!" شمائلہ نے گردن اکڑانے کے ساتھ پلٹ کر مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "سن لو" اور اُس کے پلٹ کر دیکھنے پر ہی غالباً اُسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اُس سے پوچھنے لگا۔

"یہ آپ کی سسٹر ہیں؟"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"اعتراض کیوں ہوگا البتہ حیرت ہو رہی ہے کہ آپ سے بہت مختلف ہیں۔ یعنی بہت کم گو لگ رہی ہیں۔" میرے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس نے مرر میں پھر ایک نظر مجھے دیکھا تو یکبارگی میرا دل بڑی زور سے دھڑکا۔ تبھی شمائلہ مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہنے لگی۔

"پہلے یہ ایسی کم گو نہیں تھی۔ اصل میں یار اس کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ بہت دکھی ہے بیچاری۔"

"کیا ہوا ہے؟" وہ اُس نے ایکدم سنجیدہ ہوکر میلاڈی سے پوچھا تو شمائلہ دردناک لہجے میں بولی۔

"اُس کے میاں نے اسے چھوڑ دیا ہے اور زیادہ دُکھ کی بات یہ ہے کہ بچہ بھی چھین لیا۔"

"اوکل ہیں۔" میں اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی۔ جبکہ وہ تاسف کا اظہار کرتا ہوا کہنے لگا۔

"بہت افسوس ہوا۔ کون تھا میرا مطلب ہے آپ لوگوں نے دیکھ بھال کر شادی نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔ آجکل کسی کا پتا چلتا ہے۔ دیکھنے میں اتنا شریف اور ایماندار لگتا تھا آپ سے بھی زیادہ۔" وہ اتنی معصوم بن کر بولی کہ مجھے اپنی بے ساختہ ہنسی روکنی مشکل ہوگئی۔ اور پتا نہیں وہ سمجھا نہیں یا قصداً نظرانداز کر گیا۔ تھوڑے سے توقف سے پوچھنے لگا۔

"اب یہ کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ کرنے کے قابل ہو تو کرے۔ ہر وقت تو روتی رہتی ہے۔ ابھی بھی میں اسے بہلانے کی خاطر یہاں لے کر آئی تھی۔"

"آپ ان سے چھوٹی ہیں؟"

"بڑی لگتی ہوں کیا؟" شاید وہ اُسے جاننے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ سچ مچ سٹپٹا کر بولا۔

"نہیں۔"

"پھر پوچھا کیوں؟"

"غلطی ہوگئی۔"

"چلیے معاف کیا اور دیکھیں یہاں سے بائیں جانب موڑ دیں۔" وہ احتیاط سے موڑ کاٹنے کے بعد بار بار مرر میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گئی میرے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی پہ اُسے افسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ مجھے ہنسی آرہی تھی جسے اُس سے چھپانے کی خاطر میں شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اور جیسے ہی شمائلہ نے گھر کے سامنے گاڑی رکوائی میں جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ اُس نے شمائلہ سے جانے کیا کہا پھر ایکدم میری طرف منہ کر کے کہنے لگا۔

"سنیں! آپ کے ساتھ جو ہوا اُسے بھلانا آسان تو نہیں ہے لیکن کوشش کریں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ زندگی میں آپ کو بہت خوشیاں ملیں گی۔"

"میرے خدا۔" میں اپنی جگہ گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔

شمائلہ کے امی ابو عمرہ سے واپس آئے تو ہمارے بہت اصرار پر صرف دو دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ اس کے بعد شمائلہ کو لے کر سیالکوٹ چلے گئے۔ اور ظاہر ہے شمائلہ کو جانا ہی تھا۔ میں ایک بار پھر اکیلی ہوگئی بلکہ اب تو اپنا گھر ہی سونا لگنے لگا تھا۔ کیونکہ اتنے دن وہ یہیں میرے ساتھ رہی تھی۔ حقیقتاً اُس کے دم سے بڑی رونق تھی۔ اب تو امی بھی اُس کے جانے کو محسوس کر رہی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اُسی کی باتیں کرتیں۔ اُس روز وہ اُسے یاد کر رہی تھیں تو میرے منہ سے نکل گیا۔

"بھیا مان جاتے تو شمائلہ ہمیشہ یہیں رہ سکتی تھی۔"

"کیا مطلب؟" امی نے چونک کر مجھ سے پوچھا تب میں نے انہیں ساری بات بتا دی کہ میں نے بھیا سے شمائلہ سے شادی کرنے کو کہا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔

"تمہارے بھیا کا تو دماغ خراب ہے۔ اب بتاؤ بھلا شمائلہ میں کیا کمی ہے۔" میری پوری بات سن کر امی بھیا پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگیں۔ تبھی اتفاق سے بھیا آ گئے۔ صورت حال سے بے خبر امی ہی سے پوچھنے لگے۔

"کیا ہوا امی! کیوں خفا ہو رہی ہیں؟" امی بس انہیں دیکھ کر اور بڑبڑا کر رہ گئیں تب انہوں نے اشارے سے مجھ سے پوچھا تو میں نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"امی آپ پر خفا ہو رہی ہیں۔ یعنی آپ کے شادی نہ کرنے پر۔"

"اس کا مطلب ہے پھر کوئی لڑکی امی کو پسند آگئی ہے۔" بھیا نے کن اکھیوں سے امی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"شمائلہ!" پھر فوراً ہی میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور خائف سی ہو کر بھیا کو دیکھنے لگی کہ ابھی وہ ڈانٹیں گے لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ بھیا یکدم خاموش ہو گئے اور رکے بھی نہیں، فوراً اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو میں اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔ یقیناً اب وہ میری ٹھیک ٹھاک کلاس لیں گے۔ اسی خیال کے تحت میں ان سے چھپتی پھری۔

صبح جب تک وہ آفس نہ چلے جاتے میں خود کو کچن میں ہی مصروف رکھتی۔ اور شام میں ان کی آمد پر بھی ادھر ادھر ہو جاتی۔ لیکن آخر کب تک اس رات کھانے کے بعد میں ابھی اپنے کمرے میں آئی ہی تھی کہ بھیا بھی میرے پیچھے چلے آئے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں بول پڑی۔

"بھیا! ویسے میں نے امی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی۔"

"کیا نہیں کہا تھا تم نے؟" بھیا کے انجان بننے پر میں سٹپٹا گئی۔

"وہ میرا مطلب ہے شمائلہ کی بات میں نے نہیں چھیڑی تھی۔"

"لیکن مجھ سے تو پہلے تم نے کہا تھا۔" بھیا میرے بیڈ پر بیٹھتے ہی سرسری انداز میں بولے تو مجھ سے کچھ جواب نہیں بن پڑا۔ لیکن میں قدرے اطمینان سے ہو گئی کیونکہ بھیا کے کسی انداز سے غصہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"تو تم شمائلہ کو اس گھر میں لانا چاہتی ہو، لیکن اس سے بھی تم نے پوچھا ہے کہ آیا وہ آنا چاہتی ہے کہ نہیں۔"

ہائیں! یہ بھیا کیا کہہ رہے تھے مجھ پر تو سچ مچ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فوری طور پر کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ تب بھیا اٹھ کر میرے قریب آئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"سنو، پہلے اس سے معلوم کرو اگر وہ خوشی سے راضی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" پھر جاتے جاتے رک کر بولے۔

"اور سنو! ابھی امی کو بلکہ کسی کو کچھ مت بتانا۔ اوکے؟" میرا دل اچانک خوشی سے بے قابو ہو گیا تھا اور کوئی نعرہ ہونٹوں تک آیا چاہتا تھا کہ بھیا کی بات پر مجھے ضبط کا دامن تھام کر اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ بھیا مطمئن ہو کر کمرے سے نکل گئے۔ تب میں چھلانگ لگا کر اپنے بیڈ پر چڑھ گئی، میرا دل ناچنے گانے کو چاہ رہا تھا۔ ظاہر ہے دوہری خوشی ملی تھی۔ ایک تو بھیا کا شادی کے لیے ہامی بھرنا۔ دوسرے شمائلہ ہمیشہ کے لیے یہیں آ جائے گی۔ کتنی دیر تک میں اس وقت کا تصور کر کے خوش ہوتی رہی، پھر شمائلہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ کاش شمائلہ کی یہاں موجودگی میں ہی بھیا میرے خیال سے متفق ہو جاتے تو مجھے اسے چھیڑنے میں کتنا مزہ آتا۔

اگلے دن شام میں میں آپی کے گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اسی وقت کچھ مہمان آ گئے۔ جب امی نے آ کر مجھے جانے سے منع کیا اور چائے بنانے کے لیے کہا تو میں سخت جھنجلائی۔ کیونکہ بھیا اتنی مشکل سے لے جانے پر تیار ہوئے تھے۔

"مہمانوں کو بھی اسی وقت آنا تھا۔" میں بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ کچھ دیر بعد امی آئیں اور جب انہوں نے مجھے ڈھنگ سے چائے بنانے اور ٹرالی میں لوازمات سجانے کو کہا تب میں کچھ ٹھٹک گئی۔ یعنی یہ کوئی عام مہمان نہیں تھے۔ پھر امی کی بوکھلاہٹ نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس کے بعد جہاں میرا فطری تجسس جاگ اٹھا تھا وہاں گھبراہٹ بھی ہونے لگی تھی۔ کیونکہ بھیا کی موجودگی میں مہمانوں کے سامنے جانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ امی خود ہی آ کر چائے وغیرہ لے گئیں تب میں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

کافی دیر بعد غالباً رخصت ہوتے وقت دو خواتین امی کے ساتھ میرے کمرے میں آئیں تو انہیں دیکھ کر میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے بھی بس کھڑے کھڑے میرا نام پوچھا اور یہ کہ میں کیا کرتی ہوں پھر کچھ تعریفی جملے ساتھ ہی خوشی کا اظہار بھی تھا۔ میں کیونکہ سر جھکائے کھڑی تھی اس لیے ان کے تاثرات نہیں دیکھ سکی۔ پھر جیسے ہی وہ امی کے

ساتھ کمرے سے نکل کر گیلری میں کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ یہاں سے میں ان خواتین کو جاتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ان سے پہلے ڈرائنگ روم سے نکل کر بھیا کے ساتھ جو شخص نظر آیا اُسے دیکھ کر میں اُچھل پڑی۔

"ابرار احمد۔" میرے ہونٹوں تک یہ نام آیا تھا کہ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے قریب کہیں اس کی سرگوشی سنائی دی۔

"نہیں! آپ کے ساتھ جو ہوا اُسے بھلانا آسان تو نہیں ہے لیکن کوشش کریں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ زندگی میں آپ کو بہت خوشیاں ملیں گی۔"

اور شاید میرے ساتھ ہونے والی نام نہاد ٹریجڈی نے اُسے متاثر کیا تھا جو آپ خود ہی خوشیوں کا پیامبر بن کر چلا آیا تھا۔ اور میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ وہ مجھے اوّل روز ہی اچھا لگا تھا البتہ اس وقت اسے دیکھ کر میرے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔

اگلے روز امی نے آپی کو بلوا بھیجا اور جو کچھ اُن سے کہا وہ آکر مجھ سے کہنے لگیں۔

"سنو، کل تمہارے لیے جو پرپوزل آیا تھا تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں خاموشی سے آپی کو دیکھنے لگی۔ تو وہ میرا ہاتھ دبا کر بولیں۔

"اصل میں لڑکا کویت سے آیا ہوا ہے۔ اور اس کی چھٹی بھی بس ایک مہینے کی رہ گئی ہے اس لیے اُنہوں نے فوراً جواب مانگا ہے۔ امی اور بھیا دونوں کو لڑکا پسند آیا ہے اب تم جلدی سے اپنا خیال بتاؤ تاکہ۔" آپی نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارت سے میری کمر میں چٹکی کاٹی تو میرے ہونٹ آپ ہی آپ شرمگیں مسکراہٹ کی گرفت میں آگئے۔ اس کے بعد ظاہر ہے آپی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی اور جانے کیا کیا سوچتی رہی، خصوصاً یہ تصور بڑا دلکش تھا کہ ابرار احمد کو جب معلوم ہوگا کہ میرے ساتھ کوئی ٹریجڈی نہیں ہوئی وہ محض شائلہ کا مذاق تھا۔

اور ظاہر ہے یہ سب میں ہی اُسے بتاؤں گی۔ شائلہ تو یہاں تھی نہیں اور اتنی جلدی اُس کی آمد ممکن بھی نہیں تھی۔ پھر اب تو امی کو جانا تھا بھیا کا پرپوزل لے کر کیونکہ میں اُسے خط لکھ چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھیا کو ناپسند نہیں کرتی۔ بہرحال مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ وہ میری شادی میں شرکت نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ سب کچھ آناً فاناً طے ہوگیا تھا۔ امی بھیا اور آپی کو تو ایک منٹ کی فرصت نہیں تھی ظاہر ہے اتنے کم وقت میں تیاری آسان نہیں تھی پھر بھی اپنے طور پر بھیا نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اُن کا کہنا تھا کہ میری کون سی اور بہنیں بیٹھی ہیں۔ یوں تیاری میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور میں سنہرے سپنے خوابوں کو پلکوں کی اوٹ میں چھپائے ابرار احمد کی سیج پر آبیٹھی۔ یہاں بہت ہنگامہ تھا۔ ابرار کی بہنیں اور کزنز ان سے نیگ وصول کرنے میں بہت شور مچا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میری ساس نے آکر سب کو خاموش کر دیا پھر انہیں اپنے ساتھ لے گئیں تو ایکدم سے خاموشی چھا گئی۔ لیکن مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کیونکہ میں اپنی دھڑکنیں شمار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

"جناب!" کچھ دیر بعد اُن کی شوخی سے بھرپور آواز سنائی دی تو میرا جھکا ہوا سر مزید جھک کر گھٹنوں سے جا لگا۔

"ارے۔" وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔ "یہ سب نہیں چلے گا۔ داد دینی پڑے گی کہ آپ نے تو اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ البتہ گھر دکھانے کی غلطی کر گئی تھیں۔ اس کا مطلب ہے ہر عقلمند شخص تھوڑا بیوقوف ضرور ہوتا ہے۔ اب بتائیے پہلے آپ کی عقلمندی کو سلام کروں یا۔"

"بے وقوفی کو!" میں دھیرے سے بولی تو اُنہوں نے دلکش ہنسی کے ساتھ میرا چہرا اونچا کیا۔ اور جانے کیا ہوا کہ فوراً ہی وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور ابھی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ سناٹے کے عالم میں بولے۔

"آپ۔ اور وہ کون تھی؟"

●

سائرہ یامین راؤ

"ویٹر!"

"ویٹر!" کارنر والی ٹیبل سے غصیلی آواز سنائی دی تو وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا۔

"یس میڈم!" اس نے مودبانہ ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے تم ہمارا آرڈر کیوں نہیں لا رہے ہو اور کتنا انتظار کریں یہ سروس ہے یہاں کی۔ اونچی دکان کے پھیکے پکوان۔"

وہ بہت بدتمیزی سے ڈانٹ رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے باپ کا ذاتی ملازم تھا' بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"میڈم! تھوڑا انتظار' ابھی آپ کو سروس فراہم کر دیتے ہیں۔"

"ابھی ابھی میں آدھا گھنٹہ گزر گیا ہے۔ عجیب تھرڈ کلاس ہوٹل ہے۔" اس کی آواز خاصی بلند تھی' ارد گرد کے لوگ بھی متوجہ ہونے لگے' اور یہ اس کے لیے کافی ہولناک صورت حال تھی' بمشکل یہ نوکری ملی تھی۔ مالک بھی انتہائی بدمزاج تھا اس کے گھبرائے گھبرائے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی سہیلی نے نرمی سے اس سے کہا۔

"اوکے تم جاؤ' کوشش کرو جلدی سے آرڈر لے آؤ۔" اور وہ تشکر سے اس خوب صورت نرم دل' نرم مزاج حسینہ کو دیکھتا تیزی سے سروس روم کی طرف چل دیا۔

"یار! عجیب ہو تم' بے چارے کو خوامخواہ اتنا ڈانٹ دیا کتنا خوفزدہ ہو رہا تھا۔" تمہا' ناشیہ کی طرف دیکھ کر خفگی سے بولی۔

"ایک تو سارے جہان کا درد تمہارے جگر میں ہے' بلکہ گردے' پھیپھڑے' تلی ہر جگہ ہے۔ یہ ہڈحرام یونہی جان بچاتے ہیں' کام سے ڈانٹوں نہ تو کبھی بھی کام نہ کریں' اب دیکھو کیسے آرڈر لا رہا ہے۔"

اس نے ٹرے اٹھائے بابر کو آتے دیکھ کر کہا۔ اور اس کے خاصے بلند لہجے میں کہے گئے الفاظ بابر نے بخوبی سن لیے تھے' جی چاہا ٹرے اس خوب صورت مغرور لڑکی کے سر پر انڈیل دے' یہ امیرزادی خود کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے' ہر شخص کو اپنا غلام سمجھتی ہے۔

"شکر ہے میں تو اب دوسرے ہوٹل میں جانے کا سوچ رہی تھی۔" اس نے جان بوجھ کر سہیلیوں کو سناتے ہوئے اسے جتایا۔

"چلو چھوڑو' شروع ہو جاؤ' تمہیں بہت بھوک لگی ہے نا۔" ایک اور دوست نے اس کا دھیان کھانے کی طرف دلایا تو وہ پلیٹ اٹھا کر ڈونگے سے سالن نکالنے لگی۔

اور پھر وہ جتنی دیر تک کھانے میں مصروف رہیں' اسے دھڑکا ہی لگا رہا کہ وہ کہیں کوئی بات نہ کہہ دے کوئی ایسی بات جس سے اس پر یا اس کی نوکری پر حرف آئے' مگر خدا کا شکر ہوا کہ وہ خیریت سے چلی گئی' اور جاتے جاتے سو کا نوٹ اسے ٹپ کے طور پر تھما دیا۔

ایسے گاہکوں سے وہ سخت الرجک تھا۔ بلاوجہ شور ہنگامہ کر کے خود کو برتر کرنا اور ویٹر کو ادنیٰ درجے کی مخلوق سمجھنا لیکن مجبوری تھی اسے ایسے گاہکوں کے سامنے ڈنوٹنگ کا اشتہار بن کر سروس کرنا پڑتا تھا' کیونکہ یہی لوگ تھے جن سے ان کا روٹی رزق وابستہ تھا۔

وہ سوچتے ہوئے دوسری میز کی طرف چل دیا۔

"یار بابر! آج وہ لال کپڑوں والی حسینہ بڑا غصہ دکھا رہی تھی کیا بات تھی؟" رات کو جب ہوٹل سے وہ اپنے دوست راجو کے ساتھ واپس آرہا تھا تو راجو نے دوبارہ اسے دوپہر والی صورت حال یاد دلا دی' اس نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"پیسے والے لوگ ایسے نخرے نہیں دکھائیں گے تو کون دکھائے گا' ہم غریب ان کا حکم ہی بجا لا سکتے ہیں۔" راجو نے اس کے زہریلے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا۔

"چھوڑ یار ان باتوں کو' ویسے لڑکیاں بہت اونچی تھیں۔ کتنی ٹپ ملی اس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر پوچھا۔

"سو روپیہ۔"

"واہ' چل یار سو روپے میں تو گالیاں بھی کڑوی نہیں میٹھی لگتی ہیں آج مجھے بھی اس عاشق نے

زبردست ٹپ دی ہے۔" مشترک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے راجو نے بتایا۔

"کون عاشق!" اس نے بستر کی چادر درست کرتے کرتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"ارے وہی لمبے بالوں والا لڑکا، جس کے ساتھ اس کی محبوبہ بھی ہوتی ہے۔ توبہ ہے یار! کیا بے حیائی کا زمانہ آگیا ہے، سرعام ایک بوتل میں اسٹرا ڈال کر پیتے ہیں۔ اور لڑکی کے ہاتھ میں گلاب کا پھول جو وہ کبھی ہونٹوں کو لگاتی ہے، کبھی گالوں کو، ہائے کیا موجیں ہیں اس بکرے کی۔" راجو کے کھلے کھلے تبصرے اور انداز پر اس نے اسے گھورا۔

"شرم کرو۔ دوسروں کے بارے میں یوں گھٹیا باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔"

"ارے مولانا صاحب گھٹیا باتیں ہم نہیں کرتے جو ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی زبان پر آجاتا ہے۔ ہزاروں لوگوں کے سامنے سرعام ایسی عامیانہ حرکتیں کرتے جب انہیں شرم نہیں تو ہم کیوں آنکھیں بند کریں۔ اس ٹیبل پر سروس دینے کے لیے تو سارے ویٹرز بھاگتے ہیں۔ جیسے کوئی انعامی مقابلہ ہو۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"دے چھڈ سمجھا کر۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے، ٹپ بھی اچھی اور..." اس نے انتہائی معنی خیزی سے ہونٹ کا کونا دبا کر آنکھ ماری، بابر بری طرح سلگ گیا۔

"انتہائی فضول ہو تم بلکہ بدمعاش۔ اپنے کام میں بددیانتی کرتے ہو۔"

اس کی یہ عادت تھی، اور بابر کو سخت چڑ تھی اس گھٹیا، عامیانہ عادت اور گفتگو سے مگر مجبور تھا کہ راجو اس کا دوست اور محسن تھا، وہ بے روزگاری کے عذاب میں مبتلا تھا فاقوں کا زہر نس نس میں اتر چکا تھا، ماں کے ہاتھ مسلسل لوگوں کے کپڑے دھو دھو کر سوراخ ہونے لگے تھے۔ اور معصوم بیس سالہ بہن تیس سال کی لگتی تھی اور وہ خود!

خود وہ بھی تو پریشان حال تھا، مردانہ وجاہت کا نمونہ، بے انتہا کشش اور حسین نقش بابا سے وراثت میں ملے تھے، مگر غربت، فاقوں اور پریشانیوں کے سبب وہ خود کو بھی بھلائے مارا مارا نوکری تلاش کر رہا تھا، وہ صرف انٹر پاس تھا، آگے پڑھنے کی نہ ہمت تھی نہ استطاعت اور اسے بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس کی تعلیم روپوں سے نہیں بلکہ اشکوں آنسوؤں اور حسرتوں سے کی گئی ہے۔ وہ بہت ذہین اور محنتی طالب علم تھا، انٹر تک بہترین نمبروں سے کامیابی حاصل کرتا رہا تھا۔ اسے تو بہت آگے بڑھنے کی خواہش تھی۔ کچھ بن کر کے دکھانے کی خواہش تھی۔ مگر ساری صلاحیتیں خواہشیں اور حسین سپنے غربت کے اژدھے نے نگل لیے تھے۔

گزشتہ ایک سال سے وہ انٹرویو دینے سے لگ کر صبح گھر سے نکلتا تھا، اور رات کو تھکا ہارا ناکام و نامراد واپس آجاتا تھا، ماں کی آنکھوں میں جلتا آس کا دیا جو سارا دن ٹمٹماتا رہتا تھا، رات کو اسے مایوس دیکھ کر خود بخود ہی بجھ جاتا تھا، اور اگلے دن ماں اپنے آنسوؤں کا تیل ڈال کر دوبارہ اسے جلا دیتی تھی، وہ بے انتہا صابر عورت تھی، ابا کے مرنے کے بعد اس نے کبھی گلہ شکوہ نہیں کیا کسی سے، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے خاندان کے بہت سے مرد آگے بڑھے، اسے سہارا دینے کو، مگر وہ خود سہارا پا کر بچوں کو بے سہارا کرنے کی ہمت نہ کر سکی، اور اس کی ناں نے اس کی زندگی کو اور مشکل کر دیا تھا۔

طرح طرح کے الزامات، گھٹیا باتیں، روپے پیسے کی تنگی! الغرض زندگی تو آسان پہلے ہی نہ تھی اور مشکل ہو گئی۔ مگر باعزم اور باہمت عورت نے حوصلہ نہ ہارا، بابر اس کی امیدوں کا مرکز و محور تھا، دن رات محنت کر کے اس نے اسے انٹر تک پڑھایا تھا، اگرچہ وہ جانتی تھی کہ آج کے دور میں اسے کوئی اعلا افسرانہ نوکری نہیں ملے گی، مگر اتنے برے حالات کا اندازہ نہ تھا، اسے تو بغیر سفارش اور رشوت کوئی چپڑاسی تک بھرتی کرنے کو تیار نہ تھا، گورنمنٹ کی ملازمت تو دیوانے کا خواب بن گئی تھی، پرائیویٹ جاب بھی نہیں مل رہی تھی۔

اور جب اس دن وہ بے انتہا تھک کر بھوک کے ہاتھوں مجبور اس عالیشان ہوٹل کے باہر بیٹھا ہوا اللہ

راجو اسے مل گیا' میٹرک میں وہ اس کا کلاس فیلو تھا' نالائق شرارتی سا لڑکا تھا' وہ ماہر تھا۔ اس لیے اکثر اسے اسکول ورک کے کام وغیرہ کی ضرورت پڑتی تو بابر سے ہی مانگ لیتا' اور محبتو بھی اس سے سمجھتا تھا۔ تو یہ حالات ہیں۔ داستان سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"سن یار! اگر تو برا نہ مانے تو میں تیری نوکری کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"سچ' بتا یار کیا نوکری ہے۔" نوالہ اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"نوکری تو تمہارے معیار کی نہیں' مگر جو حالات تمہارے جا رہے ہیں فی الحال مجھے یہ سب سے مناسب راستہ لگا ہے۔" راجو نے تمہید باندھی۔

"تو بتا تو سہی کیا کام ہے۔ اور کہاں؟" بابر نے بے چینی سے پوچھا۔

"کام میرے والا اور میرے ہی ہوٹل میں۔" اس نے چونک کر راجو کو دیکھا۔ وہ ایک اچھے اور بڑے ہوٹل میں بیرا تھا۔

"جانتا ہوں۔ کام تمہارے معیار کا نہیں' مگر فاقوں مرنے سے بہت بہتر ہے' تنخواہ اگرچہ کم ہے' مگر روزانہ ملنے والی ٹپ ملا کر ٹھیک ٹھاک گزارا ہو جاتا ہے' اور کھانا ہر روز نت نیا مزیدار' مفت۔" اس کی نگاہوں میں وہ کئی راتیں گھوم گئیں جو انہوں نے بنا کھائے گزاری تھیں۔ اور دال روٹی کا حصول بھی ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے کندھا ہلایا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آں... کچھ نہیں۔"

"دیکھو بابر! جتنا سوچو گے۔ اتنا ہی فیصلہ مشکل ہو جائے گا' ہاں یا ناں۔ فوراً" جواب چاہیے مجھے' میں ہوٹل جا رہا ہوں' ایک ویٹر کی جگہ خالی ہوئی ہے' مالک میری مانتا ہے۔ موقع ہاتھ سے مت کھونا' خصوصاً" ان حالات میں' جو تم نے بتائے ہیں۔"

راجو نے سب کچھ بہت اچھی طرح عیاں کر دیا تھا' اور پھر اس نے بھی فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

جب سے یہ ملازمت ملی تھی گھر کے حالات کچھ بلکہ کافی بہتر ہو گئے تھے۔ ماں کو اس نے کام کرنے سے روک دیا تھا' اور روزانہ ملنے والی ٹپ سے گھر کا خرچ بخوبی چل رہا تھا۔ اس لیے ماں نے اس کی تنخواہ سے بشریٰ کا جہیز بنانا شروع کر دیا تھا۔ خود اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی' کم از کم بے روزگاری کا خوف' فاقوں کا ڈر تو نہیں رہا تھا ناں وہ پوری تندہی سے اپنا کام کر رہا تھا' مالک بہت سخت اور شکی تھا' اور اب تک اسے اس کی طرف سے کوئی شکوہ شکایت نہیں ہوئی تھی۔"

لیکن ایک مشکل تھی' ہوٹل سے گھر بہت دور تھا' اور اسے روزانہ صبح سویرے گھر سے وقت پر پہنچنا اور رات کو گھر واپسی خاصی دشوار لگتی تھی۔ کرایہ بھی روزانہ کا کافی بن جاتا تھا' اس کا حل راجو نے یہ نکالا کہ اسے اپنے کمرے میں رہنے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا گھر دوسرے شہر میں تھا' اور وہ ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہتا تھا' بابر کو بھی اس نے وہیں رکھ لیا تھا' یوں آنے جانے کا خرچا بھی بچ گیا تھا۔

اگلے دن راجو نے جان بوجھ کر اپنی ڈیوٹی ہال میں لگوائی اور بابر کی فیملی کیبنز پر وہ ایک نمبر شرارتی اور چکر باز تھا' بابر اسے تانک جھانک کرنے اور گاہکوں کے متعلق دیے گئے ریمارکس پر خوب ڈانٹتا تھا' بلکہ اکثر سمجھاتا بھی تھا کہ کسی کی ذات پر یوں کھلم کھلا تنقید اخلاقی جرم ہے' مگر وہ اسے بڑھا کو اور مولانا کہہ کر مذاق اڑاتا تھا' باقی تمام ویٹرز بھی جب اکٹھے ہوتے تو گاہکوں خصوصاً" لڑکیوں کے متعلق بہت عجیب گھٹیا باتیں کرتے تھے۔ خصوصاً" جو لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ آتی تھیں۔

اور اب! اب اسے جان بوجھ کر ایسے ہی خاص کیبن کے لیے نامزد کروایا تھا۔ اس سازش میں اس کے دوسرے ساتھی بھی ملوث تھے۔

"ویٹر۔" وہ تیزی سے اندر لپکا۔

"یس میڈم!" اس لڑکی پر نظر پڑتے ہی اس نے نظریں جھکا کر کہا' ایک نگاہ ہی کافی تھی' اس کا لباس' انداز' اور پھر جس بے تکلفی سے وہ اپنے بوائے فرینڈ جس کا نام تو اسے معلوم نہ تھا' البتہ سب اسے بکرا کہتے تھے کے ساتھ بیٹھی تھی' وہ تو فوراً" ہی باہر نکل آیا'

حالانکہ اس لڑکی نے بہت دلچسپی سے گہری نگاہ ڈالی تھی اس پر "منو کیا نام ہے تمہارا؟" وہ چائے کے کپ رکھ رہا تھا جب اس نے پوچھا۔

"وہ جی بابر۔"

"بابر۔ گڈ تم ویٹر نہیں لگتے ہو' نئے ہو!" اس کے سوالات اور دلچسپی سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"جی! کافی عرصے سے یہاں ہوں' پہلے ہال میں ڈیوٹی تھی۔"

"ہوں۔" وہ پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں جاؤں جی۔" اس نے ایک نظر بکرے پر ڈالی' قطعی اجنبی اور لاپروا بنا وہ مزے لے کر روسٹ سے انصاف کر رہا تھا۔

"کم بخت بھوکا' بے غیرت۔" اس نے دل میں اس کی بے حسی پر اسے گالی دی۔

"ارے! تم کہاں جا رہے ہو' میں نے تمہیں جانے کو نہیں کہا۔" اس نے اسے یوں جاتے دیکھ کر پکارا' بابر کے تو آگ لگ گئی' بمشکل خود کو کنٹرول کر سکا' ہال میں تو وہ لاکھ درجے اچھا تھا' یہاں راجو نے اسے پھنسایا تھا' اوپر سے اس کا حکم۔

"میڈم! مجھے دوسرے کسٹمرز کو بھی دیکھنا ہے' ان کی سروس۔"

"ان کی سروس مجھ سے اہم نہیں۔ نئے ہو' مجھے جانتے نہیں ہو' جان جاؤ گے بل لاؤ۔" وہ اس کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں بولی۔

وہ تیزی سے باہر نکلا' جیسے موت کے منہ سے واپس آیا ہو۔ دھڑکتے دل' اور فق چہرے کے ساتھ' جی چاہا بل کسی اور کے ہاتھ بھجوا دے۔ مگر وہی مجبوری' جو اتنا رعب ڈال سکتی تھی' یقیناً" طاقت بھی رکھتی تھی' کہیں اس کی نوکری کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔

اس نے پانچ سو روپے ٹپ دی تھی' اور وہ حیرت زدہ روپے ہاتھ میں لیے کھڑا رہ گیا۔

"خداوندا! بعض لوگوں کو تو روٹی کے لیے روپیہ تک میسر نہیں' اور کچھ ایسے بھی ہیں' جو محض دو کپ چائے پی کر پانچ سو روپیہ ٹپ دے جاتے ہیں۔"

*_*_*

"یار! تیرے تو وارے نیارے ہو گئے' اس لڑکی کا فون آیا ہے منیجر صاحب کو کہ بابر مجھے سروس دے گا جب بھی میں آؤں گی' ہمارے یہ تیری شکل نے کمال کر دیا۔" راجو' بشیر' واجد سبھی اسے تنگ کر رہے تھے' چھیڑ رہے تھے اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی پھندے میں پھنسا دیا گیا ہو' وہ بے حد شریف اور نیک خیالات والا نوجوان تھا' اسے نہ تو اس حسینہ کی خوب صورتی سے کوئی غرض تھی' اور نہ ہی اس کی بے باکی سے لگاؤ' ایسی بے شرم اور سرعام دعوت نظارہ دیتی لڑکیاں تو ویسے بھی زہر لگتی تھیں۔

اگلا دن بہت کٹھن تھا اس کے لیے۔ وہ کم از کم اپنی نوکری میں بددیانتی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا' اور وہ لڑکی متواتر اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش میں تھی' آج تو اس کے ساتھ بکرا بھی نہیں تھا۔

"منو تم یہاں خود کو ضائع کر رہے ہو' تمہیں تو بہت اچھی جگہ ہونا چاہیے تھا۔" اس نے اک ادا سے جوس کا سپ لیتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔

"شکریہ میڈم میں ٹھیک ہوں یہاں بہت مطمئن۔"

"یہ ویٹر بننا تمہارا شوق ہے کیا؟" اس نے مذاق اڑایا۔

"جی ہاں' اس کے ابا مرحوم کی آخری خواہش تھی کہ بیٹا ویٹر ہی بنتا۔ اب اگر اس نے یہ نوکری چھوڑ دی تو ان کی روح بے چین و بے قرار ہو جائے گی۔" اندر آتے راجو نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔

"اوہ تم بہت نائس ہو۔" وہ اوپر سے مسکرائی۔ بابر نے اس کی آمد کو غنیمت جان کر کچھ کھسکنا چاہا۔

"میں چلتا ہوں راجو' تم یہاں ٹھہرو گے۔"

"ارے ارے رکو' میں تو میڈم کو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ یہ باتوں میں اتنی مصروف ہیں کہ موبائل اٹینڈ نہیں کر رہی ہیں' کاؤنٹر پر کسی جانی صاحب کا فون آیا ہے کہ ان سے بات کر لیں۔"

"اوہ جانی کا فون آیا ہے' او کے تھینک یو میں کر

لیتی ہوں۔" پتا نہیں جانی صاحب کون تھا کہ وہ دونوں کو نظرانداز کر کے اسی وقت بیگ سے موبائل نکال کر فون کرنے لگی۔ اور بابر موقع غنیمت جان کر باہر نکل آیا۔

"یار! میں اب وہاں نہیں جاؤں گا' خواہ کچھ بھی ہو جائے۔" سخت جھنجلایا ہوا وہ کہہ رہا تھا' اور راجو اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔" اس نے غصے سے کہہ کر منہ موڑ لیا۔

"اچھا اچھا' مجھ سے کیوں ناراض ہو رہا ہے' میں تو نہیں کہتا کہ تو وہاں جا' وہ تو خود بلاتی ہے تجھے' بڑی مہربان ہے تجھ پر' جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھا لے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں فائدے پر اور ایسی کمائی پر' دیکھو راجو! وہ مجھے اچھی شریف لڑکی نہیں لگتی' اور میں اس کی وجہ سے نوکری چھوڑ دوں گا۔ خوب صورتی کو اس طرح کیش کرانا مجھے زیب نہیں دیتا۔ اور نہ ہی میں بے غیرت ہوں۔" وہ حد سے زیادہ سنجیدہ تھا' راجو کو بھی سیریس ہونا پڑا۔

"ٹھیک ہے۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں' صبح کچھ نہ کچھ حل سوچیں گے اس کا بھی' اب تو آرام کر' اور وہاں وہ اماں اور بشریٰ بہن سب ٹھیک تھے نا۔" اس نے اس کا دھیان بٹایا۔

"ہاں سب ٹھیک ٹھاک تھے۔ اللہ کا شکر ہے۔ میری ماں کو بھی اب سکون ملا ہے بشریٰ کا رشتہ دیکھا ہے' اچھا لڑکا ہے' اگلی دفعہ جاؤں گا تو ہاں کر آؤں گا۔" وہ بھی سب کچھ بھلا کر معصومیت سے ماں بہن کی باتیں کرنے لگا۔

اگرچہ وہ لڑکی ٹینا اس کی طرف مائل بہ کرم تھی۔ مگر مقابل بھی بابر تھا' اگلے ہی دن اس نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کرالی' اور راجو بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ واقعی نوکری چھوڑ دے گا۔ مگر ان خرافات میں پڑنا اس کی سرشت میں نہیں۔

آج وہ دن بعد وہ خود کو بہت آزاد سا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی ویران ناپسندیدہ جگہ سے ایک دم پر رونق جگہ آ جائے' ہال میں ڈھیر سارے بندوں کے درمیان رزق کی خاطر بھاگ بھاگ کر کام کرنا اسے ڈھیروں اطمینان بخش رہا تھا' کچھ دنوں سے ٹینا نہیں آ رہی تھی' ذاتی مصروفیت تھی یا پھر اس کی وجہ سے وہ ہوٹل نہیں آ رہی تھی۔ اس نے تو توجہ نہیں دی تھی' مگر دوسرے ویٹر جب اکٹھے ہو کر اسے اس کے حوالے سے چھیڑتے تو اسے غصہ آ جاتا' کتنی بے باک گفتگو کرتے تھے وہ۔ اس کے منع کرنے پر راجد نے کہا۔

"یار! ہم نے کبھی کسی شریف' کسی اچھی عورت کے متعلق ایک لفظ بھی کہا ہے' ہرگز نہیں' عزت دار کی ہم بھی عزت کرتے ہیں' مگر جو خود موقع دے۔"

"کچھ بھی ہو' ان کے فعل ان کے ساتھ' برائی کو دیکھ کر خود بھی برائی کرنا' کہاں کی دانشمندی ہے۔" بابر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"یار! ہم سا ہر کوئی تو نہیں ہو سکتا' مردوں کو الزام دینے والی یہ عورتیں خود کو نہیں دیکھتیں کہ جس حالت میں جو انداز دکھا کر گھروں سے باہر آتی ہیں' اس کے بعد یہ ٹینا صاحبہ عورت کے حقوق پر دھواں دھار تقریر کر کے تالیاں بجواتی ہیں اور دوسری طرف خود ہر روز کسی نہ کسی نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ عیش اڑا رہی ہوتی ہیں' ابھی اور حقوق چاہیں' اور آزادی چاہیے' پتا نہیں کون سی آزادی' کون سے وہ حقوق انہیں چاہئیں' ہم مردوں کو خراب کرنے والی ایسی ہی عورتیں ہیں۔"

جاوا اس قدر گہری اور تلخ بات بھی کر سکتا تھا' بابر کو پسینہ آ گیا واقعی وہ درست کہہ رہا تھا' عورت کو شرم و حیا کی دیوی کا درجہ دے کر گھر کی چار دیواری کے اندر بہت سے حقوق دے دیئے گئے تھے۔ وہ باہر نکلے بھی تو باپردہ ہو کر نکلے' نہ کہ دعوت نظارہ دے' اور ایسی لڑکیاں جو ماڈرن ازم کے نام پر خود کو ہر حد' ہر قید سے آزاد سمجھ کر حقوق نسواں کی آڑ میں بے حیائی' فحاشی کی مرتکب ہوتی ہیں' عورت ذات کے نام پر دھبہ ہیں' اور پوری برادری کی تذلیل کا سبب۔

--*

آج بہت دنوں بعد وہ اسے دوبارہ نظر آئی تھی۔ نرم

دل نرم مزاج، حسینہ وہ بے حد معصوم، سلجھی ہوئی باوقار لگتی تھی۔ اس دن اس نے بابر کی حمایت کی تھی، اور لاشعوری طور پر ہی وہ اس کی شکل ذہن سے محو نہیں کرسکا تھا۔ آج بھی وہ اپنی دوست کے ساتھ تھی۔ دونوں باتیں کر رہی تھیں، وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا۔

"نیہا! جہانگیر ایسا نہیں ہے، تم اسے پرکھو تو!" وہ جب قریب کھڑا ہوا تو اس کی دوست اس سے کہہ رہی تھی، اور وہ خود گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کا دل چاہا اس کا جواب سنے۔

"یس میڈم۔" وہ متوجہ نہ ہوئیں تو بالآخر بولنا ہی پڑا۔

"ہاں تم دو کپ چائے اور سینڈوچ لے آؤ۔" وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی سہیلی ہی بول رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا کہ وہ چپ سی سنجیدہ سی، بابر ہال میں آتے جاتے قریب سے گزرتے اسے ضرور ایک نظر غیر ارادی طور پر دیکھ لیتا تھا۔

بل پے کرتے ہوئے اس نے زائد بیس روپے انہیں واپس لا کر دیے تو دونوں نے چونک کر دیکھا۔

"ارے بھئی، یہ رکھ لو، تمہارے ہیں۔" نیہا نے روپے اسے واپس کیے۔

"شکریہ میڈم!" وہ روپے تھامے بنا ہی واپس مڑ گیا۔ دونوں نے حیرت سے کندھے اچکا کر اسے دیکھا اور باہر نکل گئیں۔

پتا نہیں کیوں اسے آج اس کے ہاتھ سے بخشش لینا اچھا نہیں لگا، حالانکہ وہ ایسا بھی نہ تھا کہ کوئی ٹپ دیتا اور وہ انکار کر دیتا، مگر بعض اوقات دل کسی ایک شخص کے سامنے معتبر ہونے کو مچل جاتا ہے۔ وہ اجنبی لڑکی جس کا نام معلوم تھا، دل کے خود ساختہ یک طرفہ قائم کیے گئے تعلق کے حوالے سے خاصی عزیز ہو گئی تھی۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو عزت کرتے ہیں، اور کرواتے ہیں۔ وہ بھی بہت احترام سے نرمی سے گفتگو کرتی تھی، جب ہی وہ اس کا احترام اس قدر کرتا تھا کہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی مخصوص نشست خالی کروا لیتا تھا۔

وہ بہت زیادہ نہیں آتی تھی، کبھی کبھار بلکہ زیادہ تر تو اپنی سہیلی اناشید کے ساتھ ہی آتی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اس کا منتظر رہنے لگا تھا۔

*_*_*

آج وہ بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ اور اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ ایک نوجوان اسمارٹ سا بندہ بھی تھا، جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ دونوں اپنی مخصوص میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہوں۔ بہت بے تکلفی اور رازداری سے گفتگو جاری تھی، وہ چاہتے ہوئے بھی آج ان کی طرف نہیں جا سکا، دل عجیب طرح پھڑپھڑا سا گیا۔

"بہت بے وقوف، خود کو سنبھالو، کسی کے احترام اور اچھی عادت سے اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتے، پاگل تو فرش پر اور وہ عرش پر ہے کیا سوچے بیٹھا ہے۔"

اپنی بے چین طبیعت سے گھبرا کر وہ خود کو سرزنش کرتا ہوا تیزی سے گزرنے لگا تو ہاتھ قریب ہی ٹیبل پر دھرے گلاس سے جا لگا، اور شیشے کا نازک گلاس جو جوس سے بھرا ہوا تھا، لڑھکتا ہوا میز کرسی پر بیٹھے نفیس پوش کے کپڑوں کو رنگین بنا تا فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا، ایک زوردار چھناکا ہوا اور بھونچال سا آگیا۔

جس امیر زادے کے کپڑوں پر جوس گرا تھا، وہ اپنے لباس کی حالت دیکھ کر غصے سے بھر کر اس کی طرف جھپٹا، اور اسے گریبان سے تھام کر دو تین زوردار کے رسید کر دیے، گالیوں کا ایک طوفان اس کے منہ سے ابل پڑا تھا، سارے لوگ ان کی طرف متوجہ تھے۔

"دیکھیں سر! ہم معافی چاہتے ہیں، آپ پلیز ہمارے ساتھ آئیں ہم ابھی آپ کا لباس صاف کروا دیتے ہیں۔ پلیز سر اسے معاف کر دیں۔"

منیجر شاہد صاحب فوراً ہی بوتل کے جن کی طرح دفتر سے یہاں حاضر ہو گئے تھے۔

"چلیں چھوڑیں جناب! کوئی بات نہیں۔" اسے اس کی غلطی کی سزا مل گئی ہے۔ آپ بھی غصہ ٹھنڈا کر لیں۔" کچھ دوسرے لوگوں نے بھی انہیں ٹھنڈا کیا' وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"شکر کرو۔ تمہیں چھوڑ رہا ہوں' ورنہ ایسی بد تمیزی اور لاپروائی میں برداشت نہیں کرتا' میرا ایک ایک منٹ قیمتی ہے' اور اب اس وقت کے ضیاع کے ذمہ دار تم ہو' جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اس نے انتہائی بد تمیزی سے اسے دھکا دے کر ہٹایا اور وہ خود بھیگی بلی بنا شاہد کے ساتھ آفس کی طرف چل دیا' وہ تو جیسے زمین میں گڑ گیا تھا' اتنی تذلیل' اتنی حقارت' اتنی شرمندگی' سارے ہال کے سامنے' اور سب سے بڑھ کر اس کے سامنے' آج تک بھی اس سے معمولی سی بھی غلطی نہیں ہوئی تھی' اور راجو' جواد اسی بات سے پریشان تھے' اس نے ایک سلگتی' شکوہ بھری نگاہ نمہا پر ڈالی۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا' خود کو سنبھالنے میں اسے کافی دقت ہوئی تھی۔ وہ بہت برداشت والا' صابر اور بلند حوصلہ بندہ تھا' یوں تو کبھی ذلت نہیں ہوئی تھی جیسے آج ہوئی تھی۔

محبت انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ کھوکھلا کر دیتی ہے' وہ خود سے لڑ رہا تھا' اس امیر زادے نے بھری محفل میں اسے یوں حقارت سے بے عزت کیا تھا کہ وہ خود اپنی نظروں میں گر گیا تھا' عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی تھی۔

"دیکھو بابر! یہ پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں' اگرچہ یہ قابل معافی نہیں' مگر پھر بھی راجو کے دوست ہونے اور پہلی غلطی کرنے کی وجہ سے تمہیں چھوڑ رہا ہوں' یہ ہوٹل ہے۔ یہاں معمولی سی غلطی بھی برسوں کی ساکھ خراب کر دیتی ہے۔ آئندہ خود کو سنبھال کر رکھنا۔" مینیجر نے کہا۔

اسے تو شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ وہ اتنی آسانی سے معاف کر دیا گیا تھا۔ سب ہی دوست اسے ہمت' حوصلہ اور مبارک باد دے رہے تھے مگر اس کا دل جیسے بجھ گیا تھا' خود کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا بہت بڑی بڑی دیواریں تھیں راہ میں حائل' مگر محبت ان حدود قیود کو کہاں ماننے والی ہے' محبت تقاضوں اور نسبتوں سے ماورا ہوتی ہے۔ دل کے کواڑ تو کسی کے لیے بھی کھل سکتے ہیں۔ اتوار کو وہ گھر گیا تو اماں نے ایک اور ہی فرمائش کر دی۔

"بیٹا! اب تم خیر سے برسر روزگار ہو گئے ہو' بشریٰ کی بھی منگنی ہو گئی ہے' جہیز بھی اپنی حیثیت کے مطابق بنا رہی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ بشریٰ اس گھر سے جائے تو کوئی اور یہاں میری بیٹی بن کر بھی آئے۔"

"تمہاری بیٹی؟ اماں کیا کہہ رہی ہو!" وہ کچھ سمجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔

"بیٹا! میں تیرے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

آخر وہی پرانا روایتی ماؤں والا جملہ۔

"کیا سوچ رہا ہے میرے بچے! اگر تو راضی ہو تو میں سکینہ کے لیے شفیع سے بات کروں۔" اس نے اپنی چچیرے بھائی کی بیٹی سکینہ کا ذکر کیا۔

"دنہیں اماں! ابھی نہیں... ابھی نہیں۔" وہ ایک دم بے چین و مضطرب ہو کر چیخ اٹھا' اماں حیرانی اور پریشانی سے اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ وہ اپنی کیفیت سے بے خبر اماں کو اسی کیفیت میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

محبت مشکل ہے' دل کو سمجھانا' اس دل کو کیوں نہیں سمجھتا یہ۔ کیوں نہیں۔" وہ دل پر کے برساتا وحشت زدہ سا ہو رہا تھا' دونوں مٹھیاں سختی سے بھینچ کر اس نے خود کو انتہائی ضبط سے سنبھالا۔ اور وہ کیفیت اب تک درست نہیں ہوئی تھی' دن بدن اس وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا' اس کی دیوانوں سی کیفیت راجو کی عقابی نگاہوں سے چھپی نہ تھی' سو وہ سب کچھ اگلوا کر ہی چین سے بیٹھا۔

"یار! عجیب ہے تو بھی یہ کہاں دل لگا لیا۔ جانتا ہے وہ سیٹھ ہاشم کی اکلوتی بیٹی نمہا ہاشم ہے' ماسٹر انگلش اور سب سے بڑی بات وہ جس لڑکے کے ساتھ آج کل ہوٹل آ رہی ہے' وہ اس کا منگیتر ہے۔ بہت بڑی فیکٹری کا مالک۔" یار حیرت زدہ تھا۔

"تجھے یہ سب کس نے بتایا؟"

"تو جب پچھلی دفعہ گھر گیا تھا نا اتوار کو! اس دن اس کی منگنی تھی' اپنے ہی ہوٹل میں۔ اس کے ڈرائیور سے معلوم ہوا تھا۔"

او تو وہ وحشت' وہ بے چینی یونہی نہیں تھی۔ اس دن گھر پر اماں نے جب اس سے بات کی تو وہ کتنا تڑپ کر بے قرار سا گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ کسی اور کی امانت تھی' اس کی سنگت کے خواب خواب ہی رہنے تھے۔

"دیکھ یار' خود کو سنبھال' تیری یہ حالت مجھے بہت دکھ دیتی ہے' کوئی اور کام ہوتا تو میں جان خطرے میں ڈال کر تیری خاطر وہ بھی کر گزرتا' مگر یہ بہت مشکل ہے' دل کو تو خود سمجھا سکتا ہے' بہت برا روگ ہے یہ' جل جل کے تن کوئلہ ہو جائے گا' پر اسے آنچ تک نہیں پہنچے گی۔" وہ حد درجے سنجیدہ تھا۔

"ہاں کوشش کروں گا' اب تو دل کو سمجھانا ہی ہو گا۔" اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ اتنا دلگرفتہ انداز تھا کہ راجو نے اسے بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا کندھا بھیگ رہا تھا' منع نہیں کیا کہ وہ دل کھول کر رو لے تو غبار بھی چھٹ جائے گا۔

"میرے یار! یہ غربت بھی بہت ظالم ہے' اور غریب کی محبت تو بہت ہی ظالم' تو بادشاہ ہے۔ تیرے لیے بہت سوہنی رانی کا انتخاب کروں گا۔" وہ بہلا رہا تھا' بابر نے بھی خود کو سنبھال لیا' یوں اشتہار غم بن کر کچھ بھی حاصل نہیں تھا' اس کا تو کام بھی ایسا تھا' ہر روز بھی اس سے سامنا ہو سکتا تھا' اور یوں بے حجاب ہو کر تو وہ اپنی نوکری بھی گنوا سکتا تھا۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ اگلا پورا ہفتہ آئی ہی نہیں' اسے بھی خود کو سنبھالنے کا وقت مل گیا' اسے دیکھ کر تو وحشتیں اور بڑھ جاتی تھیں۔

*_*_*

"یار تو گھر چلا جا ہفتہ اتوار چھٹی کر لے۔" راجو نہ جانے کیوں اسے گھر بھیجنے پر تلا تھا' حالانکہ وہ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ہو کر آیا تھا' یہ الگ بات کہ اس نے کبھی چھٹی نہیں کی' رات کو پہنچا اور صبح صبح واپس ہوٹل پر۔

"نہیں یار! میں اب ٹھیک ہوں' بس اگلے ہفتے جاؤں گا کچھ کپڑے بھی لینے ہیں بشری کے لیے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ لاچار ہو گیا۔

اور یہ تو بابر کو اگلے دن واجد سے معلوم ہوا کہ اتوار کو نیہا کی جہانگیر خان سے شادی ہے۔

"تو یہ وجہ تھی' راجو مجھے یہاں سے ٹال کر نکالنا چاہتا تھا۔" وہ راجو کی محبت پر آبدیدہ ہو گیا۔

"تو تمہیں معلوم ہو گیا ہے!" راجو نے اس کی بات سن کر کہا۔

"ہاں اور تم فکر نہ کرو۔ میں اتنا بھی کمزور اعصاب نہیں ہوں۔"

وہ کافی بہادر اور حوصلہ مند لگ رہا تھا' راجو کو بھی تسلی ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ ہر آنے والا دن اس کے لیے بہت کٹھن ثابت ہو رہا تھا' ہفتے کی رات کو مہندی تھی۔ اور دونوں طرف سے مہندی کے انتظامات ہوٹل میں ہی ارینج کیے گئے تھے' زبردست آتش بازی اور ہلا گلا تھا' وہ پیلے سوٹ میں پھولوں کے زیورات سے لدی ہوئی نظروں کے سامنے تھی اور دل بے قابو کی وحشتیں عروج پر تھیں۔

"خود کو سنبھال لے بابر! یہ چہرہ دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اس روپ کو جی بھر کر نگاہوں میں بسا لے۔ یہ تیری قسمت میں نہیں تھی' ناکام مسرتوں پر ماتم کناں ہونے کو تو عمر پڑی ہے۔" اور یہی بات خود کو سمجھا کر وہ پیش پیش تھا۔

"اے ویٹر!" ایک شوخ سی سجی سنوری لڑکی نے اسے بلایا' وہ نیہا کے نزدیک بیٹھی تھی۔

"یس میڈم!" بس ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی' وہ گجرے درست کر رہی تھی۔

"سنو جلدی سے ٹھنڈا جوس لے آؤ۔" اسے عجلت میں حکم دے کر وہ نیہا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پلیز یار خود کو سنبھال لو' اب فنکشن تک تو بیٹھنا ہی ہو گا' جوس منگوایا ہے میں نے' پی کر دل سنبھل جائے گا' آج گرمی بھی تو بہت ہے۔"

"میڈم جوس۔" اس نے ایپل جوس کا ٹھنڈا گلاس نیہا کے آگے کیا۔ وہ گلاس دیکھ کر ایک دم چونکی' اس کا پسندیدہ جوس' حالانکہ اس نے بتایا نہیں

تھا اور بس ایک لمحے کو دونوں کی نگاہیں ملیں نبہا نے گھبرا کر سر جھکا' بابر فوراً" پلٹ گیا تھا' وہ بہت عجیب سی کیفیت کا شکار ہوئی تھی' سمجھ میں نہیں آیا' یہ نگاہوں میں کیا دیکھا تڑپتا احساس لے کر اس نے دیکھا تھا' حسرتیں' نا تمام آرزوؤں کے نوحے' کیا کچھ درج نہیں تھا ان آنکھوں میں' اسے ایک دم وہ واقعہ یاد آیا ۔جس دن اسے مارا گیا تھا۔ اور بے عزتی ہوئی تھی۔ اس نے بہت شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا' ایسی ہی عجیب کیفیت کا شکار وہ تب بھی ہوئی تھی' اس نے دوبارہ سر جھٹک کر جوس کا گلاس منہ سے لگایا' اور ایک ہی سانس میں سارا گلاس چڑھا گئی۔

مہندی کا فنکشن رات کے ایک بجے تک جاری رہا تھا' اور خوب ہلا گلہ ہوا تھا' مگر اس کے ساتھ ساتھ جہانگیر کا نہ ہونا بھی نبہا کے گھر والوں اور مہمانوں کے لیے تشویش کا باعث تھا' اگرچہ اس کی مصروفیت کا عذر گھر والوں نے بتا دیا تھا' مگر اتنے اہم فنکشن میں اس کی غیر حاضری' سبھی کو کھٹک رہی تھی۔

وہ بھی ڈیوٹی دیتے دیتے تھک چکا تھا' مگر نیند ہنوز آنکھوں سے کوسوں دور تھی کہ آج رات کے بعد وہ مشام دل و جان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی اور کی ہو جائے گی۔ شام سے ہزاروں بار مختلف طرح کے سوالات' خیالات اور تصورات ذہن میں آ چکے تھے' کبھی وہ خود کو جہانگیر کی جگہ دیکھتا تو کبھی نبہا کے ساتھ' مگر اب جبکہ رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی تو مایوسی پوری طرح غلبہ پا چکی تھی' اس نے کھلی آنکھوں وہاں بکھرے ہزاروں پھولوں اور کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھا ۔ہال میں صوفہ پر جہاں اس مہندی لگائی گئی تھی۔ وہاں اس کے گجرے بھی دھرے تھے۔ اسے بہت گرمی لگ رہی تھی۔ اسی لیے وہ فنکشن ختم ہونے سے پہلے ہی میوزک شو سے بغیر چلی گئی تھی' مگر اس نے بہت احتیاط سے نوچ کر اتارے گجرے اٹھا کر سمیٹ لیے۔

اس کے لیے تو یہ محبت کی انمول نشانی اور یادگار تھے کہ اس کے ہاتھوں اور جسم کی خوشبو' ان میں موجود تھی۔

صبح وہ اٹھ کر کاؤنٹر پر آیا تو راجو نے اسے اماں اور بشریٰ کی آمد کے متعلق بتا کر حیران کر دیا' وہ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے واجد کے پاس یہاں ہی ٹھہر گیا تھا۔

"اماں بشریٰ کیوں آئی ہیں! خیر تو ہے!" عجیب سے واہمے ذہن میں آ گئے۔ پہلی بار وہ یہاں شہر اس کے پاس آئی تھیں۔

"خیر ہی ہے' ماں جی بتا رہی تھیں کہ انہوں نے خواب میں تمہیں پریشان اور بیمار دیکھا تھا' سوچا کرنے چلی آئیں' بچے وہ ماں ہے' دل کا براہ راست رابطہ اسی ہستی کے ساتھ ہوتا ہے۔" راجو نے اسے سمجھایا۔

"اچھا تو وہ گھر پر ہی ہیں نا!؟"

"ہاں فی الحال تو کمرے میں ہیں انہیں ناشتہ وغیرہ دے کر آیا ہوں' شام کے بعد شاید یہاں آ جائیں۔"

"اوہو! یہاں اتنے رش میں وہ کہاں بیٹھیں گی' بے وقوف یہاں کیوں بلایا۔" وہ پریشانی سے بولا' واقعی اتنے بڑے ہوٹل میں تو ان کی آمد قطعی نامناسب تھی' ہال اور کمرے بک تھے' اور ان کے حلیے بھی تو اس شان کے نہیں تھے کہ وہ شادی میں شرکت کر سکتیں۔

"تو فکر نہ کر' تیری شان میں کمی آتی ہو گی' میری نہیں' میں اپنے مہمان بنا کر کہیں نہ کہیں بٹھا لوں گا' بس تو مل لینا' ماں جی بہت فکر مند ہیں اور ان کا رونا تو مجھ سے دیکھا ہی نہیں گیا۔" راجو کے کہنے پے وہ بھی بے تاب ہو گیا۔ ماں کو اس سے بہت محبت تھی' بے تحاشا۔ اور ہمیشہ ہی جب بھی وہ فکر مند' پریشان ہوتا تھا تو ماں کو خواب نظر آتا تھا' اور اب بھی اس نے بالکل صحیح خواب دیکھا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا' بیمار بھی تھا۔ اسے اماں پر ڈھیروں پیار آیا۔ جی چاہا اڑ کر پہنچ جائے اور مل آئے' مگر ابھی جانا بہت مشکل تھا' تمام انتظامات مکمل کروانے تھے' بارات آنے والی تھی' دلہن والے پہنچ چکے تھے۔ اور دلہن بیوٹی پارلر گئی ہوئی تھی۔ اس وقت!

اسے شدت سے احساس ہوا کہ واقعی دل نے بہت اونچی جگہ واردات کی تھی' وہ تو اس قابل ہی نہ تھا' حیثیت' رتبہ' تعلیم سب کچھ ہی کم تھا اس کے

مقابلے میں۔ دس ہزار میں وہ رات بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی اور اب بھر گئی ہوئی تھی۔ ان کے ہاں کی طرح تو نہ تھا کہ محلے کی ذرا سمجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی نے مشق ستم دلہن کو پکڑ کر اپنی ناکافی مہارت کی بدولت جیسا بھی بنا دیا، قبول کیا گیا۔ بارات ابھی تک نہیں پہنچی تھی بہت رات ہو گئی تھی۔ سیٹھ صاحب خاصے فکر مند موبائل ہاتھ میں لیے چکر پر چکر گیٹ کے لگا رہے تھے، خاندان اور دوست احباب بھوک اور نیند کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے تھے، بچے بھی رو رو کر سو چکے تھے۔ اور بوتلیں دے دے کر ان کو بہلایا گیا تھا، کھانا تیار تھا۔ وہ خود انتظار میں بھوکے ہی تھے۔ صبح سے اتنا وقت بھی نہیں ملا تھا کہ وہ اماں اور بشریٰ سے مل آتا، شام کو اسے بازار سامان لانے بھیج دیا گیا، اور اس نے رات کو جلدی جانے کا پروگرام بتایا تو بارات ہی لیٹ تھی۔ راجو الگ غائب تھا، ورنہ اسی سے کچھ پوچھتا۔

"سنو ویٹر، پانی لاؤ۔" وہ سنسان گیلری سے گزر رہا تھا، جب ایک دم ہی سیٹھ صاحب نے اسے پکار کر آرڈر دیا، وہ فکر مند اور بری طرح گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس نے فوراً انہیں پانی دیا۔

"سر! کچھ اور۔" اس نے پوچھا۔

"نو نو، تم جاؤ۔" انہوں نے اسے ٹالا۔ وہ انہیں دیکھتا نیچے ہال میں آیا، مہمانوں کی دبی دبی سرگوشیاں اب خوب اونچی اونچی آوازوں میں تبدیل ہو گئی تھیں، اور سب ہی بارات کی تاخیر پر اپنی اپنی آرا دے رہے تھے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اندر باہر بے چینی پھیل رہی تھی۔ اور یہ صورت حال خاصی تکلیف دہ تھی، وہ خود بھی حیران پریشان سا تھا مقررہ وقت ختم ہوتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں سیٹھ صاحب، بیگم صاحبہ اور دوسرے بڑے کہاں غائب تھے۔ بچے سو چکے تھے، بھوک سے نڈھال ماؤں کی گودوں میں لڑھکے ہوئے تھے بہت سی خواتین تو آرڈر دے کر کھانا منگوا رہی تھیں۔

"کھانا! اسٹارٹ کیا جائے۔" اس نے حیرت سے سیٹھ صاحب کو دیکھا، بارات کے بغیر کھانا، اور اس وقت سب لوگ بھوک اور نیند سے اتنے بے حال تھے کہ چوں چراں کیے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

وہ بھاگ بھاگ کر کھانا اور ڈشیں لا رہا تھا۔

"ویٹر روسٹ لاؤ۔" اور وہ روسٹ لینے بھاگا، مگر راستے میں ہی راجو نے پکڑ لیا۔

"کہاں جا رہا ہے، چھوڑ سب کچھ، ادھر آ۔" وہ بے انتہا خوش اور نہایت پرجوش ہو رہا تھا۔

"کیا کیا ہوا ہے! یار مجھے آرڈر۔"

"آرڈر کی ایسی کی تیسی۔ دفع کر، ادھر آ۔" راجو نے اس کی بات کاٹ کر اس کے ہاتھ سے ڈش چھین کر میز پر رکھی اور اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔

"کیا ہے۔ کیا ہوا! یار کچھ بتا تو سہی راجو مجھے۔" وہ چیختا رہ گیا تھا مگر اس نے اسے نہ کچھ جواب دیا اور نہ ہی کچھ اور کہنے دیا، سیدھا غسل خانے میں دھکیل دیا۔

"چل یہ کپڑے پہن لے جلدی سے، یہ وردی اتار ویٹر والی، اچھی طرح نہانا تاکہ بدبو نکل جائے کھانوں کی، چل جلدی۔" اس نے نیا، خوب صورت سوٹ اس کے حوالے کیا، اور خود ہی دروازہ بند کر کے کچھ بھی کہے اور سنے بغیر نکل گیا۔

"یا اللہ یہ کیا عذاب ہے! کیا چکر ہے! کیا کروں، یہ سوٹ نہاتا ہوں او راجو کے بچے، مجھے بتا تو سہی کچھ۔" وہ دوبارہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

"ابے گدھے، الو کے، دفع ہو، تو ابھی تک نہایا نہیں، جلدی کر ورنہ میں خود تجھے نہلا دوں گا۔ یہ آخری وارننگ ہے، جلدی کر۔ کوئی سوال نہیں۔ کوئی جواب نہیں، بس سمجھ لے تیری قسمت کھل گئی۔ لاٹری نکل آئی ہے، جا نہا کر آئے گا تو بتاؤں گا۔"

اور وہ اس کے خطرناک تیوروں سے گھبرا کر اندر گھس گیا، ذہن بری طرح الجھ گیا تھا، چکر سا چکر تھا۔ لاٹری، قسمت، راجو پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔" وہ نہا کر باہر آیا، آئینے میں خود کو دیکھ کر لگا، پھر کو تو چکرا سا گیا تھا، ڈارک براؤن سلکی سوٹ میں وہ نکھرا نکھرا، بہت زبردست لگ رہا تھا۔

"نہا لیا، چل اب جلدی سے کنگھی کر۔ ماشاء اللہ

تمہیں تو کسی بھی سنگھار کی ضرورت نہیں ہے' راجہ ہے راجہ' اور رانی کا ہونے والا راجہ!" اس نے معنی خیزی سے کہہ کر اسے دیکھا۔ تو وہ بری طرح چونکا۔

"رانی! راجہ!' راجو یہ تو کیا کہہ رہا ہے!' مجھے بتا یہ چکر کیا ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے سب۔" وہ الجھ کر اسی کو جھنجوڑنے لگا۔

"اسے صبر کر' کیوں مارے ڈالتا ہے' تو اماں آگئیں۔ اماں سے سن لے۔" اس نے پلٹ کر اماں کو دروازے میں کھڑے دیکھا تو مارے حیرت کے آنکھیں ابل پڑیں۔

"اماں آپ یہاں آپ تو اور یہ!" وہ حیرت سے ہکلا کر رہ گیا۔

"بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں بابر' آ یہاں بیٹھ' سن۔ آج میں تجھ سے وہ سب کچھ کہتی ہوں' جو میں نے تجھ سے چھپا کر راز کی طرح سینے میں دفن کر رکھا تھا۔" اماں نے سسپنس پھیلایا۔

"سیٹھ ہاشم تمہارا تایا ہے بیٹا۔" اماں کے انکشاف پر وہ حقیقتاً کئی فٹ اونچا اچھلا۔

"اماں!"

"ہاں بابر' یہ دولت اور اس کی ہوس اپنوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔"

سگے رشتوں اور رشتے داروں کے درمیان اتنی اونچی دیواریں' اتنی بڑی دراڑیں بن جاتی ہیں کہ وقت کے بے رحم طوفان بھی گرا نہیں سکتے' تمہارے چچا کی وفات کے بعد تمہارے ابو اور تایا ہی ساری دولت کے حقدار تھے' تمہارے تایا ساری دولت خود ہڑپ کرنا چاہتے تھے' اور انہوں نے ایک منصوبے کے تحت تمہارے ابا سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کروا لیے' اور تمام جائیداد چالاکی سے ہتھیا لی۔ تمہارے ابا بھائی کی یہ بے وفائی برداشت نہ کر سکے' بیمار ہو گئے' اور یوں وہ بیماری ہی کی حالت میں چل بسے' تمہارے تایا نے ہمیں کوٹھی سے نکال دیا۔ میں نے تمہاری اور بشریٰ کی خاطر' تمہاری زندگیوں کی خاطر کبھی پلٹ کر بھی ہاشم بھائی سے نہیں پوچھا کہ انہوں نے ہمارے حصے کا مال ہمیں دینے کے بجائے خود ہڑپ کیوں کر لیا۔ میں نے محنت کی' تمہیں اپنی حیثیت سے بڑھ کر پالا' پڑھایا' اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی کہ جو قسمت میں نہیں تھا' اس کے لیے کیا تڑپنا' مجھے اپنے مولا پر یقین تھا' یتیموں کا مال کبھی ہضم نہیں ہوتا' کبھی نہ کبھی تو ضرور اللہ اپنے بندوں کی سنتا ہے۔ اور آج! آج خدا نے میری سن لی۔ ! بیٹا میں جو بے سہارا تھی' میں جو بے وقعت تھی ہاشم بھائی نے مجھے دھکے دے کر نکال دیا تھا۔ آج وہی مجھے عزت دے رہے ہیں۔ مجھے معتبر بنا دیا ہے وقت نے' میرے مولا نے۔"

اماں کا سر فخر سے بلند تھا' بابر حیرت زدہ سب سن رہا تھا۔

"مگر اماں اب۔"

"اب نیہا' ہاشم بھائی کی بیٹی' تمہاری بیوی بننے والی ہے۔"

"بیوی! نیہا! اماں آپ۔" بابر کو اب بھی یقین ہو رہا تھا' اماں کی دماغی حالت پر۔

"سن بابر! نیہا کا منگیتر جہانگیر خان فراڈ نکلا ہے' وہ پہلے سے شادی شدہ' بچوں کا باپ ہے۔ صرف ہاشم صاحب کی دولت ہتھیانے کو نیہا سے جھوٹ بول کر اسے محبت کے جال میں پھنسا لیا تھا' اور عین وقت پر آج شام اس کی اصلیت پتا چلنے پر ہاشم صاحب نے اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا۔ اب مسئلہ بہت خطرناک تھا کہ مہمان آ چکے ہیں' دلہن تیار' اور دولہا غائب' لوگوں کو علم ہو جاتا کہ ہاشم صاحب کا ہونے والا داماد فراڈ ہے تو سارے شہر میں ان کی عزت دو کوڑی کی رہ جاتی۔ ایسے وقت میں اماں رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں' انہوں نے ملنا تو تم سے تھا' کیونکہ صبح سویرے واپسی تھی اور تم رات بھر یہاں ہی رہتے' مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہاں ہاشم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور یوں برسوں کے گلے شکوے' زیادتیاں اور مظالم بھلا کر اماں نے انہیں معاف کر دیا' اور نیہا کی خاطر تمہاری قربانی دینے پر تیار ہو گئی ہیں' حالانکہ میں جانتا ہوں' تمہیں یہ قربانی دینے میں کسی تامل' کسی انکار کی ضرورت نہیں "ہم بکرا" بننے پر بخوشی راضی ہو گے۔" اس نے بکرے پر خاص زور

دیا۔
اماں تو دوبارا اسے جلد باہر آنے کی تاکید کر کے نبھا اور بھائی 'بھاوج کے پاس چلی گئی تھیں اور اب راجو 'اسے پھولوں کے ہار پہنا رہا تھا۔
"یار! ویسے وہ دولت مند حسینہ تجھے دیکھ لے تو بے ہوش ہو جائے 'بڑا اچھا موقع ضائع کیا بادشاہ تم نے۔"
"نہیں راجو یہ جو آج مجھے اللہ نے اتنی بڑی خوشی دی ہے 'اتنی بڑی مہربانی مجھ فقیر پر کی ہے تو یہ اسی نیکی کا صلہ ہے 'میں چاہتا تو گناہ کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر اپنے نفس کی تسکین کر لیتا 'مگر خدا کی لاکھ مہربانی ہے کہ میں بچ گیا 'مجھے یہ دولت کے بل پر غلام خریدنے اور دم ہلانے والے پیچھے پیچھے چلتے مرد پسند کرنے والی لڑکیاں زہر لگتی ہیں۔ نبھا کی نیکی اور شرافت نے مجھے متاثر کیا تھا 'جب پتا چلا کہ وہ کسی کی امانت ہے تو میں نے خود کو آگے بڑھنے سے روک لیا 'اور اب وہ میری ہو رہی ہے تو میں اپنے پروردگار کا بے انتہا شکر گزار ہوں۔" بابر نے اس کی بات کا تفصیلی جواب دیا۔
"ہاں یار! ضبط کے امتحان سے سرخرو ہونے والا شخص ہی مومن مسلمان ہے 'ورنہ غربت تو انسانیت اور مذہب سب کچھ بیچنے پر تلی رہتی ہے۔" راجو نے اسے آئینے کے سامنے کھڑا کیا۔ پھولوں کی لڑیاں اس کے چہرے کو مکمل ڈھانپے ہوئے تھیں۔
"اور پھر ایک ہنگامہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کے دو بجے جب آدھے مہمان جا چکے تھے اور کچھ آ رہے تھے بمعہ دولہا۔ تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔
بہت قریبی عزیزوں کو صورت حال کا علم تھا 'جو نا واقف تھے 'وہ دولہا سے بھی انجان تھے 'ہاشم صاحب نے بابر کا ہاتھ تھام کر صوفہ پر بٹھایا اور کچھ ہی دیر بعد وہ نبھا ہاشم کا ہو چکا تھا 'اور وہ اس کی۔ اتنی بڑی اور اچانک خوشی کا تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا 'مگر اب مسلسل سامنے راجو اور پہلو میں بیٹھی نبھا احساس دلا رہی تھی کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔
فی الحال نکاح تھا 'رخصتی ابھی ملتوی کر دی گئی تھی 'اگرچہ ہاشم صاحب تو اپنے ہی گھر لے جانا چاہتے تھے مگر وہ نہیں مانا 'وہ اسے اپنے گھر رخصت کروا کے لانا چاہتا تھا 'اور اس کے لیے وقت اور صبر کی ضرورت تھی۔
گھر والوں نے فکرمندی اور پریشانی کی وجہ سے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا 'نکاح کے فوراً بعد ہاشم صاحب بمعہ بیگم اور دیگر افراد ڈائننگ ہال میں آئے تو اس نے بھی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ساتھ بیٹھی متاعِ جان و دل کو دیکھا 'وہ بے حد سنجیدہ اور خاموش تھی 'شاید روئی بھی تھی۔
ایک دم سے دل کو کچھ ہوا۔
"بابر! یہ تو جہانگیر کے خواب دیکھتی رہی ہے 'یہ تو نئی زندگی اسی کے حوالے سے شروع کرنے کا سہانا سپنا دیکھ رہی تھی 'تو درمیان میں کہاں آ گیا 'کہیں یہ عزت بچانے اور حکم کی بجا آوری کا سودا تو نہیں 'ایسا ہے تو یہ ملال عمر بھر کا ہو گا کہ تو مشکل وقت میں ایک نیک انسان کی طرح خدمت کر کے معاوضہ وصول کر گیا۔"
اس کے اندر کا شور اتنا اونچا تھا کہ وہ گھبرا کر اسے پکار بیٹھا۔
"نبھا!" عجیب سا بے قرار لہجہ 'بے تاب انداز 'کچھ سننے سنانے کو بے چین وہ اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔
نبھا نے آہستہ سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہی عجیب سا کرنٹ مارتا احساس اسے چھو گیا 'جیسا شام کو جوس پیتے وقت ہوا تھا 'اس کی آنکھوں میں جو جذبہ تھا وہ آج سے پہلے اس نے جہانگیر کی آنکھوں میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ مجنوں کی طرح دیوانہ تھا اس کی محبت میں۔
وہ سب جھوٹ تھا نبھا 'دھوکہ فراڈ 'دکھاوا 'سچ اور حقیقت سے دور مصنوعی اظہار 'مصنوعی انداز 'تو کیسے جان سکتی تھی۔ ان آنکھوں کے دہکتے جذبوں کو 'انگارے برساتے لہجے کو 'ایسی لو دیتی محبت بھری نگاہ کہ بندہ پگھل کر رہ جائے" عجیب سی سنسنی اس کے اندر نس نس میں پھیل گئی۔
"نبھا! میں جہانگیر سے ہر لحاظ سے کم تر ہوں۔ تم شاید مجھے جس حوالے سے دیکھ چکی ہو اب قبول نہ کر سکو۔ مگر ایک بات میں کہوں گا 'میں تم سے قطعی نہیں

لوٹ اور حقیقی محبت کرتا ہوں‘ یہ بندھن خواہ عزتوں کو بچانے کے لیے باندھا گیا ہے یا کی گئی زیادتیوں کے ازالہ کے لیے میرے لیے بہت مقدس اور مجھے بہت عزیز ہے۔ میں دعویٰ نہیں کرتا‘ کوشش کروں گا کہ تمہارے معیار پر پورا اتر سکوں۔"

وہ خاموشی سے دم بخود اس کی گفتگو سن رہی تھی‘ واقعی یہ بندھن ابھی تو عزتوں کے بچاؤ کی خاطر قائم کیا گیا تھا‘ بابا اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔ اور ہاتھ باندھ کر اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس نے اسی وقت ان کے بندھے ہاتھ تھام لیے‘ اسے خود اس فرانسیسی‘ ظالم جہانگیر خان سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی‘ جس نے اس کے ساتھ محبت کا اتنا بھیانک کھیل اتنا عرصہ اتنی کامیابی سے کھیلا تھا کہ وہ بے وقوف بھی اس کی چالاکی کو سمجھ ہی نہ سکی۔

اور اب!

اب جبکہ وہ اس شخص سے وابستہ ہو گئی تھی‘ جس کے بارے میں پہلے تو وہ کچھ اور سمجھتی تھی مگر بابا اور چچی جان کے ملنے کے بعد اس کی حیثیت اور رشتے کا تعین ہوا تھا۔ اور اب وہ حیات کا مالک بنا دیا گیا تھا‘ اتنے اچانک فیصلے اور اس طرح کے اپ سیٹ سے وہ غیر یقینی کیفیت میں دکھتے سر کے ساتھ خاموش سنجیدہ بیٹھی سوچ رہی تھی‘ بابر کی محبت کا تو علم تھا‘ مگر وہ لاعلم تھا اور اسے جہانگیر کے حوالے سے جو کچھ رہا تھا‘ وہ درست نہیں تھا‘ وہ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی‘ زندگی کے اس سفر کی شروعات غلط فہمیوں اور اندیشوں سے نہیں ہونی چاہیے تھی۔

"جہانگیر! میرے ماضی کا ایک کربناک کردار تھا‘ جو میں دفن کر چکی ہوں‘ مجھے اور کچھ نہیں کہنا‘ صرف یہ کہ آپ اپنے دل میں جہانگیر اور میرے حوالے سے کسی غلط فہمی‘ شک کو جگہ نہ دیں۔ کچھ وقت مجھے سمجھنے اور سوچنے میں لگے گا‘ مگر فیصلہ مثبت ہی ہوگا۔"

وہ دھیرے دھیرے اس سے کہہ رہی تھی‘ اور بابر کا دل چاہا ناچ اٹھے‘ چیخ چیخ کر دنیا کو بتائے کہ میں جیت گیا ہوں‘ میری محبت مجھے مل گئی ہے اور یہ حقیقی خوشی سے دمکتے چہروں پر اطمینان بھری نگاہ ڈال کر اماں نے فخر سے سر اونچا کر کے اپنے جیٹھ سیٹھ ہاشم کو دیکھا جو سر جھکائے شرمندہ شرمندہ بابر سے باتیں کر رہے تھے۔

"آج میں نے اپنی انا کو ختم کر کے معاف کر دیا سب کو‘ اور معتبر ٹھہر گئی۔ وقت سے مجھے ایسے ہی شاندار فیصلے کی توقع تھی‘ اور میری آس‘ میری امید رائیگاں نہ گئی‘ آج مجھے ساری محنتوں اور صبر کا پھل مل گیا ہے‘ معاف کرنے میں جو عظمت ہے‘ وہ انتقام لینے میں کہاں۔"

اماں نے آگے بڑھ کر نیہا کو گلے لگا لیا‘ بابر پہلے ہی تایا ہاشم کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

نیم تاریک سے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں جس کے چاروں کونوں میں شیڈز سے خارج ہوتی سبزی مائل ہلکے پاور کے بلب کی مدھم سی روشنی جل رہی تھی۔ ایش دان کے آگے وہ صوفے میں دھنسا سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ اس کی اداؤں سے بے چینی مترشح تھی۔ وجیہہ سے چہرے پر تنوع

دیبہ سُلطانہ فخر

مکمل ناول

اور سامنے والے کارپٹ پر مرکوز‘ بے حد چمکیلی سی نگاہوں میں شک و شبہات اور غم و غصے کی کیفیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ یوں جیسے ضبط کی انتہا تک پہنچے کے باوجود برداشت کی قوت پارہ پارہ ہو رہی ہو۔ مگر بے یقینی اور بدگمانی ان بکھری غم و غصے کی کیفیتوں کو بے لگام ہونے کا موقع نہیں دے رہی ہو۔ بہر حال اگر یہ اس کی بدگمانی ہی تھی اور وہ بھی کسی قدر و مکمل یقین۔ مگر اس کے کانوں میں بار بار‘ وقفے وقفے سے وہی مردانہ بھاری سی دھیمی آواز‘ کہیں دور بجتے خطرات کے سائرن کی طرح گونج رہی تھی۔ ہاں یہ آواز بڑے واضح طور پر پورے ہوش و حواس کے ساتھ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ گو دیکھا کچھ بھی نہ تھا کیونکہ امریکی طرز کے ٹیک کے پالش شدہ دروازے میں کوئی کی ہول تھا نہ جھری‘ جس کی راہ اندر اپنی خوابگاہ کا منظر دیکھا جاسکتا۔ مگر عالیہ کی وہ خوشامدانہ سی سرگوشیاں اور مردانہ بھاری آواز میں کسی کی کھسر پھسر اتنی واضح تھی کہ ایک اونچا سننے والا انسان بھی آسانی سے اسے سن سکتا تھا۔ اس پر اندر اس کی خوابگاہ میں ہلکی ہلکی کھڑ پڑ بھی ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر دروازے سے کان لگائے وہ خوابگاہ سے آتی ان غیر مبہم سی مشکوک آوازوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ کہیں اس کی سماعت دھوکہ تو نہیں کھا رہی۔

پھر ایک دم ہی دروازے کا ہینڈل گھما کر خوابگاہ میں داخل ہوا تو اس کی بیوی عالیہ خوابگاہ کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے جن کا وہ شیدائی تھا۔ ہلکا ہلکا سا خوف ہویدا تھا اور اڑی اڑی رنگت کے ساتھ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا تیزی سے اسی دروازے کی

طرف جھپٹا جو عمارت کی دائیں سمت عقبی حصے تک جاتی روش کی طرف کھلتا تھا اور جس پر پڑا پردہ اب بھی آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے پردہ ہٹایا۔ دروازہ گو اندر سے بند تھا پھر بھی اس نے چٹخنی گرا کر اسے کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا اور پھر چٹخنی

چڑھا کر عالیہ کی طرف پلٹا۔ جو کسی رنگے ہاتھوں پکڑ لئے جانے والے مجرم کی طرح نگاہیں فرش پہ گاڑے چہرہ جھکائے اپنی انگلیاں موڑ رہی تھی۔ اس کا سہما سہما انداز‘ نگاہیں گرانا اس کی خاموشی اور بدحواسی‘ غرض یہ کہ اس کی ایک ایک ادا اس کے مجرم ضمیر ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔ اس نے اس کے نزدیک آکر اپنی جلتی سلگتی نظریں اس پر مرکوز کر کے بڑے سخت لہجے میں پوچھا۔

”یہ تم کس سے باتیں کر رہی تھیں‘ کون تھا وہ۔“

”کک۔ کون۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ عالیہ نے بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی لرزتی کانپتی آواز اس کی بناوٹ کی چغلی کھا رہی تھی۔ کم از کم آذر کو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ وہ جذب میں آکر بولا۔

”تم مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو عیار لڑکی! سچ سچ بتا دو کہ وہ کون تھا؟“

”تھا نہیں‘ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں‘ جب کوئی تھا ہی نہیں تو میں کیسے بتا دوں کہ کون تھا‘ اور وہ بھی ایسے ناوقت بھلا کون میرے پاس آسکتا ہے۔“ عالیہ یوں بولی جیسے اس کے سوالوں سے عاجز آگئی ہو۔

”دیکھو مجھے فریب دینے کی کوشش نہ کرو مکار عورت! سچ بتاؤ کہ وہ کون تھا اور رات کی تنہائیوں میں تم سے ملنے کیوں آتا ہے؟“

عالیہ کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے پر اسے تاؤ آگیا۔ اس نے عالیہ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

”میں چاہوں تو مار مار کر بھی تم سے سب کچھ اگلوا سکتا ہوں سمجھیں۔ مگر میں انتہائی شرافت سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے خود تمہیں تم سے باتیں کرتے سنا ہے۔ اب تم سیدھی طرح بتا دو کہ وہ کون ہے۔“

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں آذر۔ آپ کے سوا میرے پاس بھلا کون آسکتا ہے‘ وہ بھی اس بند کمرے میں گیا۔ آپ مجھے ایسا ہی گیا گزرا سمجھتے ہیں۔ کیا میں نے آج تک کوئی ایسی نازیبا حرکت کی ہے‘ جس پر آپ

کو مجھے ٹوکنا پڑا ہو۔ اتنی سخت قسم کی بازپرس کرنی پڑی ہو۔"

اس کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش میں عالیہ کے پنکھڑیوں کی مانند نازک ہونٹ سوکھ کر رہ گئے تھے۔

"مگر یہ پردہ کیوں ہل رہا تھا۔ اور تم پاگلوں کی طرح آپ ہی آپ کیوں بول رہی تھیں؟" اس نے پھر بڑی کڑی نظروں سے اسے دیکھ کر سوال کیا۔

"نہیں... میں آپ ہی آپ بول رہی تھی؟ نہیں نہیں۔ وہ تو آج پھر مجھے وہی محسوس ہوا تھا' اس لئے میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تھا مگر... مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا؟"

وہ کسی طرح قبول کر کے نہیں دے رہی تھی۔ ٹپ ٹپ بہت سے آنسو اس کے رنگ اڑے رخساروں کو بھگوتے اس کے لباس میں جذب ہونے لگے۔ اس کی آہوئے ختن جیسی آنکھوں میں ابر باراں کا سماں دیکھ کر مزید کچھ پوچھنا اس نے بیکار ہی سمجھا۔ ایک جھٹکے سے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹائے اور خوابگاہ کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

باہر چھائی کوریڈور سے لے کر ڈرائنگ' ڈائننگ' لابی' لاؤنج' کچن اور عمارت کے باہر پھیلے خنک اور مہیب اندھیروں میں ڈوبے لانز اور روشوں پر سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ مگر خاموش اور ساکت ہونے کے باوجود ہر شے جیسے وقت کے کسی بھی لمحے میں اس میں جان پڑ جائے گی اور بول اٹھے گی۔ اسے خوف نہیں کچھ وحشت سی ہونے لگی۔ مگر دماغ ابھی تک سلگ رہا تھا۔ کیونکہ آج عالیہ کی یقین دہانی' عذر معذرت اسے مطمئن نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ وہ عالیہ کی باتوں سے کسی حد تک متاثر ضرور ہوا تھا' اس لیے کہ اپنی تین سالہ ازدواجی زندگی میں اسے ایک بار بھی عالیہ کو ٹوکنا نہیں پڑا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی معاملہ شناس'

خوددار' بے زبان اور بے ضرر سی۔ اماں اپنی زہر آلود باتوں سے اس کا دل اور جگر چھلنی کر دیتی تھیں مگر وہ منہ سے اف تک نہ کرتی تھی۔ اور تو اور آذر کے سامنے

بھی کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔ اس پر فرض شناس ایسی کہ اگر آدھی رات کو بھی کوئی اسے آواز دیتا تو اس کا کام کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاتی۔ اماں کی عمل داری میں گھر کا کام سنبھالنا تو خیر ممکن ہی نہ تھا لیکن اماں نے اس پر جن کاموں کا بوجھ ڈالا تھا۔ انہیں اپنی بساط سے بڑھ کر وہ مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی اور پھر شوہر کی چاہت کا یہ عالم کہ اس کی ذرا سی تکلیف اور پریشانی پر بے چین ہو اٹھتی تھی۔ وہ جو کہتا تھا وہی کرتی تھی۔ آذر کو اس کا بار بار میکے جانا پسند نہ تھا۔ اس لیے اس نے میکے جانا بھی کم کر دیا تھا۔ مگر یہ بات جسے وہ پچھلے کئی ماہ سے بہت معمولی اور بے حقیقت سمجھتا آ رہا تھا۔ اسے اب محض ایک واہمہ اور دھوکا سمجھ کر نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی سماعت نے وہ مردانہ آواز اور عالیہ کی کھسر پھسر محفوظ کر لی تھی اور اب وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ عالیہ اسے پچھلے چند ماہ سے دھوکہ دیتی آ رہی ہے۔"

آتش دان کے نزدیک رکھے فوم کے صوفے میں دھنس کر اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونک کر وہ حالات کی کڑیاں ملانے لگا۔

یہ سلسلہ تو پچھلے کئی ماہ سے جاری تھا۔ تقریباً" اب سے پانچ ماہ پہلے ایک رات جب وہ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر واپس گھر آیا تو حسب معمول اپنے مخصوص انداز میں دروازہ کھول کر اس نے دیکھا۔ عالیہ بڑی خوفزدہ سی اپنے بیڈ کے قریب کھڑی دوسرے دروازے پر پڑے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہی ہے۔ یہ دوسرا دروازہ عمارت کی دائیں سمت عقبی حصے تک جانے والی روش کی طرف کھلتا تھا۔ اسے بھی ایک تجسس سا پیدا ہوا۔ اس نے دبے دبے قدموں سے عالیہ کے نزدیک آ کر پوچھا۔

"کیوں بھئی کیا دیکھ رہی ہو؟" اور عالیہ ایک دبی دبی چیخ کے ساتھ ڈر کر اچھل پڑی۔ اور وہ اس کے اس

بری طرح ڈر جانے پر ہنسنے لگا۔

"بھئی آخر بتاؤ تو سہی کہ ماجرا کیا ہے۔ تم کس چیز

سے اس قدر خوفزدہ ہو رہی تھیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔" عالیہ نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر پھنسی پھنسی آواز میں پردے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"یہ۔۔۔ یہ پردہ۔۔۔"

"ہاں یہ ہے تو پردہ ہی، مگر تم نے کسی بھوت دوت کو تو اس میں سماتے نہیں دیکھ لیا۔"

وہ اسے چھیڑنے کی غرض سے مسکرا کر بولا۔

"نہیں نہیں، بس۔۔۔ وہ میں۔۔۔ میں۔۔۔" خوف کے مارے عالیہ کے منہ سے الفاظ ہی ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو گئی ہے، اس کا ڈر مٹانے کو وہ اسی دروازے کی طرف بڑھا تو عالیہ نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

"نہیں نہیں، دروازہ تو اندر سے بند ہے، مگر یہ پردہ پتا نہیں کیوں ہل رہا تھا جبکہ پنکھا بھی نہیں چل رہا۔"

"ارے تو کوئی بلی یا چوہا ہوگا۔ بلکہ چوہا ہی ہو سکتا ہے کیونکہ بلی تو اتنی سی جھری میں سے نہیں گزر سکتی، تم خواہ مخواہ ہی ڈر گئیں۔"

اور پھر اپنا کوٹ اتارنے لگا تو عالیہ اس کا بازو چھوڑ کر جلدی سے دوسری طرف گھوم گئی۔

"واہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی ڈرپوک بھی ہو سکتی ہیں۔ ورنہ کوئی باڈی گارڈ ضرور چھوڑ کر جاتا۔" اس نے کوٹ اتار کر اپنی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے ہنس کر کہا اور پھر کوٹ کو ہینگر پر لٹکا کر اس کے نزدیک آ کر بولا۔

"سب سے بڑا آسیب تو میں ہوں۔ مجھ سے ڈرو تو کوئی بات بھی ہو۔ یہ چوہوں اور بلیوں سے ڈرنا بھی بھلا کوئی معقولیت ہے۔" وہ ہنس ہی نہیں رہا تھا بلکہ بڑی وارفتہ نظروں سے اس کے خوبصورت اور معصوم سے چہرے کو تک رہا تھا۔ مگر وہ شرمانے کے بجائے کتراتی سی لگ رہی تھی۔ کم از کم اسے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ مگر وہ تو اس کی بھولی بھالی اور سوہنی سی صورت کا دیوانہ تھا اور اپنی ماں بہنوں کی زیادتیوں کا ازالہ وہ اپنی بے پناہ چاہت اور گرمجوشی دکھا کر ہی کرتا تھا۔

"کیوں بھئی، کیا تمہیں مجھ سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔" اس نے اپنی وارفتگی میں والہانہ پن شامل کر کے اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے پوچھا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بڑے قاتلانہ انداز میں مسکرائی اور ایک ادائے دلربائی سے بولی۔

"آپ سے تو اتنا ڈر لگتا ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"اچھا۔ مجھ سے یا اماں جان سے۔" اس نے معنی خیزی سے کہا اور پھر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بھئی کیا کریں، اماں تو ایک روایتی ساس کی بہترین مثال ہیں، مگر ہم تو تمہارے دیوانے ہیں نا۔" اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے لیے یہی بہت کافی ہے۔ آپ کی رفاقت اور محبت حاصل رہی تو پھر کوئی خواہ ظلم و زیادتی کی انتہا کر دے مجھے بالکل پروا نہ ہوگی۔"

"شاباش بچہ، مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس نے اس کا کھلا کھلا سا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لیتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ایسی دلکش اور پیاری ہنسی کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

"بھئی ہماری آنتیں قل ہو اللہ ہی نہیں بلکہ صدق اللہ العظیم بھی پڑھ چکی ہیں اور آپ ہیں کہ بس اپنی اداؤں ہی سے ہماری بھوک مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

"او ہاں واقعی، آپ کی باتوں میں کچھ خیال ہی نہ رہا۔ کھانا تو کب کا تیار رکھا ہے۔ مگر آپ لباس تو تبدیل کر لیں۔" وہ اس کے یاد دلانے پر کچھ خجل سی ہو گئی۔

"اچھا تو ایسا کرو۔ تم کھانے کی ٹرالی یہیں لے آؤ۔ اتنے میں میں کپڑے بدل لیتا ہوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں بالکل بالکل۔" وہ اس کے لیے اور اپنے لیے کھانا لانے کی عجلت دکھاتی ہوئی بولی اور پھر کمرے

نکل گئی۔

بات بہت معمولی تھی۔ اس لیے اس نے کچھ خیال ہی نہیں کیا۔ یہی سوچا کہ کسی وقتی تاثر کے تحت عالیہ ڈر گئی ہوگی۔ ویسے بھی فطرتاً بہت نازک طبع اور بھولی بھالی ہے اور پھر پیچھے تنہا بھی تو رہتی ہے۔ میں اتنی رات گئے آتا ہوں۔ مگر کیا کروں' میرا کام ہی ایسا ہے۔ جب بھی رات کی ڈیوٹی لگتی ہے۔ دیر سے ہی گھر آنا پڑتا ہے۔ تو کیا آصف سے کہہ دوں کہ عالیہ کا خیال رکھا کرے۔ مگر نہیں ایسی حماقت تو کبھی بھول کر بھی نہیں کروں گا۔ ہماری اماں تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی ہیں۔ نامعلوم کیسی کیسی تہمتیں لگا دیں۔ پھر وہ تو محض اس کا واہمہ ہی تھا ورنہ پہلے تو کبھی نہیں ڈری تھی۔

ان دنوں اس کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ کسٹم آفس میں پروشنگ آفیسر کے عہدے پر فائز تھا اور بیرون ملک جانے اور آنے والے ہر سامان کی چیکنگ اس کے ذمے تھی۔ ویسے بھی ذاتی طور پر وہ ایک معقول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد ایک بڑے بزنس مین تھے اور گھر میں اللہ کا دیا وہ کچھ بھی تھا جس کے ہونے کی ایسی ضرورت تھی نہ تمنا۔ کبھی رات کی ڈیوٹی لگتی جو دنوں بعد لگتی تھی تو اسے تمام رات گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ مگر ان دنوں بیرونی ملکوں سے مال بردار جہاز آنے کی وجہ سے اس کا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے رات گئے ہی گھر آنے کی فرصت ملتی تھی۔ اس واقعے کو کوئی روز گزر گئے تھے کہ ایک رات پھر وہ اسی طرح بے آواز قدموں سے اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا تو عالیہ کو بیرونی سمت کھلنے والے دروازے کا کھٹکا لگاتے ہوئے پایا۔ اس وقت وہ بہت عجلت میں اور گھبراہٹ میں تھی۔ جلدی سے کھٹکا لگا کر مڑی تو اس پر نظر پڑتے ہی اس کا رنگ فق ہوگیا۔ اور نہ جانے کیوں اسے اپنے دل میں ایک عجیب سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے ہنس کر پوچھا۔

"کیوں بھئی کیا آج پھر کچھ نظر آگیا؟"

"نہیں نظر تو کچھ نہیں آیا۔" عالیہ کی آواز لڑکھڑائی

"میرے خیال میں تو تمہیں کچھ وہم ہوگیا ہے۔" اس نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے قدرے لاپروائی سے کہا۔

"وہم۔ ہاں۔ شاید وہم ہی ہوگیا ہے۔" عالیہ عجیب سے انداز سے بولی۔

"ہاں۔ ورنہ میں تو اسی طرف سے آرہا ہوں۔ کوئی ہوتا تو....."

"آپ۔ آپ اسی طرف سے آرہے ہیں۔" آذر کی بات سن کر اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اسی دروازے سے آؤں مگر تمہارے ڈر جانے کے خیال سے ارادہ ترک کردیا۔" وہ اس کی گھبراہٹ کو اس کے خوف پر محمول کرکے ہنس کر بولا۔

"نہیں نہیں۔ میں ڈرتی تو نہیں۔ بس ایک خیال سا بندھ جاتا ہے۔ یا پھر میرا وہم ہی ہوگا۔ اسی لیے تو میں نے کھٹکے کو بھی چیک کیا تھا۔" وہ سخت گھبرا رہی تھی۔

"لیکن تمہارا یہ وہم۔ میرا مطلب ہے اس کا کوئی سر پیر بھی ہے۔ کیا تمہیں کچھ نظر آتا ہے یا پھر کسی قسم کا احساس ہوتا ہے۔" اس نے غور سے عالیہ کی اتری اتری صورت دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں نظر تو کچھ بھی نہیں آتا۔ البتہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کمرے میں موجود ہے۔" عالیہ نے اس کی نظروں سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر تو یقیناً کوئی جن وِن تم پر عاشق ہوگیا ہے۔ کسی پری زاد سے کم بھی تو نہیں ہو۔" وہ بڑے شریر سے انداز میں آنکھیں مٹکا کر بولا۔

"نہیں خدا نہ کرے۔" عالیہ نے ایک جھرجھری سی لے کر کہا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"ہاں بس ایک ہی ہوا ہے۔" وہ اس کے مذاق اڑانے پر جھینپے جھینپے انداز میں مسکرا کر آہستہ سے بولی۔

"اچھا۔ مگر کون؟" اس نے بھنویں تان کر بڑے

مزاحیہ انداز میں پوچھا۔
"تم ہو میری زندگی کا مختار کل ہے۔" عالیہ نے کسی قدر اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا۔
"اوہ۔ اچھا اچھا۔ پھر تو تمہیں کسی بھی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ تمہارے اس جن نے تو تمہیں پورا پورا تحفظ دے رکھا ہے۔" وہ عالیہ کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔
"ہاں' اسی پر تو میری تمام تر زندگی کا دارومدار ہے۔" عالیہ نے بڑی خود سپردگی میں اس کے سینے سے سر ٹکا لیا۔
"ہوں بڑا ناز ہے تمہیں اس پر' مگر پھر بھی اسے بھوکا مارنے سے باز نہیں آتیں۔ معلوم بھی ہے آج لنچ کھانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔"
"تو اور میں اسی طرح اسٹینڈ تو کی حالت میں کھڑی کیے ہوں۔ مگر آپ تو مجھے اپنے پاس سے ہلنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔" عالیہ نے بڑے ناز سے کہا۔
"ہاں کیا کریں سخت مجبور ہیں' ورنہ اپنے بس میں ہوتا تو یہاں۔۔۔"
اس نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔
"ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنوا لیتے جس میں تم فٹ آجاتیں اور پھر دفتر کا کمرہ بند کر کے تمہیں نکال کر اپنے سامنے بٹھاتے اور فائلیں وغیرہ چیک کرتے۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ایسے حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ عالیہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ پھر ہنس لینے کے بعد قدرے سنجیدگی سے بولی۔
"ایسی باتیں نہ کیا کیجیے آذر! جو عالیہ کو کہیں کا نہ رکھیں۔"
"کیا مطلب ذرا وضاحت تو کرو۔" جوتے کے تسمے کھولتے کھولتے سیدھا ہو کر اس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں' کچھ نہیں۔ آپ جلدی سے لباس تبدیل کریں۔ میں ابھی آئی ہوں۔"
عالیہ نے عجلت میں کہا اور پھر اسے انگوٹھا چڑا کر بھاگ گئی۔ اور وہ تصور ہی تصور میں اس پر مسکراہٹوں کی بجلیاں گراتا رہا۔
اس واقعے کے بعد جب اسے دیر ہو جاتی تو بار بار اس کا خیال عالیہ کی طرف ہی جاتا اور وہ بڑا فکر مند ہو جاتا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ عالیہ ڈر رہی ہو گی۔ نامعلوم کیا چکر ہے۔ یعنی یہ محض وہم ہے اس کا' یا حقیقت ہی ہے۔ مجھے معلوم ہے ڈرنے کے باوجود وہ اوپر اماں کے پاس ہرگز نہ جائے گی۔ وہ تو اس کے لیے آسیب سے بھی زیادہ ڈراؤنی چیز ہو کر رہ گئی ہیں۔ خدا کرے کوئی آہی گیا ہو' تاکہ اس کا تھوڑا سا وقت تو اچھا کٹ جائے۔ کبھی کبھی تو وہ اتنا بے کل سا ہو اٹھتا کہ جلد جلد آدھا کام نمٹا کر باقی اپنے ماتحت کے حوالے کر دیتا اور بھاگم بھاگ گھر پہنچ جاتا۔ مگر روز روز تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اتفاق سے ہی کبھی ایسا موقع میسر آتا تھا۔

*_*_*

اس روز بھی وہ عالیہ کے ہی خیال سے جلد ہی اپنے آفس سے اٹھ آیا تھا۔ پچھلے واقعے کو بھی بہت دن گزر گئے تھے۔ اصل میں تو اسے عالیہ کے بغیر چین ہی نہ پڑتا تھا۔ وہ حسب دستور اپنی گاڑی شیڈ کے نیچے چھوڑ کر اندر آیا اور دروازے کا ہینڈل گھمایا تو خلاف معمول اس روز اندر سے دروازہ بند تھا۔ شاید عالیہ نے خوف کی وجہ سے کھٹکا لگا لیا ہے' اس نے سوچا اور دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہو۔ اسے سخت اچنبھا ہوا۔ ایک لمحے کو یہ خیال بھی دماغ میں رینگا کہ کہیں واقعی عالیہ پر کسی آسیب کا سایہ تو نہیں ہو گیا۔
مگر اس سے آگے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ اندر سے یکے بعد دیگرے کھٹکا کرنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ اس سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور زور سے بولا۔
"عالیہ۔۔۔ عالیہ سنو۔۔۔ میں آگیا ہوں۔"
اور اس کے ساتھ ہی عالیہ نے فوراً ہی کھٹکا کھول دیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ سامنے دروازے کے ہلتے ہوئے پردے پر ہی پڑی' اور پھر عالیہ کے سفید پڑتے چہرے پر۔
"کیا پھر وہی۔۔۔" اس نے پوچھنا چاہا۔

"جی جی... آج تو... آج تو پردہ بھی آپ ہی نے سرک کیا تھا۔" عالیہ غالباً خوف کی وجہ سے ہکلانے لگی تھی۔

"اچھا۔" وہ بڑے تردد سے بولا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ کر پردہ سرکایا اور دروازے کا کھٹکا کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر کھٹکا بند کر کے عالیہ کی طرف مڑا تو وہ جھک کر قالین پر سے کوئی چیز اٹھاتی ہوئی بولی۔

"میں نے بھی ابھی ابھی کھٹکا کھول کر دیکھا تھا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔"

"اچھا۔ بڑی ہمت کر لی تم نے' لیکن یہ پلیٹیں کیسی کیسے نظر آ رہی ہیں۔ کیا تم نے کھانا کھا لیا۔" اس کی نظر اچانک کارنر ٹیبل پر رکھی جھوٹی پلیٹوں پر پڑی تو اس نے پوچھا۔

"میں نے... ہاں... میں نے کھانا کھا لیا۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"چلو خیر اچھا کیا۔" وہ یوں بولا جیسے کسی چیز کا نقصان ہو جانے کے بعد انسان مجبور ہو کر یہی کہتا ہے۔

"وہ دراصل مجھے آج بھوک بہت لگ رہی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مگر آپ کو ناگوار تو نہیں گزرا۔" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولی مگر اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں' ناگوار کیوں نہیں گزرا' بلکہ سخت ناگوار گزرا ہے' تم اپنے آپ نگل ٹھونس کر بیٹھ گئیں۔ اور میں تمہاری وجہ سے ابھی تک بھوکا ہوں۔"

اس نے یہ بات مذاق میں کہی تھی یا سنجیدگی سے' عالیہ کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔ کیونکہ اس کا لہجہ ناقابل فہم تھا۔

"اوہ... آپ تو سچ مچ ہی برا مان گئے۔ اچھا میں آپ کے ساتھ بھی کھا لوں گی۔" عالیہ اپنی مخصوص عادت کے مطابق اس کے بازو پر جھول کر بولی۔

"جی نہیں' معاف کیجئے۔ آپ کو بدہضمی کرا کر مجھے اپنی جان پر نہیں بنوانی۔ مجھے تو پہلے ہی زیادہ بھوک نہیں تھی۔ اب آپ کی خود غرضی نے رہی سہی بھی مٹا دی۔"

وہ لاڈ بھی کر رہا تھا اور ملامت بھی۔ جانے کیسا عجیب سا موڈ ہو رہا تھا اس کا کہ عالیہ کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف تھی۔

"سنیں آذر! اس دفعہ معاف کر دیجئے آئندہ کان پکڑ کر توبہ کرتی ہوں کہ آپ کے بغیر کبھی کھانا نہ کھاؤں گی۔" اس نے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھتے ہوئے آذر کے گھٹنے پکڑ لیے۔

"یہ کیا حماقت ہے' بھئی واہ۔ تم تو ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔" اس نے جھک کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو تم سے ہزار بار کہا ہے کہ تم میرے انتظار میں نہ بیٹھا کرو۔ مگر تم مانتی ہی نہیں ہو اور میں بھی تمہاری وجہ سے وہاں کچھ نہیں کھاتا۔ سوچتا ہوں کہ جب تم میرے بغیر نوالہ ہی نہیں توڑتیں تو پھر میں تمہارے ساتھ ہی کیوں نہ کھاؤں۔"

"اچھا اچھا جی۔ بڑی نوازش ہے آپ کی' مگر کم از کم ترال تو نہ چھوڑا کریں۔ کفران نعمت میں شمار ہوتا ہے۔" عالیہ بڑے چنچلے سے انداز میں بولی۔

"خیر شکر ہے' نال تو یہاں بھی تر ہی ملتا ہے۔ اچھا ایسا کرو میرے لیے ایک کپ چائے بنا لاؤ۔ مگر ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں' ورنہ وہ تمہارا عاشق واشق نظر آ گیا تو۔"

"اف... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

عالیہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب مجھے ایسا ڈر بھی نہیں لگتا۔"

"اچھا تو پھر جاؤ۔ تمہیں اللہ کو سونپا۔" اس نے شریر سے لہجے میں کہا۔ اور عالیہ ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔ کچھ عجیب سی ہو گئی ہے عالیہ بھی۔ اس نے پہلی بار عالیہ کے مزاج اور عادتوں میں ایک نمایاں تغیر محسوس کر کے سوچا۔ کبھی ڈرتی ہے۔ کبھی گھبرا جاتی ہے کبھی پریشان ہو اٹھتی ہے اور کبھی چیخنے لگتی ہے۔ آخر کس وجہ سے وہ اتنی بدل گئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ کچھ محسوس کرتی ہے' مگر اب وہ آ جائے تو

اس سے پوچھوں کہ کیا اس کے یہ احساسات یا
تاثرات میں میرے آنے کے وقت پر ہی ہوتے ہیں یا
کسی اور وقت بھی۔ نو بجے تک تو نیچے خاصی چہل
پہل رہتی ہے۔ وہ تو آج کل ابا میاں کی علالت کی وجہ
سے ان کے دوست احباب نہیں آرہے ورنہ یہاں تو
رات گئے تک ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔
اور جب وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اس نے
اس سے پوچھ ہی لیا۔ عالیہ ایک لمحے کو توسٹپٹائی پھر
اپنا گلا صاف کر کے بولی۔

"اس نکتے پر تو میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا
لیکن۔ لیکن اندازہ ہے کہ یہ سب آپ کے آنے
سے کچھ دیر پہلے ہی محسوس ہوتا ہے۔"

"ہوں تو ان حضرت کو مجھ سے رقابت پیدا ہو گئی
ہے۔" وہ مذاق پر اتر آیا۔

"اف توبہ' ایسی باتیں کر کے تو آپ مجھے اور بھی
ڈرا دیتے ہیں۔" عالیہ منہ پھلا کر بولی۔

"ارے ڈرنے کی کیا بات ہے' ہماری موجودگی میں
تو یہاں پتنگے کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا۔" اس نے
مضبوطی سے عالیہ کو تھام کر کہا' تو وہ اس کے پتنگے کا
بچہ کہنے پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ وہ باتیں ہی ایسی
کرتا تھا کہ عالیہ کی روح تک شاداب ہو جاتی تھی۔
چائے پینے کے بعد اس نے اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے
کہا۔

"یہ کپ یہیں رکھ دو اور جلدی سے آکر لیٹ جاؤ'
آج تمام دن ایک منٹ بھی مجھے بیٹھنے کی مہلت نہیں
ملی۔ سارا بدن تھکن سے چور چور ہو رہا ہے۔" اور
عالیہ نے بلا توقف اس کے کہنے پر عمل کیا اور جلدی
سے پڑ کر سو گئی۔

مگر تھکن کے باوجود آذر کو نیند نہ آئی۔ وہ معمولی سی
بات جسے بے حقیقت اور محض عالیہ کا وہم سمجھ کر وہ
اب تک مذاق میں ہی اڑاتا آرہا تھا۔ اس کے لیے
ایک قابل غور مسئلہ بن چکی تھی۔ شاید اس لیے کہ
اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عالیہ اس سے کچھ
چھپا رہی ہے۔ اگر اس قدر ڈرپوک اور کمزور دل کی
بھی اور کسی احساس سے خوفزدہ بھی تھی تو پھر اتنی
رات گئے اس قدر خوف و دہشت کے عالم میں
دروازے کا کھٹکا کھول کر باہر دیکھنا کیا معنی رکھتا تھا۔ اور
وہ خوفزدہ نہیں گھبرائی گھبرائی سی اور پریشان لگتی تھی۔ وہ
بھی اسے دیکھ کر' خیر ہو گا کچھ یہ آج کل کی لڑکیاں تو
مکھی اور مچھر سے بھی ڈرتی ہیں۔ وہ اس عقدے کو
حل نہ کر سکا تو تنگ آکر سو گیا۔

--*

کئی روز بہت سکون سے گزر گئے تھے۔ وہ جب بھی
آفس سے آتا۔ اسی سلسلے میں عالیہ سے مذاق کرتا رہا۔
اور عالیہ بڑی خوبصورتی سے بات گھما دیتی۔ ایک دن
اس نے عالیہ کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

"سنو' اب وہ تمہارا عاشق نامراد یہاں کبھی نہیں
آئے گا کیونکہ اسے میری طاقت اور اختیارات کا
اندازہ ہو گیا ہے کہ میں کتنا جلاد اور جبلی قوتوں کا مالک
ہوں۔"

اور عالیہ بگڑ کر بولی۔

"میں جتنا اپنے ڈر اور خوف کو زائل کرنے کی
کوشش کرتی ہوں۔ آپ ایسی باتیں کر کے اسے اور
بھی ابھارتے رہتے ہیں۔ آپ تو میری زندگی میں برابر
کے شریک ہیں۔ آپ کو تو میری ہمت بندھانی
چاہیے۔" عالیہ اس کے مذاق پر اس قدر سنجیدہ ہو گئی
تھی۔ اس لیے اس کی دل شکنی کے خیال سے اس نے
پھر اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں کی۔ پھر تو جیسے
بات آئی گئی ہو گئی۔

--*

مگر اس رات اس نے اتفاق سے اپنا سارا کام جلد
ہی نمٹا لیا تھا۔ سوا آٹھ بج رہے تھے جب گھر جانے کے
ارادے سے آفس سے اٹھا تو راستے میں ایک دم ہی
اسے خیال آیا کہ کیوں نہ آج کوئی پکچر دیکھی جائے۔
ابھی تو پکچر شروع ہونے میں کافی وقت ہے اور اصل
پکچر تو انٹرول کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ ویسے بھی
کافی دن سے کوئی پکچر نہیں دیکھی۔ بس یہی سب سوچ
کر اس نے شہر کے سینما ہاؤس میں چلتی انگلش فلم
کے لیے دو سیٹیں ریزرو کرائیں اور خوش خوش گھر
پہنچا۔ کار شیڈ میں چھوڑنے کے بجائے پورچ میں

روکی اور تیزی سے اپنی خوابگاہ کا رخ کیا۔ مگر خوابگاہ کے قریب آکر اس خیال سے رک گیا کہ عالیہ کو تھوڑا سا سرپرائز ضرور دے گا کیونکہ وہ فلموں کی دیوانی تھی۔ مگر آج تک کبھی اپنے منہ سے نہیں کہا کہ مجھے پکچر دکھا دو۔ اس نے اپنے دل میں عالیہ کے لیے ایک عقیدت سی محسوس کر کے سوچا اور پھر ہینڈل گھماتا چاہا مگر بڑھتا ہوا ہاتھ معلق ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اندر سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تجسس کے شدید غلبے نے اسے دروازے سے کان لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اندر خوابگاہ میں کھسر پھسر بھی ہو رہی تھی اور عالیہ کی منت سماجت کرتی سرگوشیاں بھی جاری تھیں۔ مگر ان آوازوں پر ایک مردانہ بھاری اور دبی دبی آواز حد درجہ غالب تھی۔ جسے وہ بڑی آسانی سے سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر باہر رک کر وہ ان مبہم اور پراسرار سرگوشیوں سے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا پھر غیرت نفس نے جوش مارا تو اس نے دروازہ توڑنے کے سے انداز میں زور سے کھولا اور اس کے بعد وہ کچھ ہوا جو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ یعنی اس نے عالیہ پر سختی کی اور اس سے بدکلامی سے بھی پیش آیا لیکن پھر بھی اس نے کسی طرح قبول نہیں کیا۔ اس پر بھی وہ عالیہ کے کسی عذر بہانے کو ماننے پر تیار ہی نہیں تھا۔ عالیہ نے اس کے خیال میں اس کے اعتماد کو بڑی طرح مجروح کیا تھا۔ اس نے خود اپنے کانوں سے کسی مرد کی آواز سنی تھی۔ اور یہ اس کی سماعت کا کوئی دھوکا تھا نہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا سمجھ بیٹھا تھا۔

بہت سی باتیں جنہیں انسان معمولی اور بے حقیقت سمجھ کر نظرانداز کر دیتا ہے یا کرتا رہتا ہے اور جب سنجیدگی اختیار کرتی ہیں یا انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں تو انسان کے احساسات اتنے نازک اور رقیق ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کے حقیر سے حقیر پہلو کو غور اور توجہ کے لائق سمجھنے لگتا ہے اور اسے بھی اب ہی یہ سارے احساسات ہو رہے تھے۔ اپنی تین سالہ ازدواجی زندگی میں پہلی بار عالیہ سے متعلق ہریات کا احساس اسے آج ہی ہوا تھا۔

اماں اور اس کی بڑی بہن صالحہ نے جنہیں وہ اور اس کے دونوں چھوٹے بہن بھائی باجی کہتے تھے۔ کچھ دنوں سے اس سے شادی کرنے کا مطالبہ کر کر کے اس کی جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ یوں تو وہ بھی اب شادی کرنے کی پوزیشن میں آگیا تھا۔ کیونکہ پچھلے دو سال سے برسر روزگار تھا۔ بڑی بہن کی شادی بھی ڈیڑھ سال پہلے ہو چکی تھی۔ مگر اس کی والدہ چونکہ گھریلو سیاست میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں اور بڑے چلن کی خاتون تھیں۔ اس لیے پورے دو برس تک تو بیٹے کی کمائی پس انداز کرنے اور اپنے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے انہوں نے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں منہ سے بھاپ بھی نہ نکالی تھی۔ مگر اب شاید ان کا کوٹا پورا ہو گیا تھا۔ یا پھر اس وجہ سے کہ اچھی اور خاندانی لڑکیوں کی ارزانی تھی۔ اتفاق سے ان دنوں بہن بھی میکے آئی ہوئی تھی۔ اور بس اماں پر ایک دم ہی اس کی شادی کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ سارا دن بیٹی کو لیے ایک ایک گھر جھانکتی اور ایک ایک در کی خاک چھانتی پھرتی تھیں اور گھر آ کر جب بھی سب کو یکجا ہو کر بیٹھنے کا موقع ملتا تو شروع ہو جاتیں اسے لیکچر پلانے کہ ”بیٹا بس اب تم شادی کر لو۔ صالحہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہے اور صائمہ کو اپنی پڑھائی لکھائی سے فرصت نہیں ملتی۔ بہو آجائے گی تو گھر میں کچھ رونق ہو گی اور میرا ہاتھ بھی بٹائے گی۔“ اصل میں انکار تو اسے بھی نہیں تھا مگر بعض ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر ایسی پڑی تھیں کہ وہ شادی کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر تو خود اس کی والدہ ہی وجہ اجتناب بنی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی ماں کی ذہنیت اور عادت مزاج سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اپنی بہو کو خوش رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں۔ انہوں نے مزاج ہی کچھ ایسا پایا تھا۔ حالانکہ سدا پیسے میں کھیلتی رہی تھیں مگر اس کے باوجود پیسے کی چاہ بہت تھی۔ اس پر ہر ایک پر نکتہ چینی ضرور کرتی تھیں۔ مزاج کی بھی ذرا تیز تھیں اور اپنے آگے کسی کی چلنے نہیں دیتی تھیں اس پر خیالات اور دماغ اتنے اونچے کہ ان کا بس چلتا تو کسی بادشاہ زادی کو ہی بیاہ کر لاتیں۔ ادھر باپ پر جب سے فالج گرا تھا۔ ان کا سارا

کاروبار تقریباً" ٹھپ ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ چھوٹا بھائی ناظم اور چھوٹی بہن صائمہ ابھی زیر تعلیم تھے۔ بس ان ہی ساری باتوں کے پیش نظر وہ اپنی شادی رچا کر بندھ جانے کے حق میں نہ تھا۔ جبکہ مالی پریشانی کا بھی کوئی مسئلہ حائل نہ تھا۔ اماں کے پاس اتنا تھا کہ کاروبار بالکل ٹھپ بھی ہو جاتا تو ساری عمر خوب پیر پسار کر بے فکری سے کھا اور کھلا سکتی تھیں۔ وہ تو انہیں کچھ نہ نہ کرنے کی عادت ہی ہو گئی تھی اور بس اماں کی اسی عادت سے اسے شدید اختلاف تھا۔ کیونکہ وہ بھی پورے دو سال سے اپنی پوری تنخواہ کٹ اور اماں کی بزرگی کے خیال سے یونہی کی یونہی ان کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا تھا۔ ابا کے پاس خاصی وسیع جائیداد بھی تھی اور زمینیں بھی۔ ان کا کاروبار مندا ضرور پڑ گیا تھا۔ مگر تھوڑی بہت آمدنی تو ہو ہی جاتی تھی۔ اس پر بھی اماں کفران نعمت کی انتہا کر دیتی تھیں اور ان کی اسی بات سے اسے سخت چڑ تھی۔

کچھ ہی روز بعد اماں اور بہن نے بالآخر بھانت بھانت کی لڑکیوں میں سے ایک کا انتخاب کر ہی لیا۔ اور اب اس کی تو جیسے شامت ہی آ گئی۔ جب دیکھو لڑکی اور لڑکی کے خاندان والوں کے قصے اور قصیدے۔ کبھی موڈ میں ہوتا تو وہ بھی دلچسپی سے سنتا رہتا اور اگر موڈ میں نہ ہوتا تو اٹھ کر چلا جاتا۔ مگر اب اس معاملے میں اس کی اماں بڑی سنجیدگی سے ایکشن لینے کی ٹھان چکی تھیں اور اس کے لیے یہی کیا کم اچنبھے کی بات تھی کہ ڈنڈی مارنے کی پختہ عادت کے باوجود اماں کے معیار کے ترازو میں کوئی لڑکی پوری اتر آئی ہے۔ ایک دن وہ اپنی قمیص میں بٹن ٹکوانے صالحہ کے پاس پہنچا تو اماں بھی عقبی سمت کے بیچ نما درے میں صالحہ کے پاس دیوان پر بیٹھی اپنے لیے پان بنا رہی تھیں۔ وہ بھی وہیں ان کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اماں تو جیسے اسی کی گھات ہی میں بیٹھی تھیں فوراً" شروع ہو گئیں۔

"دیکھو ایسے ہفت ہزاری تو نہیں مگر حیثیت تو رئیسوں کی سی بنا رکھی ہے اور بھئی سب سے بڑھ کر تو شریف لوگ ہیں۔ لڑکی بھی ہیرا ہے ہیرا۔"

"جی ہاں امی! ایسی باحیا اور نیک اطوار لڑکیاں تو آج کل ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ اس پر اخلاق اور خوش مزاجی کا یہ عالم کہ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔"

بہن نے فوراً" لقمہ دیا اور اس نے ہنس کر دل میں سوچا۔ یہ تو کسی پرستانی مخلوق کی خصلتیں بتا رہی ہیں۔

"خیر وہ تو ہے ہی مگر بہنوں میں سب سے بڑی بھی تو ہے گویا ان لوگوں کا یہ پہلا کار ہو گا۔ ظاہر ہے بڑھ چڑھ کر ہی دیں گے۔" اماں نے پان کی گلوری بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا اور پھر سروتا اٹھا کر چھالیہ کترنے لگیں۔

"کیوں نہیں اماں! خدا نہ کرے ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔ خالہ رشیدہ کہہ رہی تھیں کہ کبھی ان کے نام کا طوطی بولتا تھا سارے زمانے میں۔ وہی مثل ہے کہ مرا ہاتھی پھر بھی سوا لاکھ کا۔ دیں گے تو ایسا کہ دنیا اش اش کر اٹھے گی۔"

اس کی بہن نے کہا تو اس نے سوچا۔ بھلا یہ لینے دینے کی بات کیوں نکلی ہے۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

"ارے ہاں یوں تو غریب سے غریب آدمی بھی اپنی گڑیا کو سنوار کر ہی دیتا ہے۔ پھر بھلا وہ لوگ کیوں نہیں دیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اللہ کا نام لے کر ہامی بھر لو آذر بیٹے۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے خواہ لڑکے ہوں یا لڑکی کے۔"

اماں نے براہ راست اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ بھی ماں اور بہن کے روز روز کے تقاضے سنتے سنتے عاجز آ گیا تھا۔ اسے بالآخر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ بڑی بے دلی سے بولا۔

"اچھا اماں! اگر آپ اسی قدر بضد ہیں تو پھر مجھے بھلا کب انکار ہو سکتا ہے؟؟"

اور پھر وہ اپنی قمیص بہن کے ہاتھ سے لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اس کے ہامی بھرنے کے بعد ماں اور بہن نے مل کر کیا کارروائی کی۔ کیونکہ عالیہ کے گھر تک اس کا پیغام پہنچایا۔ مگر چند ہی روز بعد ایک دن اس کی بہن نے خوشی سے جھومتے

ہوئے اسے جتایا کہ "ادھر سے تمہارے لیے ہاں بھر لی گئی ہے۔ مگر اماں چونکہ منگنی کرنے کی قائل نہیں اس لیے سیدھی بات ہی ٹھہرا دیں گی۔ انہیں تو پہلے ہی تمہاری شادی کرنے کی جلدی ہے اور ویسے بھی دو ڈیڑھ ماہ کے لیے منگنی کرنا کچھ مناسب نہیں ہے۔"

مگر اس نے اپنی بہن کی مصلحت آمیز باتوں کو جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ تو غصے سے بل کھا کر رہ گیا کہ اماں اور بہن نے لڑکی دکھائے بغیر ہی سارے معاملات طے کر لیے اور سارا پروگرام بھی مرتب کر لیا۔

"باجی! میں نے اماں کی ہر بات بے چون و چرا مان لی۔ مگر اب یہ تو کسی قیمت پر بھی مجھے گوارا نہیں کہ لڑکی کو دیکھے بغیر شادی کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ آنکھیں بند کر کے ایک ایسی لڑکی کا ہاتھ تھام لوں جسے میں نے دیکھا تک نہ ہو اور جو زندگی کی رفاقت میں میری برابر کی شریک ہو گی۔"

"ارے تو یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے۔ تم عالیہ کو دیکھنا ہی چاہتے ہو تو اسے دکھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ابھی تمہاری بات تو نہیں ٹھہری۔ وہ لوگ خود تم کو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ جب چاہو وہاں جا سکتے ہو۔"

بہن نے اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بڑی رسانیت سے سمجھایا۔ تب کہیں جا کر اس کا غصہ فرو ہوا۔

اس کے بعد جلد ہی اس کی ماں اور بہن اسے عالیہ کے یہاں لے گئیں۔ ماڈرن نہ اس کا گھرانہ تھا نہ عالیہ کا۔ بس عالیہ کی اسے ایک جھلک سی دکھائی گئی تھی۔ وہ خود بھی کسی سے کم نہ تھا مگر عالیہ کی بس ایک ہی جھلک اسے خود سے بیگانہ کر گئی تھی۔ بر دکھوے کے فوراً ہی بعد ایک طاق دن اور طاق تاریخ میں ان دونوں کی نسبت قرار پائی تھی۔ اس کی ماں اور بہن کو تو شادی کی بہت جلدی تھی۔ مگر عالیہ کی والدہ چھ سات ماہ سے پہلے کسی طرح ان کی شادی کرنے کے لیے آمادہ ہی نہ ہوتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ میرا پہلا کار ہے اور ابھی تو میں نے عالیہ کا ڈھنگ سے جہیز بھی نہیں بنایا۔ عذر یہ تھا کہ پہلے سے جوڑے ٹانک کر رکھو تو یہاں کی سیلی ہوئی آب و ہوا سے مسالے کی آب چلی جاتی ہے، اور اگر نہ بھی ٹانکو تو لڑکیاں چپکے چپکے نکال نکال کر پہن لیتی ہیں۔ اصل میں عالیہ کے والد حیات نہ تھے۔ ایک بڑا لڑکا تھا اور چار بیٹیاں۔ گو اچھے معقول لوگ تھے۔ مگر مہنگائی کی وجہ سے ہر چیز پر تو آگ برس رہی تھی۔ مگر اماں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بہن ہمیں تو کچھ نہیں چاہیے۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ ایک انمول ہیرا ہمارے سپرد کر رہے ہیں۔ بس آپ تو اللہ کا نام لے کر تاریخ مقرر کر دیجیے۔ باقی جو کمی بیشی ہو گی ہم پوری کر دیں گے۔ گو مجھے معلوم ہے کہ آپ کا یہ پہلا کار ہے، پہلی خوشی ہے اور آپ جو نہ دیں وہ کم ہے۔ آپ کے دل میں بھی بڑے ارمان ہوں گے مگر ہمیں تو شادی سے مطلب ہے۔ ہمارے بیٹے کا گھر جلد از جلد بس جائے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ باقی باتوں کی آپ فکر نہ کریں۔"

"نہیں۔ یہ تو آپ کی محبت ہے ورنہ اب میں ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ بیٹی کو غریبانہ طور پر کچھ نہ دوں، ویسے بھی خالی بیٹی کون دیتا ہے۔" عالیہ کی امی اس کی ماں کے خلوص سے متاثر ہو کر بولیں۔

"اوہو خالہ جان! ذرا ہمیں بھی تو بتایئے کہ آخر آپ کیا کیا دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔" اس کی بہن نے بڑی دلچسپی کا اظہار کر کے پوچھا۔

"اے بیٹی! بس اپنی بساط کے مطابق ہی دوں گی۔"

عالیہ کی امی نے مسکرا کر کہا۔

"اے صالحہ! تم بھی بعض وقت بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اللہ رکھے ان کے گھر کی پہلی خوشی ہے۔ کیا یہ اپنے دل کے ارمان نہیں نکالیں گی۔" انور کی اماں نے جس انداز میں اپنی بیٹی کی فہمائش کی۔ عالیہ کی امی پہلو بدل کر بولیں۔

"ارمان کس کے دل میں نہیں ہوتے۔ اور بیٹی والے جتنا بھی دیں، کم ہی ہوتا ہے۔ وہ تم نے سنا نہیں شاید پرانے وقتوں میں جبکہ سستے زمانے تھے۔ ایک باپ نے بیٹی کو مکان، زمین، لاکھوں کا جہیز، زیور پاتا، غرض یہ کہ ہر نعمت دی تھی۔ حتیٰ کہ دولہا کے لیے

گھوڑا بھی۔ اور تو اور بارات میں دولہا دلہن پر سے سونے چاندی کی پھڑی نچھاور کرائی تھی مگر جب لڑکی سارے ساز و سامان کے ساتھ سسرال پہنچی تو دولہا نے ساری چیزوں پر ایک نظر ڈال کر ناک چڑھا کر کہا۔

"ہونہہ سسرے نے سب کچھ دے دیا پر گھوڑے کی زین تو دی نہیں۔"

اور اس حکایت پر تو صالحہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ مگر اماں ذرا سنجیدہ ہو کر بولیں۔

"مگر ہم اتنے ناشکرے نہیں ہیں بہن! آپ جو کچھ بھی دے دیں گی وہی ہمارے لیے بہت ہو گا۔ اور میں تو کہتی ہوں کہ کچھ دینے کی ضرورت ہی نہیں۔"

اماں نے لاکھ کوشش کر لی۔ مگر عالیہ کی امی تاریخ مقرر کرنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ اصل میں اماں کی عادت ہر بات کو جلد از جلد انجام تک پہنچانے کی تھی اور بس وہ چاہتی تھیں کہ گھڑی کی چوتھائی میں شادی ہو جائے۔ ورنہ ایسی عجلت بھی نہیں تھی اس کی شادی کی۔

*_*_*

پانچ چھ ماہ کا عرصہ بھی پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا۔ اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ اس لیے دونوں طرف زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گو لڑکے کی بری بازار میں گھڑی کے مصداق لڑکے کی ماں ہونے کی وجہ سے اماں کو ایسی تیاریاں نہیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ پھر بھی سینکڑوں کام ہوتے ہیں۔ کارڈ چھپوانا' دعوت نامے بانٹنا اور بہت سے کام۔ جن میں اماں اور بہن ہمہ تن مصروف رہتی تھیں۔ اطمینان ہی اطمینان تھا۔ اس لیے بیٹھے ہی بیٹھے حکم چلایا کرتی تھیں۔ وہ بھی بالکل ہی ایک نئے اور انوکھے تجربے سے دوچار ہونے والا تھا اور پھر یہ اس کا ہی معاملہ تھا اس لیے گھر کی باتوں میں بڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ عالیہ کا گھرانہ پرانی روایات کا اسیر تھا۔ ادھر اماں سخت قدامت پرست۔ بیچارہ عالیہ کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خواہش میں اپنا دل مار کر رہ جاتا تھا۔ بس بہنیں اور بھائی ہی ہر وقت چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ یا پھر صالحہ عالیہ سے متعلق کوئی بات سنانے بیٹھ جاتی تھی۔ اس جستجو میں اماں اور بہنوں کے پاس آکر بیٹھ جاتا کہ عالیہ کا کچھ ذکر ہی سن لے۔

اور اس دن بھی وہ ماں اور بہنوں میں آکر بیٹھا تو اماں جو صالحہ سے باتیں کر رہی تھیں کہنے لگیں۔

"اے ہاں ان لوگوں نے خواہ مخواہ ہی دیر لگائی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ان کے پاس پھر نا معلوم بیٹی کو ایسا کیا دینا چاہتی ہیں جواب بھی بڑی مشکل سے تیار ہوئی ہیں تاریخ مقرر کرنے کے لیے۔"

"کیجیے اماں! آخر کو لڑکی کا معاملہ ہے۔ کوئی لڑکا تو نہیں کہ دو چار جوڑے کپڑے بازار سے خرید کر بری میں لگا دیئے۔ اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا بھاری جہیز دیں گی بیٹی کو' جبھی تو دنوں سے تیاریاں کر رہی ہیں۔"

"ہاں دیکھو کیا دیتی ہیں' بے چاری بیوہ بھی تو ہیں۔ شوہر سر پر موجود ہو تو عورت کا دل شیر رہتا ہے؟" اماں نے گود کے میوے کو چھان پھٹک کر کے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بیوہ بھی ہیں تو حیثیت میں تو ہمارے برابر ہی ہیں اور سب سے بڑھ کر دل کی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب بھی ہم جاتے ہیں تو کس طرح ہماری خاطروں میں بچھ بچھ جاتی ہیں۔" صالحہ بری کے خوان پوشوں میں کرن ٹانکتے ہوئے بولی۔

"ہاں' دل والی تو بہت ہیں اور پھر بیٹی کے لیے تو کنجوس سے کنجوس بھی دل بڑا کر لیتے ہیں۔ ان کا تو ہاتھ بھی کھلا ہوا ہے۔"

"ہاں اماں! مگر یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی کہ انہوں نے عالیہ کے لیے پہلے سے کچھ جمع ہی نہ کیا ہو۔"

"تو بھلا کیوں نہ کیا ہو گا۔ بیٹی پیدا ہوتی ہے تو چلن کے لوگ چھٹی چھوچھک سے ہی اس کی نیت سے چیزیں جمع کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ اور میرے خیال میں تو یہ لوگ فرز' ٹی وی اور گاڑی بھی دیں گے۔" اماں ہمیشہ فرج کو فرز ہی کہتی تھیں۔

"ہاں دیں گی کیوں نہیں نہیں دیں گی تو ہم مانگ کر لے لیں گے۔" صالحہ کچھ دھونس جماتی ہوئی بولی۔

"میرے خیال میں اپنے منہ سے کہنا کچھ مناسب

نہیں۔ ہم سیدھے سبھاؤ ان سے پوچھ لیں گے۔"
اماں پرخیال انداز میں بولیں۔ تو وہ جو عالیہ کا ذکر سننے کے شوق میں آکر بیٹھا تھا۔ ماں اور بہن کی فضول سی باتوں پر جھلا کر بولا۔

"مگر اماں! یہ آپ جہیز وغیرہ کا ذکر کیوں لے بیٹھتی ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک چھوڑ دو فرج' ٹی وی' ریڈیو گرام گاڑی سب کچھ ہی موجود ہے پھر ان لوگوں سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اے لو (اے لو) بھلا ضرورت کیوں نہیں۔ گھر میں خواہ لاکھ چیزیں موجود ہوں۔ مگر لڑکی کی لائی ہوئی چیزوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ ایک تو سب کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی ہے دوسرے یہ ساری چیزیں اس کی اپنی ہوتی ہیں۔ اور پھر سسرال کی چیزوں پر لڑکی کا حق ہی کیا ہوتا ہے۔ وہ تو لڑکے کے والدین اور بہن بھائیوں کی ہوتی ہیں نا۔" اماں نے اسے جہیز کا فلسفہ سمجھاتے ہوئے تمام نزاکتوں سے آگاہ کیا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"یہ بھی خوب ہے اماں! لڑکی تو گھر کی عزت اور گھر ہی کا ایک فرد بن کر آتی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ سسرال کی چیزوں پر کوئی حق نہیں ہوتا اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ارے تم ان باتوں کو کیا جانو بھیا۔ سدا سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ ہمیں تو اماں نے اتنا دیا تھا کہ کیا کوئی بادشاہ اپنی بیٹی کو دے گا۔ پھر بھی ہمارے سسرال والوں کی کچھ بھاویں ہی نہ آیا۔ اور اس پر مزے کی بات یہ کہ ہماری ہی چیزوں پر حق ایسا جمایا جاتا ہے جیسے ان کے باپ دادا ہی کی ہوں۔"
صالحہ نے کہا۔

"ارے ہاں اسے کیا معلوم' یہ تو بس مزے سے عیش کرنا ہی جانتا ہے۔ تمہاری سسرال والوں نے تو فرمائشیں کر کر کے میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ گاڑی فرج' ٹی وی اور وہ موا کیا ہوتا ہے' ہاں وہ ریڈیو گرام' سلائی مشین' کپڑے دھونے کی مشین' بجلی کا بڑا چولہا' منہ پھوڑ پھوڑ کر ساری چیزیں مانگی تھیں۔ اور تو اور تینوں بھائیوں' چاروں بہنوں' بہنوئیوں' بہوؤں' بھانجیوں' بھانجوں اور خود بڈھے بڈھیا کے لیے پہناونیاں بھی مانگی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو پیٹ کی اولاد کے لیے بھی مانگ لیتے' پورے سات لاکھ خرچ ہوئے تھے صالحہ کی شادی پر۔"

"نہیں بلکہ کہیں زیادہ اماں۔ آپ نے آدھا جہیز تو بہت پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ اور وہ زیورات کے چار سیٹ' سچے موتیوں کا ست لڑا' چندن ہار اور کنٹھی گریبان کے بٹن اور سونے کا جوڑا۔ وہ تو لگایا ہی نہیں آپ نے حساب میں۔"

"ہاں ہاں وہ بھی دو لاکھ کی مالیت کا ہی ہو گا۔ ان لوگوں نے تو گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ خیر اب میں اپنے بیٹے کی شادی پر ساری کسر نکال لوں گی۔ آخر میں نے بھی تو صالحہ کی شادی پر اتنا پیسہ خرچ کیا ہے؟"

"ہاں اماں! ہم بھی پہناونیاں لیں گے مگر کچھ زیادہ تو نہیں ہوں گی' باجی کی' دولہا بھائی کی' صبیح (صالحہ کا بیٹا) اعظم بھائی کی اس طرح ابا کی اور آپ کی کل سات ہی تو ہوں گی نا۔" صائمہ نے خوش ہو کر کہا۔

"مگر اماں! کیا پہناونیوں میں صرف جوڑے ہی آتے ہیں۔" یہ بات کہہ کر صائمہ نے پوچھا۔

"نہیں زیور۔ پانا اسکوٹر اور بہت سی قیمتی چیزیں بھی دی جاتی ہیں۔" اماں کے بجائے صالحہ نے جواب دیا۔

"ہاں اور کیا" یہ تو لڑکے والوں کی مانگ پر منحصر ہوتا ہے' وہ پھوپھی جو تم ہیں نا" ان کے بیٹے کی شادی پر تو ان لوگوں نے اپنے دونوں بہنوئیوں کے لیے اسکوٹر اور بہنوں کے لیے زیور مانگے تھے۔" اماں نے بتایا۔

"پھر تو ٹھیک ہے اماں! آپ بھی میرے لیے سیٹ اور اعظم بھیا کے لیے اسکوٹر مانگ لیں اور ہاں صبیح کے لیے تو ائے کار باجی اور دولہا بھائی کو جوڑے ہی کافی ہوں گے۔" صائمہ بولی۔

"لاحول ولا۔" وہ ان کی باتوں پر جز بز سا ہو کر بولا

"اے لاحول ولا کیسی' یہ تو دستور دنیا ہے وہی مثل ہے کہ کیا نقد سودا خوب ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اسے یہ شادی بیاہ کا معاملہ تو ایک سودا ہی ہوتا

ہے جتنا میں نے اپنی لڑکی کو دیا اتنا ہی بہو سے لے لیا۔

"اچھا دستور ہے اماں! معلوم ہوتا ہے جیسے شادی نہیں سٹے بازی ہو رہی ہے یہ تو کھلا ہوا جوا ہوا۔" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"نہیں خیر جوا تو نہیں ہوتا" اسی لیے تو پہلے سے ہی سارے معاملات طے کر لیے جاتے ہیں۔" صالحہ نے کہا۔

"مگر غیرت اور حمیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے باجی! ایک تو لڑکی والوں پر پہلے کیا کم بار ڈالا جاتا ہے۔ اس پر خود اپنے منہ سے کہہ کر بھائی بہنوں کے لیے زیورات اور اسکوٹر بھی مانگو' میرے نزدیک تو اس سے بڑھ کر کوئی بے غیرتی ہی نہ ہوگی۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"ارے چل بڑا آیا نکیلا کہیں کا' یہ تو خوشی کی رسمیں ہوتی ہیں کوئی مارے بندھے کا سودا نہیں ہوتا۔ لڑکی والے تو اپنی ناک اونچی رکھنے کو بن مانگے ہی بہت کچھ دے دیتے ہیں۔" اماں نے بڑے دلار سے اسے سمجھایا۔

"خیر کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں' مگر اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اپنے معاملے میں ایسی جاہلانہ اور ناجائز رسومات کو برداشت نہیں کروں گا اور اس پر بھی اگر آپ نے ان لوگوں سے کوئی فضول سا مطالبہ کیا تو میں سرے سے شادی ہی نہ کروں گا۔"

"ارے واہ! کچھ دماغ چل گیا ہے کیا۔" بہن نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اماں نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

اس کی بات پر کہاں تک عمل کیا گیا' یہ تو اس نے دیکھا ہی نہیں البتہ چند روز بعد بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی ہو گئی۔

وہ بے تابیاں جن پر روایات اور نزاکتوں کے بند باندھ باندھ کر اس نے یہ چھ سات ماہ کا عرصہ گزارا تھا' سارے بند توڑ کر بے لگام ہوتی لگ رہی تھیں جس وقت اس نے حجلہ عروسی میں قدم رکھا۔ عالیہ سامنے ہی پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گھری عروسی سیج پر بیٹھی تھی۔

وہ ہستی جو اب سے چند گھنٹے پہلے اس کے لیے بالکل غیر تھی اب اپنے تمام تر جملہ حقوق کے ساتھ اس کی اپنی ہو گئی تھی' اور یہ احساس اس کے لیے بڑا ہی نرالا اور انوکھا سا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں ایک رفیق کی حیثیت سے داخل ہوئی ہے اس کے دکھ درد' حرج۔ مرض اور غم اور خوشی میں برابر کی شریک ہونے کا عہد کر کے آئی ہے۔ کم از کم آزر کے لیے تو یہ ایک بالکل ہی انوکھا اور اچھوتا سا تجربہ تھا۔ ایک عجیب سا مسرت آگیں اور گدگدا دینے والا احساس تھا جو اس کے رونگٹے رونگٹے کو انگیز اور دھڑکنوں کو منتشر کر رہا تھا۔ کچھ دیر دروازے کے آگے ٹھٹکا وہ زندگی کے اس نئے باب میں پہلا قدم رکھنے کے متعلق ہی سوچتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور عالیہ کی طرف بڑھا دونوں ہاتھوں سے مسہری کے اردگرد لٹکتی پھولوں کی لڑیوں کو سمیٹ کر وہ بڑی پر اشتیاق اور والہانہ نظروں سے سرخ زرتار دوپٹے میں لپٹی عالیہ کو دیکھتا رہا' جو گھونگھٹ ہی نہیں منہ بھی اٹھائے ساکت سی بیٹھی تھی۔

آزر نے اس کے قریب بیٹھ کر بڑی از خود رفتگی کے عالم میں عالیہ کے گود میں رکھے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہت غور سے جھک کر اسے دیکھا۔

سینٹ اسپرے عطر اور پھولوں کا ایک روح تک کو بہکا دینے والا بھبکا اس کے نتھنوں کی راہ اس کے دل میں اترتا چلا گیا جس میں حنا کی خوشبو سب سے نمایاں تھی۔ خوبصورت مخروطی انگلیوں میں دمکتی انگوٹھیاں اور گداز سی کلائیوں میں پھنسی طلائی چوڑیاں جن پر اس کی نظریں تنگ کر رہ گئیں۔ یہ چوڑیاں جو عالیہ کو میکے کی طرف سے جہیز میں ملی تھیں اس کی خوبصورت گوری گوری اور گداز کلائیوں میں پھنسی بہت ہی دلفریب لگ رہی تھیں۔ مگر عالیہ کے ہاتھ کس قدر سرد تھے کہ سینے میں اترتے طمانیت کے گہرے احساس کے باوجود ایک دم ہی اسے خیال آیا' دلہنیں تو اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپائے رکھتی ہیں مگر یہ دلہن کیسی ہے؟ بالکل کسی بے جان شے کی مانند گود میں ہاتھ رکھے

گھونگھٹ اونچا کیے یوں ساکت وجامد سی بیٹھی ہے جیسے یہاں اس مسہری پر کوئی سنگی مورتی نصب کر دی گئی ہو اور اس کے یہ خوبصورت ہاتھ کس قدر سرد اور بے جان سے لگ رہے ہیں یوں جیسے ان میں زندگی کی حرارت کبھی دوڑی ہی نہ ہو مگر یہ سوچنے اور غور کرنے کا موقع نہیں تھا بلکہ نزاکت اور لطافت سے بھرپور زندگی کی وہ اہم ترین ساعتیں تھیں جن میں مختلف اور انجانی سمتوں سے آنے والے وہ راہی ایک دوسرے کے کاندھوں پر اپنے یقین اور رفاقت کی اساس رکھ کر اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر زندگی کے سفر میں شانہ بہ شانہ آگے بڑھتے ہیں اور بڑھتے ہی رہتے ہیں۔

عالیہ نے اس کی توقع کے برعکس اپنے ہاتھوں کو اس کے حوالے کرنے میں تھوڑی سی بھی مزاحمت نہیں کی تھی اور نہ اس کے قرب پر کوئی ردعمل ہی دکھایا تھا اور یہ کوئی ایسی قابل گرفت بات بھی نہ تھی یعنی اس کے خیال میں عالیہ کا یہ بے جان اور خاموش سا طرز عمل اس کی لاعلمی اور ناتجربے کاری کی وجہ سے بھی ہو سکتا تھا لیکن ابھی جب وہ دولہا بن کر بارات کے ساتھ عالیہ کے گھر پہنچا تھا تو مہر کے معاملے میں تھوڑی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ عین نکاح کے موقع پر کسی بات پر فریقین کے درمیان تلخی یا بدمزگی پیدا ہو جائے تو دلوں میں تھوڑا بہت تکدر ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ایک قدرتی بات ہوتی ہے حالانکہ دیکھا جائے تو ہر لحاظ سے دولہا والوں کا پلا بھاری ہوتا ہے اور وہ شیر بھی ہوتے ہیں مگر انور کے دل میں تو ایک گرہ سی پڑ گئی تھی اور اسی لیے وہ معمولی معمولی سی باتوں کو اتنی اہمیت دے رہا تھا۔

پھر اس نے بڑی نرمی اور احتیاط سے عالیہ کے دونوں ہاتھ اس کی گود میں رکھ دیے اور بے ترتیب سی دھڑکنوں کے ساتھ اس کا ماتھے تک جھکا گھونگھٹ اونچا کرنے کا مرحلہ بھی طے کر لیا تب بھی وہ یونہی بے حس سی بیٹھی رہی مگر وہ تو جیسے اپنے ہوش نہ رہا' مبہوت سا اس کا عروسی جلوہ دیکھتا رہ گیا۔ روشن اور کشادہ پیشانی جس پر چمکتا ٹیکہ کانوں تک جھکی جڑاؤ پٹی' بچی موتیوں کا جڑاؤ جھومر تھے سے بجی ستواں ناک' سمٹا ہوا دہانہ ابھرے ہوئے لپ اسٹک سے رنگے خمیدہ ہونٹ افشاں اور بلو آئی شیڈو میں لپٹے غلافی پپوٹے جن کے سروں پر پلکوں کی سیاہ جھالریں صبیح رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر وہ زیورات جو وہ کانوں اور گلے میں پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں جڑاؤ گجرے بالے اور گردن سے لے کر ناف تک ایک دو نہیں چھ سات قسم کے ہار جن میں گلوبند نیکلس ست لڑا مالا اور چندن ہار وغیرہ شامل تھے۔

"میں تو بھی صرف وہ سیٹ دے رہی ہوں چڑھاوے میں۔ اے ہاں بری میں تو اتنا ہی زیور کافی ہوتا ہے اور پھر بٹیا کی بھی تو ہے وہ جو چاہیں دے دیں ویسے تو میں نے پانچ سیٹ ہی مانگے ہیں۔"

ایک دم ہی کانوں میں بڑی اپنی ماں کی آواز صدائے باز گشت کی طرح اس کے کانوں میں گونجی تو اپنی محویت سے چونک کر اس نے منہ ہی منہ میں لاحول پڑھی اور پھر عالیہ کو مخاطب کر کے بولا۔

"ہنہیں عالیہ! جو کچھ ابھی کچھ دیر پہلے نکاح کے موقع پر ہوا تھا۔ اس میں میری مرضی کو بالکل دخل نہ تھا۔ اصل میں شادی بیاہ کی رسومات کا تمام تر انحصار بزرگوں کی مرضی اور خواہش پر ہوتا ہے جب کہ میں تو ایسی رسومات کو بالکل لغو ہی سمجھتا ہوں۔"

تب بھی عالیہ اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی اور تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بے موقع بات کہہ گیا ہے۔ اس نے فوراً ہی پینترا بدل کر اپنی فطری شوخی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بھئی آخر کیا معاملہ ہے۔ اپنا جلوہ دکھا کر تو مجھے اپنا دیوانہ بنا دیا مگر میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ویسے اطمینان رکھیے اتنا بھیانک اور بدہیئت بھی نہیں ہوں کہ مجھے دیکھ کر آپ کی گھگھی بندھ جائے۔"

اس نے بڑے پیار سے عالیہ کی ٹھوڑی اونچی کر کے کہا تو عالیہ کے سپاٹ سے چہرے پر مسکراہٹوں کے چاند اتر آئے۔ اس نے ڈرتے جھجکتے شرماتے لجاتے آہستہ سے پلکوں کی چلمن اٹھائی لیکن بار حیا نے

دوسرے ہی لمحے اسے گرا دیا پھر بھی اس ایک لمحاتی وقفے میں عالیہ کی موہنی صورت اس کی روح کی گہرائیوں تک اترتی چلی گئی۔

موہنی صورت کومل اور معصوم سی عالیہ نے پہلی ہی شب پہلی ہی نظر میں آذر کے دل میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا جو کم ہی کسی بیوی کو حاصل ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو کچھ عرصے دونوں کے درمیان ایک تکلف سا قائم رہا مگر جب بقول اماں دلہن پرانی ہوگئی تو اس نے محسوس کیا کہ تکلف ہی نہیں عالیہ اس سے تھوڑی تھوڑی غیریت بھی برتتی ہے اور ہر دم چپ چپ سی کسی فکر میں غلطاں اور پیچاں نظر آتی ہے۔ گو اسے معلوم تھا کہ وہ فطرتاً کم گو اور بے زبان سی لڑکی ہے مگر اس کا فکر مندی سے کچھ سوچتے رہنا آذر کو بہت عجیب سا لگتا تھا۔ ادھر ماں کی زہر میں بجھی گفتگو سے بھی وہ لاعلم نہیں تھا جو کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی موضوع نکال کر ڈائریکٹ عالیہ پر انڈیلتی رہتی تھیں۔

"اے بس بہت ہولیے مان گون' اب کام کاج پر لگاؤ اپنی بیگم کو' صائمہ بے چاری اکیلی جان کیا کیا کرے۔ پڑھنے جائے گھر سنبھالے یا دادی کی سو سو جھکیں سہے اور پھر خدا معلوم اس کا نصیب کیسا ہو' اپنے گھر میں کس طرح رہے۔ اسی لیے تو ماں باپ کے گھر میں لڑکی لعلوں کی لعل بن کر رہتی ہے اور اب تو تمہاری شادی کو خیر سے چار مہینے ہوگئے مگر تمہاری بیوی نے آج تک ایک پھلی بھی تو نہیں پھوڑی۔"

کبھی کہتیں۔

"اے لو ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں تو نہ معلوم بیٹی کو ایسی کیا بادشاہت عطا کردیں گی مگر وہاں تو کل اکیس جوڑے' تین سیٹ' جھومر اور سونے کے بٹن ہی دیئے ہیں وہ بھی پتا نہیں موئے کس دل سے' پورے چھ مہینے لگائے' اس پر گاڑی اور بجلی کا بڑا چولہا بھی نہیں دیا اور سوغاتیں بھی ایسی کہ میں نے تو جل کر اپنی دھوبن کو دے دیں آج کل تو بھنگی اور چمار بھی اچھا پہنتے ہیں وہ تو میں نے خود منہ پھوڑ کر اور زبردستی کہہ سن کر صالحہ کے دولہا کو اسکوٹر دلوائی ہے میں تو کہتی ہوں کہ اگر کسی قابل نہ تھے تو پھر ہم پر اتنا احسان بھی کیوں کیا۔؟"

اور کبھی کہتیں۔

"اے اچھے سسرال والے ہیں نہ کبھی خود آتے ہیں نہ بیٹی داماد کو بلانے کی توفیق ہی ہوتی ہے اور کبھی خود میرا بچہ وہاں چلا جاتا ہے تو یونہی بغلیں جھاڑتا ہی آتا ہے۔ ایسا کچھ دیا بھی نہیں جہیز میں جو پھر کچھ دینے کی ضرورت ہی نہ ہو' ایک اللہ رکھے وہ ہمارا داماد ہے جب بھی آتا ہے جیبیں خالی کرا کے ہی جاتا ہے' یہ بھی دے دو وہ بھی دے دو' اس کا بس چلے تو تن کے کپڑے بھی اتار کر لے جائے اور ایک آذر کی سسرال والے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرے بچے کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔"

اماں کو اس کا ڈر تو نہیں پڑا تھا کہ اس کے سامنے ایسی باتیں کرنے سے پرہیز کرتیں۔ وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر آئے گئے کے سامنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی تھیں۔ ان کی اور باتوں پر تو وہ کان ہی نہیں دھرتا تھا مگر یہ عالیہ کے گھر جانے کی بات اس کے دل کو بہت لگتی تھی۔ اس نے بھی کئی بار محسوس کیا تھا کہ وہ جب بھی عالیہ کے ساتھ اس کے میکے جاتا ہے' اس کی سالیاں اس سے منہ چھپائے چھپائے پھرتی ہیں۔ ساس بھی لیے دیئے رہتی ہیں اور اس کے جاتے ہی گھر میں ایک کھچڑی سی پکنی شروع ہوجاتی ہے۔ آج تک کسی نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ عالیہ کو چھوڑ کر جارہے ہو تو خود بھی ایک دو روز ہمارے یہاں رہ جاؤ بلکہ وہاں تو کوئی سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا تھا۔ قسمت سے ایک ہی سالا تھا جو لائلپور کے کسی مل میں چیف اکاؤنٹنٹ لگا ہوا تھا اسے بھی صرف شادی کے موقع پر سرسری طور پر دیکھا تھا کیونکہ اسے کل پانچ دن کی چھٹی ہی مل سکی تھی۔ اور شادی کے تیسرے روز ہی اپنی ملازمت پر واپس چلا گیا تھا عالیہ سے بڑا تھا' یا پھر فطرتاً "نروٹھا تھا" جو رسمیں ادا کرنے کے موقع پر بھی غائب ہی رہا تھا' اور سامنے بھی آیا تھا تو منہ پھلائے خاموش بیٹھا رہا تھا آذر نے تو شادی کے ہنگامے کی وجہ سے اچھی طرح اسے دیکھا بھی نہ تھا۔ لیکن آذر کے دل میں تو ایں سے ملنے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ واقعی

عجیب لوگ تھے عالیہ کے میکے والے بھی، آذر کی تو سمجھ میں ہی نہ آئے تھے اور بقول اماں کے وہ تو اپنے سگوں سے بھی نہیں ملتے تھے تو آذر کو بھلا کیا گھاس ڈالتے اور اماں کو جہاں کنبے داری نبھانے میں کمال حاصل تھا، وہاں وہ ڈپلومیسی برتنے میں بھی بہت ماہر تھیں اور جوڑ توڑ کرنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں، اور ہمیشہ ہی بڑی خوبصورتی سے اس کے کان بھرتی رہتی تھیں۔

"اے بس اب ان لوگوں کو زیادہ منہ نہ لگاؤ، عالیہ کی ایسی ہی پسلی پھڑکتی ہے، تو وہ خود ہو آیا کرے گی اپنے میکے۔ تم کوئی اس کے زر خرید ہو جو دم چھلا بنے اس کے ساتھ جاتے ہو، سسرال والوں سے دور رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے غرضیکہ اماں اسے ساری اونچ نیچ اور مصلحتوں سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔

اصل میں اماں کو شروع ہی سے اپنی اولاد کی زندگی میں بڑا دخل تھا، ابا تو ویسے بھی مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ بہت کم گو اور سادہ لوح اور جب سے معذور ہو کر بستر سے لگے تھے انہیں بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ مگر اماں تو ہمیشہ ہی سے ان پر حاوی تھیں گھر کے سارے معاملات بھی اماں ہی کی مرضی اور حکم سے طے پاتے تھے۔

مگر اماں خواہ کچھ بھی کہتیں یا عالیہ کے میکے والے اس سے کیسا بھی سلوک روا رکھتے، اسے تو صرف عالیہ سے غرض تھی۔ اور چونکہ عالیہ کے ساتھ اماں کا رویہ بھی اس سے مخفی نہ تھا جو عالیہ کے ہر کام میں عیب نکالتی تھیں۔ ہر بات پر نکتہ چینی کرتی تھیں۔ اور پھر اماں کی زبان تو شاید نیم اور کریلے کے مرکب سے بنائی گئی تھی، جس سے عالیہ کے لیے زہر ہی ٹپکتا تھا وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ عالیہ کی والدہ نے اماں کی مرضی اور مانگ پوری نہیں کی تھی اور اماں کو اس بات پر سخت پچھتاوا تھا کہ بقول ان کے کن فتنوں میں پھنس گئی تھیں۔ سخت دھوکا ہوا تھا ان کے ساتھ ورنہ آذر کے لیے ایک سے ایک رئیس گھرانے کی لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ اماں ہمیشہ اس کے سامنے یہی دکھڑا لے کر بیٹھ جایا کرتی تھیں اور وہ چپ چاپ ان کی خرافات سنتا رہتا تھا اور کبھی بہت ہی تنگ آجاتا تو جل کر کہتا۔

"ہاں! آپ کسی طرح عالیہ کا پیچھا بھی چھوڑیں گی، میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی رئیس گھرانے کی لڑکی کبھی آجاتی تو آپ کی ان باتوں سے ایک دن بھی میرے ساتھ نباہ نہ کرتی۔" اور اس بات پر تو اماں کی وہی شکل ہو جاتی کہ آئیں تو جائیں کہاں، بس وہ بے نقط سنائیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

اسی روز روز کی چخ چخ کی وجہ سے ہی تو اس نے نچلی منزل میں رہائش اختیار کی تھی جب کہ رہائشی کمرے بالائی منزل پر تھے اور شادی سے پہلے وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ نچلی منزل میں تو ڈرائنگ ڈائننگ کچن چینزی لاؤنج وغیرہ کے علاوہ بس ایک ہی کمرہ تھا جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور جس سے ملحق ایک پارلر بھی تھا اور اماں کی شدید مخالفت کے باوجود اس نے گیسٹ روم کو ہی اپنے بالائی کمرے پر ترجیح دی تھی لیکن نیچے گیسٹ روم میں رہائش اختیار کرنے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ عالیہ اوپر جا کر جھانکتی ہی نہیں۔ صالحہ تو زیادہ تر اپنے شوہر کے پاس بہاولپور ہی رہتی تھی۔ بس سال میں ایک دو مرتبہ چند روز قیام کی غرض سے ہی میکے آتی تھی اور صائمہ اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔ سارے کام عالیہ کو ہی انجام دینے پڑتے تھے یوں تو گھر میں تین ملازم بھی موجود تھے ایک خانساماں، ایک لڑکا جو اوپر کے کاموں پر مامور تھا اور ایک چوکیدار، مگر اماں سالن وغیرہ عالیہ سے ہی پکواتی تھیں۔ اس پر گھر کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال مہمانوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارت، دھوبی کو کپڑے لینے اور دینے حتیٰ کہ صائمہ اور اعظم کے چھوٹے موٹے کام بھی عالیہ ہی کے ذمے تھے۔

عالیہ کی جان ناتواں پر اماں نے جو کام ڈالے تھے، وہ آذر کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور اسی بات پر کئی بار اماں سے بڑی لے دے ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ تو عالیہ کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

اسی طرح روز روز کے جھگڑوں، قضیوں میں دقیق بڑی

بھی سے گزرتا رہا۔ عالیہ نے تو خیر اپنا مقدر سمجھ کر شروع ہی سے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا ویسے بھی اسے یہ اطمینان تو تھا کہ اس کا شوہر اس کا اپنا ہے' وہ اس کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے اور اس پر جان چھڑکتا ہے اور بس یہی عالیہ کو چاہئے بھی تھا' مگر اماں نے بھی کسی حد تک حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

وہ اب زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھیں آذر بھی مطمئن ہو گیا تھا کہ چلو اماں نے کسی طرح عالیہ کو گھر کا ایک فرد تو تسلیم کر لیا ویسے بھی اس کی شادی کو دو ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا تھا کہ اسی دوران اماں کو بیٹھے بٹھائے گھر کی بے رونقی کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا تھا۔

"اے شادی کو تین برس ہونے کو آئے مگر عالیہ نے اب تک چوہے کا ایک بچہ بھی نہ جنا' جانے کیا بات ہے' کسی ڈاکٹرنی واکٹرنی کو تو دکھاؤ' تاکہ پتا چلے کہ عالیہ میں بچہ جننے کی صلاحیت بھی ہے؟"

اماں دبی دبی زبان میں آذر سے کہتیں۔ اماں کے ہاتھ کوئی موضوع آجانا تو شرط تھا۔ پھر تو وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے ہی پڑ جاتی تھیں۔

شروع شروع میں تو دبے دبے لفظوں میں آذر کے سامنے یہ موضوع لے کر بیٹھ جایا کرتی تھیں مگر جب انہوں نے دیکھا کہ بیٹے کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تو انہوں نے علی الاعلان ہی کہنا شروع کر دیا۔

"میری صالحہ کے تو خیر سے پانچ برس میں دو بچے ہو گئے اور تمہارے یہاں ابھی دور دور تک بچے کے آثار نظر نہیں آتے۔

اصل میں بچوں کے دم سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے اسی وجہ سے صالحہ چلی جاتی ہے تو یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے یوں بھی بیٹی کی اولاد پرائی ہوتی ہے۔ اسی لئے تو بیٹے کی اولاد پر دادی دادا کا بہت حق ہوتا ہے۔"

اس روز وہ اوپر اماں کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا' عالیہ بھی وہیں موجود تھی' اماں نے اس کی پروا کئے بغیر پھر زہریلے تیر چلانے شروع کر دیئے۔

"اے بچے! میں کہتی ہوں کہ آخر تو کب اسے ڈاکٹرنی کو دکھائے گا' میرا تو کہتے کہتے منہ خشک ہو گیا مگر تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور یہ کوئی ایسی بری بات تو نہیں کم از کم ہمارا اطمینان ہی ہو جائے گا۔"

اماں خاص طور پر اسے مخاطب کر کے بولے ہی چلی گئیں تو چائے کی پیالی تپائی پر پٹخ کر نیچے چلا آیا۔ اماں کی فضول سی باتوں پر اسے جھنجلاہٹ بھی ہو رہی تھی کیونکہ انہوں نے جس موضوع کو ٹارگٹ بنایا تھا۔

اس نے آذر کو ایک الجھن میں گرفتار بھی کر دیا تھا اولاد کی خواہش کسے نہیں ہوتی مگر اسے تو کبھی احساس تک نہ ہوا تھا۔ وہ تو اماں نے ہی احساس دلایا تھا گو وہ الجھ ضرور گیا تھا پھر بھی اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ نیچے اپنے کمرے میں آکر کچھ دیر وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ اماں نے صرف ہماری ازدواجی زندگی کا

سکون درہم برہم کرنے کے لئے یہ نیا شوشا چھوڑا ہے ورنہ بعض عورتوں کے یہاں دیر میں بھی بچے پیدا ہوتے ہیں اور جب اسے عالیہ کے ساتھ یکجا ہو کر بیٹھنے کا موقع ملا تو اس نے ہنس کر کہا۔

"لو بھئی اب اپنی خیر مناؤ، تمہیں جلانے اور کلسانے کے لئے اماں کے ہاتھ ایک نیا موضوع آگیا ہے۔"

"خیر نیا تو نہیں کافی پرانا موضوع ہے مگر اماں کچھ غلط تو نہیں کہتیں عالیہ کے لہجے میں افسردگی شامل تھی۔

"یعنی کیا... کیا تمہارے خیال میں وہ سچ کہتی ہیں کہ تم ماں بننے کے قابل نہیں ہو۔"

اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"ہوسکتا ہے سچ ہی کہتی ہوں۔" عالیہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولی۔

"لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ سچ ہی کہتی ہیں، کیا وہ کوئی غیب کا علم جانتی ہیں۔ انہیں تو صرف تمہارے اور میرے درمیان کھنڈت ڈالنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ہی چاہیے۔"

عالیہ کے بجھے بجھے لہجے پر آسے دکھ سا ہوا تو اس نے نرمی سے کہا، عالیہ نے قدرے توقف کے بعد کچھ سوچ کر کہا۔

"لیکن آذر! اگر میڈیکل چیک اپ کرانے کے بعد اماں کا خیال درست نکلا تو پھر کیا ہوگا؟..." عالیہ کے لہجے میں گہری یاسیت تھی۔

"ہاں میں۔" وہ جل بھن کر رہ گیا۔

"پھر وہی ہوگا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے یعنی اماں مجھ سے دوسری شادی کے لئے مطالبہ شروع کردیں گی۔"

اور عالیہ کا چہرہ اتر گیا۔

"اچھا تو کیا آپ ان کی بات مان لیں گے۔" عالیہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں اس کے سوا چارہ ہی کیا ہوگا۔"

"یعنی دوسری شادی کرلیں گے۔" عالیہ کو جیسے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"بالکل کر ہی لیں گے۔ تم تو ماں بننے کے قابل ہی نہ ہوگی اور پھر اولاد کی تمنا کیسے نہیں ہوتی، ویسے بھی اماں کی تو یہ سب سے بڑی آرزو ہے کہ وہ میری اولاد کو......"

اور ابھی وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ٹپ ٹپ عالیہ کی خوبصورت آنکھوں سے برکھا رت ہونے لگی اور آذر کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے فوراً ہی اسے سینے سے لگالیا

"پگلی۔ تمہیں کم از کم میری فطرت سے تو واقف ہونا چاہیے میں تو تمہاری احمقانہ باتوں پر جل کر تم سے مذاق کررہا تھا ورنہ عالیہ کے سوا کون مائی کا لال ہے جو اس دل میں گھر کرنے کی جرات بھی کرسکے اور میں کوئی اماں کے ہاتھ کی ڈگڈگی تو نہیں ہوں کہ وہ جس طرف مجھے گھمائیں گی میں گھوم جاؤں گا، اول تو انہوں نے اب تک اشارۃً بھی کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا دوسرے اگر وہ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی کہیں گی تو ان کی طبیعت بھی ٹھیک کردوں گا۔"

وہ اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش میں بڑے پیار سے ہنس ہنس کر کہتا رہا۔

مگر عالیہ کی آنکھوں سے تو بادل سے اٹھ رہے تھے شاید وہ دل پر چھایا غبار اسی بہانے نکال رہی تھی۔ وہ پھر اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔

"اماں خواہ کچھ بھی کہیں، مجھے تو اولاد کی ذرا سی خواہش نہیں مجھے تو بس زندگی کے ہر لمحے اور ہر کام پر تمہاری رفاقت درکار ہے اور کیا تم یہ بھول گئیں کہ ہم نے سینکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں خدا کے سامنے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا اور پھر ہم تو تمہارے شیدائی ہیں۔ تم پر پروانہ وار نثار۔"

"کاش آپ کے یہ دعوے سچ ہی ثابت ہوں ورنہ مردوں کی زبان تو صرف ان کی مرضی اور خواہشات کی تابع ہوتی ہے۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔" عالیہ بڑی دیر تک روتے رہنے کے بعد اپنے آنسو خشک کرکے بولی۔

"اچھا تو تمہیں مردوں کی فطرت کا بڑا تجربہ ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"مم... مجھے نہیں... نہیں زیادہ تجربہ تو نہیں ہے۔" عالیہ نے سٹپٹا کر کہا۔

"مگر تھوڑا بہت ہے ضرور۔" اس نے شوخ سی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"نہیں تھوڑا بہت بھی نہیں ہے' البتہ تھوڑا سا مشاہدہ ضرور کیا ہے۔" عالیہ اس کی بات پر گڑبڑا سی گئی۔

"چلو مشاہدہ ہی سہی مگر کیونکر کیا ہے ذرا یہ تو بتایئے۔" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بس... کر ہی لیا' اصل میں قصے کہانیوں کے ذریعے میں نے کچھ ایسا ہی اندازہ لگایا ہے۔" عالیہ نے موڑ توڑ کر جواب دیا اس کے انداز سے گھبراہٹ متشرح تھی۔

مگر وہ تو اس وقت مذاق کے موڈ میں تھا' الٹے سیدھے سوالات کرکے اس کی گھبراہٹ سے حظ اٹھا رہا تھا' اس لئے اس نے کچھ خیال ہی نہ کیا۔

"اوہو تو ابھی تک آپ قصے اور کہانیوں کے پھیر سے نہیں نکلیں' تب ہی تو ہر وقت خواب اور خیالوں کی دنیا میں کھوئی رہتی ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بلکہ جب سے ایک پری زاد سے واسطہ پڑا ہے جاگتے ہی میں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔" عالیہ نے اس کی طرف دیکھ کر شوخی سے کہا یا پھر بات ہی گھما دی۔

"اوہو، تھو! ابھی اماں سے جا کر کہتا ہوں کہ عالیہ آپ کو ناری مخلوق سمجھتی ہے... ویسے ایک بات بتاؤں اماں بھی وضو کے لئے پائنچے اونچے کرکے پیر دھوئیں تو ذرا غور سے دیکھنا کہیں ان کی پنڈلیوں پر ریچھ کی طرح لمبے لمبے بال تو نہیں ہیں' سنا ہے پریوں یا پری زادوں کی شناخت اسی طرح ہوتی ہے اور اماں تو اس بڑھاپے میں بھی ماشاء اللہ چندے آفتاب ہیں۔" اس نے کہا تو عالیہ ہنستی ہوئی بولی۔

"ہاں اماں ضرور ہیں مگر آپ تو اتنے خوبصورت نہیں ہیں۔"

"ارے ہم... ہمارا کیا پوچھتی ہو' ہم تو جدھر سے بھی گزر جاتے ہیں ایک قتل عام ہی ہو جاتا ہے ادھر سے۔"

"جی ہاں جیسے کہ بڑے ہی تو خوبصورت ہیں آپ۔" عالیہ اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

"کیوں کیا ہم تمہیں اچھے نہیں لگتے۔" اس نے روکھا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"اونہوں بالکل نہیں عالیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا اور جواب میں وہ غور سے عالیہ کی صورت دیکھنے لگا۔

"ارے یہ تو بتاؤ یار! کیا تمہارا بھی کوئی آئیڈیل تھا؟" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا اور عالیہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

"یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا خیال آ گیا۔" اس نے قدرے ترش سے لہجے میں کہا۔

"ارے بھئی ویسے ہی پوچھ لیا' سنا ہے لڑکیوں کو آئیڈیل بنانے کا خبط ہوتا ہے۔" اس نے اپنی بات کو غیر اہم ثابت کرتے ہوئے کہا۔

"خبط جنہیں ہوتا ہوگا انہیں ہوتا ہوگا۔ میں نے تو کبھی ایسی حماقت کی ہی نہیں۔" وہ یوں بولی جیسے اسے بہت ناگوار گزرا ہو۔

"میں نے تو انٹر ہی کیا تھا کہ میری شادی ہو گئی اور اگر آئیڈیل کا ہی سوال ہے تو ایک بیوی کے لئے تو اس کا شوہر ہی کسی آئیڈیل سے کم نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ اس کی توقعات پر پورا اترے۔"

"جیسے کہ میں۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

اور عالیہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر چہرہ جھکا کر بولی۔

"ہوں۔"

اور وہ اس کی ہوں پر ہی خوش ہو گیا کیونکہ اس وقت تو اس پر عالیہ کی محبت کا رنگ چڑھا ہوا تھا اس نے بالکل محسوس ہی نہیں کیا تھا مگر اب

اب تو معمولی سے معمولی بات بھی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اماں نے اس کا رنگ اور تیور دیکھ کر اب بچے کے معاملے میں خاموشی تو اختیار کر لی تھی مگر اشاروں کنایوں میں کسی نہ کسی بہانے اس کے سامنے یہ ذکر

لے کر ضرور بیٹھ جاتیں۔

اس روز جمعہ کا دن تھا اور چونکہ وہ اعظم کو ساتھ لے کر جمعہ کی نماز ادا کرنے مسجد جاتا تھا' اس لئے تیار ہو کر اس کا انتظار کر رہا تھا ادھر اسے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی جب کہ اماں کا قاعدہ تھا کہ وہ نماز پڑھ کر آنے کے بعد ہی کھانا لگواتی تھیں آزر نے سوچا کہ وہ عالیہ سے کوئی ہلکی پھلکی چیز لے کر کھا لے گا اس لئے وہ پینٹری میں پہنچا تو اماں کو وہیں بیٹھے پایا۔ وہ منڈی سے آئے پھلوں اور ترکاریوں کو دھلوا اور پونچھوا کر ملازم سے فریج میں رکھوا رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"ارے تم دونوں ابھی تک مسجد نہیں گئے۔"

"نہیں اماں! ابھی تو نماز شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں اور اعظم بھی تیار نہیں ہوا۔"

اس نے عالیہ کو تلاش کرنے کی غرض سے نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اے ہاں اس میں تو شیطان سا گیا ہے' خاص طور سے جمعہ کے دن ہی سستی کرتا ہے ویسے بھی آج کل کے بچے تو بس مارے باندھے کو نماز پڑھ لیتے ہیں' وہ بھی میں زبردستی کہہ کہہ کر بھیجتی ہوں ورنہ دل کس کا چاہتا ہے۔" اماں بولیں۔

جواب میں وہ کیا کہتا' بھوک کے مارے تو پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ کاؤنٹر پر رکھی ہوئی ٹرے میں سے ایک کیلا اٹھا کر وہ کھانے لگا۔

مگر اماں تو شروع ہو گئی تھیں اس لئے بولتی ہی گئیں۔

"اے ہاں' وقت کے وقت مسجد میں جا کر جلدی جلدی دو چار ٹکریں مار لیتے ہیں۔ یہ آج کل کے بچے نہ خطبے میں شریک نہ دعا میں۔ دل سے تو کوئی جاتا ہی نہیں نا' ایک ہمارے باوا دادا تھے کہ گیارہ بجے سے ہی تیار ہو کر مسجد میں جا بیٹھتے تھے اور جمعہ کی تیاری بھی ویسے کرتے تھے جیسے دولہا بارات کی کرتا ہے اور ایک یہ ہمارے چھوٹے صاحبزادے ہیں کہ گیارہ بجے تک تو بستر میں ہی پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ اور پھر اٹھتے بھی ہیں تو سو نخروں سے' اتنا بھی نہیں کہ جمعے کا ہی احترام کر لیں۔"

اماں بولیں تو اس نے بھی سوچا' اماں کسی حد تک ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔

"چل فضل دین! یہ تینوں کشتیاں دھو پونچھ کر احتیاط سے الماری میں رکھ دے اور ہاں اوپر بڑے صاحب سے پوچھ کر آ کہ کیا وہ ہریرہ ابھی کھائیں گے۔"

اماں نے اس سے بات کرتے کرتے ملازم کو مخاطب کر کے کہا' عالیہ شاید اس وقت کچن میں تھی۔ آزر بار بار کچن کے دروازے کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھنے لگتا۔ فضل دین کشتیاں لے کر چلا گیا تو اماں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"ایسا کرو ٹیلیفون پر کسی ڈاکٹرنی سے وقت لے لو' پھر تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر عالیہ کو دکھانے لے جانا اے ہاں کچھ تو پتا چلے کہ عالیہ میں خرابی کیا ہے۔"

اماں کے منہ سے بہت غیر متوقع پھر وہی ذکر سن کر وہ ایک دم ہی بگڑ اٹھا۔

"یہ آپ نے آپ ہی آپ کیسے اندازہ لگا لیا کہ عالیہ میں کوئی خرابی ہے۔"

مگر اماں نے اس کے لب و لہجے کا ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ ایک سرد سی آہ بھر کر بولیں۔

"یہ خرابی نہیں ہے تو اور کیا ہے بیٹے کہ اب تک عالیہ کی کوکھ ہری نہیں ہوئی ورنہ ادھر لڑکی کی شادی ہوتی اور ادھر دوسرے ہی برس بچہ ہوا۔ اے تم کیا جانو بیٹے' بچے کے بغیر یہ گھر مجھے کیسا سونا سونا لگتا ہے۔"

"اگر عالیہ کی وجہ سے آپ کو یہ سارے احساسات ہوتے ہیں اماں تو آپ فکر نہ کریں' اس کا بھی جلد ہی انتظام ہو جائے گا۔" وہ تڑخ کر بولا۔

"اے کیسا انتظام یہ تو ذرا سی بات میں پھلکی کی طرح ناچنے کیوں لگتا ہے۔"

"آپ باتیں ہی ایسی کرتی ہیں اماں' بہرحال میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں بھی اب اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر لوں گا' پھر تو یقیناً آپ کو ان فکروں سے نجات مل جائے گی۔"

اس نے تیز و تند لہجے میں کہا اور اسی وقت پینٹری سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر عالیہ پر پڑی جو

دیوار سے لگی اس کی اور اماں کی گفتگو سن رہی تھی اور اسے دیکھ کر گھبرا بھی گئی تھی مگر اس وقت تو اس پر سخت جھنجلاہٹ سوار تھی۔ اس نے اعظم کو بھی ساتھ نہ لیا اور تیزی سے مسجد کا رخ کیا۔ مارے غصے کے اس سے ڈھنگ سے نماز بھی ادا نہ ہو سکی‘ یہ خیال اسے نماز میں بھی پریشان کرتا رہا کہ عالیہ نے بھی اماں کی گفتگو سن لی ہے اسے معلوم تھا کہ اماں نے کس وجہ سے اس موضوع کو اپنا ٹارگٹ بنایا ہے یعنی وہ عالیہ پر سوکن لانے کے منصوبے باندھ رہی ہیں اور ان ہی ساری باتوں کے پیش نظر اس نے واقعی بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہی فیصلہ کرلیا تھا کہ عالیہ کو لے کر کسی اچھے سے مکان میں منتقل ہو جائے گا۔

——*

اماں بیٹے کی دھمکی سے خائف ہو گئی تھیں یا پھر کوئی اور چکر چلانے کی فکر میں تھیں جو انہوں نے اس روز کے بعد سے چپ سادھ لی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی آذر برابر کسی اچھے مکان کی جستجو میں لگا ہوا تھا‘ مگر انہی دنوں کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اماں کو اچانک صالحہ کے پاس بہاولپور جانا پڑا۔ اصل میں صالحہ پر امید سے تھی اور کسی بداحتیاطی کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھی۔ اماں اعظم کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ صرف صائمہ ہی باپ کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر رہ گئی تھی۔ ادھر اب تک آذر کو اپنے مطلب کا کوئی مکان ہی نہیں ملا تھا‘ اس لیے مکان کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا اور اماں کے جانے کے چند روز بعد ہی عالیہ کو وہ عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے تھے جن کو شروع شروع میں آذر نے کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی‘ مگر اب۔ اب تو اس نے خود اپنے کانوں سے وہ آواز سنی تھی‘ جو عالیہ کی تو ہرگز نہ تھی گو عالیہ نے اس کے ہر الزام کی سختی سے تردید کی تھی اور اس کے سختی برتنے پر بھی اس نے کسی طرح قبول کر کے ہی نہ دیا تھا مگر اب وہ عالیہ کی کسی عذر معذرت کو ماننے پر بالکل تیار نہ تھا اور انہی واقعات کی روشنی میں تمام پچھلے واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ اپنی اتنی بے اندازہ اور شدید چاہت کے جواب میں عالیہ کا اپرایا اپرایا اور کترایا کترایا سا رویہ‘ کھویا کھویا سا انداز افسردگی اور فکر مندی‘ جسے اب تک وہ اماں کی بدسلوکی کا سبب گردانتا رہا تھا اب حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آ رہی تھیں آج کل تو اماں اور اعظم کے جانے کی وجہ سے گھر میں بالکل سناٹا رہتا ہے ابا کی وجہ سے صائمہ بھی نیچے نہیں اترتی اور دن میں تو وہ کالج جاتی ہے پھر تو عالیہ کو اور بھی گل کھلانے کا موقع ملا ہوگا مگر کیا واقعی عالیہ ایسی ہے ایسی فریبی اور بدکردار۔ اور پھر اس کی نظروں میں عالیہ کی بھولی بھالی شکل گھوم گئی تو ایک اضطرابی سی کیفیت میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آتش دان کے آگے ہی ٹہلنے لگا۔

لیکن عالیہ بظاہر تو ایسی نہیں لگتی۔ وہ کس قدر بے چین اور جز بز سی ہو رہی تھی جب میں اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ وہ کون تھا تو وہ کتنی عاجزی اور بے چارگی سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں نے بالکل غلط سنا ہے جو کچھ سنا ہے وہ میرا وہم ہے ہو سکتا ہے یہی بات ہو کیونکہ اس کے لہجے میں ریا اور مکاری نام کو نہیں تھی اور وہ زچ ہو کر رونے بھی تو لگی تھی۔ اگر جھوٹی اور مکار ہوتی تو پھر یوں بلک بلک کر کیوں روتی۔ اس پر بھی میں اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں اگر واقعی وہ بے قصور ہے تو میں نے خوانخواہ اس پر ظلم توڑا۔

اس کی شدید چاہت نے ایک دم ہی اس کی بدگمانیوں پر چھینٹا مارا تو وہ تیزی سے اپنی خوابگاہ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک جھٹکے سے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تو سامنے ہی مسہری پر عالیہ کو سوتے ہوئے پایا۔ وہ دبے قدموں سے اس کے قریب آیا اور تھوڑا سا جھک کر اسے دیکھا وہی معصومیت وہی دلربائی سوتی ہوئی عالیہ کے حسین تر چہرے سے ہویدا تھی جس کا وہ شیدائی تھا۔ وہ سوتے میں بھی ہلکے ہلکے سسکیاں لے رہی تھی۔ نیند سے جڑی گھنیری پلکوں میں ننھے ننھے قطرے اب بھی چمک رہے تھے‘ ناک گریہ وزاری کی وجہ سے تھوڑی سی سرخ ہو رہی تھی اور ملیح رخساروں پر اشکوں کے نشان لکیریں سی کھینچ رہے تھے وہ عالیہ سے اس معاملے میں مزید کچھ کہہ کر

اس کے احساسات مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا' وہ سو گئی ہے تو اس وقت اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ سوتی رہے اس نے دل میں سوچا اور اس کے بے آرام ہو جانے کے خیال سے وہ رات اس نے کوچ پر لیٹ کر گزاری۔

دونوں کے درمیان ایک کھچ سی قائم ہو گئی تھی یا کیا بات تھی' تین روز گزر گئے تھے نہ اس نے عالیہ سے کوئی بات کی تھی اور نہ عالیہ نے ہی اس سے اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنا ہی گوارا کیا تھا جب کہ وہ اس سے اسی بات کا متمنی تھا کہ وہ اپنے بارے میں مزید کچھ کہے تاکہ اس کی بدگمانی کی تردید ہو سکے کیونکہ وہ اپنی بدگمانی اور زیادتی پر سخت متاسف تھا۔ عالیہ کے خاموش اور لاتعلق سے رویے سے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ واقعی بالکل بے قصور ہے۔ ورنہ اگر خطاوار ہوتی تو ضرور اس کے سامنے جھک جاتی۔ مگر وہ تو میری موجودگی میں کمرے میں بھی کم آتی ہے' اور جب میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتا ہوں تو وہ چپکے سے آ کر کوچ پر لیٹ جاتی ہے وہ اب مزید عالیہ کی بے رخی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

چوتھے روز وہ آفس سے آیا تو ایسے چپکے سے آ کر خوابگاہ میں بیٹھ گیا کہ کسی کو پتا تک نہ چلا' ویسے بھی وہ وقت سے کچھ پہلے ہی آ گیا تھا اور عالیہ اس وقت گھر کے کاموں میں مصروف تھی' کچھ ہی دیر بعد وہ کسی کام سے خوابگاہ میں آئی تو اسے بیٹھا دیکھ کر دروازے کے آگے ہی ٹھٹھک گئی اور پھر پلٹ کر باہر جا ہی رہی تھی کہ اس نے جھپٹ کر اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

"تمہارے چنگل سے بچ نکلنا آسان نہیں جانم' مگر یہ تمہارے منہ میں کیا بھرا ہوا ہے' جو پھول کر غبارہ ہو رہا ہے۔"

وہ گزشتہ تلخیوں کو بھلا دینا چاہتا تھا اس لیے اس نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو' مگر عالیہ بدستور منہ پھلائے کھڑی تھی۔

"دیکھو بھئی' یہ سخت زیادتی ہے۔ ہم تو صرف تمہاری وجہ سے جلد جلد کام نمٹا کر وہاں سے بھاگے ہیں اور تم ہو کہ ہمیں بور کرنے پر تلی ہوئی ہو۔"

اس پر بھی عالیہ نے اپنی طرف سے کوئی ردعمل نہیں دکھایا۔ کسی ساکت اور بے جان شے کی طرح اس کی بانہوں میں گھری کھڑی رہی۔

"اچھا بھئی ٹھیک ہے' تو پھر تم جاؤ جہاں جا رہی تھیں۔ ہم بھی باہر جا کر تھوڑی سی آوارہ گردی کریں گے۔ سخت حماقت ہی کی جو جلدی چلے آئے۔"

اس نے اپنی بانہوں کا حصار توڑ کر برا مان جانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تو عالیہ نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اپنی ساری ایکٹنگ بھول گیا مگر جلد ہی سنبھل کر بولا۔

"جو کچھ ہوا ہے اس پر مجھے بہت افسوس ہے عالیہ اگر تم سے ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔"

اس کے ندامت بھرے لہجے میں تاسف بھی شامل تھا عالیہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بڑے تلخ و ترش لہجے میں بولی۔

"نہیں نہیں آذر! میری بھلا کیا حیثیت اور کیا اوقات' جو آپ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں' وہ بھی ایک فریبی اور بدچلن لڑکی سے جو آپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آپ ہی کے گھر میں آپ ہی کی خوابگاہ میں غیر مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔"

اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر عالیہ رونے لگی۔

اور وہ تڑپ اٹھا عالیہ کو سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے اس نے نادم سے لہجے میں کہا۔

"مجھ سے واقعی بڑی سخت زیادتی ہو گئی ہے لیکن تمہیں بھی اختیار ہے' جو سزا چاہو مجھے دے سکتی ہو' میرے یہ ہاتھ جلا دو جنہوں نے تمہارے نازک سے بدن کو جھنجوڑا تھا۔ میری اس زبان پر انگارے رکھ دو جس نے تم پر جھوٹی تہمت لگائی تھی میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اف تک نہ کروں گا۔"

لیکن عالیہ بدستور روتی رہی۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ کچن میں چلو' میں خود تمہارے سامنے اپنے یہ گناہ آلود ہاتھ جلاؤں گا۔"

اس کا منہ پر رکھا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا بولا تو عالیہ نے گھبرا کر جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔

"اچھا آپ میرا ہاتھ تو چھوڑیے۔ میرا دل آپ کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا ہے' یہ یہ تو صرف تاسف کے آنسو ہیں۔" عالیہ نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"کاش آپ نے مجھ پر تھوڑا سا ہی اعتماد کر لیا ہوتا آذر! مگر آپ نے تو ایک ذرا سی غلط فہمی میں الٹا میرے ہی دل کے آبگینوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیا۔"

"او پلیز عالیہ! ایسی تکلیف دہ باتیں تو نہ کرو کہ میں خود اپنے آپ ہی سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔" وہ عالیہ کی دل گرفتہ باتوں پر تڑپ کر بڑی عاجزی سے بولا۔

"یہ تکلیف دہ باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اعتماد کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ آذر ڈرتی ہوں کہ اگر آئندہ بھی آپ کو کچھ ایسی ہی غلط فہمی ہو گئی تو۔۔۔"

"نہیں نہیں' اب کبھی ایسا نہ ہو گا' تم اطمینان رکھو۔" وہ عالیہ کی بات قطع کر کے بولا۔

"میں تو آپ پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئی تھی آذر! مگر آپ نے میرے احساسات اور جذبات کو اتنی شدید ٹھیس پہنچائی ہے کہ آپ کی بات پر یقین کرنے کی کوشش بھی کروں تو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مرد تو مختار کل' برتر اور عالی ظرف ہوتا ہے آذر! پھر وہ اس قدر کوتاہ نظر کیوں ہو جاتا ہے کہ ذرا سے شبہے میں اپنی ہنستی مسکراتی زندگی کو خزاں کے حوالے کر دیتا ہے اور آپ کو تو اپنی محبت پر بڑا ناز تھا بہت دعوے تھا اور آپ ہی ایک بے بنیاد بات پر مجھ پر شک کر بیٹھے۔"

آنکھوں کی راہ دل کا غبار نکالتے نکالتے اب عالیہ زبان سے بھی دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"اوہ بھئی اب کہاں تک چرکے لگاؤ گی اس دل ناتواں پر تمہارے دل میں اب اتنی بھی گنجائش نہیں رہی کہ میری ایک ذرا سی خطا کو معاف کر دو۔" وہ عالیہ کی باتوں سے بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا اس نے پھر عالیہ کو مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

"اچھا تو دوستی۔" اس نے جلدی سے دو انگلیاں عالیہ کے سامنے نچاتے ہوئے کہا تو عالیہ نے ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی دونوں انگلیاں اس کی انگلیوں سے ملائیں اور پھر ہنستے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"دوستی تو ہو گئی مگر پھر بھی آپ سے ڈر ہی لگتا ہے کہ کہیں پھر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تو شاید میری کھال ہی اتروا دیں گے۔"

اور آذر نے بڑی شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو عالیہ نے جلدی سے بات پلٹ کر پوچھا۔

"آپ کے لئے چائے لاؤں یا کافی۔"

"نہ چائے نہ کافی بس تم میرے سامنے بیٹھی رہو میں تو آج تمہاری دید سے اپنا پیٹ بھروں گا بہتر گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں تم سے بچھڑے ہوئے۔"

"مگر وہ ابا میاں کی یخنی بھی تو تیار کرنی ہے مجھے" عالیہ نہ جانے کیوں اس سے کترا رہی تھی۔

"ہائیں کیا کہا کیا آج غصے میں ابا میاں کی یخنی ہی بنا ڈالی سچ مچ یہ تو بڑا برا ہوا۔"

اور عالیہ جواب میں بڑے اوپری سے انداز میں مسکرائی۔

"خیر کسی کی یخنی بنائی ہو یا قیمہ میں تمہیں اب کہیں نہ جانے دوں گا ٹھہرو میں صائمہ سے کہہ دوں گا وہ آخر کس مرض کی دوا ہے۔" وہ اسے بستر پر بٹھا کر باہر جانے لگا تو عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"آپ صائمہ سے کچھ نہ کہیں بس ایک منٹ کا کام ہے میں آپ کے لئے چائے بھی لے آؤں گی۔" اور پھر عالیہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے مگر تیسرا منٹ نہ ہونے پائے ورنہ میں وہیں سے تمہیں پکڑ لاؤں گا۔" اس نے کمرے سے باہر نکلتی عالیہ کو وارننگ سی دی۔

دونوں میں صلح ہو گئی تھی صفائی نے دل میں بھری کدورتوں کو بھی کاٹ دیا تھا مگر وہ برابر محسوس کر رہا تھا کہ اس ناخوشگوار واقعے کے بعد سے عالیہ اس سے کھنچی کھنچی سی رہتی ہے اور اگر کھنچی کھنچی سی ہی

رہتی تو وہ یہی سمجھتا کہ اس کے دل پر اب تک اس تلخ واقعے کا اثر غالب ہے۔ مگر عالیہ تو کچھ بجھ کر بھی رہ گئی تھی ہر دم سوگوار سی رہتی تھی یوں جیسے کسی کا غم کر رہی ہو۔ یہ بات اس نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی۔ چونکہ اس کے خیال میں سوائے اس تلخ واقعے کے کوئی دوسرا سبب ہی نہیں ہو سکتا تھا' اس لئے عالیہ سے اس نے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

--*

اماں گئی تھیں ایک دو ہفتے قیام کے ارادے سے مگر وہاں صالحہ کی بیماری نے کچھ طول کھینچ لیا تھا۔ اماں وہیں کی ہو کر رہ گئی تھیں البتہ اعظم کو انہوں نے واپس بھیج دیا تھا کیونکہ ایک تو وہ اپنے والد کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھا اور دوسرے پڑھ بھی رہا تھا۔

صائمہ کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ اور اماں نے اسے بھی اپنے پاس بلایا تھا اور ان دنوں صائمہ اماں کے پاس بہاولپور جانے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ اس کی روانگی سے دو دن قبل عالیہ نے اپنے میکے جانے کی خواہش ظاہر کی تو تنور نے کہا۔

"تمہیں پہلے خیال نہیں آیا تھا جو اب ایسے موقع پر جانا چاہ رہی ہو' جب کہ صائمہ بہاولپور جانے کو تیار بیٹھی ہے۔ تم ہی بتاؤ اگر تم چلی گئیں تو گھر میں رہ کون جائے گا۔"

"لیکن میں تو صرف دو تین روز کے لئے ہی جا رہی ہوں' کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں۔ یہ کہئے کہ آپ مجھے بھیجنا پسند نہیں کرتے۔" عالیہ برا ماننے کے سے انداز میں بولی۔

"کمال ہے۔ کیا تم میری فطرت سے واقف نہیں ہو جو تمہیں یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں تمہیں وہاں بھیجنا پسند نہیں کرتا۔ بھئی یہ تو وقت اور موقع کی بات ہے۔ پرسوں صائمہ بہاولپور جا رہی ہے اور تم بضد ہو کہ تمہیں میکے جانے دوں۔" وہ جھلاتے ہوئے انداز میں بولا۔

"تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں وہاں نہیں جا سکتی۔" عالیہ نے بڑے طنز سے ہاتھ چلا کر کہا۔

"اچھا یہی سمجھ لو۔" اسے بھی عالیہ کے طنز کرنے اور برا ماننے پر تاؤ آ گیا وہ درشت لہجے میں بولا اور بس اسی بات پر اس کے اور عالیہ کے درمیان ایک تلخی سی پیدا ہو گئی۔ عالیہ نے اس سے منہ پھلا لیا اور اس نے بھی عالیہ کے اتنے بے موقع میکے جانے کے مطالبے کو اس کی بے جا ضد تصور کرتے ہوئے اسے منہ لگانا چھوڑ دیا' وہ خود کو اپنے اس رویے میں حق بجانب سمجھتا تھا' وہ عالیہ کے کتنے مان اور ناز برداریاں کرتا تھا' اسے کتنی شدت سے چاہتا تھا' اور عالیہ تھی کہ اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ معمولی معمولی بات پر بگڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اسی وجہ سے تو اس مرتبہ اس نے عالیہ کی خفگی کو ذرا سی بھی اہمیت نہ دی تھی پھر بھی وہ عالیہ کو ناراض کر کے بڑی بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔

اس روز صائمہ شام کی ٹرین سے بہاولپور جا رہی تھی' تنور کا ان دنوں چونکہ کام بہت بڑھا ہوا تھا اس لئے طے یہ ہوا کہ اسی کی کار میں اعظم صائمہ کو اسٹیشن چھوڑ کر آئے گا' ٹرینیں لیٹ بھی ہو جایا کرتی ہیں نہ معلوم اعظم کو واپسی میں کتنی دیر لگے' ساڑھے آٹھ بجے شب تو ریل کی روانگی ہے۔ کیوں نہ میں گھر چلا جاؤں' عالیہ بالکل تنہا ہو گی اور پھر لاج یاب کا خیال تھا' اصل میں اس کا ایک ہم پیشہ پھر آ رہا تھا' اور ادھر اس روز اس کے پاس کار بھی نہ تھی' اس لئے یہ سب سوچ کر اپنا باقی ماندہ کام اپنے ایک اور ساتھی کے سپرد کر کے وہ بھی گھر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا' اور اپنے اسی ہم پیشہ کی کار میں گھر کا رخ کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

واقعی کبھی کبھی میں بھی عالیہ پر خواہ مخواہ ہی زیادتی کر بیٹھتا ہوں' اماں نے اس کے بار بار میکے جانے پر اعتراض کر کے اور طعنے دے دے کر پہلے ہی اس کا میکے جانا بند کرا دیا تھا۔ کبھی ہفتوں مہینوں میں جاتی بھی ہے بے چاری تو بس کھڑے کھڑے اور اب تو جب سے اماں گئی ہیں۔ کبھی گئی ہی نہیں ہے بے چاری ورنہ دل تو بہت چاہتا ہو گا اپنی ماں بہنوں سے ملنے کو جب کہ رہائش بھی ایک ہی شہر میں ہے' اور اسی وجہ سے وہ

وہاں جانا چاہ رہی ہو گی کہ صائمہ بھی اماں کے پاس جا رہی ہے' نہ معلوم وہ اور اماں کب تک واپس آئیں اور میں نے خوامخواہ اس کی ذرا سی خواہش کو رد کر کے اس کا دل توڑ کر رکھ دیا۔ خیر میں کل ہی تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی اسے اس کی امی اور بہنوں سے ملوانے لے جاؤں گا۔" وہ تمام راستے یہی سوچتا رہا' وہ جو اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کو جلد ہی تسلیم کر لینے کا عادی تھا' وہ عالیہ کی بہت سی خامیوں کے باوجود اسے دل و جان سے چاہتا تھا جب کہ عالیہ کی طرف سے اپنی اتنی شدت چاہت کے جواب میں اسے اتنی گرمجوشی بھی نہیں ملی تھی' جس کا وہ عالیہ سے خواہاں تھا' متمنی تھا۔

کار سے اتر کر اس نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ ہی ہو رہے تھے۔ گویا ابھی اعظم اسٹیشن پر ہی تھا۔ عالیہ اس سے سخت خفا تھی۔ اور یہ اس کی کمزوری تھی' عالیہ اس سے خفا ہو جاتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ زندگی ہی اس سے روٹھ گئی ہو اور آج تو وہ ہر طریقے سے اسے منانے کا تہیہ کر کے آیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہی ہو گی کہ میں اپنے اسی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے وقت آؤں گا اس نے دل میں سوچا اور پھر بڑی لگن اور شوق سے اندر کا رخ کیا۔ اس روز بھی گھر پہ غیر معمولی سناٹا طاری تھا' کچن وغیرہ بھی سب بند پڑا تھا۔ عالیہ کو سرپرائز دینے کی غرض سے وہ چپکے سے بیڈ روم میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بے حد آہستگی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور احتیاط سے اسے دھکیلا تو خلاف دستور دروازہ اندر سے بند پایا' شاید ڈر کی وجہ سے عالیہ کھٹکا لگا کر بیٹھی ہے۔ اس نے ایک لمحے کو دل میں سوچا اور پھر آہستہ سے اپنے مخصوص انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔

اور اسی دم عالیہ کی خوف و دہشت میں ڈوبی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اف یہ کیسے شاید کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔"

"تمہارے کان بج رہے ہوں گے ورنہ میں تو کوئی دستک نہیں سنی۔" وہی مردانہ بھاری آواز آئی تو اسے یوں لگا جیسے چھتیں اور دیواریں اس پر گر رہی ہوں۔ وہ دروازے سے کان لگائے ساکت کھڑا رہ گیا۔

"لیکن میں نے تو سنی ہے' اف آخر آپ یہاں کیوں آ گئے اگر آذر کو معلوم ہو گیا تو پھر۔"

عالیہ ہراس کے عالم میں قدرے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ جب کہ مرد کی آواز بہت نیچی اور بھنچی بھنچی سی تھی' کوشش کے باوجود وہ سن ہی نہ سکا کہ اس نے عالیہ کی بات کا کیا جواب دیا۔

"ہاں مجھے بھی احساس تھا۔ میں خود آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی' مگر کیا کرتی سخت مجبور تھی۔ آذر نے وہاں آنے کی اجازت ہی نہیں دی۔"

"اس لئے تو آج پھر میں اتنا بڑا رسک لے کر۔۔۔" آگے کچھ سنائی ہی نہ دیا۔

"اچھا اچھا' خدا کے لئے آپ جلدی سے یہاں سے چلے جایئے۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی۔" عالیہ کی ملتجیانہ اور خوشامدانہ سی آواز آئی۔

"نہیں نہیں۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے' تمہاری مسرتوں اور سکون کی خاطر تو میں نے اپنی عزت اور جان کی بازی لگائی ہے اچھا آؤ آخری بار میرے گلے سے لگ جاؤ پھر یا قسمت یا نصیب نہ معلوم کبھی ملنا بھی ہو یا۔۔۔"

اور وہ جو اب تک بڑے ضبط و تحمل سے کام لے کر دروازے سے کان لگائے کھڑا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کی شریانوں کے اندر چیختی ہوئی چنگاریاں اس کی غیرت نفس پر' اس کی شرافت اور مردانگی پر آتشی کوڑے بن کر گریں تو اس کے پورے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اس نے توڑ دینے کے سے انداز میں دروازے کو اتنے زور سے دھڑ دھڑایا کہ دیواریں لرز اٹھیں۔

"دروازہ کھولو ورنہ میں اسے توڑ ڈالوں گا۔" اس نے چیخ کر کہا۔

اور ادھر سناٹا چھا گیا مگر وہ برابر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ وہ چاہتا تو دوسرے دروازے سے بھی اندر جا سکتا تھا۔ جو بیرونی سمت کھلتا تھا۔ مگر اس کا تو پورا وجود غصے

سے کھول رہا تھا۔ اسے خیال ہی نہ آیا۔ اور ابھی اس نے دروازے پر مکا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ عالیہ نے اندر سے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔

دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑتی عالیہ چٹخنی کرتے ہی ایک کونے میں دبک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوری قوت سے دروازہ کھولا۔ اور پاگلوں کی طرح اسی دروازے کی طرف بڑھا جو بیرونی سمت کھلتا تھا۔ اس نے لوچ دینے کے سے انداز سے دروازے پر پڑا پردہ اٹھایا تو دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ اور اس دروازے کو چند روز پہلے عالیہ کے خوف زدہ ہو جانے کے خیال سے اس نے خود مقفل کیا تھا اور اب اس دروازے کے سوا اس شخص کے لیے جس نے اس کی بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کر کے اس کی غیرت کو للکارا تھا۔ فرار کی کوئی راہ ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی خواب گاہ میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔

مقفل دروازے نے اسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے مڑ کر خواب گاہ میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر سامنے کونے میں دبکی لرزتی کپکپاتی عالیہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اس پر اس طرح جھپٹا جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے ایسے شکار پر جو عین اس کی گرفت کی زد میں ہو اور پھر اس نے عالیہ کا گریبان پکڑ کر بڑی بے دردی سے اسے جھٹکے دیتے ہوئے پوچھا۔

"بتاؤ اسے کہاں چھپایا ہے۔ تم تو۔" عالیہ اس مرتبہ خود بھی ریت کی دیوار ثابت ہو رہی تھی۔ اب اس کا کوئی عذر، کوئی بہانہ اسے آذر کے غضب سے نہیں بچا سکتا تھا۔

"فاحشہ عورت! بتا وہ تیرا آشنا کہاں ہے؟ تو اب تک میری آنکھوں میں دھول ہی جھونکتی رہی، مگر اب میں تجھے جان سے ہی مار ڈالوں گا۔ بدچلن اور آبرو باختہ عورتوں کو مار ہی دینا چاہیے۔" وہ غصے سے آگ

بگولا ہو کر بولا اور اس کا گلا گھونٹ کر مار ہی دینا چاہتا تھا کہ وہ رکتے ہوئے سانسوں کے ساتھ بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔

"میں مر جانا پسند کروں گی مگر آپ کو یہ راز کبھی نہیں بتاؤں گی۔" اور ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ عین اس کی پشت پر بنا پار کے دروازے کو کوئی زور زور سے کھٹکھٹانے لگا اور آذر کی گرفت نہایت غیر اختیاری طور پر اس کی گردن پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے خون بار نظروں سے ایک لمحے کو عالیہ کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف جس پر زور زور سے دستک ہو رہی تھی۔

"ہوں تو یہاں چھپا رکھا ہے اپنے۔" اس نے ایک بہت غلیظ سا لفظ کہا اور عالیہ کو ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ عالیہ دروازے سے پیٹھ لگا کر تن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"نہیں نہیں۔ آپ اسے نہیں کھول سکتے، جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔"

مگر اس نے ایک جھٹکے سے عالیہ کو دروازے کے آگے سے ہٹا دیا اور چٹخنی کھولنے لگا تو عالیہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"خدا کے لئے آذر! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، ان کی راہ میں حائل نہ ہوئیے۔ نہیں تو ہم سب کی قسمت تاریک ہو جائے گی۔"

مگر اس نے عالیہ کو اٹھا کر پوری قوت سے پٹخ دیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ اسی دم دروازہ کھلا اور جو کوئی بھی دروازے پر نمودار ہوا، اسے دیکھ کر آذر ایک لمحے کو تو چونک ہی گیا پھر اس کی خون بار آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی بھٹی سلگ اٹھی۔

"ہوں تو یہ تم ہو، خود اپنی عزت اور ناموس کے دشمن، بہن کے دلال، ہٹو میرے راستے سے، میں بھی تو دیکھوں تم نے اپنے شکار کو کہاں چھپا رکھا ہے۔"

"تمیز سے بات کر گستاخ! مجھے اپنی بہن کا پاس نہ ہوتا تو تمہاری اس ذلیل گفتگو پر ہی تمہارا جبڑا توڑ کر رکھ دیتا۔" عالیہ کا بڑا اور اکلوتا بھائی مظہر آذر کی اخلاق سوز گفتگو سن کر اپنے آپے میں نہ رہا اور آذر نے بڑھ

کراس کا گریبان پکڑ لیا۔
"تم ذلیل کمینے عورتوں کے دلال ہو۔ تم میں اتنی ہمت ہے کہ میرا جبڑا توڑ دو گے۔ بے غیرت انسان! میں تمہارے سارے دانت تمہارے حلق میں گھسا دوں گا۔"

آذر بھی غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور قریب تھا کہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے کہ فرش پر پڑی کراہتی ہوئی عالیہ تیزی سے گھسٹتی ہوئی ان دونوں کے نزدیک آگئی اور چلا کر بولی۔

"بھائی جان! آپ کو میرے سہاگ کا واسطہ آپ انہیں کچھ نہ کہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں۔ غصے اور لاعلمی میں کہہ رہے ہیں۔ آپ کو امی کی قسم بھائی جان! اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم۔"

اور پھر شدت گریہ سے عالیہ کی آواز بند ہو گئی مظہر نے ایک نظر اپنی روتی اور فریاد کرتی بہن پر ڈالی اور پھر مضبوطی سے پکڑی آذر کی کلائیوں سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ عالیہ بھائی کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مگر خوف و ہراس کی وجہ سے اس کے اشک بھی رک رک کر بہہ رہے تھے۔ آذر پر ابھی تک جنون سوار تھا۔ وہ مظہر کا گریبان پکڑے کھڑا تھا۔ اور اس کی اس حرکت پر عالیہ بڑی ملتجی نظروں سے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"انہیں چھوڑ دیجیے آذر! میں حلفیہ کہتی ہوں کہ ان کے سوا یہاں کوئی بھی نہ تھا۔"

مگر آذر پر اس کی بات کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوا' وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم مجھے مزید دھوکہ نہیں دے سکتیں بدکار عورت' میں تمہارے اس بدمعاش بھائی کو بھی مزہ چکھائے بغیر نہ رہوں گا۔"

اور اپنی اس اہانت پر مظہر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے پوری قوت اور جذب سے آذر کو دھکا دیا تو آذر پیچھے کو ڈول گیا۔ اور تبھی عالیہ ان دونوں کے درمیان میں آگئی۔

"آذر پلیز! صرف ایک بار اور میری بات سن لیجیے۔ آپ کو اماں جان کا قسم' صرف آخری بار میری بات سن لیجیے۔ پھر چاہے آپ میری جان بھی لے لیجیے گا۔"

اور وہ جو سنبھل کر اس کے بھائی پر جھپٹنا ہی چاہتا تھا۔ عالیہ کے بیچ میں آکر کھڑے ہو جانے پر نہ جانے کیوں اپنی جگہ پر ساکت سا رہ گیا خوف و دہشت کی وجہ سے اس سمے عالیہ کے آنسو بھی آپ ہی آپ خشک ہو گئے۔ مگر اس کی فق رنگت' خشک ہونٹ اور کانپتا لرزتا وجود' عالیہ کی یہ ساری کیفیات' دھوکہ' فریب' ریا اور مکاری کی مظہر ہرگز نہ تھیں۔ شاید اسی ایک احساس نے آذر کو اپنے ارادوں سے باز رکھا تھا۔

"ہاں بتا دو آج اسے سب کچھ عالیہ! کوئی بات بھی نہیں چھپانا جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہنا۔" مظہر آذر کے غضبناک سے موڈ میں سکوت پیدا ہو جانے پر یوں بولا جیسے عالیہ کی ہمت بندھا رہا ہو۔

"یہ یہ چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے آتے تھے۔ اس لیے اس لیے کہ ان کا وارنٹ نکلا ہوا تھا۔" اپنی بات بڑے کرب کے ساتھ ہونٹ بھینچ کر عالیہ نے کہی۔ اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کو آذر پر مرکوز کر کے رقت سے بوجھل آواز میں دل کا سارا کرب شامل کر کے بولی۔

"یہ گھر میں بھی نہیں رہ سکتے' وہاں بھی چوری چھپے جاتے ہیں' اسی طرح مجھ سے بھی ملنے آجاتے ہیں۔ حالانکہ میں نے انہیں سختی سے یہاں آنے کی ممانعت کر دی تھی۔ مگر اب یہ کبھی یہاں نہ آئیں گے 'یہ ان سے میری آخری ملاقات ہے آذر۔ کیونکہ یہ کل سعودی عرب روانہ ہو رہے ہیں۔"

"اوہ... تو یہ کہو کہ یہ یہاں سے منہ کالا کر کے کہیں بھاگ رہے ہیں۔ مگر کیا تم سمجھتی ہو میں اتنی آسانی سے اس ضمیر فروش اور خطرناک مجرم کو یہاں سے نکلنے دوں گا۔ میں تو اب اسے پولیس کے حوالے کر کے ہی دم لوں گا۔"

آذر نے عالیہ کی ساری بات نہایت تحمل اور خاموشی سے سنتے رہنے کے بعد بڑے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں آذر! آپ انہیں پولیس کے حوالے

نہ کیجیے۔ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی کے یہاں ڈاکہ ڈالا ہے نہ چوری ہی کی ہے یہ تو گردش ایام میں آ گئے ہیں۔" آذر کی دھمکی پر عالیہ تڑپ کر بولی۔

"نہیں عالیہ! یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اسے کر لینے دو۔ اگر تباہی اور بربادی ہی میرا مقدر بن گئی ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔" مظہر نے بڑے یاس بھرے لہجے میں کہا اور پھر آذر سے بولا۔

"تمہیں اس سلسلے میں زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا البتہ تم سے اگر ہو سکے تو تھانے تک میرے ساتھ چلو۔"

"ابھی نہیں آپ اپنے پیروں کو زحمت کیوں دیتے ہیں وہ لوگ خود ہی آکر آپ کو یہاں سے اٹھالیں گے۔ بس تھوڑا سا انتظار ضرور کرنا پڑے گا۔"

آذر نے بڑے جلے بھنے لہجے میں کہا اور فون کرنے کی غرض سے پارلر میں جانے لگا تو سارا ڈر اور خوف بالائے طاق رکھ کر عالیہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

"میں اپنی جان دے دوں گی آذر اگر آپ کو کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانے دوں گی جو میرے پورے خاندان کی تباہی کا باعث بن جائے۔ میں نے بقول آپ کے اگر دھوکہ ہی دیا ہے تو صرف اپنی مصلحتوں کے تحت اور ایک ماں جائے سے چھپ کر ملنا کوئی ایسا جرم تو نہیں جس کی معافی ہی نہ ہو۔" عالیہ نے بڑی جرات اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہونہہ ماں جایا۔ مجرم اور روسیاہ کہو۔" آذر نے اپنی دانست میں بڑی گہری چوٹ کی۔

"ٹھیک ہے اگر یہ مجرم اور روسیاہ بھی ہیں تو انہیں ایک ایسے جرم کا ارتکاب کرنے پر جو آپ کی نظروں میں ناقابل تلافی ہے۔ آپ کی والدہ اور بہن نے ہی مجبور کیا تھا۔" عالیہ بڑے رنج بھرے لہجے میں بولی۔

"میری ماں کا نام نہ لو ذلیل عورت۔" وہ بپھر کر بولا۔

"کیوں نہ لوں آپ کی ماں کا نام۔ وہی تو اس ساری تباہی کی اصل ذمے دار ہیں۔ انہوں نے ہی تو جہیز میں دینے کے لیے قیمتی اور قسم قسم کی چیزوں کا مطالبہ کر کر کے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے کہ بھائی جان گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ امی کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور بہنوں کا چین و سکون برباد۔"

"منحوس بدذات عورت! اب اگر تم نے اماں کا نام لیا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے بھائی کے ڈراوے میں آکر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"لیجیے یہ میرا منہ حاضر ہے۔ آپ اسے توڑیں یا مسخ کر دیں۔ مگر آج میں وہ سب کہے بغیر نہ رہوں گی جس نے پورے تین سال سے میری زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔" عالیہ نے غصے میں اپنا چہرہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ جانے کیا بات تھی کہ اس نے عالیہ کی اس جرات رندانہ پر کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔ وہی کڑے تیور لیے ہونٹ بھینچے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی شعلوں کی لپک تھی۔

"ہم نے تو اپنی اجلے پوشی قائم رکھنے کے لیے اپنی ظاہری حیثیت ہی بنا رکھی تھی۔ کیونکہ ابا میاں ہماری کمسنی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ انہوں نے جو تھوڑا بہت اثاثہ چھوڑا تھا بس اسی کے سہارے ہم پروان چڑھتے رہے۔ امی جان نے اپنی ساری پونجی بھائی جان کی تعلیم پر لگا دی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔"

ایک جذب اور روانی سے اپنی بات کہتے کہتے عالیہ کے گلے میں دھسک سی ہونے لگی تو اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ مگر غم و یاس کی بدلیاں پھر پلکوں کی سرحدوں پر جمع ہونے لگی تھیں۔ ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود جن سے چند بوندیں رخساروں پر ٹپک گئیں۔

"بھائی جان کو لائلپور کی ایک مل میں چیف اکاؤنٹنٹ کی نوکری ملی تھی۔ تنخواہ کل دس ہزار تھی۔ اور یہ اپنا خرچ رکھ کر باقی ساری تنخواہ امی کو بھیج دیتے تھے۔ اور اس طرح چھ ہزار روپے ماہوار ہمارے بچے دموں کے سر آتے اور دبے پاؤں جاتے تھے مگر ابھی بھائی جان کو ملازمت کرتے چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ

ایک دن آپ کی والدہ اور بہن مجھے دیکھنے آگئیں۔ امی اس وقت میری شادی کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہ تھیں اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ابھی میں نے عالیہ کا جہیز تیار نہیں کیا' اور نہ اس قابل ہوں کہ جلدی شادی کر سکوں۔ لیکن بدقسمتی سے اماں جان اور باجی کو میں اتنی پسند آئی تھی کہ انہوں نے ہمارے دروازے کی مٹی لے لی۔"

"سنو میں ایسی کوئی بکواس سننے کا متحمل نہیں۔ اور تم خواہ اپنے بھائی کی صفائی میں کچھ ہی کہہ دو' میں وہی کروں گا جو میرا فرض ہے۔" وہ عالیہ کے بدقسمتی کہنے پر کھول اٹھا۔

"میں بھی آپ کے ارادوں میں حائل نہیں ہوں گی۔ لیکن کم از کم مجھے بھی تو ایک بار دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دیجیے۔ اماں جان نے مجھ پر کون سا ستم نہیں توڑا۔ اپنی اہانت آمیز گفتگو اور دل آزار باتوں سے میرا دل و جگر چھلنی کر کے رکھ دیا' میرے ہر کام میں عیب نکالے' میری ذرا ذرا سی بات پر نکتہ چینی کی۔ مجھے میری غریبی کے طعنے دیے حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا کہ اب خواہ آذر اسے ڈاکٹر کو دکھائے یا نہ دکھائے میں تو اپنے بچے کی دوسری شادی کر دوں گی۔ لیکن کیا میں آپ کے سامنے کبھی حرف شکایت زبان پر لائی۔ کیا میں نے کبھی اماں کے خلاف آپ کے کان بھرے کیا میں نے۔۔۔"

"یہ سب بے کار باتیں ہیں عالیہ' اور انہیں جتانے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ یہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اسے کرنے دو میں برے سے برے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

مظہر جو اب تک بالکل خاموش اور سناٹا سا چھو لیے کھڑا تھا اس نے عالیہ کی بات قطع کر کے کہا۔

"نہیں بھائی جان! آج مجھے سب کچھ کہہ لینے دیجیے ورنہ میرے اندر جلتی نامرادیوں کی آگ مجھے بھسم کر کے رکھ دے گی۔" عالیہ یوں بولی جیسے آہ و بکا کر رہی ہو۔ آذر بدستور اپنے اسی خونخوار موڈ میں کھڑا تھا۔ اور عالیہ کو بری طرح گھور رہا تھا۔

"امی نے تو صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر اماں جان اور باجی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ جب تک نسبت قرار نہیں پائی یہی کہتی رہیں کہ ہمیں صرف عالیہ چاہیے۔ آپ جہیز وہیز کی فکر نہ کریں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ہم خود اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ بنا لیں گے۔ مگر اس کے باوجود بھی امی میرا جہیز جمع کرتی رہیں۔ لیکن جب نسبت قرار پائی تو اماں جان اور باجی کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی اور ہر دوسرے تیسرے دن اسی ٹوہ میں ہمارے گھر آتیں کہ امی جہیز میں مجھے کون کون سی چیزیں دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ امی کو بھی احساس تھا کہ ایک متمول گھرانے میں انہوں نے بیٹی کی بات ٹھہرائی ہے' اپنی حیثیت سے زیادہ انہیں بھی کرنا ہو گا کیونکہ اس وقت تک اماں جان اور باجی نے کھل کر ان سے کچھ نہ کہا تھا مگر ادھر تاریخ ٹھہری اور ادھر اماں جان کے نت نئے مطالبات بڑھتے ہی چلے گئے اور پھر۔۔۔ پھر امی کو مجبور ہو کر بھائی جان کو لکھنا پڑا۔"

عالیہ نے ایک تسلسل کے ساتھ بولتے بولتے ایک زور کی سسکی لی۔ اور اتنی دیر سے رکا سیل اشک یکدم ہی بہہ نکلا۔

"تاریخ ٹھہر گئی تھی۔ دعوت نامے چھپنے چلے گئے تھے اور ادھر لوگوں کی انگشت نمائی کا خیال تھا۔ امی انکار ہی نہیں کر سکتی تھیں۔ ویسے بھی کون سی ماں ایسی ہو گی جو اپنی بیٹی کا سکھ اور چین دیکھنا نہ چاہے گی۔ مگر اماں جان کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرنا امی کے بس میں نہ تھا۔ پھر بھی انہیں دنیا کی نظروں میں اپنا بھرم اور اپنی عزت تو قائم رکھنی ہی تھی اور بھائی جان کی مدد لیے بغیر وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ گو انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا بیٹا اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتا کہ شادی کے اخراجات ہی ادا کر سکے۔ جہیز جمع کرنا اور اماں جان کی خواہش کے مطابق جمع کرنا تو بڑی بات تھی۔ پھر بھی یہ بہن کی زندگی کا معاملہ تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کا سوال تھا۔ اس نے اپنی عزت داؤ پر لگا کر آفس کے اکاؤنٹ میں سے تیس لاکھ روپے خرد برد کر کے ماں کو بھجوا دیے اور یوں اپنی عزت اور جان پر کھیل کر ساری زمانے کی خواری اپنے

سر لے لی۔ یہی تو میری بیوہ ماں اور بہنوں کا واحد سہارا تھے۔ آذر۔ اب یہ نوبت ہے کہ میری ماں اور بہنوں کو ڈھنگ سے کھانے کو بھی نصیب نہیں۔"

عالیہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا یہ سب کیا دھرا آپ کی ماں اور بہن کا نہیں ہے۔ کیا ان کی وجہ سے ہمارے خاندان پر یہ مصیبت نہیں آئی۔ جس کے نتیجے میں آج میرا جان سے پیارا اکلوتا بھائی بے در اور بے گھر ہو کر چوروں کی طرح چھپا چھپا پھر رہا ہے۔ امی نے جو کچھ بھی ان کے پاس بچا کھچا تھا۔ سب کچھ بیچ ڈالا۔ پھر بھی تین لاکھ کی رقم وہ کس طرح سے پوری کر سکتی تھیں۔"

عالیہ نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اشکوں کی یلغار میں بڑی بے بسی سے کہا اور وہ جو شروع ہی سے اماں کی زیادتیوں سے واقف تھا اور عالیہ کی کسی بات کی نفی کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ ساری حقیقت جان لینے کے باوجود بھی اس کا دل ذرا بھی نہ پسیجا۔

"بہر حال.... مجھے ایک چور اور غاصب شخص کی بہن کی رفاقت بالکل منظور نہیں۔ اماں واقعی بالکل ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ ہم بہت غلط جگہ پھنس گئے ہیں۔ لیکن میں کہیں پھنسنے دینے کا قائل نہیں ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔" وہ اپنی نفرت میں ایک کراہیت سی شامل کر کے بولا۔ اور عالیہ نے بڑی بے بسی سے مظہر کی طرف دیکھا۔

"لیکن اس نے تو کوئی ایسا قصور نہیں کیا آذر۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کرو۔ کیونکہ اپنی مجبوریوں کے تحت غبن تو میں نے کیا ہے۔" مظہر نے قدرے عاجزی سے آذر کو مخاطب کر کے کہا۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا یا فرار ہونے میں مدد کروں گا۔" اس نے ایک زہر خند سے کہا۔

"نہیں، نہیں، آپ انہیں چھوڑ دیجئے آذر۔ خدا کے لیے آذر یہ رحم کر دیجئے ورنہ میری ہی نہیں میری دونوں بہنوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ آخر آپ بھی تو دو بہنوں کے بھائی ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے اگر خدا نخواستہ بھائی جان کے بجائے آپ کو ایسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو آپ کیا کرتے؟ میرے بھائی نے تو میری خوشیوں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لی۔ خدارا انہیں جانے دیجئے آذر! یہ وہی رقم واپس کرنے کے ارادے سے تو جا رہے ہیں۔ ان کی زندگی بالکل تو تباہ نہ کیجئے۔"

اور پھر روتی بلکتی عالیہ نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ وہ کچھ دیر تو بت کی طرح ساکت سا کھڑا رہا۔ پھر اس کی گرفت سے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے بولا۔

"تم جا جاؤ۔ مگر جس قدر جلد ممکن ہو سکے تم دونوں میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں اب ایک منٹ کے لیے بھی تم دونوں کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"او ہ۔" عالیہ نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے مظہر کی طرف دیکھا۔ جس کے تھوڑے بجھے ہوئے چہرے پر بڑی تیزی سے رنگ بدل رہے تھے عالیہ بھی ایک منٹ ضائع کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے لیے یہی کیا کم تھا کہ آذر نے اس کے بھائی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ گو بھائی کے چہرے سے شرمندگی اور تاسف صاف عیاں تھا مگر اس نے اس کی ہر کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔

"آیئے بھائی جان۔" اس نے دوپٹے سے اچھی طرح سر ڈھانپے ہوئے پست سی آواز میں کہا اور پھر بھائی کا ہاتھ پکڑ کر خوابگاہ سے باہر نکل آئی۔

وہ اسے جاتا دیکھ کر قدم بڑھا کر پارلر میں آ کھڑا ہوا تھا اور جانے کتنی دیر کھڑا رہا تھا، اور کیا کیا سوچتا رہا تھا کہ وقت کے گزرنے کا اسے احساس ہی نہ رہا تھا۔ البتہ عالیہ کے آخری فقرے، دور سے آتی کسی آواز کی طرح اب تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے اگر خدا نخواستہ بھائی جان کے بجائے آپ کو ایسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو آپ کیا کرتے میرے بھائی نے تو میری خوشیوں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لی۔"

"او ڈیم اٹ۔" نہ معلوم اپنی کس سوچ کے تحت اس کے منہ سے نکلا۔ اور تب ہی باہر کار کا انجن بند

ہونے کی آواز آئی۔ شاید اعظم آگیا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ کچھ سوچ کر پہلے باہر جانے کے ارادے سے پارلر سے باہر نکلا مگر پھر پلٹ کر الماری کی طرف بڑھا اور اس کی بالائی دراز کھول کر اس میں سے کوئی چیز نکالی اور جیب میں ڈال کر باہر آگیا۔ باہر اعظم کھڑا تھا جو اسے دیکھتے ہی بولا۔

"کمال ہے بھائی جان! یعنی کہ آپ یہاں آ بھی گئے اور ادھر میں آپ کو لینے آپ کے آفس پہنچا تو کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"ہوں۔ بس ذرا جلدی اٹھ گیا تھا۔ خیر لاؤ کار کی چابی کہاں ہے۔" اس نے یوں جواب دیا جیسے اپنے ہوش میں نہ ہو۔ اعظم نے جیب سے چابی نکال کر اسے تھمائی تو وہ فوراً ہی کار کی طرف بڑھ گیا۔

*_*_*

"آپا' آپا۔ دولہا بھائی آئے ہیں۔ عالیہ کی سب سے چھوٹی بارہ سالہ بہن نائلہ نے بڑے وحشت ناک طریقے سے زارو قطار روتی ہوئی عالیہ کا شانہ ہلا کر اطلاع دی تو عالیہ کے ہوش اڑ گئے۔ قریب بیٹھی ہوئی آنسو بہاتی ہوئی بہنوں کے رنگ فق ہو گئے اور اس کی امی کو اختلاج ہونے لگا۔

مگر مظہر پرسکون سا بیٹھا رہا۔

"دیکھا بھائی جان! میں نے آپ سے کتنا کہا تھا کہ اس وقت کہیں اور چلے جایئے۔ مگر آپ مانے ہی نہیں۔ اور اب وہ خود آگئے۔" عالیہ نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ کر مظہر سے کہا۔

"ہاں خدا خیر کرے۔ نہ معلوم کس ارادے سے آیا ہے۔ بیٹے! تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی تو اس نے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔" عالیہ کی امی اختلاج کی وجہ سے لرزتی کانپتی آواز میں بولیں۔ اور تبھی وہ اندر آگیا۔ حالانکہ اتنی بے تکلفی سے کبھی اندر نہیں آیا تھا۔

"نہیں' میں نے انہیں دیکھ لیا ہے۔" اس نے آتے ہی کہا تو مظہر سمیت سب کو سانپ سونگھ گیا۔ عالیہ نے وحشت زدہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے انہیں ہی نہیں دیکھا بلکہ اور بھی بہت کچھ دیکھ اور سمجھ لیا ہے۔" اس کا لہجہ بہت عجیب و غریب سا تھا اور اس کے چہرے پر ایک ناقابل فہم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"بہرحال آداب عرض کرتا ہوں امی جان۔" اس نے اپنے اسی عجیب و غریب انداز میں اس کی امی کو آداب کر کے گویا ان سب کے خشک ہوتے خون کو بالکل ہی منجمد کر کے رکھ دیا۔ عالیہ کی امی اپنی بدحواسی اور گھبراہٹ میں اس کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکیں۔

"آپ.... آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔" آخر عالیہ سے نہ رہا گیا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

"مجھے پکڑوانے کی غرض سے آئے ہیں اور بھلا یہ کس لیے آسکتے ہیں۔ کیا اپنے ساتھ پولیس بھی لائے ہو یا اس کے آنے کے انتظار میں کھڑے ہو۔" مظہر نے بڑے تلخ سے لہجے میں کہا۔

"جس غرض سے بھی آیا ہوں۔ ابھی آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" وہ قدم بڑھا کر عالیہ اور مظہر کے درمیان آکھڑا ہوا۔

"مگر بیٹے! تم نے کچھ تو ہمارے اور اپنے رشتے کا لحاظ کیا ہوتا۔ کیا تم یہ بھول گئے کہ ہماری بدنامی تمہاری رسوائی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔" عالیہ کی باوقار والدہ نے بڑے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ آپ اس سے گلے شکوے کر کے اپنی بات کیوں گرا رہی ہیں امی۔ اس کے دل میں اگر تھوڑا سا بھی خدا کا خوف ہوتا تو یہ آپ کی بے گناہ بیٹی کو اپنے گھر سے ہی کیوں نکالتا۔ بہرحال مسٹر آذر میں بھی ہر طرح سے تیار ہوں۔ آپ پورے اطمینان سے اپنے دل کے ارمان نکال سکتے ہیں۔" مظہر نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔

"مجھے اس قدر بھی شرمندہ نہ کیجیے بھائی جان۔ میں پہلے ہی آپ کی شان میں سخت گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہوں۔" آذر نے ایک دم ہی بڑے معذرتی لہجے میں کہا تو تھر تھر کانپتی عالیہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور

بولی۔

"آخر ان باتوں سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا مجھے نکال کر بھی آپ کے دل کا غبار ہلکا نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ بلکہ کچھ سوا ہی ہو گیا ہے۔ مگر یہ ندامت اور تاسف کا غبار ہے عالیہ۔" وہ واقعی نادم سے لہجے میں بولا۔

"آخر تم ہماری پریشانیوں میں اضافہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو بیٹے۔ ہم نے تو تمہارا کچھ بگاڑا بھی نہیں۔ خدا گواہ ہے بیٹے ہم نے عالیہ کو جو کچھ بھی دیا ہے اپنی بساط سے بڑھ کر ہی دیا ہے۔ گو وہ بھی تمہارے شایان شان نہیں مگر ہماری۔"

"اُف امی جان! ایک وقت آپ ہی ان سب کی غرضوں کے مقابلے میں میری ڈھال بن سکتی تھیں۔ میں آپ کی بردبار اور باوقار شخصیت سے کچھ ایسی ہی توقعات وابستہ کر کے آیا تھا۔ مگر آپ بھی مجھ پر رشتہ داروں کے ڈونگرے برسانے لگیں مگر ایک ناہنجار بیٹے کے لیے ماں اپنی ممتا کا دامن اس طرح تنگ تو نہیں کرتی جیسا آپ کر رہی ہیں۔" وہ عالیہ کی امی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا۔ اس کی گفتگو سے ایک بار پھر سب سناٹے میں آ گئے۔

"عالیہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں امی جان کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہی ہے جو آپ پر مصیبتوں کے پہاڑ بن کر ٹوٹا ہے۔" اس نے مڑ کر اپنی گفتگو کو سمجھنے میں کوشاں خاموش کھڑی عالیہ پر ایک نظر ڈالی اور پھر عالیہ کی امی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لیکن میرا بھی خدا گواہ ہے یا پھر عالیہ کہ میں ایسی لغو اور دوسروں کو مصیبت میں مبتلا کر دینے والی رسموں کے خلاف تھا۔ میں نے خود بھی عالیہ کو کسی جہیز کی کمی یا زیادتی کا طعنہ نہیں دیا۔ آپ خود ان سے پوچھ سکتی ہیں کہ میں نے انہی کی وجہ سے اماں کی خفگی مول لے لی ہے۔ اور سچ پوچھیے تو مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ اماں اور باجی نے آپ سے کس کس چیز کا مطالبہ کیا ہے۔ بلکہ میں نے تو ان دونوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ آپ لوگوں سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہ کریں۔ ورنہ میں سرے سے شادی ہی نہ کروں گا۔"

وہ گویا اپنی صفائی میں بڑی تفصیل سے بولا۔

"ہاں بیٹے! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ اپنی ذات سے تو تم بہت ہی اچھے ہو۔"

اور وہ اس کی امی کی بات نظر انداز کر کے بولا۔

"نکاح والے روز یہاں جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں بھی میری مرضی کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ مجھے تو آج تک معلوم ہی نہ ہو سکا کہ آخر قصہ کیا تھا۔"

"آپ کی امی نے پہناونیوں میں آپ کے بھائی اور بہنوئی کے لیے اسکوٹر مانگا تھا۔" عالیہ سے چھوٹی بہن نائمہ جھٹ سے بولی تو اس کی امی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

"ہاں بیٹے اصل میں انہوں نے وقت کے وقت مانگا تھا۔ اگر پہلے سے بتا دیتیں تو میں اسکوٹر کا بھی انتظام کر دیتی۔"

"لیکن امی جان! خالہ جان کے جھگڑا کرنے کے ڈر سے آپ نے وقت کے وقت اسکوٹر کے پیسے تو دے دیے تھے۔" نائلہ پھر بول اٹھی۔

"مگر جھگڑا تو مہر کی رقم پر ہوا تھا امی۔" نائمہ سے چھوٹی بہن عالمہ بھی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"خیر جس وجہ سے بھی ہوا تھا۔ تم کو اس سے مطلب؟ تم خاموش بیٹھی رہو۔" عالیہ کی امی نے اسے ڈانٹا تو عالیہ بولی۔

"ہاں بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے عالمہ۔"

"کمال ہے اماں نے اتنے بڑے بڑے کارنامے انجام دے لیے اور یہاں خبر تک نہ ہوئی۔" آذر شرمندہ اور ملول سے لہجے میں بولا۔

"نہیں مہر پر جھگڑا تو باجی نے کیا تھا۔ خود ہی عندالطلب دینے کا وعدہ کیا تھا اور عین نکاح کے وقت خود ہی مکر گئی تھیں۔" عالیہ بولی۔

"خیر چھوڑو اس قصے کو۔ شرمندگی تو ایک طرف مجھے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔"

آذر اس طرح منہ بنا کر بولا جیسے واقعی اسے سخت تکلیف ہو۔

"ماں اور باجی کی باتوں سے آپ لوگوں نے ہی

دنوں میں نے اور عالیہ نے بھی کافی تکلیف اٹھائی ہے۔ مگر ایک فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ میں خود ایک بڑی تباہی سے بچ گیا ہوں۔ ورنہ میری آنکھوں پر خود غرضی اور مادہ پرستی کی پٹی بندھی رہتی تو میرا بھی وہی حشر ہوتا جو نادان اور ناعاقبت اندیش لوگوں کا ہوتا ہے۔"

"لیکن یہ پٹی میں نے اتاری ہے۔" عالیہ مسکرا کر دبی زبان سے بولی۔

"ہاں اس کا سہرا بھی تمہارے ہی سر ہے۔ تم نے مجھے ٹھنڈے دل سے ساری باتوں پر غور کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تمہارے جاتے ہی تمہاری باتوں کی روشنی میں میں نے واقعی ٹھنڈے دل سے غور کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے برزخ میں کھڑا ہوں، جہاں اضطراب ہی اضطراب ہوتا ہے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کی دھول اڑتی رہتی ہے۔ جہاں امنگیں بھی ہوتی ہیں تو ایسی تڑپتی اور سسکتی کہ انسان کے پاس اپنی پچھلی زندگی کے اعمالوں پر توجہ کرنے کے سوا کچھ نہیں رہتا تو میں نے سوچا ابھی تو میری اگلی زندگی شروع نہیں ہوئی۔ کیوں نہ میں اپنے اعمالوں کا بوجھ ہلکا کر کے اپنی ارضی جنت پالوں اسی لیے میں آپ سب سے اپنے گناہ بخشوانے چلا آیا۔"

"ارے ارے توبہ کرو بیٹے غفور الرحیم تو وہ ہے کیوں ہمیں گناہ گار کر رہے ہو۔" عالیہ کی امی رقت آمیز لہجے میں بولیں۔

بڑے ہی رقت آمیز اور اثر انگیز لمحات تھے وہ جنہوں نے تقریباً سب ہی کے قلوب کو بوجھل اور آنکھوں کو نم کر دیا۔ خود آذر کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے پھر دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے تو آذر نے جیب سے کوئی چیز نکال کر مظہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب بھائی ہی کہا ہے تو اب کہیں آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیک بک حاضر ہے۔ جس قدر رقم درکار ہو آپ میرا چیک کاٹ کر لے سکتے ہیں۔ رہ گیا وارنٹ وغیرہ کا معاملہ تو میں آپ کی ضمانت دے کر پولیس والوں کو کچھ کھلا پلا کر ایک دو دن میں ہی ختم کرادوں گا۔"

مگر مظہر نے نہ صرف اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے بلکہ چند قدم پیچھے بھی ہٹ گیا اور بڑی خفت سے بولا۔

"نہیں نہیں یہ کیا کر رہے ہو، میرے لیے تمہارا یہ خلوص ہی کافی ہے۔"

"خدا کی قسم بھائی سمجھ کر دے رہا ہوں سالا سمجھ کر نہیں، اگر آپ نے قبول نہ کیا تو میرا دل ٹوٹ کر رہ جائے گا۔"

آذر نے زبردستی وہ چیک بک مظہر کی قمیص میں ٹھونستے ہوئے کہا اور جواب میں مظہر تو کیا کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ شاید سب ہی شرمندہ اور خفیف ہو رہے تھے۔ آذر ماحول کو خوشگوار بنانے کی غرض سے وہیں فرش پر عالیہ کی امی کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

"چلو بھئی نائمہ! تم ذرا میرا سر کھجاؤ اور ہاں نائلہ! تم میرے ہاتھ دباؤ اور تم عالیہ! ذرا جلدی سے مجھے لخلخہ سنگھاؤ۔"

اور سب ہی اس کی بات پر ہنس دیے۔

"ارے یہ لخلخہ سنگھانے کی نوبت کیوں آگئی۔" عالیہ کی امی نے مسکرا کر پوچھا۔

"بس وہ ذرا اماں کے کارناموں سے ہوش گم ہوتے جا رہے ہیں۔" اس نے بڑی برجستگی سے جس طرح گردن ڈال کر کہا ہلکے پھلکے قہقہوں سے فضا میں رچی تمام کثافت دور ہو گئی۔ بچیاں فوری پر اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے ارد گرد بیٹھی اس کی ناز برداریاں کر رہی تھیں۔ اور طمانیت کا گہرا احساس لیے بیڈ سے پشت ٹکائے اور آنکھیں بند کیے وہ سوچ رہا تھا۔ آج میں نے کھل کر بات کی ہے تو بچیاں مجھ سے کتنی اپنائیت سے پیش آرہی ہیں۔ ورنہ بے چاریاں اپنے حالات کی وجہ سے کیسی ڈری ڈری سی رہا کرتی تھیں کہ مجھے دیکھتے ہی ادھر ادھر کونوں میں چھپ جایا کرتی تھیں۔

"آذر بیٹے! اگر تھکن محسوس ہو رہی ہے تو آرام سے پلنگ پر لیٹ جاؤ۔" اسے آنکھیں بند کیے بیٹھا دیکھ کر عالیہ کی امی نے بڑی دلار سے کہا۔

"وہ نہیں شکریہ امی جان! مجھے ان ننھی منھی

وں کے پاس بیٹھ کر بڑا ہی لطف آرہا ہے۔" اس نے آنکھیں کھول کر نائلہ کی ناک کھینچتے ہوئے کہا۔ تو عالیہ کی امی خوش ہو کر ہنستی ہوئی بولیں۔
"ارے بچو! اپنے دولہا بھائی کو کچھ کھلاؤ پلاؤ تو سہی۔ کسی سے اتنا بھی نہ ہوا کہ چائے کی ایک پیالی ہی دے دیتا۔"
عالیہ کی امی اشارے سے مظہر کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئیں اور ان کے جاتے ہی بچیاں بھی اٹھ کر چلی گئیں تو تنویر نے سر موڑا کر اور بھوں چڑھا کر عالیہ کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔
"دیکھا کس ترکیب سے تخلیہ کرایا ہے امی جان نے۔" مگر عالیہ خاموش ہی بیٹھی رہی۔
"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تنہائی ملتے ہی تم اب قتل مچاؤ گی۔ بلکہ مرغا تک بنانے سے دریغ نہ کرو گی۔ پھر بھی تم سے میری یہ التماس ہے کہ مجھے معاف کردو... کردو نا یار! شرمندگی بذات خود ایک اعتراف ہوتا ہے انسان کی اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا لیکن اس کی ہار بھی بڑی زبردست ہوتی ہے انسان۔۔۔"
"آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں تنویر۔ میرا دل تو اس وقت بھی آپ کی طرف سے صاف تھا جب... جب آپ کے کہنے پر میں آپ کے گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔"
"لیکن پھر بھی۔" وہ اس سے حد درجہ متاثر ہو کر بولا۔
"میرا ضمیر تو مجرم ہے۔ خیر آؤ ابھی میرے ساتھ گھر چلو تاکہ میں۔" آگے اس نے جو کچھ کہا لووں تک سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ عالیہ قدرے گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔
"اچھا میرا ہاتھ تو چھوڑیے کوئی آگیا تو۔۔۔"
"تو آجائے۔ یہی دیکھے گا نا کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔" وہ عالیہ کی گھبراہٹ سے مزا اٹھا کر بڑی لاپروائی سے بولا۔
"ہونہہ شرم تو نہیں آتی۔" عالیہ نے محجوب سے انداز میں کہا۔
"آئے بھی کیسے جبکہ ساری شرم پر تو تم قبضہ کیے بیٹھی ہو خیر چلو اٹھو۔"
"لیکن امی آپ کو بغیر کھانا کھلائے جانے ہی نہیں دیں گی۔ ذرا میں بھی تو جا کر دیکھوں کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔"
"میں کھانا تو ضرور کھاؤں گا مگر اس شرط پر کہ امی جان اس سلسلے میں کوئی اہتمام نہ کریں، جو کچھ بھی موجود ہے بس وہی کھلا دیں۔" اس نے جاتی ہوئی عالیہ کو تاکید کی اور پھر اس کے پیچھے ہی باورچی خانے میں آگیا۔ جہاں عالیہ کی امی، بہنیں اور مظہر سبھی موجود تھے۔ وہ بھی ان میں جا کر گھل مل گیا۔ اور اس گھر کی بوجھل اور کثیف فضائیں مدتوں بعد سب کے خلوص اور سچائی کے مدھ بھرے قہقہوں سے زعفران زار ہوتی رہیں۔

رعنا گلاب

ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ اب تو کوریڈور کا فرش بھی خود پہ ایک ہی انداز سے پڑنے والے قدموں سے بیزار ہو چکا تھا۔ مگر جس کے انتظار میں اس کی یہ حالت ہو رہی تھی۔ وہ نہ آیا۔ سورج کے غروب ہونے کے بعد اگرچہ کوریڈور میں اور اس کے سامنے پھیلے ہوئے وسیع لان میں بلب جل اٹھے تھے مگر ان کی روشنی بھی اس اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام ہو رہی تھی جو اسے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تھک کر وہ وہیں کوریڈور کے ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ گئی اور نگاہیں لان کے دوسری جانب ایستادہ آہنی گیٹ پر گاڑ دیں یکبارگی دل چاہا کہ بھاگ کر وہ اس گیٹ پہ چڑھ جائے اسے پھلانگ کر اس حویلی نما گھر اور اس کی پراسرار قید سے نجات حاصل کرلے مگر درحقیقت یہ سب بھی ایک خواب تھا۔ اصل مسئلہ گیٹ نہیں بلکہ اس کے پیروں میں پڑی آزمائش کی زنجیر تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا اور بے بسی سے آنسو آگئے لیکن ابھی یہ آنسو ڈھلکنے نہ پائے تھے کہ پیچھے سے بوا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”اب اندر آ بھی جائیے بہو رانی۔! بالکل اندھیرا ہو چکا ہے۔ بھلا آپ کب تک یوں بیٹھی رہیں گی۔“ اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”ہاں۔ چھوٹی بی بی دیکھیے۔ آٹھ بجنے والے ہیں۔“ صفو بھی بولی۔ ”اگر چھوٹے سرکار کو آنا ہوتا تو وہ اب تک آچکے ہوتے۔“

”صفو! تو چل باورچی خانے میں۔“ بوا نے اسے حکم دیا۔

”میں نہیں جا رہی۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”میں تو ابھی چھوٹی بی بی کے ساتھ ڈراما دیکھوں گی۔“

”ہونہہ! ڈراما دیکھوں گی۔“ بوا بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں اور صفو اس کے قریب آکر فرش پر بیٹھ گئی۔

”چھوٹی بی بی!“ اس نے مخاطب کیا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”آخر آپ کب تک یہاں بیٹھی رہیں گی اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

وہ لمبی ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس مکان میں آئے ہوئے اسے چار مہینے ہو چکے تھے مگر اسے یوں لگتا تھا جیسے چار سال بیت گئے ہوں ابھی اسے پتا نہیں کتنے دن یہاں گزارنا تھے جبکہ اس پر ایک ایک پل بھاری تھا مگر کسی سے وہ کیا شکوہ کرتی۔ یہ آج آزمائش یہ کڑا امتحان تو اسی کا۔۔۔ اختیار کردہ تھا۔ ایک ایسا امتحان جو آج تک کسی نے نہ دیا تھا۔

اس وقت اسے گزرے دنوں کی یادیں بے چین کیے دے رہی تھیں۔ وہ دن جو اس نے شمیر کی رفاقت میں گزارے تھے اور جن کا ہر ہر لمحہ اس کے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا خزانہ لے کر آیا تھا ان دنوں وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی اسے خود اپنی قسمت پہ رشک آنے لگا تھا۔ وہ جو ایک لوئر مڈل کلاس کی پروردہ تھی اور جس نے خواب میں بھی ایسی خوشیوں کا تصور نہیں کیا تھا اتنی ڈھیر ساری خوشیاں پاکر پاگل ہی تو ہونے لگی تھی شہزادیوں جیسے ٹھاٹ باٹھ اور سب سے بڑھ کر شمیر جیسے شخص کی رفاقت و محبت۔ اسے اچانک ہی یہ

سب کچھ مل گیا تھا۔ ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان چند روزہ خوشیوں کی قیمت اسے ایک عجیب آزمائش سے گزر کر ادا کرنا ہوگی۔ اور اب جبکہ وہ اس آزمائشی دور سے گزر رہی تھی تو اسے یہ تک اندازہ نہیں تھا کہ یہ آزمائش کب ختم ہوگی۔

وہ بھی کیا دن تھے جب اسے کوئی فکر کوئی غم نہیں تھا۔ اپنے بہن بھائیوں کی محبتوں اور ماں باپ کی شفقتوں کے بیچ آزادی کا ایک احساس اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس وقت بھی کتنی مگن تھی اور اسے اپنی کم مائیگی کا کوئی دکھ نہیں تھا اور ایک اسے کیا اس گھر میں کسی کو بھی احساس کمتری نہیں تھا سب مطمئن تھے اس کے والد اپنی بساط کے مطابق اپنے سب بچوں کو تعلیم دلوا رہے تھے۔ محدود آمدنی ہونے کے باوجود وہ اپنے تینوں بیٹوں اور تینوں بیٹیوں کی مناسب تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھ رہے تھے۔ جب بڑا بیٹا تعلیم مکمل کرکے کسی نہ کسی طرح اپنی اہلیت کی بنیاد پر ان ہی کے محکمے میں ملازم ہو گیا تو گھر کا خرچ جس میں کبھی کبھی تنگی ہو جایا کرتی تھی۔ میں بھی آسانی ہو گئی اور انہوں نے فوراً ہی اپنی بڑی بیٹی کی شادی کر دی۔ بہنوں میں دوسرا نمبر اس کا تھا مگر ایک دن بڑی حیرت انگیز بات ہو گئی جن دنوں وہ بی اے فائنل کا ایگزام دے رہی تھی۔ ایک دن اچانک نور خالہ اس کے لیے ایک رشتہ لے کر آئیں۔

”ہائیں آپا۔ تم ہوش میں تو ہو۔“ اماں ان کی بات سن کر حیران ہی تو رہ گئیں۔

”اے میں تو ہوش میں ہوں۔ اب تم بھی ہوش میں آ جاؤ۔ اپنی نگینہ صرف نام ہی کی نگینہ نہیں۔ مجھے یقین ہے بیگم افتخار اسے ضرور پسند کریں گی انہیں اپنے بیٹے کے لیے صرف خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی چاہیے۔ ان کے نزدیک دولت کی کوئی اہمیت نہیں۔“ نور خالہ نے تفصیل سے انہیں بتایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے آپا۔ مگر...“ اماں تذبذب میں پڑ گئیں۔

”اب یہ اگر مگر چھوڑو۔ اور تیاری کرو۔ کل بیگم افتخار آ رہی ہیں نگینہ کو دیکھنے۔ بارے میں تو کہتی ہوں شکر کرو شکر۔ تمہاری بیٹی کے لیے اتنے بڑے گھر کا رشتہ آیا ہے۔“

”ابھی آیا کہاں ہے آپا۔ اور پھر ہم کہاں ایسے لوگوں سے میل کھاتے ہیں۔“

”اے میل کھانے کی بات چھوڑو۔ کبھی کبھی تو امیر امیر سے اور غریب غریب سے میل نہیں کھاتے۔ اب یہ بیگم افتخار کی بڑی بہو کو ہی دیکھ لو۔“ خالہ پان چباتے ہوئے بولیں۔ ”شہر کے اتنے بڑے مل والے کی بیٹی تھی مگر بیگم افتخار کی نہیں بنی اس سے۔“

”یہی آپا۔ تم خود ہی سوچو۔ جب اس سے بیگم کی نہیں بنی تو میری بیٹی تو سیدھی سادی ہے۔ وہ کیسے ان لوگوں میں رہے گی۔“ اماں کا فکر سے برا حال تھا۔

”اے۔ سیدھی سادی ہے اس لیے تو بیگم آ رہی ہیں تمہارے در پہ۔“ خالہ نے انہیں پھر حیران کر دیا۔ ”بڑی بہو کی تیز طراری نے ہی ان بے چاری کو بڑے بیٹے سے جدا کر دیا۔ اس لیے اب دوبارہ وہ بڑے گھر کی بیٹی لا کر اپنا دوسرا بیٹا نہیں گنوانا چاہتیں۔“

”مگر تم خود سوچو آپا۔ ہم میں کس قدر طبقاتی فرق ہے۔“ اماں بولیں۔

”ارے اس بات کو جانے دو بس یہ دیکھو کہ اپنی نگینہ بڑی سعادت مند ہے ان کو خوش رکھے گی تو راج کرے گی وہاں۔ بیگم دل کی بہت اچھی ہیں۔“ خالہ نے زور دیا۔ ”اسے مجھے ہی دیکھ لو۔ کیا ان کے ہم پلہ ہوں؟ مگر بیگم مجھے بہت عزت دیتی ہیں۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ اماں ان کی اس دلیل سے کچھ قائل ہو گئیں تو خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تم کل لڑکی کو تیار رکھنا۔“

اگلے دن شام پانچ بجے بیگم افتخار کی لمبی سی گاڑی ان کے گھر کے سامنے آ کر رکی بیگم افتخار بڑی تمکنت سے گھر میں داخل ہوئیں۔ گھر کے مکینوں کی کم مائیگی

کو دیکھ کر انہوں نے اپنے تاثرات سے ناگواری کو ظاہر تو نہیں ہونے دیا مگر نگینہ کو دیکھ کر ان کی نگاہوں کی پسندیدگی چھپی نہ رہ سکی۔ یوں لگا جیسے نگینہ انہیں پہلی ہی نظر میں پسند آگئی ہو۔ لگے ہی لمحے انہوں نے کھلے لفظوں میں رشتے کی بات رکھ دی اور جاتے جاتے تمکنت سے کہہ گئیں۔

"ہمیں آپ کی بیٹی پسند آئی ہے اور یہ بات شاید نور آپا زیادہ بہتر طور پر آپ کو بتا سکتی ہیں کہ آپ کی بیٹی ہمارے یہاں کتنی خوش رہے گی۔"

یہ کہہ کر وہ ایک شان سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلتی بنیں اور اپنے پیچھے اماں بے چاری کو حیران کے ساتھ ساتھ پریشان بھی کر گئیں حیرانی کی اس بات پر کہ انہوں نے نگینہ کو پہلی نظر میں کیسے پسند کر لیا اور پریشان یوں کہ اتنا اچھا رشتہ وہ لوگ طبقاتی فرق کو دیکھ کر ٹھکرا دیں یا قبول کر لیں۔

اس رشتے کے بارے میں بھائی جان کا خیال تھا کہ فوراً مسترد کر دینا چاہیے، جبکہ دولہا بھائی اور باجی اسے قبول کر لینے کے حق میں تھے۔ بہر حال یہ بحث اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دی گئی جب تک شہیر کے بارے میں تحقیقات نہ کروالی جائیں۔ تحقیقات کے نتیجے میں کوئی قابل اعتراض بات سامنے نہیں آئی۔ شہیر ایک امیرزادہ ہی نہیں پڑھا لکھا سلجھا ہوا نوجوان ثابت ہوا۔ اب اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی چنانچہ اللہ کا نام لے کر ہاں کر دی اور دو مہینے کے مختصر سے عرصے میں نگینہ رخصت ہو کر "خان ولا" میں آگئی۔ اس کی شادی کی تقریب میں شریک ہر شخص نے اس کی قسمت پہ رشک کیا۔ خود اسے جب حجلہ عروسی میں لایا گیا تو اسے اس سب پر یقین نہیں آرہا تھا اور پھر جب اس نے شہیر کو دیکھا تو دنگ رہ گئی۔

پہلی مرتبہ جو اس نے شہیر کو نظریں کے لیے اٹھائیں تو بے یقینی کے عالم میں پلکیں جھپکنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں۔ کیا کسی بات کا یقین کرنا چاہ رہی ہیں۔"

شہیر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے شوخی سے کہا تو اس نے محجوب ہو کر نگاہیں جھکالیں۔

"ویسے یقین تو ہمیں بھی نہیں آرہا اپنی آنکھوں پر کہ امی جان نے ہمارے لیے ایسا بے مثال نگینہ ڈھونڈا ہے جس کے رخ کی چمک ہماری آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی ہے۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ذرا ہاتھ تو ادھر لیے۔ تاکہ آپ کو چھو کر ہم یقین تو کریں۔" اس نے اس کا ہاتھ تھامنے کا گویا بہانہ کیا اور وہ یقین کرنے لگی کہ واقعی یہ سب کچھ حقیقت ہے۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تو تھی نہیں کہ جنہوں نے اپنے ذہنوں میں آئیڈیل بنا رکھے ہوتے ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادے گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ بڑی صابر اور قانع قسم کی۔ اگر اسے یہ سب کچھ نہ بھی ملتا اور اس کا شوہر شہیر جیسا شاندار نہ بھی ہوتا۔ تب بھی وہ شکوہ کرنے والوں میں سے نہ تھی مگر اب جبکہ اسے اتنی بہت سی آسائشیں اور شہیر کی ڈھیروں محبت اور توجہ ملی تو وہ حیران رہ گئی۔ اپنی قسمت کی مہربانی پہ۔ وہ آئینے میں خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی۔ کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت ہے کہ پہلے شہیر کی امی نے اور پھر شہیر نے اسے دل و جان سے پسند کر لیا کیونکہ اس کے علاوہ تو کوئی بھی پلس پوائنٹ اس کے پاس نہیں تھا۔

شہیر تو گویا اس کا دیوانہ ہو گیا تھا! اس کی صورت کا ہی نہیں اس کی سادگی کا بھی۔ شادی کے بعد کافی دنوں تک اس کی یہ حالت رہی کہ وہ شہیر سے جھجکتی رہی۔ وہ اس سے بات کرتا تو اس سے نگاہیں ہی نہیں ملائی جاتیں۔ آخر ایک دن شہیر نے پوچھ لیا۔

"نگینہ۔ ایک بات تم آج مجھے بتا ہی دو۔"

"کون سی بات؟" وہ اس کے سنجیدہ لہجے سے چونکی۔

"ایسے نہیں۔ پہلے میرے پاس آکے بیٹھو۔" وہ بولا تو وہ جو الماری میں کپڑے سیٹ کر رہی تھی اس کے پاس آبیٹھی اور الجھن کے عالم میں اس نے اس کی طرف ایک نظر ڈالی۔

"جی کہیئے۔ کیا بات ہے؟"
"پہلے میری آنکھوں میں دیکھو۔"
وہ بولا تو وہ حیران ہوئی "جی!" اور تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی۔
"بھئی میں کہہ رہا ہوں میری آنکھوں میں دیکھو۔"
"دیکھ تو رہی ہوں۔" اس نے صرف ایک نظر ڈالی۔
"آخر تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیوں نہیں کرتیں۔ بھئی میں تمہارا شوہر نامدار ہوں۔"
"مجھے معلوم ہے۔" وہ ہنس پڑی۔
"تو پھر کیا میری آنکھیں بہت بری ہیں؟"
"نہیں تو۔ آپ کی آنکھیں تو بہت پیاری ہیں۔"
"پھر تم یہ میری طرف اجنبیوں کی طرح کیوں دیکھتی ہو؟"
"مجھ سے آپ کی آنکھوں میں دیکھا نہیں جاتا۔"

"کیوں نہیں دیکھا جاتا۔"
"مجھے نہیں معلوم۔ مگر آپ کی آنکھوں میں شاید کچھ ہوتا ہے۔"
"میری آنکھوں میں؟ مگر میری آنکھوں میں تمہاری چاہت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔"
"ہم۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں آپ کے قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہوں۔" وہ بے چین ہو کر بولی۔
"ارے" اس نے ایک قہقہہ لگایا "کیسی بے وقوف لڑکی ہو تم۔ بھلا یہ کیوں نہیں محسوس ہوتا ہے۔ تم سے پہلے مجھ سے اتنا قریب نہ تو کوئی لڑکی آئی ہے اور نہ تمہارے بعد کوئی آئے گی۔"
"مجھے نہیں معلوم مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایک احساس ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے" وہ کہتے کہتے رک گئی۔
"کہو نا۔ رک کیوں گئیں؟"
"کچھ نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا اور وہ ہنسنے لگا اور بولا۔
"میں نے سنا ہے بہت زیادہ حسین لوگ۔ کبھی کبھی بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔"
"جی نہیں، میں کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔" وہ خفا ہو کر بولی اور اٹھ کر دوبارہ الماری میں کپڑے درست کرنے لگی۔

یہ بات اس وقت وہیں ختم ہو گئی تھی مگر درحقیقت نگین واقعی اس عجیب و غریب احساس سے دوچار تھی کہ شہیر اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے دور ہے وہ جب بھی شہیر کے ساتھ ہوتی بیگم افتخار کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کے لیے ایک تنبیہ ہوتی اور اس کے لیے ایک تختی کبھی کبھی وہ اس سے بہت محبت کا اظہار کرتی تھیں مگر یہ برداشت نہیں کر پاتی تھیں کہ شہیر ان کی موجودگی میں اسے زیادہ اہمیت دے حالانکہ وہ نئی نویلی دلہن تھی اور دلہن بھی ایسی کہ دیکھنے والوں نے جہاں اس کے حسن و معصومیت کو سراہا وہاں بیگم افتخار کے انتخاب کو بھی داد دی۔ ایسے میں شہیر کا اس کی جانب جھکاؤ ایک فطری سی بات تھی مگر بیگم افتخار کی نظروں کا تنبیہی انداز اسے ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیتا۔ خود شہیر بھی ماں کے سامنے اس سے کسی حد تک لاتعلق سا رہتا مگر ان کی غیر موجودگی میں اس کے ہر انداز میں اس کے لیے ایک شدت کا والہانہ پن ہوتا۔
اس تمام عرصے میں وہ تین چار مرتبہ ہی اپنی اماں کے گھر گئی تھی اور وہ لوگ ایک دفعہ ہی اس سے ملنے آئے تھے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا سالوں کا ساتھ ایک دم سے تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان کی رفاقتوں کی یاد ایک دم سے تو نہیں بھلائی جا سکتی۔ اس کا کتنا دل چاہتا کہ وہ روز نہ سہی ہر دوسرے تیسرے دن ہی وہاں چلی جایا کرے یوں بھی آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر وہ اپنی اس خواہش کو زبان پر نہیں لا سکتی تھی اسے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اسے یوں لگتا کہ اگر اس نے زیادہ گھر جانے کی بات کی تو وہ ناراض ہو جائیں گی۔ اسے ان کے غصے سے نہیں ناراضگی سے خوف آتا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ بھی محسوس کرتی تھی مگر ایک دوسرا احساس بھی اسے ہر وقت گھیرے رہتا ایک مرتبہ اس نے سنا۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہی تھیں۔

"میری بھوی بہو؟ اللہ نہ کرے کہ وہ ندا جیسی ہو۔"

اور یہ سن کر وہ لاؤنج کے دروازے پر ہی رُک گئی وہ بڑے میٹھے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"ارے وہ تو بہت پیاری ہے۔ اچھی شرمیلی اور معصوم۔ بس میری دعا ہے کہ وہ خوشیاں بانٹنے والی ہو۔ خوشیاں چھیننے والی نہ ہو۔ زبیر کی بیوی کی طرح۔"

نگینہ بس اتنا ہی سن سکی تھی کیونکہ انہوں نے اس کے بعد زیادہ بات نہیں کی۔

زبیر دراصل شہیر کے بڑے بھائی کا نام تھا۔ ان کے بارے میں شہیر نے اُسے صرف یہ بتایا تھا کہ وہ کچھ اختلافات کی بنا پر علیحدہ رہتے تھے۔ ندا ان کی بیوی کا نام تھا۔ فون پر اتی کے الفاظ سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اختلافات ندا کے پیدا کردہ تھے مگر حقیقت سے وہ بالکل بے خبر تھی کیونکہ شہیر نے اُسے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس دن صبح ناشتے پر اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ دراصل کل رات ہی وہ اماں کے گھر دو دن گزار کر لوٹی تھی۔ رات کھانا شہیر نے وہیں کھایا تھا اور بہت انجوائے کیا تھا۔ ناشتے پر بھی شہیر اماں کے ہاتھ کے کھانوں کی تعریف کر رہا تھا۔ جبکہ بیگم افتخار خلاف معمول اسے کسی بھی قسم کی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے کے بجائے چپ چاپ ناشتے کی طرف متوجہ تھیں پھر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وہ شہیر سے مخاطب ہوئیں۔

"شہیر!"

"جی ماما!"

"تمہیں اپنے وہ الفاظ یاد ہیں؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کون سے الفاظ ماما!" شہیر چائے کا سپ لیتے لیتے رُک گیا۔

"یہی کہ تم اپنی ماں سے زیادہ کسی ہستی کو اہمیت نہیں دو گے۔"

"جی ماما!" اس نے کہتے کہتے رُک کر ایک نظر نگینہ پر ڈالی جو حیرت سے آنکھیں کھولے ان کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں اپنے الفاظ پر قائم ہوں ماما!"

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم تیار ہو کہ میں تمہارے الفاظ کی سچائی کو پرکھ لوں۔"

"جی ہاں۔ آپ جب چاہیں مجھے آزما سکتی ہیں میں آپ کا بیٹا ہوں ماما اور آپ کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

شہیر ان کو یقین دلانے والے انداز میں کہہ رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان کے ان الفاظ کے پیچھے کیا دکھ پوشیدہ ہے۔

"تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔؟" ماما نے چائے کا آخری سپ لے کر کپ میز پر رکھا۔

"شاید تین مہینے!" وہ نگینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جس کی الجھن اب پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

"میرا خیال ہے اتنا عرصہ انڈر اسٹینڈنگ ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

"جی ماما۔ مگر آپ۔۔"

"میں صرف اتنا کہنا چاہ رہی تھی۔" بیگم افتخار نے شہیر کی بات کاٹ دی۔ "کہ تم نگینہ کو یہ بات بتا دو کہ اسے اب کچھ دن ہمارے آبائی گھر میں گزارنا ہوں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولیں۔ "اور یہ بھی بتا دینا کہ میں ایسا اس لیے چاہتی ہوں کہ میں اب دوبارہ اپنی اولاد کی طرف سے زخم نہیں کھانا چاہتی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر چلی گئیں نگینہ نہ سمجھنے والے انداز میں اور شہیر کسی قدر پریشانی سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ پھر شہیر نے اس کی طرف نگاہ کی اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"نگین! تم اگر ناشتا کر چکی ہو تو کمرے میں آؤ۔"

اور نگینہ جو اس وقت ناشتا وغیرہ سب کچھ بھول چکی تھی فوراً اٹھ کر شہیر کے پیچھے چل دی۔ اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیگم افتخار کی اس بات کا کیا مطلب ہے۔ وہ اس کے پیچھے چلتی کمرے میں داخل ہوئی تو شہیر صوفے پر جا بیٹھا اور اسے قریب بیٹھنے

کا اشارہ کیا۔

"نگینہ! شاید تمہیں یقین نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے مما میں روایتی ساسوں والی ایک خاصیت بھی نہیں تھی۔" وہ دھیرے سے بولا تو نگینہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بلیو می۔ مما پہلے اتنی محبت کرنے والی ساس ہوا کرتی تھیں کہ کوئی بھی بھابی کے ساتھ ان کا سلوک دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ بھابی کی ساس ہیں۔" شہیر نے بتایا۔

"تو پھر ما ما اب کیوں ویسی نہیں ہیں؟" نگینہ نے بالآخر سوال کر ڈالا۔

"وہ مجھے بھی ایسے کیوں نہیں چاہتیں جیسے بھابی کو چاہتی تھیں۔ جبکہ میں تو ان کا انتخاب ہوں آپ کا نہیں۔"

"ہاں!" شہیر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ سوال تم نے اس لیے کیا ہے کہ تم مما کو ملنے والے اس دکھ کے بارے میں نہیں جانتیں جس کے ردعمل کے طور پر ان کا رویہ تمہارے ساتھ اتنا سرد ہے۔"

"کیسا دکھ شہیر؟ کس نے دیا ہے انہیں یہ دکھ؟" وہ سر تا پا سوال بنی پوچھ رہی تھی۔

"یہ دکھ انہیں زبیر بھائی اور بھابی نے دیا ہے۔" شہیر نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولا۔ "زبیر بھائی کی شادی سے پہلے وہ ایسی ہرگز نہ تھیں وہ تو اتنی براڈ مائنڈڈ تھیں کہ انہوں نے زبیر بھائی کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ زندگی زبیر کو گزارنا ہے اس لیے شریک حیات بھی ان کی پسند کی ہونا چاہیے جب زبیر بھائی نے انہیں بتایا کہ انہیں سرفراز انکل کی بیٹی ندا پسند ہے تو بھی انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا حالانکہ ندا بہت ماڈ تھیں اور یہ مما کو عموماً الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکیاں پسند نہیں آتیں۔ مگر انہوں نے زبیر بھائی کی پسند کو اس لحاظ سے سراہا کہ وہ پڑھی لکھی اور خوش اخلاق تھیں چنانچہ انہوں نے خوشی اور رضامندی کے ساتھ زبیر بھائی کی شادی کی تیاری شروع کر دی۔ ان دنوں مما کتنی خوش تھیں۔ یقین کرو نگینہ میں نے مما کو بہت کم مواقع پہ اتنا خوش دیکھا ہے۔ شادی کے بعد بھی مما، ندا بھابی اور زبیر بھائی کی خواہشات اور خوشیوں کا خیال رکھتی تھیں۔ زبیر بھائی تقریباً ایک ماہ کے لیے ہنی مون منانے یورپ گئے تھے مگر وہاں سے واپسی پر زبیر بھائی کافی تبدیل ہو گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے مما کو گھر میں اہمیت دینا بہت کم کر دی تھی بلکہ انہوں نے مما کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ تم خود تصور کرو جس ماں نے اپنے بچوں کے لیے ساری زندگی محنت کی ہو۔ جوانی میں بیوہ ہو جانے کے بعد ساری عمر صرف اس لیے دوسری شادی نہ کی ہو کہ اس سے بچوں کی زندگی متاثر ہونے کا خدشہ تھا جس ماں نے باپ کی کمی ساری عمر بھی محسوس نہ ہونے دی ہو۔ اتنے عرصے اس حصے میں اگر اولاد نظر انداز کرنا شروع کر دے تو اس کے دل پہ کیا گزرے گی۔"

وہ چند لمحوں کے لیے رُکا پھر بولا۔

"دوسری تبدیلی ان میں یہ آئی تھی کہ انہوں نے بزنس افیئرز میں مما کے فیصلوں پر اعتراض کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد سے بزنس مما نے سنبھالا ہوا تھا۔ زبیر بھائی نے تو اپنی شادی سے چند ماہ پہلے ہی بزنس کے معاملات میں مما کی ہیلپ کرنا شروع کی تھی۔ جب مما نے زبیر بھائی کے اعتراضات سنے تو انہیں شاک لگا۔ مجھے معلوم ہے وہ زبیر بھائی کی اپنی زبان نہیں تھی۔ وہ ندا بھابی کے ڈیڈی کی زبان تھی جو وہ بول رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ زبیر بھائی نے مما سے جائیداد وراثت میں اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ پھر اپنا بزنس اور گھر علیحدہ کر لیا۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتا نگینہ جس دن زبیر بھائی یہاں سے جا رہے تھے۔ اس دن بھی مما نے اگرچہ ان کی کوئی غلطی نہیں تھی زبیر بھائی کو روکنا چاہا تھا مگر جاتے جاتے زبیر کی ایک بات نے انہیں مزید دکھی کر دیا۔"

یہ کہہ کر شہیر خاموش ہو گیا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے شہیر! بتایئے نا۔ زبیر بھائی نے کیا بات کہی تھی؟" نگینہ اس کی خاموشی سے بے چین ہو اٹھی۔

"انہوں نے کہا تھا۔" شہیر نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا کہ

ممّا آپ یقیناً ایک بہترین ماں تھیں مگر جب سے آپ ندا کی ساس بنی ہیں۔ آپ ماں نہیں رہیں اس لیے میں جا رہا ہوں۔"

"اوہ" نگین کے منہ سے افسوس کے عالم میں نکلا۔

"یہ بات تو مجھے بھی اپنے دل پہ ایک تازیانہ لگی تھی۔ میں سوچتا ہوں ممّا کے دل پہ کیا گزری ہو گی یہ سن کر۔ جبکہ انہوں نے ندا بھابی کی محبت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔" شہیر اس وقت بہت دکھی ہو رہا تھا۔

"کیا ندا بھابی نے بھی ممّا سے گستاخی کی تھی؟"

نگین نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہی تو بات ہے۔" شہیر ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ "ندا بھابی نے کبھی خود براہ راست جھگڑا نہیں کیا۔ البتہ ممّا کی محبت کا جواب ہمیشہ سرد مہری سے دیا۔ انہوں نے زبیر بھائی کے اتنے کان بھرے کہ وہ ممّا سے اور مجھ سے بہت دور ہو گئے۔ میرا بھائی اتنا برا نہیں تھا۔ یہ سب صرف اس ایک عورت کی وجہ سے ہوا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا اور "تم بھی ایک عورت ہو نگین جس سے ممّا ڈرتی ہیں کہ وہ ان کا دوسرا بیٹا بھی نہ چھین لے۔"

"لیکن شہیر۔ میں ندا تو نہیں ہوں۔ مجھ میں اور ان میں تو بہت فرق ہے۔" وہ بے چین ہو کر بولی۔

"یقیناً جانِ شہیر۔" شہیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم میں اور ندا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ندا کو بھائی نے پسند کیا تھا تمہیں ممّا نے خود چنا ہے۔ ندا میں بناوٹ تھی تم میں سادگی ہے معصومیت ہے۔"

"تو پھر۔ تو پھر ممّا ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ کیا انہیں اپنے انتخاب پہ بھروسا نہیں؟"

"انہیں ان کے خون نے دھوکا دے دیا تو دلہن کس پہ بھروسا ہو سکتا ہے۔ انہیں تو مجھ پر بھی بھروسا نہیں نگین۔"

"تو پھر خود کو ہم قابل بھروسا کیسے ثابت کریں؟" نگینہ ایک اضطراب کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں ایک امتحان سے گزرنا ہو گا۔" شہیر نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"کیسا امتحان؟"

"یہ امتحان تو دراصل میرا ہے ایک بیٹے کی حیثیت سے مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں واقعی اپنی ماں سے محبت کرتا ہوں اور میں کسی اور کی محبت کی وجہ سے ان کی محبت کو نہیں بھلا سکتا۔ مگر میں اس آزمائش میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہوں جب تم میرا ساتھ دو۔"

"میں آپ کا ساتھ دوں! مگر کس طرح؟" اس نے سوالیہ نگاہ اس پہ ڈالی "تمہیں اس دوران تھوڑی سی مشکل کا سامنا کرنا پڑے شاید۔ مگر تمہیں میری خاطر سب برداشت کرنا ہو گا۔" شہیر نے آہستہ آہستہ بتایا۔

"کیا برداشت کرنا پڑے گا؟" وہ الجھ رہی تھی۔

"میری جدائی۔"

"آپ کی۔ جدائی؟"

"ہاں نگین۔ مجھے تم سے کچھ دن کو دور رہنا ہو گا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمہاری محبت ممّا کی محبت پہ غالب نہیں آ سکتی اور یہ کہ میں اب بھی ممّا کو جتنی اہمیت دیتا ہوں اتنی اہمیت کسی اور کی بات کو نہیں دیتا۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

"جی!" اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"نگین!" شہیر نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ "کیا محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ جس سے محبت کریں اس کی عزیز ترین ہستیوں کو بھی چاہیں؟" جواباً نگین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر میری جان تمہیں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ تم مجھ سے ہی نہیں میری ماں سے بھی محبت کرتی ہو۔ یقین کرو اگر تم نے اس آزمائش سے گزر کر یہ ثابت کر دیا تو ممّا بھی تمہارے لیے اپنی چھپی ہوئی محبت کے اظہار میں دیر نہیں کریں گی۔" وہ بغیر رکے کہتا چلا گیا۔ "تم سمجھ رہی ہو نا نگین؟"

"جی۔ میں سمجھ رہی ہوں۔" وہ کہتے کہتے رکی اس کے ذہن میں ممّا کے فون والے الفاظ گونجنے لگے "میں یہ ثابت کر دوں گی کہ میں ندا نہیں ہوں بلکہ ان کے دکھ بانٹنے والی ہوں۔"

"اوہ۔ تھینک یو نگین۔" شہیر نے اس کے

دونوں ہاتھ تھام کر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔
چند دنوں بعد اسے شہیر کے آبائی مکان میں پہنچا دیا گیا جو شہر سے کچھ دور ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا۔ اس پاس کچھ کھیت تھے۔ باغات تھے۔ قصبے میں بجلی اور ٹیلی فون کی سہولتیں بھی موجود تھیں مگر اس بڑے سے گھر میں اب اسے صرف ایک بوا اور اس کی بیٹی کے ساتھ رہنا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں مکان کی حفاظت کے لیے ایک چوکیدار بھی تھا جو ہر وقت گیٹ پر موجود رہتا۔ دن میں ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا بھی بوا کی مدد کے لیے آجایا کرتا تھا جو قصبے میں ہی رہتا تھا۔
اس مکان میں وقت گزاری کے لیے بہت سی چیزیں تھیں۔ شہیر نے اس کی پسند کی آڈیو کیسٹ اور مووینز لا کر رکھ دی تھیں۔ کتابیں بھی تھیں تاکہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ وہاں جانے سے پہلے وہ اپنے والدین سے ملنے گئی تھی مگر اس نے انہیں یہ بتایا تھا کہ اسے شہیر کے خاندان کی ایک رسم کے مطابق کچھ دن ان کے آبائی مکان میں گزارنا ہیں، اس لیے وہ کچھ عرصے کے لیے جا رہی ہے۔ اس نے شہیر سے لے کر وہاں کا فون نمبر بھی امی کو دے دیا تھا۔
جس دن شہیر اسے چھوڑ نے قصبہ جا رہا تھا تو ماما نے گلے لگا کر پیار کیا اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی مگر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔
شہیر سارا راستہ اسے ہنساتا آیا تھا مگر وہ دراصل اوپری دل سے ہنس رہی تھی۔ اندر سے اسے طرح طرح کے وسوسے پریشان کر رہے تھے جنہیں وہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گھر کے دروازے پر اسے اتارتے ہوئے شہیر نے کہا۔
”نگین میں کبھی تمہیں اس قسم کی آزمائش سے دوچار نہ کرتا اگر میرے سامنے ممی کی یہ جذباتی کیفیت نہ ہوتی۔ مگر تم بھی مجھے کم عزیز نہیں ہو۔ اس لیے اپنا خیال رکھنا۔“
”اب آپ پھر کب آئیں گے؟“ اس نے اس کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا۔
”بہت جلد۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھپکا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔
وہ کافی دیر تک اس کی گاڑی پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ بوجھل قدموں سے اندر آگئی۔ اس کا استقبال بوا اور ان کی بیٹی نے کیا۔ بوا نے تو اسے دیکھتے ہی بلائیں لے ڈالیں اور صفو نے ایک عجیب انداز میں خوشی کا اظہار کیا۔
کچھ دیر تو وہ ان دونوں کی باتوں میں سب کچھ بھول گئی۔ مگر جب بوا شام کے کھانے کی تیاری کے لیے اس کے پاس سے اٹھ کر گئیں تو صفو کو بھی ساتھ لے گئیں تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر کے سفر کی تھکن اتار لے۔ مگر اسے آرام تو کیا ہوتا اس کمرے کا خالی پن اسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بوا اور صفو کو اپنے کمرے میں ساتھ ہی سونے کے لیے کہے گی ورنہ اسے تو یہ تنہائی اور خاموشی مار ڈالے گی۔
دن گزارنا تو اس کے لیے اتنا مشکل نہ ہوتا تھا کیونکہ وقتی طور پر دل بہلانے کو وہاں بہت سی چیزیں تھیں مگر رات بہت طویل اور خاموش ہوتی تھی۔ صفو اور بوا تو دن بھر کے کام کاج کے بعد تھک کر جلد سو جاتی تھیں (حالانکہ اس کے کمرے میں ہی سوتی تھیں)۔ مگر اسے نیند نہیں آتی تھی اور سب لوگ اسے بے طرح یاد آتے۔
اسے دن میں قصبے میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مگر قصبہ تھا ہی کتنا بڑا دو تین دن میں اس نے پورا قصبہ دیکھ ڈالا۔ فون گھر میں تھا بھی تو وہ کر نہیں سکتی تھی کیونکہ فون ڈیڈ تھا اس پر کال آتو سکتی تھی جا نہیں سکتی تھی۔ اسے ہر وقت اماں اور شہیر کے فون کا انتظار رہتا۔ شہیر ہفتے دس دن میں ایک بار فون کر لیا کرتا تھا جبکہ اماں کا بھی یہی سلسلہ تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اماں سے کہے کم از کم

وہ تو روز فون کر لیا کریں شہمیر کی تو مجبوری ہے مگر وہ کہہ نہ سکی کیونکہ وہ جانتی تھی اس کے اپنے گھر میں تو فون تھا نہیں اماں جب بھی فون کرتیں پی سی او سے ہی کرتیں اور کال بھی کافی مہنگی پڑتی تھی۔

وہ عجیب طرح سے بے بس تھی۔ دوسری چیزوں سے وہ آخر کب تک دل بہلاتی۔ شہمیر نے ایک مہینے میں صرف تین فون کیے تھے۔ ہر مرتبہ اس نے بے چین ہو کر اس کے آنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہنس کر بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ وہ فون پر مسلسل اسے ہنسانے اور اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا۔

پھر ڈیڑھ مہینے کے بعد آخر کار وہ ملنے آ ہی گیا۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے گنگ رہ گئی۔ اس دن لتنے دنوں بعد اس نے ڈھنگ سے کپڑے پہنے سنگھار کیا۔ شہمیر اس کے لیے گجرے لایا تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں میں لگائے۔ مگر وہ بہت جلد چلا گیا۔ وہ پھر اداس ہو گئی اور ایک مرتبہ پھر طویل انتظار شروع ہو گیا۔

دوسری مرتبہ شہمیر نے پورے چار مہینے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا تو یہ فون بھی پورے دو ہفتوں کے انتظار کے بعد آیا جس میں اس نے اپنے آنے کا بتایا تھا۔ اس کے آنے کی خبر نے ایک بار پھر اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اس نے اس دن ــــــ کتنے اہتمام کیے تھے اور سورج غروب ہونے کے بعد تک نگاہیں دروازے پر ہی لگی رہی تھیں مگر وہ نہ آیا۔

وہ قنوطیت کے عالم میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی تھی۔ صفو نے بھی کہہ دیا۔ بھولی بی بی۔ آخر آپ کب تک یوں بیٹھی رہیں گی اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" اور وہ تھک ہار کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آج اس کا دل بے تحاشا رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف اداس ہو جایا کرتی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ صرف ایک آزمائش ہے جو جلد ختم ہو گی مگر آج جب شہمیر کو اپنا وعدہ پورا کرنا یاد نہ رہا جب وہ اسے اتنے آرام سے بھول گیا۔ اس نے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا تو وہ اندر سے ٹوٹنے لگی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ماما کو نہ سہی شہمیر کو تو اس کا احساس ہے مگر اب جب شہمیر وعدے کے مطابق نہ پہنچا۔ تو اسے یوں لگا جیسے اس نے اسے کھو دیا ہو ہمیشہ کے لیے۔ اور یہ احساس لمحہ بہ لمحہ شدید تر ہوتا گیا وہ اپنے بستر پر پڑی بے آواز روتی رہی۔

بوا نے بہت کہا کہ "بھورانی دو نوالے تو کھا لیجیے آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا" مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔ اگر احساس تھا تو صرف یہ کہ شہمیر اب اس کا نہیں رہا۔ وہ اب کبھی اسے نہیں دیکھ سکے گی۔

نہ جانے یہ شدید احساس کیسے اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا اور وہ اسی احساس تلے آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کب بے سدھ ہو گئی۔

"ماما میں آج قصبے والے گھر سے ہو آؤں" شہمیر ناشتے کی ٹیبل پر ان سے پوچھ رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا آج جانا بہت ضروری ہے؟" بیگم افتخار بولیں۔

"آپ کو تو معلوم ہے ماما کہ میں نے اس سے کل پہنچنے کا وعدہ کیا تھا مگر آپ کی ہدایت پر کوریا کے ڈیلیگیشن سے ملنا پڑا اور میں وہاں نہیں جا سکا۔" شہمیر نے وضاحت کی۔

"تو ٹھیک ہے۔ ایک دو دن بعد چلے جانا۔ آج بھی کچھ ضروری کام ہیں پہلے انہیں نمٹا لو۔" بیگم افتخار ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولیں اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

"مگر ماما" شہمیر بھی اٹھ کر ان کے پیچھے لپکا "یہ کام تو نمٹتے رہیں گے۔ میرا وہاں جانا ضروری ہے کیونکہ میں نے وعدہ کیا تھا۔"

"نگینہ اتنی نازک مزاج نہیں کہ تمہاری ذرا سی

وعدہ خلافی سے اسے کچھ ہو جائے گا؟" انہوں نے طنز کیا۔

"مگر ماما آپ جانتی ہیں کہ وہ حساس ہے۔ آپ اس کے لیے اتنی سنگدل تو نہ بنیں پلیز۔"

"شہمیر!" وہ غصے سے بولیں۔ "کیا تم بھی میرے لیے زبیر ثابت ہو گئے؟"

"مما۔ مما۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ ان کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔

"میں زبیر بھائی کیسے ہو سکتا ہوں جبکہ میں نے صرف آپ کی خاطر اسے اتنا عرصہ خود سے بلاجواز دور رکھا۔ اسے کئی کئی دن تک آپ کی اجازت کے بغیر فون تک نہیں کرتا اور اس چار مہینے کے عرصے میں یہ دوسرا موقع ہے جب میں اس سے ملنے جا رہا ہوں تو کیا اب بھی۔"

"تم یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے دن رات اس کے بغیر بے کیف ہیں۔" مما یہ کہتے ہوئے اسے اپنی ماں بالکل نہیں لگ رہی تھیں۔

"جی ہاں۔" وہ بہت تحمل سے بولا۔ "میرے دن رات اس کے بغیر بے کیف ہیں۔ مجھے رات کو دیر تک نیند نہیں آتی اس کے بغیر۔ لیکن میں تو پھر بھی سکون میں ہوں میرے پاس تو پھر بھی آپ موجود ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ سارا دن آفس کی مصروفیات ہیں مگر وہ تو بالکل تنہا ہے۔ نہ کوئی عزیز نہ دوست۔ نہ ہی کوئی مصروفیت اس کا تو فون بھی دن دے ہے مما کہ وہ کسی سے خود بات تک نہیں کر سکتی سارا وقت کسی نہ کسی کے فون کی منتظر رہتی ہے۔ مگر مما اب تو اس کی یہ آزمائش ختم ہو جانا چاہیے کیا آپ کو اس کی وفاداری کا یقین نہیں آیا۔" شہمیر رکے بغیر بولتا چلا گیا۔

"شہمیر!" بیگم افتخار کی آواز اونچی ہو گئی۔

"چلے جاؤ یہاں سے مجھے اب مزید پریشان نہ کرو۔ جاؤ۔"

انہوں نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ تو وہ اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں اس کی خوشبو ہر طرف رچی ہوئی

تھی۔ وہ اپنی چیزیں جس انداز میں چھوڑ کر گئی تھی ویسی ہی پڑی تھیں۔ یہ تو وہی جانتا تھا کہ یہ دن اس کے لیے کتنے کٹھن تھے۔ پچھلی ملاقات میں وقت رخصت اس کا یاسیت بھرا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

"اوہ میں کیا کروں۔ اپنی کس محبت کو بچاؤں۔ کس کو ڈوب جانے دوں!" وہ سر پکڑ کر صوفے پہ گر سا گیا اس وقت اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے آفس جانا تھا۔

"بہو رانی۔ بہو رانی۔ اب اٹھ بھی جائیے دیکھیے دس بج رہے ہیں دن کے" بوا اس کے سرہانے کھڑی پکار رہی تھیں۔

"بہو رانی" بوا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلانا چاہا تو وہ دوسری طرف لڑھک گئی۔ اور بوا کے تو جیسے حواس ہی جواب دینے لگے۔

"اری صفو!" انہوں نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ "جلدی سے ادھر آ۔ دیکھ تو بہو رانی کو کیا ہو گیا ہے"

"کیا ہو گیا ہے چھوٹی بی بی کو" صفو دوڑی ہوئی آئی۔

"دیکھ تو سہی کیسی بے ہوش پڑی ہیں"

"ہائے اماں اب کیا ہو گا" صفو بھی ایک دم گھبرا گئی "چھوٹی بی بی کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔ قصبے میں تو کوئی بڑا ڈاکٹر بھی نہیں ہے"

"یہی تو مجھے بھی فکر ہے" بوا بولیں۔

"اچھا تو یوں کر ان کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے۔ ان کی ہتھیلیاں تلوے مسل۔ میں قصبے کے دواخانے سے ہو کر آتی ہوں شاید ڈاکٹر موجود ہو" وہ تیزی سے کمرے سے نکلتے ہوئے بولیں۔

"یہ سب چھوٹے سرکار کی وجہ سے ہوا ہے" صفو بڑبڑا رہی تھی "کیا ہوتا جو اگر وہ وعدہ پورا کر دیتے۔ چھوٹی بی بی کتنی بے چین تھیں ان کے لیے۔ رب وفا کہیں سب۔ نہ کہ میری چھوٹی بی بی کو بیمار کر دیا" اسے شہیر پر سخت غصہ آ رہا تھا وہ اس کی ہتھیلیاں بھی مسلتی جا رہی تھی تلوے بھی بھی کرتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بوا کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا اماں۔ ڈاکٹر ملا؟"

"کہاں سے ملتا۔ کم بخت اتنے چھوٹے قصبوں میں ملتے کہاں ہیں۔ بس کیا ڈسپنسر بیٹھا ہوا تھا ڈاکٹر کی کرسی پر" بوا ہانپتے میں تھیں۔

"اب کیا ہو گا اماں۔ بی بی تو ہوش ہی میں نہیں آ رہیں"

"تو پھر تو ہی بتا کیا کروں۔ فوراً ڈاکٹر کہاں سے لاؤں" بوا پریشانی سے بولیں۔

"ہم چھوٹے سرکار کو فون کر دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کو لے آئیں گے"

"اے کہاں سے کر دیں فون۔ یہ موا تو نمبر ملاتا ہی نہیں" بوا نے فون کو کوسا۔

"تو اماں تم قصبے کے ڈاک خانے سے کر آؤ۔ کہیں دیر ہو گئی تو بی بی کی حالت زیادہ نہ بگڑ جائے" صفو بولی تو بوا گھبرا کر پھر باہر کی طرف لپکیں۔

فون کی گھنٹی بجی تو شہیر نے ریسیور اٹھایا۔ وہ ابھی تک الجھن کے مارے آفس نہیں گیا تھا۔

"ارے بوا آپ؟ خیریت تو ہے" اس کو ایک دم پریشانی نے گھیرا۔

"اوہ کیا ہوا ثمین کو" وہ بے تاب ہو کر بولا عین اسی وقت بیگم افتخار لاؤنج میں داخل ہو رہی تھیں وہ فون کی گھنٹی سن کر آئی تھیں۔

"تو قصبے کے ڈاکٹر کو بلایا۔ کیا؟ ڈاکٹر بھی نہیں ہے" اس کی بے چینی بڑھ گئی۔

"میں پہنچ رہا ہوں ڈاکٹر کو لے کر" اس نے عجلت میں فون رکھ دیا اور تیزی سے مڑا تو دیکھا مما کھڑی تھیں وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

"مما۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ بہت حساس ہے اس نے میرے کل نہ پہنچنے کو کسی اور انداز میں لے لیا ہے اور اب"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے لاؤنج سے نکل گیا۔

تیز ترین رفتار سے کار چلاتے ہوئے قصبہ پہنچا اور اتنی ہی تیز رفتاری سے وہ اسے کار میں ڈال کر شہر کے اسپتال لے آیا۔ اسے نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی اور شہیر کا پریشانی سے ٹہل ٹہل کر برا حال ہوچکا تھا۔ یہ تصور ہی سوہان روح تھا کہ وہ اسے کھو دے گا۔

ڈاکٹرز نے اگرچہ ابھی مایوس نہیں کیا تھا مگر۔

شام میں وہ کسی کام سے گھر آیا تھا تو اسے مما نظر نہیں آئیں۔ وہ ان کے کمرے کی طرف آیا تاکہ انہیں اس کی حالت کے بارے میں بتا دے تو دیکھا کہ وہ جائے نماز پر بیٹھی دعا گو ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

"مما" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں جانتا ہوں آپ اسے چاہتی ہیں۔" وہ زیر لب بولا تبھی اسی لمحے وہ دعا کر کے فارغ ہوئیں اور پلٹیں تو اسے کھڑا ہوا پایا۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکیں۔

"اب وہ کیسی ہے؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"دیکھو شہیر بیٹے میں نے خود اللہ سے اس کے لیے دعا کی ہے میں نہیں چاہتی کہ اسے کچھ ہو۔"

"میں جانتا ہوں مما!" شہیر بولا۔

"مگر اس کی حالت اچھی نہیں ہے اسے واقعی آپ کی اور سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے آپ پلیز اس کی امی وغیرہ کو خبر کر دیں میں نے اب تک انہیں نہیں بتایا ہے" وہ یہ کہہ کر مڑا تو انہوں نے روک لیا۔

"ٹھہرو بیٹے میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں" انہوں نے جلدی سے اپنا پرس اور موبائل فون اٹھایا اور اس کے ساتھ چل دیں۔

اور ہاسپٹل میں جب ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ اب وہ بالکل خطرے سے باہر ہے اور ہوش میں آرہی ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"نگین۔ نگین میری بچی آنکھیں کھولو!" وہ اس کا ہاتھ تھامے اس پر جھکی ہوئی تھیں "نگین۔ بیٹا دیکھو میں۔ میں تمہاری مما۔ یہ دیکھو شہیر بھی موجود ہے۔"

"مما۔ شہیر" نگین کے کپکپاتے لبوں سے نکلا۔ اور پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور نگاہوں کے سامنے مما کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی" اس نے جھٹ اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔

"نہیں میری بچی یہ خواب نہیں ہے۔ شاباش آنکھیں کھولو" وہ بہت دلار سے کہہ رہی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کہتی رہیں۔

"کیا واقعی" اس نے آنکھیں کھول کر نگاہ دوڑائی تو شہیر کو مما کے پیچھے کھڑا ہوا پایا۔

"کیا واقعی میری آزمائش ختم ہوگئی ہے۔ کیا واقعی میں اس امتحان میں کامیاب ہوگئی ہوں"

"ہاں میری بچی۔ تم واقعی اس امتحان میں کامیاب ہوگئی ہو۔ سدا خوش رہو" انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر پیار کیا اور کمرے سے چلی گئیں یہ کہہ کر کہ "میں جا کر نگین کا صدقہ نکالتی ہوں" ان کے جانے کے بعد اس نے شہیر کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

"جان شہیر میری خطا معاف کر دو" اس نے ہاتھ جوڑے "دیکھو اتنے دن تمہاری جدائی برداشت کی ہے۔ اب تمہاری بے رخی سہنے کی سکت نہیں ہے مجھ میں" اس نے یہ بات اتنے فلمی اسٹائل سے کہی کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ساری خفگیاں خود بخود دھل گئی تھیں اور اسے یوں لگا جیسے وہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کر رہی ہو۔

میاں بیوی کا خوشگوار حسین تعلق دراصل اعتبار' اعتماد یقین کی بنیادوں پر مستحکم ہوتا ہے' اعتبار اور خلوص نہ ہو تو ہر بندھن وقت کے ساحل پر بکھر جائے۔

محبت رشتے کو مضبوطی بخشتی ہے' نفرت دوریاں پھیلا دیتی ہے جھوٹ مبالغہ آرائی دراڑیں ڈال دیتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے سنجوگ کی کوئی صورتحال نظر نہیں آتی۔

اتنے مضبوط اور اٹوٹ بندھن کے درمیان جھوٹ کیوں جنم لیتا ہے مبالغہ آرائی کیوں اختیار کرنی پڑتی ہے توجیہات کیوں دینی پڑتی ہیں عذر کیوں تراشنے پڑتے ہیں۔

سیدھے سادے راستے پر کیوں گامزن نہیں ہوا جاسکتا۔

مسلسل سوچوں نے اس کے اعصاب کو شل کردیا۔ طویل سفر کی تھکن اس کے وجود پر سوار ہونے
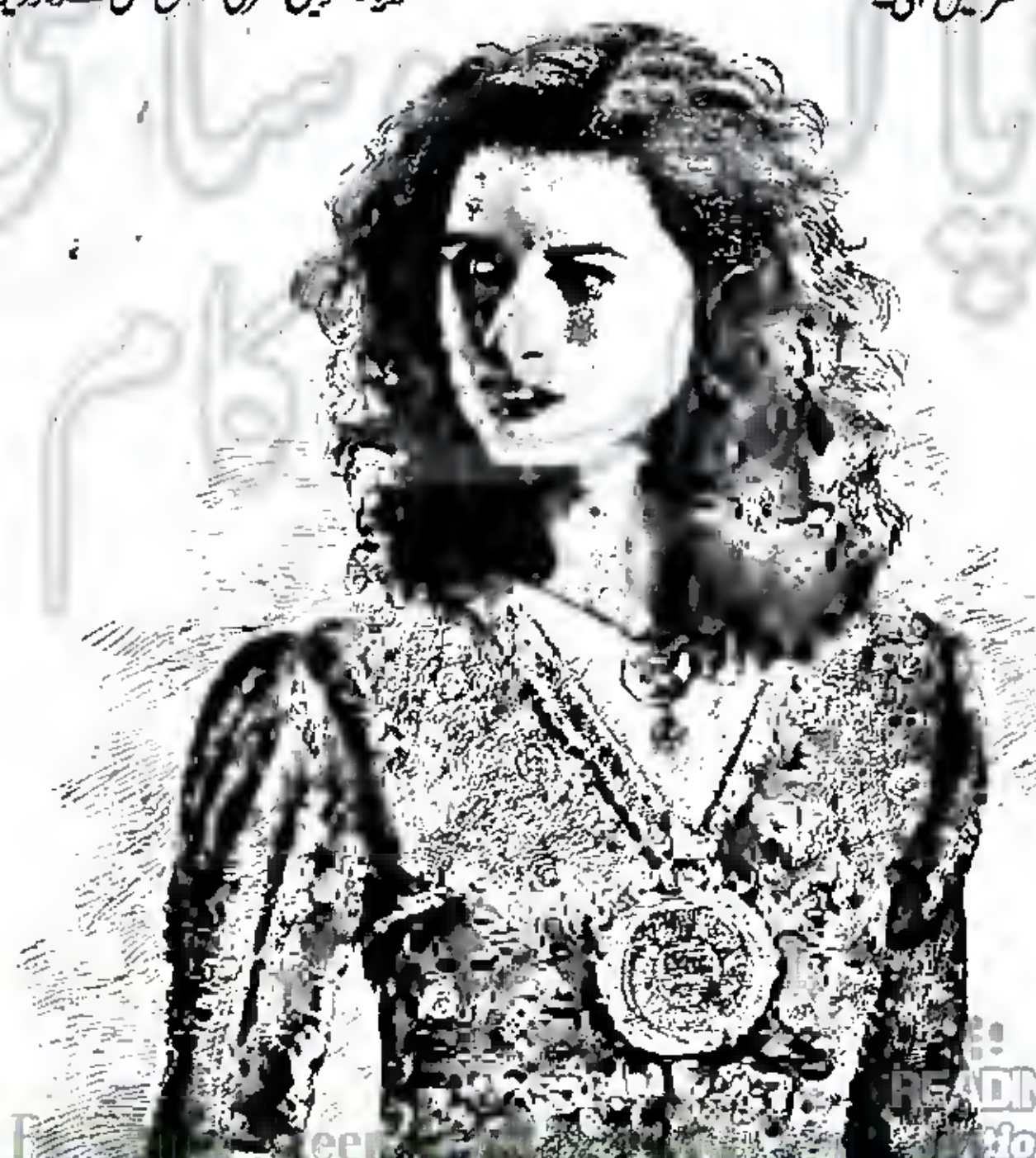
کی اپنا مضبوط بندھن عارضی سہارا محسوس ہونے لگا۔

رعنا حسام کا اصول تھا کہ ملو تو خلوص یگانگت ' بے غرضی اور دلی تعلق سے ملو' اگر نہیں تو ضروری نہیں ہے تعلق کو مشکوک بنا ڈالو' دلوں کو کدورتوں کی نذر کرکے چہرے پر مبالغہ آرائی سجالو' محبت اور شک ایک دل میں رہ ہی نہیں سکتے۔

جھوٹی محبت ہر حال میں جھوٹی ہوتی ہے کسی بھی لمحے بدترین نفرت میں بدل جاتی ہے۔

کیا میری محبت بھی بدترین نفرت میں بدل جائے گی

"کیا میں بھی حسام عارف سے شدید نفرت کا اظہار کروں گی۔

"نہیں۔۔۔۔!" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"یہ کس طرح سے ممکن ہے میں۔۔۔ میں یعنی رعنا نصیح احمد جس نے حسام عارف کو ٹوٹ کر چاہا' انمول رتن سمجھ کر دل کی وسعتوں میں چھپایا جو میرا حاصل زندگی ہے گیا۔۔۔ کیا اس سے میں نفرت کر سکتی ہوں ۔۔۔ نہیں قطعی نہیں ناممکن۔" اس نے گرل پر رکھے ہاتھ پر اپنی پیشانی ٹکا دی۔

"جو محبت کرتا ہے اسے ناممکنات کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔" ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔
"محبت نہ سیکھی جاتی ہے اور نہ سکھائی جاتی ہے' یہ تو وہ احساسات' جذبات ہوتے ہیں جو دل کی نرم گرم زمین پر نمو پا کر پروان چڑھتے ہیں۔"
اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دور افق کے پار ڈوبتے سورج کی زرد شعاعوں کو دیکھا' ہر جانب عجیب مٹیالا سا اندھیرا چھانے کو تھا۔
"کل سورج دوبارہ نکلے گا آج ڈوب گیا تو کیا ہوا' یہ اٹل حقیقت ہے' اور حقیقت کا سامنا کرنا بہت دل گردے کا کام ہے یا تو تم خوف کی چادر اوڑھ کر بے سائبان ہو جاؤ۔
یا پھر...!
حسام عارف کو اپنے روح و قلب میں ڈھال لو۔"
اس کے دل نے جذبات میں آئے بغیر اس کے مدمقابل کھڑے ہو کر بلا کسی مشروط جذبے کا سہارا لیے بغیر فیصلہ سنا دیا۔
"یہ اگرچہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں اسے تم چیلنج سمجھ کر قبول کرو' آخری ضرب کبھی کبھی کامیابی سے بھی ہمکنار کر دیتی ہے اور کبھی...." وہ سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس بھی کے آگے اس نے مزید کوئی بات نہیں سنی کہ ہر حال میں اسے خود کو ثابت قدم رکھنا تھا۔ مضبوطی سے قدم اٹھاتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

......*

"گویا تم شکست کھا بیٹھی ہو...؟" کنول نے بڑے یقین سے کہا۔
"نہیں...!" اس نے مضبوطی سے تردید کر دی۔
"یہ میری محبت ہے اور محبت کبھی شکست نہیں کھاتی۔"
"اتنا یقین' اور وہ جو اس کے رویے' اعتراضات شکایت ہیں وہ۔" اس کے لہجے میں تحقیر اور لفظوں میں گمان غالب تھا۔
"وہ کچھ نہیں ہے' سوائے اس کے کہ وہ ایک جذباتی مرد ہے اور جذباتی مرد بہت جلدی باغی ہو جاتا ہے' اور مجھے اسے بغاوت سے باز رکھ کر تمام تر شعوری کوشش کا اختیار حاصل کر کے ایک راہ پر چلانا ہے۔
میں نے اسے وقتی نہیں ابدی درد آشنا چاہا تھا' اپنے مزاج کے تمام موسموں کا ساتھی سمجھا تھا بے شک مجھے اعتراف ہے میرے انتخاب میں کہیں کوتاہی ہوئی ہے کہیں کچھ ہوا ہے مگر میں پشیمان نہیں ہوں عورت محبت ایک بار کرتی ہے اور پھر اس کے سہارے زندگی گزارتی ہے میری محبت ہاتھ میں پکڑا کشکول نہیں ہے۔
عورت کا ظرف بہت بلند ہوتا ہے اور میں عورت پر کوئی الزام نہیں آنے دینا چاہتی جستجو کی پہلی سیڑھی پر میں شکست کھا کر ڈھ نہیں جاؤں گی' بلکہ اسے الفت کے معنی سمجھاؤں گی۔"
اس کے لہجے میں اعتراف' یقین' مضبوطی' گہرائی' سب ہی کچھ تھا۔
"بہ صورت دیگر...!" بے ساختہ سوال تھا۔
"یہ محبت کا چیلنج ہے اور محبت بصورت دیگر نہیں دیکھتی۔" وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔
"ہوں...!" کنول سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔
"خدا تمہیں تمہارے مقاصد میں کامیاب کرے۔" کنول نے جس دل سے کہا وہ جانتی تھی۔
"واقعی تم ٹھیک کہتی ہو عورت محبت کے چیلنج میں سود و زیاں نہیں دیکھتی اور نہ ہی ہار تسلیم کرتی ہے۔" وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی "میں بھی شکست تسلیم نہیں کروں گی۔"
"کہاں چلیں...؟"
"بس اب چلوں امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
"تم کب تک یہاں ہو...؟"
"صبح ہی حسام چھوڑ کر گئے ہیں شام کو لے جائیں گے وہ تو کہہ رہے تھے کہ چند دن رہ جاؤ مگر میں نے ہی منع کر دیا۔" وہ ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔
"کیوں...!" کنول کے چلتے قدم رک گئے۔
"ہر مرد کی قسمت میں ایک عورت ہوتی ہے ہر عورت کی قسمت میں ایک مرد... اس مرد کو بھرپور

طریقے سے ہمارا ہی ہونا چاہیے' کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے نا۔"

"اس مرد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کی قسمت میں دو عورتیں ہوں۔" سوال بے ساختہ اور ذو معنی تھا تاہم کنول کے ہونٹوں کی نیم وا مسکراہٹ سے وہ اسے شرارت ہی سمجھی۔

"میری جان دو کشتیوں کا مسافر خسارے میں بھی تو رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا اور وہ کنول کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

"بے وقوف۔" وہ اپنی معصوم دوست کی بات پر زیر لب مسکرائی اور اماں کی جانب آگئی۔

"کبھی ہمارا معصوم دوست خود ہی ہمارا ازلی دشمن ثابت ہوتا ہے۔ آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے کی سبب اختیاری بہت سے گھاؤ بھی لگا دیتی ہے۔"

......*

"چلو۔" آفس سے آتے ہی کھڑے کھڑے حسام نے آرڈر دے ڈالا۔

"ارے اتنی جلدی بابا تو آجائیں۔" رعنا نے اطراف میں نظر دوڑا کر اسے دیکھا۔

"کیوں کیا صبح نہیں ملیں بابا سے؟" اس نے کڑی نگاہ ڈالی۔

"ملی تھی اور ان کے پوچھنے پر ہی کہا تھا آپ کی آفس سے واپسی کے بعد جاؤں گی۔"

"مجھے کچھ فائلیں دیکھنی ہیں۔ تم بعد میں فون پر معذرت کر لینا۔"

"پلیز حسام یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"حسام بھائی چائے۔" نبیلہ ٹرے تھامے آگئی۔

"سوری بھئی' آج تو بہت چائے پی ہے ٹھنڈے کی خواہش تھی۔" اس نے معذرت کے ساتھ ساتھ اپنی خواہش بھی بتا دی رعنا شرمندہ ہو گئی حالانکہ چائے اس کا پسندیدہ مشروب تھی۔

"وہ بھی لائی۔" اس نے ٹرے رکھ کر رعنا کو چائے کی آفر کی اور پلٹنے لگی۔

"تمہارا ٹھنڈا پھر کبھی سہی' مجھے جلدی گھر جانا ہے۔"

"اتنی بھی جلد بازی ٹھیک نہیں' بیٹا رات کا کھانا کھا کر جانا۔" اماں جان ادھر آگئیں انہوں نے آخری جملہ سن لیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم رہو' میں چلا جاتا ہوں' نوکری ہوگی تو سب کچھ ہوگا۔" خاصی بے رخی سے کہتا وہ کھڑا ہو گیا' اماں جان بھی ہکا بکا رہ گئیں اس کے انداز پر' شرمندگی در شرمندگی تھی۔

مزید سوالوں سے بچنے کے لئے وہ بیگ لے آئی۔

"اچھا اماں جان ہم جا رہے ہیں اگلے ویک اینڈ پر آئیں گے بابا کو سلام کہیے گا نبیلہ میرا گلا تمام کرتا اور فاروق سے کہنا کہ جلدی سے مجھے وہی گفٹ لا کر دے۔"

بالکل نارمل لہجے میں بات کرتی مسکراتی ڈھیرے سے نبیلہ کے رخساروں پر پیار کرتی وہ حسام کے برابر جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

شدید اضطرابی ماحول میں اندر کے خلجان کو باہر نکالنا سراسر خسارے کا سودا ہوتا ہے لب بھینچ کر وہ تمام راستہ خاموش بیٹھی رہی۔

اس کے اور حسام کے تعلق کے درمیان یہ تو طے تھا کہ وہ گھر والوں کی انسلٹ نہیں ہونے دے گی آج کے اس ناروا سلوک پر اس کی احتجاجی خاموشی حق پر تھی تاہم حسام پر مطلق اثر نہ تھا۔

اور ہوتا بھی کیسے آج کل وہ سنہری زلفوں اور براؤن آنکھوں والی مارگریٹ کے چکر میں چکرا کر چاروں شانے چت گر پڑا تھا موصوفہ گرین کارڈ کی مالک امریکا کی شہری تھیں اچھی خاصی جائیداد تھی امریکا میں' آج کل یہاں ایجوکیشن گروپ کے ساتھ آئی تھیں پاکستان کی کشش یہاں کھینچ لائی تھی۔

ٹریول ایجنسی میں مشکل کا شکار ہو کر بے ساختہ ہی حسام عارف کو مدد کے لئے پکار بیٹھی حسام صاحب جی جان سے فدا ہو کر تمام تر مدد کے لئے تیار ہو گئے۔

"حاضر ہوں اگرچہ میں گیڑا ذرا سا ہوں مگر راہ میں روشنی کروں گا۔"

کے مصداق اور وہ گوڈے گوڈے اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

دوسرے دن مسکرا کر اس نے سب کو پسندیدگی کی سند دے دی تھی۔ پہلے دن ہی سے حسام اسے سمجھا ہوا شائستہ مودلگا اور مردوں کی شائستگی و وقار اس کا آئیڈیل تھی گزرتے وقت نے اس پر مہر لگا دی تھی۔

حسام نے اسے کنول کے گھر میلاد میں دیکھا تھا قرأت کا انداز و پاکیزگی والا روپ اتنا بھایا کہ بے اختیار وہیں محفل میں ہی ماں کو بتا دیا۔ کنول اس کے دوست اظہار کی بہن تھی۔ ان کے گھر قرآن خوانی تھی ساتھ ہی محفل میلاد بھی۔

کنول' رعنا کی بھی دوست تھی قریب ترین' دونوں کے گھر ایک ہی روڈ پر چند گھروں کے فاصلے پر تھے۔ اظہار اور حسام بچپن کے دوست تھے دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا کنول بچپن سے ہی حسام کو پسند کرتی تھی حسام کو بھی وہ اچھی لگتی تھی مگر صرف بحیثیت دوست کے پھر بچپن میں تو لڑکے لڑکیاں ساتھ ہی کھیلتے' بڑھتے' جوان ہوتے ہیں' ان جذبوں کو محبت کا جذبہ نہیں کہا جا سکتا۔ کنول اس کو ٹوٹ کر چاہتی تھی اپنی پسند سے آگاہ بھی کر دیا تھا کچھ عرصے کے لئے حسام بھی سنجیدہ ہو گیا اپنی محبت کا یقین بھی دلا دیا۔

مگر یہ سب کچھ وقتی تھا اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں تھا ایک جگہ پر ٹک نہیں سکتا تھا اس کے نزدیک زندگی کھاؤ' پیو موج اڑاؤ کی طرح تھی یہی وجہ تھی وہ لڑکیوں کے حلقے میں مشہور تھا' کالج میں لڑکیاں اس پر فدا ہو ہیں' یونیورسٹی میں اس کی شخصیت کا کریس کچھ اور بڑھ گیا۔

اور جب مرد کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہو جائے تو وہ کچھ اور خاص طریقے اختیار کر لیتا ہے حسام کا شمار ان ہی مردوں میں ہوتا تھا۔

اس کے انداز نے نہ صرف کئی لڑکیوں کو گھائل کیا بلکہ کئی لڑکیاں اس پر مرمٹیں' لیکن حسام صرف خاص لڑکیوں کو ہی لفٹ کراتا جو یک بیک ہی اس کے من کو بھا جاتیں۔

حسام اظہار کا بہت اچھا دوست تھا اظہر کو بس حسام کی اس ایک بات سے اختلاف تھا کہ وہ کیوں بلاوجہ لڑکیوں کے نازک آبگینوں جیسے جذبات سے کھیلا کرتا ہے کیوں ان کے دلوں کو توڑتا ہے جواب میں' ایک بلند و بانگ قہقہہ لگا کر بات کو ہنسی میں اڑا جاتا۔

"میں تو نہیں بلاتا انہیں۔" وہ خاص ادا سے جھک کر کہتا۔

"تو جانتا ہے کہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں اس معاملے میں ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں پھر بھی۔ پھر بھی۔" اظہار کو دکھ ہوتا۔

"کیا ان کے والدین کو علم نہیں ہے کہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں مت بھیجیں تعلیم حاصل کرنے۔" وہ آنکھ بند کر کے مسکراتا' تبھی تبھی اظہار کو بہت برا لگتا تھا۔

کنول کو حسام کی شادی کا شدید دکھ تھا۔

وہ تو صبر و آس کا دامن تھامے انتظار میں تھی یہ کیا ہوا اس کے بجائے کسی اور کے لیے قبولیت کا در کھل گیا اس کی مانگی ہوئی دعائیں کسی اور ہتھیلی پر رقم ہو گئیں۔

وہ شاک کی کیفیت میں تھی' اس کی دوست' اس کے دکھ سکھ کی ساتھی نے اس کے جذبوں پر شب خون مارا تھا۔ اس کے اندر کی حسد و رقابت کی آگ میں جلتی لڑکی جھٹکے سے شعلوں کی تپش سے جھلس کر اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہ کیونکر ہو گیا۔" وہ تحیر کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ ادھر ولیمہ ہو گیا اور وہ جوڑا ہنی مون کے لئے بھی پرواز کر گیا۔

رعنا تو اس کی محبت سے آگاہ تھی۔

اس نے حسام کا صرف نام ہی تو نہیں بتایا تھا صرف تعارف ہی تو نہیں کروایا تھا اسے یقین تھا کہ رعنا سمجھ گئی ہو گی مگر افسوس کنول کئی سالوں کی دوستی میں یہ ہی نہ سمجھ سکی کہ رعنا فصیح احمد کو ٹٹولنے کی عادت نہیں ہے جتنا بتا دیا جائے اسی پر قناعت کرتی ہے اور کنول دل و جان سے رعنا سے شدید نفرت کرنے لگی تھی مگر بظاہر وہ بالکل نارمل انداز میں ملتی تھی منافقت کا لبادہ بہت سے روپ چھپا لیتا ہے۔

رعنا شادی سے پہلے کی محبت کی قائل نہیں تھی' جذبوں کو رائیگاں کرنے سے کیا فائدہ' جب کہ یہ طے

ہے کہ کوئی ایک مرد ہماری زندگی میں رقم ضرور ہوگا کیا فائدہ پھر محبتوں کی بھیک مانگنے کا اور نہ ہی اسے اس بات پر یقین تھا کہ محبت ایک نظر میں ہو جاتی ہے۔

یہ ہی وجہ تھی کہ وہ کنول کی خود ساختہ محبت سے خائف تھی' اسے سمجھاتی تھی کنول اس کی بات کو اہمیت نہ دیتی تھی۔

کنول سوچتی "یہ ہی وجہ تھی حور عنا اسے حسام سے محبت کرنے سے روکتی تھی' اندر ہی اندر دوست ہو کر جڑیں کاٹتی رہی دیکھنا میں ایسا بدلہ لوں گی تمہاری جڑیں بھی ایسی کند چھری سے کاٹوں گی کہ اس کا تریاق بھی نہ ہوگا میں اپنی محبت کو حاصل کر کے رہوں گی۔"
اس کا قطعی فیصلہ تھا۔

لڑکیاں واقعی بے وقوف ہوتی ہیں اس لئے حقیقت کی آنکھ کو بند رکھتی ہیں' کنول فاروقی کو لوگوں کو پرکھنے جانچنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا رعنا کو سمجھنے میں بھی اس سے سراسر غلطی ہوئی۔

بچپن سے جوانی کے فاصلے نے بھی حسام کو سمجھنے نہ دیا آنکھ بند کر کے حسام کو پوجتی رہی۔

درحقیقت محبت صرف شکلوں سے نہیں ہوتی عادت' اطوار' گفتار' نیچر' جذبات عقل' رکھ رکھاؤ نشست برخاست تمام چیزوں کا احاطہ کرتی ہے۔ محبت جذبات سے نہیں عقل سے ہوتی ہے۔ پہلی نگاہ میں صرف شکل اچھی لگتی ہے عقل نظر نہیں آتی دوسری نگاہ بھی چہرے پر ہی پڑتی ہے۔

محبت ہمیشہ سیرت سے کرنی چاہیے' چہرے ہمیشہ دھوکا دے جاتے ہیں۔

جیسے بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے سرورق کے ساتھ بہت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن انہیں خرید کر پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے ماسوائے رقم اور وقت کے ضائع کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔

فرق صرف اتنا ہے اس زیاں کا کچھ عرصے بعد احساس ہوتا ہے جب وقت کا دھارا تیزی سے بہہ جاتا ہے' جب کہ کتاب کے معاملے میں رد عمل فوری ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں پر حساب برابر ہوتا ہے سود و زیاں کا کوئی حساب نہیں ہوتا خسارے کا سودا دکھ' اذیت' آنسو ہی دیتا ہے۔

"بھابھی کیا پکایا ہے آج۔"

خلاف توقع آج جلدی آ گیا تھا' کوریڈور میں ہی فائزہ سے پوچھ لیا اس کے قدم لاؤنج میں ہی ٹھہر گئے۔

"معلوم نہیں کیا پکایا ہے آج تو تمہاری بیگم کی باری تھی۔" بھابھی کی ذو معنی مسکراہٹ نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

"تو گویا آج بدمزہ کھانا کھانا پڑے گا اس سے بہتر تھا کہ میں باہر کھا لیتا۔" اس کی ناگواری کا احساس رعنا کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

ابھی کچھ ہی عرصے پہلے کی تو بات تھی اس سے اچھا کھانا تو کوئی پکا ہی نہیں سکتا تھا اور اب۔۔۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

ارجمند خاتون بغور حسام کا جائزہ لے رہی تھیں اندر ہی اندر کتنے خدشات نے جنم لے لیا تھا' نوٹ تو وہ کتنے ہی دنوں سے حسام کی حرکات و سکنات۔۔ کر رہی تھیں موقع کی تلاش میں تھیں کہ اس کو سمجھایا جاتا۔

"کیوں بھئی! ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ اچھا بھلا مزیدار کھانا تمہیں بدمزہ لگنے لگا۔"

"آپ کو خود اندازہ ہونا چاہیے کبھی نمک تیز ہو جاتا ہے کبھی گرم مسالہ۔"

"اور تمہارے مزاج کی۔۔۔ گرمی کا کیا کروں؟" انہوں نے گھیراؤ کیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں' کیوں بھابھی کیا میں نے غلط کہا۔" اس نے فوراً" فائزہ بھابھی کی جانب مدد طلب نگاہ موڑلی۔

"میں کیا جانوں میاں' بیوی تمہاری ہے مزہ' بدمزہ تم ہی جانو۔"

ارجمند خاتون کو فائزہ کی پہلو تہی کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا جانتی تھیں اس کی وجہ بھی۔

"اپنا قبلہ درست کر لو حسام' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" انہوں نے اپنی قوت برداشت کو استعمال کر کے تنبیہہ کی۔

"میں نے کیا کیا ہے امی۔" اس نے تحیر سے انہیں دیکھا۔

"تم جو کرنا چاہتے ہو وہ بھی میں جانتی ہوں' اب میں تمہاری کوئی شکایت نہ سنوں اور نہ ہی اب تم چھڑے چھانٹ ہو کہ من مانیاں کرتے پھو' جو کرنا تھا تم کر چکے ہو اور جو کچھ ہوا ہے تمہاری ایما پر ہوا ہے' بہتر ہے کہ مجھے کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔"

پس پردہ انہوں نے بہت کچھ سمجھا دیا۔

"خوامخواہ ناراض نہ ہوں امی میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ مزید ان کی کوئی بات سنے بغیر باہر نکل گیا' رعنا بھی اپنے قدموں جانے کو تھی۔ پھر رک گئی۔

"تم بھی ہر وقت اس کی ہاں میں ہاں نہ ملایا کرو اپنی عقل کا استعمال بھی کیا کرو سمجھ نہیں ہے حسام۔"

ساس نے فائزہ کو بھی تنبیہہ کی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ صفائی میں بولتی وہ باہر نکل گئیں گہرا سانس لے کر رعنا پلٹ گئی۔

اسے تو کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اس کی ڈھال بہت مضبوط تھی۔

ڈھال جتنی بھی مضبوط ہو خود پر گرفت بھی رکھنی چاہیے اپنی قوت برداشت اور گویائی پر اسے بخوبی کنٹرول تھا۔

--*

"آج امی کے گھر جانا ہے۔" بڑے دنوں بعد اس نے حسام کی کج روی کو یکسر نظر انداز کر کے کہا۔

"کیوں ابھی تو تم ہو کر آئی ہو کیا مزہ آتا ہے روز جا کر۔" اس نے ناگواری سے اسے گھورا۔

"ابھی کہاں' پورے اٹھارہ دن ہو گئے ہیں کتنا کمزور مینٹل ہے آپ کا ظاہر ہے سب کو میری فکر ہوتی ہے کیا میں ان کی فکر نہ کروں' پھر وقاص کی سالگرہ بھی ہے آج۔"

"ٹھیک ہے چھوڑ دوں گا' رات کو پک کر لوں گا۔" وہ بریف کیس میں جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

"کیا آپ کا کام صرف پک اینڈ ڈراپ کا ہی رہ گیا۔" اس نے مطمئن انداز میں پوچھا۔

"پھر کیا چاہتی ہو تم۔" یک دم ہی تیکھی نظروں سے لہجہ بدل کر بولا۔

"وہی جو ہر لڑکی چاہتی ہے وہی جو ہر داماد کا حق ہوتا ہے۔"

اس کے سخت لہجے کے جواب میں رعنا نے بالکل ہی ٹھنڈے لہجے میں قدرے مسکرا کر بات کی۔

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے رعنا بیگم کہ فضول کے چونچلے برداشت کرتا رہوں' اطلاعاً" عرض ہے کہ میں ایک مصروف بزنس مین ہوں اور یہ میرا شوق نہیں مستقبل بھی ہے۔" اس نے وارننگ دیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایک بات میری طرف سے بھی اطلاعاً" عرض ہے ہر انسان مصروف ہوتا ہے لیکن حقوق و فرائض بھی کوئی اہمیت رکھتے ہیں جب میں آپ کے ساتھ ہر تقریب میں آپ کی فیملی میں جاتی ہوں تو میرا بھی تو حق بنتا ہے کہ آپ۔"

"اب تقریر کرنے مت بیٹھ جانا کہہ دیا ہے کہ میرے پاس فضول ٹائم نہیں ہے' چلنا ہے تو چلو گیٹ پر اتار دوں گا۔"

وہ وارننگ دیتا کھڑا ہو گیا اس کی بات دلیل کے ساتھ ہی رد کر دی۔

کچھ لوگ ہوتے ہی اس طرح کے ہیں' جہاں اہمیت دی جائے وہیں بس جاتے ہیں باقی ہر جگہ پر ٹانگ ٹوپیاں ماریں گے' حسام احمد کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

"ٹھیک ہے میں نہیں جا رہی۔" اس نے حتمی فیصلہ دے دیا۔

"سوچ لو میرے پاس وقت کم ہے۔" اس نے دوٹوک انداز میں دیکھا مگر وہ سنی ان سنی کر کے باہر نکل گئی۔

وہ بھی کندھے اچکا کر باہر نکل گیا راستے کا پتھر خود ہی لڑھک گیا ویسے بھی اسے آج ہر صورت میں مارگریٹ کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا رعنا۔" ارجمند خاتون نے اسے لان میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"اور کیا کروں امی اب میرے پاس ان کے لئے

ہم نہیں ہے ہر بار میں اکیلی جاتی اچھی لگتی ہوں بھلا' ہر بار گھر والوں کے سوال و جواب' میں کہاں تک انہیں مطمئن کروں' والدین کے سوچنے کے انداز بدل بھی سکتے ہیں۔"

"بے شک بدل سکتے ہیں بیٹا مگر انہیں ایسا موقع ہی دو۔"

وہ اس کا روہانسا چہرہ دیکھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم ہی ۔۔۔ میں موقع دیتی ہوں انہیں۔" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"میری جان! میرا بیٹا۔" انہوں نے شفقت و محبت سے اس کا سر شانے سے لگا لیا۔

"میں بھی عورت ہوں بیٹا اور عورت ہی عورت کا دکھ بہت اچھی طرح سے جان سکتی ہے' بے شک میں بیٹے کی ماں ہوں ایک ساس ہوں' مگر سخت گیر نہیں ہمیشہ حق بات کہوں گی' چاہے میرا بیٹا ہی کیوں نہ برا مانے۔" وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں کو سہلانے لگیں۔

"یہ جو مرد ہوتے ہیں نا' جب شوہر بنتے ہیں تو خود کو مطلق العنان سمجھ کر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھتے ہیں میں اپنے بیٹے کی عادت سے واقف ہوں اس لئے تمہارا ساتھ دوں گی تمہیں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہے' اور ٹھنڈے لہجے کو اختیار کرنا ہے ہر جگہ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانا صحیح نہیں ہوتا' حسام تمہارا ہے تمہارا ہی رہے گا۔" اس کی نگاہوں کو مضبوطی سے تھام کر وہ کہتی رہیں کیسے تمہارا نہیں بنتا۔

تمہارا حق بنتا ہے بیٹا کہ اس کو اپنے معیار کے مطابق ڈھال لو جب بیوی شوہر کے معیار میں ڈھل سکتی ہے تو پھر شوہر کیوں نہیں' پھر یہ تو ایک بیوی کا حق ہے۔"

رمشا حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی ایک ماں کا یہ کہنا کہ شوہر کو اپنے معیار کے مطابق ڈھال لو' جب کہ وہ ایک ساس بھی ہو' کتنی اعلا ظرف عورت ہے۔

"خامیاں اور خوبیاں تو ہر ذی روح میں ہوتی ہیں نہ کوئی خوبیوں کا مرقع ہوتا ہے نہ خامیوں کا مجموعہ' بات بس حوصلے' ضبط و شائستگی اور ثابت قدمی کی ہے تم بہت اچھی ہو اور میں چاہتی ہوں حسام تمہارا ہی رہے۔"

"ہوں ہی ۔۔۔" اس نے قدرے حیرانی سے دیکھا۔

"یہ کیسی باتیں اور کس قسم کی نصیحت ہے۔"

"ابھی تم نہیں سمجھو گی بس جو میں کہتی ہوں وہ کرو حسام پر اپنی گرفت مضبوط رکھو اپنی منواؤ' ہر جگہ پر خاموشی' بھی حضوری نہیں چلتی' اپنی بات منوانا ہر عورت کا جائز حق ہے اور میں تمہیں اس حق سے منع نہیں کروں گی۔"

رمشا کے چودہ طبق ایک ساتھ روشن ہو گئے' یہ کس قسم کی نصیحت تھی کیسی حکمت عملی تھی یا خدایا۔ حقیقت میں اس کی سمجھ میں ارجمند بانو کی گہری باتیں نہیں آئیں اور نہ ہی یہ حکمت عملی کا محتاط انداز بلکہ وہ تو عالم تحیر میں تھی اور ارجمند خاتون اٹھ کر اندر بھی چلی گئیں۔

رمشا کے لئے سوچوں کے بہت سے در وا ہوتے چلے گئے' کیا اس کے دل کے خدشات درست ہیں' اس کی چھٹی حس نے جو حسام کے متعلق فیصلہ دیا ہے وہ ٹھیک ہے؟ اور کیا اس کو ہی کوئی قدم اٹھانا ہو گا؟"

"نہیں ۔۔۔!" بہت دیر تک سوچ و بچار کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔

"نہیں ۔۔۔ فی الحال وہ کوئی فیصلہ نہیں دے گی تیل کی دھار کا رخ دیکھے گی طوفان کا اندازہ کرے گی' پھر ۔۔۔ پھر کوئی بات کرے گی جلد بازی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتی۔" اس نے اطمینان سے سوچا۔

ہارن کی آواز پر اس نے خود اٹھ کر گیٹ کھولا' گاڑی کی روشنی میں حسام نے اسے دیکھا' چونکا اور پھر گاڑی اندر لے آیا اتنی دیر میں رمشا گیٹ بند کر چکی تھی۔

حسام نے اس کے چہرے کے تناؤ سے اندازہ لگایا کہ آج کوئی بات ضرور ہوئی ہے اور کافی دنوں سے حسام کسی چور دروازے کا منتظر تھا جس سے جست لگا کر وہ اپنی منزل تک پہنچ سکے۔

"آج چوکیدار نہیں آیا؟"

"نہیں اس کی بیوی بیمار ہے اسپتال گیا ہے۔"

"اوہ۔" سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑے' اور اندر بڑھ گیا۔

"کھانا۔۔۔" حالانکہ پوچھنا فضول تھا' کھانے کا ٹائم گزرے بہت دیر ہو چکی تھی۔

"نہیں' ہوٹل میں ڈنر تھا۔"

اس نے گھڑی دیکھی' ڈیڑھ بجے ڈنر سے واپسی کا وقت نہیں ہوتا اس کی نظروں نے رعنا کی نظروں کا تعاقب کیا اسی سرعت سے اس کی نگاہ پلٹ آئی۔

وہ گھمسان کے رن کا منتظر تھا' مگر یہاں پرسکون سا انداز تھا۔

"چائے۔۔۔"

"نہیں گرمی بہت ہے۔" وہ کہتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا رعنا اپنی جگہ پر چلی گئی۔

وہ ڈریس چینج کر کے واپس آیا اور شاید پھر کو حیرت میں مبتلا ہوا رعنا تقریباً سو چکی تھی وہ بھی شانے اچکا کر اپنے بستر پر گر گیا۔

آج کا دن بہت اچھا اور خوبصورت گزرا تھا مارگریٹ کو اس کی محبت پر اعتبار تھا اور وہ اس سے شادی کر کے اسے امریکا لے جانے کے لئے تیار تھی۔ امریکا کی شہریت اس کا اولین خواب تھی اب اس کی تعبیر ملنے والی تھی امریکا کی شہریت اس کی پہلی خواہش تھی لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اب جب کہ قسمت نے اسے اتنا نادر موقع فراہم کیا تھا تو کیوں نہ وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا' اس کے لئے کیوں وہ سود زیاں کا احساس کرے ایسا حسین اتفاق دوبارہ اس کی زندگی میں نہیں آسکتا تھا' پھر وہ کیوں آنکھیں بند کر کے موقع ضائع کرے۔

بے شک رعنا بہت اچھی تھی اس کی پسند تھی' جسے اس نے حاصل کیا تھا اس کی ایما پر ہی تمام مراحل طے ہوئے تھے لیکن' اب امریکا کی محبت تمام محبتیں بھلا دینے پر مجبور کر رہی تھی۔

اسے یقین تھا کہ وہ جب بھی اس بات کا ذکر کرے گا گھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا اس لئے تمام مراحل بخیر و خوبی گزرنے کے لئے اس نے یہ پروگرام ترتیب دیا تھا پہلے رعنا سے گریز کی راہ اختیار کی اور گھر سے فرار اختیار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے سوال وجواب باز پرس ہو گی جواب میں وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

اسے یقین تھا اس کے دیر سے گھر آنے پر گھر میں کھانا نہ کھانے پر' بات بات پر نکتہ چینی کرنے پر اس کے گھر والوں سے بلاوجہ کا الجھاؤ' رعنا کے صبر کو ہوا دے گا جواب میں وہ اس پر بے صبری کا بدزبانی کا الزام لگائے گا بات کو اتنا طول دے گا کہ معاملہ گمبھیر صورت اختیار کر جائے گا' پھر فیصلہ کرنا آسان ہو گا اور وہ با آسانی دوسری شادی کر کے اپنے خوابوں کی تعبیر پائے گا لیکن ابھی تک رعنا کی جانب سے کوئی شدید رد عمل نہ ہوا تھا۔

بندہ کتنا نا سمجھ ہے لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے' پروگرام پر آخری ضرب لگاتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ آخری مہر تو اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے وہی اپنے بندوں کے معاملے بہتر طور پر جانتا اور سمجھتا ہے جوڑے وہی تشکیل دیتا ہے دلوں میں خیال وہی ڈالتا ہے' ورنہ ہم تو کچھ نہیں' بے عمل ہیں ہماری ذات' وہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔

"اب کیا کیا جائے؟" رعنا کا صبر و استقلال دیکھ کر حسام سوچ میں پڑ گیا تھا' اس کے لئے تو لمحہ بھر کی کمزوری بہت تھی۔ اب تو اس نے رعنا سے بات کرنا بھی چھوڑ دی اللہ کی بندی نے پلٹ کر وجہ دریافت نہ کی' اور شاید حسام یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی پشت پر مضبوط ہاتھ ہے عورت ہی عورت کا گھر بناتی ہے عورت ہی ہے جو دوسری عورت کا گھر اجاڑ دیتی ہے کتنا فرق ہوتا ہے ان عورتوں کے درمیان۔

حسد و جلن کی ماری وہ عورت جس کا نام کنول صدیقی تھا ہر حال میں رعنا کو اجاڑ کر حسام کی زندگی سنوارنے کا تہیہ کئے بیٹھی تھی وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا' پہلی محبت' پہلا عشق' اور بارش کا پہلا قطرہ ہی بہت طاقتور ہوتا ہے ابر نیساں کا پہلا قطرہ سیپ میں بند ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ اور بیش قیمت توقیر پاتا ہے' دوسری جانب بھی معاملہ اس کے

برعکس نہیں تھا۔

رعنا کی زندگی میں بھی حسام پہلا مرد تھا' خود سے وعدے کے مطابق والدین کے اس انتخاب کو اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔

پھر کس طرح سے اسے جانے دیتی' اس کی محبت اتنی بے توقیر نہ تھی' بس کس طرح سے اپنی ذات کی تذلیل اپنے جذبوں کی انسلٹ برداشت کرتی بظاہر وہ ہنستی مسکراتی نظر آتی ہر فعل میں آگے آگے چابکدستی کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہوئی مگر اس کے اندر آگ تھی جو بھڑک رہی تھی۔

فی الحال اس نے خود کو خاموشی کی شاہراہ پر ثابت قدمی سے چلتے رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

اس روز بھی لان میں بظاہر میگزین دیکھتی وہ سوچوں میں گم تھی۔ ارجمند خاتون آج اپنی بڑی بیٹی راضیہ کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ فائزہ بھابھی اندر اپنے بچوں میں گم تھیں ان سے تو بہت کم ہی راہ و رسم بڑھائی تھی اس نے ان کے اور اس کی نیچر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حنا اس کی دیورانی جس کی شادی اس سے ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی خاصی خوش مزاج اور حاضر جواب تھی اس سے خاصی دوستی تھی' ابراہیم بھائی سے بس دعا سلام تھی۔ ابو سے دوستی تھی ابرار آتے جاتے خیریت دریافت کرلیتا تھا' دونوں نندیں بھی اچھی تھیں۔

اگر ہم پتھر اٹھائیں گے تو جواب میں اینٹ تو آئے گی ہی نا' اسی لئے سسرالی رشتوں کو نبھانے کے لئے اس کا رویہ بہت محتاط تھا' اور محتاط رویے بہت دور اندیشی سے راستے منزلیں طے کرتے ہیں۔

ارادہ کرتی ہوں' باندھتی ہوں توڑ دیتی ہوں
کہیں ایسا نہ ہوجائے کہیں ویسا نہ ہوجائے

"بھابھی.....!" اپنی سوچوں میں غلطاں وہ چونک گئی۔

سامنے حنا کھڑی تھی۔

"نہ میگزین پڑھا جارہا ہے اور نہ کسی ڈیزائن پر ڈسکس کررہی ہیں آپ کا دماغ کیا سوچ رہا ہے۔" وہ مسکراتی ہوئی شرارت سے ابرو اٹھاتی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"کچھ..... نہیں تو....." وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"حمزہ کہاں ہے؟۔"

"ارے ابھی تو اپنے بابا کے ساتھ گیا ہے۔" اس نے خاصی حیرانی سے دیکھا۔

"اچھا دراصل فیچر اتنا زبردست تھا کہ بس کسی اور جانب دھیان نہیں گیا۔"

"فیچر اچھا تھا' کیا مسئلہ گمبھیر ہے۔" وہ قدرے جھک کر رازداری سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" رعنا نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مطلب تو آپ خود سے پوچھیے میں تو صرف کچھ بتاسکتی ہوں۔"

"مثلاً کیا؟" اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"مثلاً" یہ کہ آج کل آپ بہت پریشان ہیں' کیا کریں کس طرح سے اس صورتحال کو فیس کریں؟" وہ شرارت سے اس کی صورت دیکھ کر مسکرائی۔

"میں سمجھی نہیں!" اس نے بات سمجھ کر پہلوتہی برتی۔

"یہ آپ کا مسئلہ ہے ویسے آپ جیسی پیاری خاتون کے ساتھ کم سے کم حسام بھائی کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے' لیکن آپ بے فکر رہیں' حسام بھائی ایک جذباتی مرد ہیں اور جذبات تو بس چڑھتی اترتی موجوں کی مانند ہوتے ہیں' دودھ کے ابال کی طرح جلد ہی گرتے اور ٹھہر جاتے ہیں بس آپ صبر واستقلال سے منتظر دیکھتی جائیں۔"

"حنا....." وہ منہ کھولے عالم تحیر میں تھی' حنا مسکرادی۔

"یہ میرا خیال ہی نہیں تجربہ بھی ہے' حسام بھائی کی مثال میرے سامنے ہے' آپ تو اب ان کی زندگی میں شامل ہوئی ہیں میں تو ڈھائی سال سے انہیں دیکھ' پرکھ اور جانچ رہی ہوں۔"

اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ تھی۔

"حنا تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھا۔

"وہی جو آپ سمجھتی ہیں اور جانتی ہیں بس تھوڑی

سی آگہی اور دے رہی ہوں میں کافی دنوں سے آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر موقع نہیں ملا گرفت مضبوط رکھنے سے بہتر ہے کہ آپ ڈھیل دے کر خاموشی سے تماشا دیکھیں جوش ہوش اڑا دیتے ہیں۔

ان کی زندگی میں نہ جانے والی لڑکیوں کی کمی ہے اور نہ آنے والی' امی نے ایسے ہی آپ کو سمجھا کر ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کیا' اپنے بیٹے کی عادات سے وہ اچھی طرح سے واقف ہیں۔"

اسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا وہ جو اپنے دل و دماغ کی آگہی سمجھتی تھی وہ تو ساری دنیا کی زبان پر تھی۔

یا اللہ یہ کیسا سکھ اس کی زندگی کا مقدر ہے۔

"حسام بھائی کا ہر فیصلہ جذباتی ہوتا ہے' آپ سے پہلے انہوں نے کتنی لڑکیوں سے ٹوٹ کر محبت کی' اور ان میں سے صرف ایک لڑکی کے لئے سیریس ہوئے' جانتی ہیں وہ کون تھی' وہ ایک اداکارہ کی بیٹی تھی۔"

اس کے ہوش اڑ گئے آج کیسے کیسے انکشافات کا دن تھا۔

"پھر... پھر..." بے ساختہ ہی اس کے لب لرزے۔

"پھر یہ کہ ان کے جذبات کا رخ موڑ دیا گیا سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔" چاروں طرف طنزیہ ہنسی بکھر گئی۔

"یہ تو بس انوکھے لاڈلے ہیں ان پر قہر و جبر کیا جائے تو طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔"

"آپ کی سی آئی ڈی کیا کہتی ہے؟۔" حنا نے اچانک باتوں کا رخ بدل دیا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس نے اپنے ماؤف ہوتے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔

"آپ کو سب سمجھ میں آ رہا ہے بس یقین نہیں کر پا رہیں مگر یہ حقیقت ہے اور میری نظر اتنی کمزور نہیں ہو سکتی میں آپ کو کبھی غلط بات نہیں بتاؤں گی مگر عورت کو ہر حال میں اپنا گھر بچانا ہوتا ہے اس لئے وہ عروسی جوڑا نہیں پہنتی کہ دکھ کا کھنڈر بن جائے' اپنے شوہر کی ہر بات کا عورت کو علم ہونا چاہیے' اس پر گرفت مضبوط رکھو مگر ظاہر نہ کرو۔"

"حنا تم کتنی گہری باتیں کر لیتی ہو۔"

"آپ بھی گہری باتیں کر سکتی ہیں' اگر حالات کو سمجھ کر جائزہ لیں' آپ نے آنکھیں بند کر کے محبت میں دھوکا کھایا ہے آپ کی دوست کنول آپ کی جڑیں کاٹنے کے چکر میں ہے۔

حسام احمد دو کشتیوں کے مسافر آج کل کسی انگریز لڑکی سے عشق لڑا رہے ہیں روز ایئر پورٹ کی حدود میں پائے جاتے ہیں میرے بھائی جان نے نہ صرف بتایا بلکہ ابرار نے مجھے خود دکھایا بھی ہے۔"

"مائی گاڈ!۔" اسے چکر آیا کیسے کیسے انکشافات کا دن تھا آج اس کی سوچ کے دھارے تو کسی اور ہی سمت رواں تھے یہاں تو پورا منظر تو کیا ماحول ہی بدلا ہوا ہے۔

کیسا شخص اس کی زندگی میں رقم ہوا ہے' اسے افسوس صد افسوس تھا۔

"میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا' لیکن جو بات میرے علم میں ہے اس کو بتانا ضروری تھا ان لوگوں کے لیے حدیں بے حد ضروری ہوتی ہیں ورنہ حد سے تجاوز کر کے یہ لوگ بہت بہادر بن جاتے ہیں۔" اس نے دھیرے سے رعنا کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔ رعنا نے تشکرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"کنول کے بارے میں تم کیسے جانتی ہو وہ' وہ تو میری بہت پیاری دوست ہے۔" اس نے غیر یقینی سے اسے دیکھا۔

"بہت پیاری۔" حنا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

"یقین کریں پیارے لوگ ہی ہماری جڑیں کاٹتے ہیں یہ پیار و محبت ہی ہمیں دھوکا دیتا ہے محبت پر اعتبار بے شک اچھی چیز ہے مگر بہتر ہے آنکھوں کو کھلا رکھنا چاہیے' اگر آپ کو یقین نہیں تو میں ثبوت دینے کے لئے تیار ہوں۔"

رعنا یقینی اور بے یقینی کے درمیان اسے دیکھنے لگی کیسی عجیب سی بات تھی چاروں طرف — ایک عجیب سی اداسی بکھرنے لگی' ٹھنڈا سانس لے کر وہ گر

سی گئی، حنا کسی کام سے اندر جا چکی تھی۔
"تو یہ تھی تمہاری پسندیدہ زندگی، یہ تھا تمہارے آئیڈیل شوہر کا تصور۔" وہ دکھ کی انتہائی سرحدوں پر کھڑی تھی۔
آج سمجھ آیا تھا کہ اس کی سانس کیوں اتنی باریک بنی سے اسے سمجھایا کرتی ہیں یقیناً وہ اپنے لاڈلے کے تمام کرتوتوں سے آگاہ ہیں اس کے باوجود اس کی زندگی برباد کی ایک جذباتی موڑ۔۔۔ لمحہ بھر میں تمام سوچیں سرحدیں عبور کر لیتا ہے اس کی سوچوں میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔
"کنول!" ایک دم سے رعنا چونک کر سیدھی ہوئی گویا وہ سامنے آموجود ہو۔
"کیا کنول ایسی ہو سکتی ہے کہ اپنی دوست کے گھر میں شب خون مارے۔"
"حنا۔۔" ایک دم سے اس نے پکارا، مگر وہ اندر جا چکی تھی۔
حنا کس طرح سے جانتی ہے، جب کہ کنول تو اس کی بچپن کی دوست ہے ساتھ بچپن گزرا تھا پھر پھر کس طرح ہے جب کہ وہ تو کسی اور سے محبت کرتی تھی اس کی باتیں اس کے قصے سنایا کرتی تھی اور اس کی نام نہاد محبت کے قصے سن سن کر وہ ہنسا کرتی اور پھر سمجھایا کرتی۔
"یک طرفہ محبت کوئی محبت نہیں ہوتی محبت تو تب ہے جب آگ دونوں جانب برابر کی ہو۔"
"ارے وہاں بھی آتش دہکا دیں گے فکر کس بات کی ہے۔"
شان بے نیازی سے پورے یقین سے کہتی تھی، رعنا اس کا ساتھ دیا کرتی کہیں بھی تو اس کا جھکاؤ حسام کی جانب نظر نہیں آیا۔
کنول شادی میں شریک نہ ہو سکی کیونکہ اس کی دادی کا انتقال ہو گیا تھا، ایبٹ آباد میں تھی بعد میں ملی تو بھرپور طریقے سے ملی۔ پھر۔۔ پھر کس طرح سے۔۔۔ حنا کے لہجے میں اتنا یقین کس طرح سے ہے اور کیا جانتی ہے وہ۔۔ حنا سے ایک بار پھر تفصیل سے بات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، مسلسل سوچوں نے اس کے اعصاب شل کر دیئے۔
رات کا اندھیرا ہر سو پھیل رہا تھا فائزہ بھابی لائٹ آن کر کے گئیں تاہم اس کے تنہایوں بیٹھنے کا مطلب نہیں پوچھا وہ خود ہی اپنے بیڈ روم میں آگئی آج اپنی خواب گاہ ہی اجنبی اجنبی سی محسوس ہو رہی تھی۔
حنا سے پھر سامنا نہیں ہوا، ورنہ اسی وقت پوچھ لیتی کیا۔ کیوں۔۔ کیسے اور اب اسے کیا کرنا چاہیے اس قسم کے سوالوں نے اسے پریشان کر دیا جانے کب وہ سو گئی صبح آنکھ کھلی تو برابر میں حسام محو خواب تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی بال سمیٹتے ہوئے اسے دیکھا، کس قدر معصوم چہرہ تھا ذرا احساس نہ ہوتا تھا کہ یہ چہرہ اس قدر دو غلا اور مکر و فریب کا ماسک چڑھائے ہوئے ہے اس نے باتھ روم کا رخ کیا۔
محبت چڑھتے سورج کی طرح روشن اور ڈھلتے چاند کی طرح تاریک ہوتی ہے۔
زیاں تو صرف عورت کا ہی مقدر ہوتا ہے، مرد تو ہر حال میں مرد کے ساتھ جیتا ہے۔
"تمہیں تمہارا نیا ہمسفر مبارک ہو، مجھے جھوٹے برتن کی عادت نہیں ہے۔" باہر نکل کر تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے یکدم اس نے فیصلہ دے دیا۔
ہر عورت میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ مرد کی دوہری شخصیت کو برداشت کرے فی الحال میں ثابت قدمی سے اپنی بنیادوں پر کھڑی رہوں گی۔" اس نے شیشے میں بال بناتے ہوئے بغور حسام کی جانب دیکھا۔ اور دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر باہر نکل گئی۔
حسام جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، آج رعنا اسے بہت انوکھی سی لگی تھی۔ خاموشی گہری خاموشی۔۔ کسی طوفان کا پیش خیمہ ہی ہوتی ہے دل سے صدا ابھری۔
"ارے حسام احمد میں تمام طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ ہے۔" وہ سر جھٹک کر مسکراتا ہوا بیڈ سے اترا وہ مرد ہی کیا جو نئی منزلوں کا راستہ نہ طے کرے اور ڈیک آن کر دیا۔
ایک روز ملوں ہمیں شام ڈھلے
سن تو لو میری جان
دھڑکنوں نے چھپا رکھے ہیں جو گلے

"کیا بات ہے آج کل بہت چپ چپ سی ہو۔" اخبار دیکھتے ہوئے احمر صاحب نے یک دم ہی رمشا کو مخاطب کیا' جو بظاہر ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں تو خبریں سن رہی تھی۔" وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"کیا حسام سے لڑائی وڑائی ہوئی ہے۔" اس نے جھک کر شرارت سے پوچھا رمشا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ہوئی ہے تو بتادو' کان کھینچوں گا۔"

"نہیں پپا ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ ہنس دی۔

"پھر کیا حسام گھمانے لے کر نہیں جاتا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر گھومنے نہیں لے کر گیا' ہاں میں نوٹ کر رہا ہوں' آج کل یہ خوردار زیادہ ہی سرگرم ہیں اور اپنی نصف زندگی سے غافل' خیر تم فکر مت کرو میں کان کھینچتا ہوں۔"

"واقعی پپا ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے یقین دہانی کروائی۔

"چلو شاباش اچھی سی چائے بنا کر لاؤ' باقی ہمارا کام ہے۔" وہ اپنی کہے گئے وہ بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی زیادہ بولنا ہی فضول تھا۔ کمرا سانس لے کر ارجمند خاتون بھی اسے جاتے دیکھتی رہ گئیں کیسی کمھلا کر رہ گئی تھی۔

"ذرا خیال رکھا کرو' بہو کا' بہت نازک ہے۔" انہوں نے بیوی کو حکم دیا۔

"میں کیا خیال رکھوں' آپ کے بیٹے کے کام ہی ایسے ہیں' آپ ہی کی طرح دل پھینک ہے اور تو کوئی نہیں یہ ہی آپ پر گیا ہے۔" وہ جل بھن کر گویا ہوئیں۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے اچنبھے سے کہا۔

"اور کیا جوانی میں جو گل آپ نے کھلائے تھے ان ہی پھولوں کو برخوردار بھی چن رہے ہیں۔" انہوں نے جھنجلا کر منہ پھیر لیا۔ ان کے انداز پر احمر صاحب مسکرا دیے۔

"کیا مثال پیش کی ہے مگر آپ سے شادی کے بعد تو میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا خوف سے۔"

"مگر آپ کے بیٹے کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے وہ آپ سے دو ہاتھ آگے ہی نہیں چار ہاتھ آگے ہے مجھے خود مسز کرمانی نے بتایا ہے وہ ڈیولی فری شاپ پر شاپنگ کے لئے گئی تھیں وہاں آپ کے بیٹے انگلش میم کو شاپنگ کروا رہے تھے۔"

"کیا مطلب؟" احمر صاحب سنجیدہ ہو گئے۔

"مطلب خود ہی سمجھ لیں' مگر ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھا دوں بہت ہو گیا' اب اگر حسام نے ایسی ویسی حرکت کی تو اس کے ایسے کان کھینچوں گی کہ تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔" واقعی وہ حسام کی حرکتوں سے دلبرداشتہ تھیں اور اب معاملہ ان کی بہو کا تھا جو عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

"ہوں۔۔۔" وہ سگار سلگا کر سوچنے لگے۔

--*

حسام اب مسلسل دیر سے گھر آ رہا تھا' اور رمشا یوں پوز کر رہی تھی کہ گویا اس کو پرواہ نہ ہو' حسام کو بہت جلدی تھی مارگریٹ کو اس نے شادی کے لئے رضامند کر لیا تھا اس کا گروپ جا چکا تھا' شمالی علاقوں کی سیر کے لئے وہ حسام کے ساتھ جانا چاہتی تھی اور حسام کا پروگرام یہ تھا کہ اس کے ساتھ جانے سے پہلے مارگریٹ کو مسلمان کر کے نکاح کر تا ان کا ہنی مون پیریڈ بھی ہو جاتا واپسی میں پاسپورٹ پر امریکا کا ویزا لگواتا' مارگریٹ کے ساتھ نکل جاتا' جاتے جاتے وہ رمشا کو فارغ کر جاتا۔

حسام بہت خود پسند شخص تھا اس کی اپنی رضا اپنی خوشی کے آگے سب کچھ ہیچ تھا۔ امریکا کی کشش نے سود زیاں کا فرق مٹا دیا تھا ہر حال میں اسے اس سرزمین کو چھوڑنا تھا مگر یہاں پر موسم بالکل سرد تھا۔

اس نے یہ کیا کہ جان بوجھ کر لڑائیاں کرنی شروع کر دیں۔

"آئندہ سے میرے کپڑوں کو ہاتھ مت لگانا' یہ استری کی ہے نہ کریز بنی ہے نہ چمک اٹھی ہے۔" اچھی خاصی ہینگر کی ہوئی شرٹ کو اس نے مسل کر پھینک دیا۔

"ٹھیک ہے میں آئندہ دھوبی سے دھلوا کروں گی۔" اس نے سہل انداز میں کہا۔

"رعنا بی بی اگر مجھے دھوبی سے ہی دھلوانے ہوتے تو آپ کا کیا مصرف ہے کس مقصد کی وہ ہیں آپ؟" اس نے کھا جانے والے انداز میں دیکھا۔

"مگر آپ کو تو اپنی سوچوں سے ہی فرصت نہیں ملتی' کون سے ہوائی قلعے تعمیر کرتی ہیں۔" اس نے بدتمیزی سے کہا۔ رعنا چپ ہو گئی ایک لفظ کہنا اپنی انسلٹ کروانا تھا اور فی الحال اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ خاموشی سے باہر نکل گئی حسام بل کھا کر رہ گیا۔

باہر فائزہ بھابھی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی گویا قصور اس کا ہو' حنا کے چہرے پر بھرپور یقین تھا کہ چہتا عذاب ڈھلنے کو ہے۔

فی الحال اسے مطلق پروا نہیں تھی پاس سے گزر کر آگے نکل گئی۔ کسی کی پروا کئے بغیر حسام کی تیز آواز پر ارجمند بانو باہر نکلیں' سیدھی اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

حسام بیڈ پر چت پڑا تھا استری شدہ شرٹ اپنی چمک کھو کر باتھ روم کے دروازے کے پاس پڑی تھی۔

"حسام۔" انہوں نے خود پر کنٹرول رکھا۔

"امی آپ؟" جھٹکے سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا تم نے مذاق بنا رکھا ہے' اس گھر کے مردوں کی آواز کبھی بھی اتنی بلند ہوئی ہے' تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو' کبھی تم نے اپنے باپ کی بلند آواز سنی ہے تمہارے کپڑے دھوبی استری کرتا تھا مگر تم نے خود منع کیا کہ رعنا استری کرے گی پھر اب کیا قباحت ہے۔"

"امی دیکھیں یہ شرٹ استری کی ہے ذرا بھی شائننگ نہیں آئی۔" اس نے شرٹ ان کے سامنے ڈالی۔

"اس کی چمک تمہارے مسلنے سے ماند ہوئی ہے اپنی حد میں رہو خوامخواہ کی لڑائی اچھی نہیں ہوتی۔" انہوں نے اس کو موردِالزام ٹھہرا دیا۔

"امی!" وہ ہکا بکا رہ گیا اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔

"وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے' ہر کام اس کا ٹھیک ہے میں ہوں نا اس کا جائزہ لینے والی' تم بتاؤ تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے' کیوں راتوں کو دیر سے گھر آتے ہو ایسا کون سا مسئلہ ہے جو راتوں کے ڈھائی تین بجے تک حل ہوتا ہے' کون سی فائلیں ہیں کہ آدھی آدھی رات تک کھلی رہتی ہیں۔"

آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"کس بات کی بے سکونی' بے آرامی ہے تم اب شادی شدہ شخص ہو' پہلے کے سارے چھن چھوڑ دو ایک زندگی تمہارے ساتھ ہے کل کو گھرانہ بڑھے گا تم ابھی تک غیر سنجیدہ ہو جب کہ رعنا تمہاری پسند ہے میرا زور و جبر نہیں۔"

"امی!" حسام تو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کا ساتھ دیں گی مگر۔۔۔

"یہ آپ اس سے پوچھیں کہ میں گھر سے باہر کیوں رہتا ہوں وہ کون سی خیالی دنیا آباد رکھتی ہے پہلے کیوں نہیں تھا میں ایسا جب گھر والی صحیح نہیں ہوگی تو کیسے سکون رہے گا۔"

"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے کیا تم ٹھیک ہو۔۔۔ بہت سی خبریں مل رہی ہیں تمہارے بارے میں" مگر میں یقین نہیں کر رہی کیوں کہ تم ایک شادی شدہ شخص ہو اور تم سے حماقت کی توقع نہیں' لیکن جس دن مجھے ثبوت مل گیا اسی دن میں تمہارے لئے مر جاؤں گی نکل جانا اس گھر سے تم اور اگر تمہارے باپ نے تمہارا ساتھ دیا تو مجھے ان کو چھوڑنے پر بھی اعتراض نہیں' ایسی ناہنجار اولاد سے بہتر ہے کہ میں تہی دامن ہو جاؤں اب روز روز کی یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا حسام ساکت کھڑا ہو گیا ان کا یقینی لہجہ بتا رہا تھا کہ انہیں کچھ نہ کچھ بن گن مل گئی ہے۔

"سن لیا تم نے۔۔۔؟" وہ جانے کے لئے پلٹ گئیں۔

"امی۔۔۔!" اس نے اسی وقت بات کرنے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے رخ موڑ کر دیکھا۔

"امی میرا انتخاب غلط تھا میرا اس عورت کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔"

"حسام.....!!" ارجمند خاتون کے پیروں تلے
[ز]مین نکل گئی۔
"ہوش میں ہو تم' شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل
ہے جو مذاق بن کر رہ گئی ہے کیا برائی ہے اس میں قصور
اس کا نہیں تمہارا ہے تم زندگی کے بارے میں سنجیدہ
نہیں ہو زندگی کو غیر سنجیدگی کی نذر نہیں کیا جا سکتا'
اب میں تمہیں کسی عیاشی کی اجازت نہیں دوں گی'
ورنہ تم ۔ ۔ سے اور اس گھر سے ہر تعلق ختم کرلوں
گی۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا اور باہر نکل
گئیں۔
"یا اللہ.....! بازی تو بالکل الٹ گئی تھی۔" حسام
صوفے پر گر گیا۔
ان تمام قصے سے بے خبر رعنا کچن میں پالک گوشت
بنانے میں مصروف تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا
ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

۔۔*

"کیا بات ہے رعنا اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟"
اس روز وہ امی کے گھر آئی تھی ابو چھوڑ کر گئے تھے کہ
کنول آگئی وہ گہری خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہی
تھی۔
"رعنا نے جو کچھ کہا کیا وہ درست ہے کنول اس کی
دوست ایسی ہو سکتی ہے۔"
"ہاں بس پچھلے دنوں فلو تھا ساتھ ہی بخار بھی
ہو گیا۔"
"حسام بھائی کا کیا حال ہے؟" اس نے خود ہی ذکر
کیا۔
"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"
"اور ان کے اندر کا جذباتی مرد؟"
بے ساختہ رعنا اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی' اس کے
چہرے پر کچھ تھا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔
"ہنوز برقرار ہے۔"
"اور تمہاری کوششیں؟"
"اپنی جگہ قائم۔"
"جیت کے امکان.....؟" سوال بڑا غیر یقینی تھا
گویا حنا کی رائے مستند ہے۔

"میں نے کہا تھا نا محبت الفت کے معنی خود ہی
سمجھا دیتی ہے میں عورت کی عظمت پر حرف نہیں
آنے دینا چاہتی۔"
"اور جو عورت کو احترام ہی نہ دینا چاہے۔" اس
نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے سوال کیا۔
"اسے عورت کے معنی' مفہوم سکھا دینا چاہیے'
عورت صرف جذباتیت کی تسکین کا ہی ذریعہ نہیں
ہوتی اور بھی بہت کچھ ہوتی ہے' حسام والدین کے بعد
میرا انتخاب تھے اور میں اپنے انتخاب پر شرمندہ نہیں
ہوں' غلطیاں تو پھر انسانوں سے ہی ہوتی ہیں
اور.....اور معاف کرنے کا ظرف عورت کے حصے
میں ہی آتا ہے۔"
(ہو سکتا ہے تمہیں معافی کے دروازے سے گزرنا
ہی نہ پڑے۔)
"حسنو تمہارے پروپوزل کا کیا ہوا؟" رعنا نے بے
ساختہ اسے روک کر گہری نگاہ ڈالی۔
"فی الحال کچھ نہیں ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ
نہیں ہے پھر تمہارا انجام میرے سامنے ہے میں کسی
طرح بھی دو راستوں کی مسافر نہیں بن سکتی۔"
اس کے جواب پر رعنا بے ساختہ مسکرا دی۔
"میں تو دو راستوں کی مسافر ہوں ہی نہیں' پھر
ازدواجی زندگی میں تو یہ سب چلتا ہی ہے دراصل
یکسانیت مرد کو جلد ہی بیزار کر دیتی ہے ماحول بدلنا
عورت کا ہی کام ہے۔"
وہ جو بشریٰ رحمان نے اپنے ناول میں کہا ہے۔
"مرد ہر روز عورت کا نیا روپ دیکھنا چاہتا ہے ہر
رات اس کے نئے بھید پانا چاہتا ہے۔"
تو بس پھر سود و زیاں کس بات کا' میری مانو تو ہاں
کر دوں' فائدہ ہی فائدہ۔"
"نہیں.....!!" حنا بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔
"میرے اندر تمہارے جیسا حوصلہ نہیں ہے میں
چلتی ہوں خدا حافظ۔"
وہ کچھ اتنی سرعت سے اٹھی اور چلی گئی کہ رعنا کچھ
کہہ بھی نہ سکی تاہم اس کے چہرے پر جو دکھ کا عجیب
سا تاثر تھا اس نے اس کو بھی دکھی کر دیا میرا تو اس میں

کوئی دوش نہیں ہے' یہ تو قسمت کا کھیل ہے میری سہیلی تمہارا محبوب میری قسمت کی لکیروں میں لکھا تھا' بتاؤ میں کہاں قصوروار ہوں۔ اس نے تھک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔

نہ جانے اس رشتے کا کیا انجام ہو گا اس کے قدموں کی مضبوطی کہیں اس کے کردار کی کمزوری نہ بن جائے حسام کو ہر حال میں اس کی جانب لوٹنا ہو گا' اس کی جذباتیت کی سزا وہ خود کو نہیں دے گی۔

"آپی حسام بھائی آئیں گے لینے ؟۔" نبیلہ اسکوائش لے کر لان میں آ گئی۔

"نہیں میں وسیم کے ساتھ جاؤں گی کیا وہ ٹینس کورٹ سے آ گیا۔" اس نے سنبھل کر گلاس تھام لیا۔

"بس آنے والا ہے حسام بھائی نہیں آئیں گے کیا۔"

"میں نے انہیں خود ہی منع کر دیا تھا دراصل مصروفیت بہت ہے پھر روٹ بھی دوسرا ہے وسیم بائیک پر آسانی سے چھوڑ دے گا۔"

"ذرا ان کے کان کھینچا کرو تم ان کی ذمہ داری ہو یہ چھوٹے چھوٹے راستے ہی تو مضبوط خوشیوں کا سائبان بناتے ہیں میں تو کبھی بھی اسامہ کو اجازت نہیں دوں گی کہ میں کسی اور کے ساتھ میکے جاؤں جب ذمہ داری اٹھائی ہے تو نبھاؤ بھی۔"

"یار مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اگر میں انتظار کرنے لگوں تو بس پھر سال میں ایک بار ہی تم میری شکل دیکھ سکو گی۔"

"اچھا چھوڑو یہ تمہارا مسئلہ ہے کنول اتنی جلدی کیوں چلی گئی۔"

"کوئی کام تھا؟۔"

"اچھا اسے تو تمہارا بہت انتظار تھا' ہر وقت تمہاری باتیں کرتی رہتی ہے۔"

"اچھا۔" اس نے حیرت سے دیکھا۔

"تمہاری شادی کے بعد بہت چپ چپ سی ہو گئی ہے۔ شرارتی تو رہی نہیں آنٹی اتنی پریشان ہیں کہ یہ کسی رشتے کے لئے ہامی نہیں بھرتی۔ بہت کھری دوست ہے وہ تمہاری۔"

"ہوں۔!" وہ سوچوں کے دریا عبور کرنے لگی تب ہی باہر بائیک رکنے کی آواز آئی۔

"وسیم آ گیا ہے شاید۔"

"ہوں۔۔۔"

"چلو پپا کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں تھوڑی دیر۔" کھڑی ہوتی نبیلہ ٹرے اٹھا کر اس کے پیچھے ہولی۔

--*

امی کی باتوں نے اسے پریشان کر دیا' ایک طرف ماں تھی اور دوسری جانب خوابوں کی تکمیل' کسی صورت وہ یہ نادر موقع کھونا نہیں چاہتا تھا' اور مارگریٹ بالکل تیار تھی۔ ہنزہ کی وادیاں دیکھنے کے لئے پھر ساتھ بھی اتنا خوبصورت ٹیشنگ اسے شروع سے ہی ایشیائی مرد پسند تھے عجیب سی کشش ہوتی ہے ان میں وفادار بھی ہوتے ہیں ایشیائی مردوں کی وفاداریاں اس نے خود دیکھی تھیں اس کی ایشیائی دوست سلمیٰ کا شوہر خرم اس کی ہم وطن مارٹینا کا ایشیائی شوہر صدام' یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ۔

اس نے بھی عہد کیا تھا وہ کسی ایشیائی مرد سے شادی کرے گی ساری عمر پابند وفا تو ہو گی ہم وطنوں نے تو صرف بے وفائی کا دکھ ہی دیا تھا اس لئے اس نے حسام عارف احمد کو خوب پرکھ لیا تھا۔

شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی اور یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے قسمت کس روپ میں اس کا مذاق اڑانے کے لئے کھڑی ہے۔

اور۔۔۔ اور۔۔۔ یہ کہ وفا کے نام پر بے وفائی کا وہ بہت بڑا اور عظیم دکھ اٹھائے گی حسام کا انتخاب اس کی زندگی کی سب سے بڑی کوتاہی اور غلطی ہے اس کا ارادہ تھا امریکا کے شہر نیو یارک میں جا کر دونوں گھر بسائیں گے سب سے الگ تھلگ نئی دنیا نئے لوگ' نئے باسی۔

حسام بھی اس دنیا میں تنہا تھا اور مارگریٹ بھی تنہائی کا دکھ جانتی تھی ماں باپ نے تو بچپن سے ہی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اس نے اپنی محنت سے آج یہ مقام بنایا تھا۔

--*

"ممی پلیز، آپ میری بات سمجھیں کہ میں اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ بہت فرق ہے ہمارے درمیان، اس کی عادات بالکل مختلف ہیں ہمارے مزاج آپس میں بالکل نہیں ملتے، بس میں اور نہیں رہ سکتا اس کے ساتھ۔"

"واہ۔ واہ برخوردار، واہ۔" عمر صاحب باتھ روم سے نکل کر اندر آگئے حسام ارجمند خاتون کے قدموں میں بیٹھا اپنی بات کو دلیل اور عاجزی سے منوانے کی کوشش کر رہا تھا اپنے باپ کی آواز سن کر نہ صرف چونکا بلکہ جز بز ہو کر شرمندہ ہو گیا پھر بھی ایک شرم مانع تھی ان کے درمیان۔

"برخوردار!" عمر صاحب اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھ گئے۔

"میاں بیوی کا رشتہ تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ ساری عمر بھی اس کو سمجھنے کے لئے ناکافی ہے اور آپ دو سال میں سمجھ گئے داد ملنی چاہیے آپ کی سمجھ کی ہر روز اس کے نئے اسرار کھلتے ہیں مہک ختم ہی نہیں ہوتی اور آپ توڑنے کے چکر میں ہیں۔"

"بابا جی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا مذاق بنا رکھا ہے تم نے، اب تم چھوٹے بچے نہیں رہے کہ تمہاری ہر بات ہر ضد مان لی جائے، رعنا تمہاری پسند تھی ہم لوگ تکمیل کا ذریعہ بنے اب دو سال میں ہی تم سیر ہو گئے تف ہے تمہاری مردانگی پر۔" ایک دم سے ان کا لہجہ بدل گیا۔

"میں تمہیں نہ کسی نئے رشتے کو استوار کرنے کی اجازت دوں گا اور نہ ہی کسی پرانے رشتے کو توڑنے کی، رعنا ہم سب کو بے حد عزیز ہے، خود کو درست کرو۔"

"میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بالآخر اس نے وہ بات کر دی جس کے لئے وہ اتنی تمہید باندھ رہا تھا "ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے پھر آج ہی کیوں نہیں" بیڈ روم کی فضا ساکت ہو گئی۔

"بکواس بند کرو، یہ کیا مذاق ہے" اس فرنگی عورت سے شادی کرو گے جس کے حسب و نسب کا علم نہیں کس بات کی کمی ہے تمہارے اندر "کون سے ارمان پورے نہیں کیے۔" وہ غضبناک ہو کر کھڑے ہو گئے

ارجمند خاتون ہکا بکا رہ گئیں۔

اس بات کی تو انہیں بھی امید نہ تھی، لمحہ بھر کو وہ بھی چپ ہو گیا۔

"وہ بہت اچھی ہے، میں ملواؤں گا آپ سے۔" اس نے دفاعی راستہ اختیار کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے، اسے یہاں لانے کی سمجھے تم۔"

"لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں۔" اس نے ہٹ دھرمی دکھائی، ضدی لہجہ اختیار کیا۔

"تو پھر تم یہ بھی سن لو جس دروازے سے تم اسے اندر لاؤ گے اسی لمحے اسی دروازے سے تمہاری ماں باہر نکل جائے گی۔"

ایک بار پھر ہر چیز ساکت ہو گئی، وہ تو ماں کی بات کو مذاق سمجھ رہا تھا یہاں تو باپ نے ہی تیر چلا دیا۔

"بابا۔!"

"مر گیا ہے تمہارا باپ، جا سکتے ہو تم یہاں سے۔" اس نے ایک لمحے کو باپ کے سرخ چہرے اور ماں کے متوحش انداز کو دیکھا اور جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

*_*_*

"یہ عورت۔ یہ عورت کس قدر معتبر ہو گئی ہے۔"

اس نے جھنجلا کر اس کے سوئے ہوئے وجود کو دیکھا کل تک کتنی قریب تھی یہ، لیکن آج۔ آج اس کے دل سے اترا ہوا غبار بن گئی تھی مارگریٹ کا سحر ایسا تھا کہ ہر صورت وہ اس عورت سے ہر ناتا توڑ لینا چاہتا تھا۔

لیکن اب درمیان میں امی، ابو کا اٹوٹ رشتہ آ گیا تھا پہلے تو سوچا تھا کہ ماں کو منا لے گا لیکن اب باپ کے آگے سر اٹھانا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی بند باندھ سکتا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

"یا خدایا۔" اس نے سر ہاتھوں پر گرایا اور صوفے پر ڈھے گیا۔

اور ساری رات دھوئیں کے مرغولے بناتا خود سے لڑتا جھگڑتا سوچ و بچار میں مصروف رہا اور بظاہر سوتی رعنا یہ سوچتی رہی۔

رہ رہ کر یہ بات میرے دل میں
کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے
کیا میری وفاؤں میں کچھ کمی ہے
جاری ہے خلوص سے پرستش
پگھلا نہ کسی مجسمے کو
لیکن۔۔۔!
یہ گمان بھی ہے شاید
اندر سے وہ بت پگھلا گیا ہو
چہرے پر نہ ہو کوئی تاثر
اور دل میں
چراغ جل گیا ہو۔

صبح پھر ایک نئی سحر نمودار ہو گئی اور دونوں اپنے اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچ سکے۔

گھر میں ایک غیر معمولی خاموشی کا راج تھا سب نے اس نئی بات کو سن لیا تھا فائزہ اور حنا یہ سوچ کر بیٹھ گئیں یہ تو ہونا ہی تھا حسام کمزور کردار کا مرد جو ٹھہرا۔

رعنا خاموشی سے اپنے صبر کی انتہا دیکھنا چاہتی تھی اس نے تو زندگی کا یہ سفر اعتبار' اعتماد' یقین و خلوص کے سہارے شروع کیا تھا مگر دوسری جانب یہ سب نہیں تھا صرف لمحاتی اثر تھے تو کیا اس نے صرف لمحاتی اثر کے سہارے مات کھائی ہے اس کی بقیہ زندگی ایک ٹوٹی پھوٹی جیسا کچھ بن جائے گی۔

"نہیں' زندگی کو وہ بھی پرجوش انداز میں گزارے گی لیکن صبر سے اس انتہائی حدوں کو چھوتے شخص کی انتہا اس کو دیکھے گی سنا اور پڑھا تھا صبر سے ساری منزلیں آسان ہو جاتی ہیں' وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی اسے یقین تھا کہ حسام اس کے سامنے ضرور بولے گا اور وہ اس وقت کی منتظر تھی۔

"رعنا تم نے سنا حسام بھائی آج کل ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔" کنول کی آواز فون کی لہروں پر پرجوش انداز میں سنائی دی۔

"تم نے کچھ نہیں کہا کس چیز کا مان ہے تمہیں خود پر کان کھینچوں ان کے' یہ کیا چکر چلایا ہے انہوں نے۔"

اس نے خاصے استعجاب سے اس کی آواز کو سنا یہ کنول ہی ہے نا'۔۔۔

"گویا تم شکست کھا بیٹھی ہو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔!!" بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

"یہاں فتح و شکست کا کوئی کھیل شروع نہیں ہوا یہ موڑ تو آنا ہی تھا۔"

"گویا تم اپنی محبت سے دست بردار ہو چکی ہو۔"

محبت طاق دل پر
جلنے والا وہ چراغ آخر شب ہے
کہ اس کی لو اگر
مدھم بھی پڑ جائے
تو اندر کا
اجالا کم نہیں ہوتا۔

"اتنا یقین ہے تمہیں' حسام کی زندگی میں دوسری عورت داخل ہو چکی ہے اور تمہاری خاموشی۔"

"میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ دو کشتیوں کا مسافر خسارے میں رہتا ہے۔"

"گویا تم حسام کی واپسی کی منتظر ہو اور اسے دوبارہ دل کے سنگھاسن پر بٹھا لوگی۔"

"نہیں وہ میرے دل کے سنگھاسن سے اترا ہی نہیں ہے میں نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا پھر وفا تو ہوتی ہی بے وفا سے ہے۔"

اس کے لہجے میں محبت کی حلاوت تھی کنول کے اندر کا حال جانتی تھی اس لئے اس کے سامنے مطمئن رہنا چاہتی تھی۔

"حیرت ہے!۔"

"تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔"

"میں۔۔۔ میں اس شدید محبت میں مبتلا ہوتی تو پھر ہر چیز کو تہس نہس کر کے اس سے پہلے ہی حسام کی زندگی سے نکل جاتی۔" اس نے سرعت سے اپنا فیصلہ سنایا اور یک دم خاموش ہو گئی رعنا نے اس کی خاموشی کو دل پر محسوس کیا۔

"تو گر میں بھی حسام کی طرح جذباتی ہو جاؤں تو کیا فرق رہ جائے گا ہم دونوں میں۔"

"اوہ!۔" بات بہت گہری تھی۔

"اس کا کیا حل ہے۔"
"وقت ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے بس استقامت سے انتظار کی ضرورت ہے۔"
"مجھے بہت افسوس ہے۔"
"کس بات کا؟"
"حسام کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"ان شاء اللہ۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
اور رعنا اندازہ نہ کر سکی کہ یہ فخر و خوشی کا فون تھا یا اطلاع' جو چیز ایسے نہ مل سکی ایسے ہی سی دل نے قیاس کیا۔
"میں تمہیں چھوڑنا چاہتا ہوں۔" وہ جو ابھی ابھی فریش ہو کر خوشگوار احساسات کے ساتھ بیڈ روم میں آئی تھی حسام کی آواز پر ساکت ہو گئی۔
"بولو کیا قیمت لو گی۔۔۔؟" تند و ترش لہجے میں خشونت تھی۔
"میں نے آپ کی زندگی میں داخل ہونے کی کوئی قیمت نہیں لگائی تھی۔" اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔
"تو وہ جو میرے اتنے حریف پیدا کر دیے ہیں۔" کھا جانے والا انداز تھا اس کا۔
"آپ کے خود ساختہ ہیں مجھے ضرورت نہیں ہے' تحفظ کے لیے کچی دیواریں اٹھانے کی۔" اس کے اطمینان نے آگ لگا دی۔
"ٹھیک مجھے منظور نہیں' ماں کے سر سے زیادہ قیمتی شے کیا ہوتی ہے۔"
"تم کیا چاہتی ہو۔" اس نے جھٹکے سے اسے سامنے کیا۔
"میں نے سوال ہی نہیں کیا تو جواب کیا مانگوں۔" اس نے رسان سے ہاتھ جھٹک دیا۔
"پھر امی سے جا کر کہو کہ میرے راستے کی دیوار نہ بنیں مجھے ہر سو یہ راستہ طے کرنا ہے۔" اس نے اسے دھکا دے کر صوفے پر اسے گرا دیا۔
"مجھے ضرورت نہیں ہے پلی بننے کی۔" اس کا اطمینان و سکون اس کے اندر کی آگ کو بھڑکا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں تمہیں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔"
"مجھے کوئی مہلت درکار نہیں ہے۔" وہ جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔
"ٹھیک ہے پھر میں یہ سب چکر ہی ختم کر دیتا ہوں ڈیمیٹ عورت" حسام جنون میں دیوانہ ہو چکا تھا اس کے پیچھے باہر نکلا۔
"تت۔۔۔ تم۔" یک دم ہی زبان گنگ اور وجود منجمد ہو گیا لان کا منظر تھا ہی حیران کر دینے والا۔
ابرار بھائی کے برابر میں مارگریٹ کھڑی تھی اور وہ مارگریٹ سے گھر والوں کا تعارف کروا رہا تھا "یہ میرے ابو' امی' یہ بڑے بھائی جان' یہ فائزہ بھابی ہیں یہ میری وائف حنا' یہ میرا بیٹا' یہ میرا بھائی حسام۔" انہوں نے ستون پکڑے گنگ کھڑے حسام کی جانب اشارہ کیا۔
اور مارگریٹ ساکت ہو گئی' اس کا حسام' اس کی محبت اس نے تو بتایا تھا کہ کوئی نہیں تھا اس کا ایک ٹوٹا بکھرا شخص ہے۔
"اور یہ اس کی بیوی رعنا۔۔۔ اور رعنا یہ میری دوست مارگریٹ ہیں پاکستان وزٹ پر آئی ہوئی تھیں پاکستان اور یہاں کے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں انہیں' آج میں انہیں آپ سب سے ملانے لایا ہوں۔" ابرار بھائی نے مسکرا کر سب کی جانب دیکھا۔
حسام کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' یہ وقت نے کون سی چال چل دی تھی ابرار بھائی کہاں ملے مارگریٹ سے اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا مارگریٹ کے چہرے پر خون کی سرخی پھیلتی چلی گئی۔
وہ تو وفا کی تلاش میں نکلی تھی' اور سعی لاحاصل رہی بے وفا تو ہر قوم میں ہوتے ہیں خوامخواہ ہی ایشائی لوگوں کی وفا کے گیت گاتی رہی۔ وفا کے نام پر کھیل تو ہر قوم میں ہی کھیلا جاتا ہے اچھے برے لوگ تو ہر نسل میں ہوتے ہیں۔ آنکھ دھوکا کھاتی ہے یقین کو فریب ہوتا ہے۔
اس کے وجود میں شکوے شکایات کا طوفان تھا آج اسے ایک عظیم غم کا سامنا تھا اور جو سانحہ آج اس کے دل نے جھیلا تھا اس کا اثر ساری عمر رہنا تھا۔

[illegible] گریٹ رات گئے تک ان سب لوگوں کے ساتھ [illegible] ابرار کی فیملی اسے بہت اچھی لگی حسام فوراً منظر سے غائب ہوگیا۔ ابرار کا مقصد پورا ہو گیا معصوم سی [illegible] کا گھر بچانے کے لیے اس نے بہت بڑا جوا کھیلا [illegible]۔

[illegible] حسام سے کسی قسم کے بھی سلوک کی توقع کی [illegible] تھی مگر اس کے لب خاموش تھے۔ ارجمند [illegible] نے بہت محبت سے اسے رخصت کیا تحفے [illegible] دیے۔ پھر آنے کو کہا لیکن اب اس نے کبھی [illegible] آنا تھا دوسری صبح اسے اپنے دیس لوٹنا تھا اور [illegible] جا کر اپنے نام کی وفا تلاش کرنی تھی۔

[illegible] حسام نے ملے بغیر ہی جانا تھا کہیں کوئی مبالغہ [illegible] نہیں تھا پس منظر سے اچانک ہی ہر شے منظر [illegible] آگئی تھی اب وہ اتنی پاگل نہیں تھی کہ کسی کا بنا بنایا [illegible] تباہ کر دیتی۔

——*

[illegible] معمول پر آگئی وہی صبح و شام کا کھیل، سب کے [illegible] بچوں کے اسکول بدل گیا تھا تو۔ حسام عارف احمد اس کے اندر کی دنیا بدل گئی تھی۔ اپنی خواہشات کا [illegible] ہار گیا۔ تقدیر نے اب کنارے لا کر مارا تھا اس [illegible] یہ ہوا کہ مارگریٹ اس سے ملے بغیر واپس جا چکی [illegible] ورنہ کچھ نہ کچھ کہہ کر اسے منا لیتا۔

[illegible] روم میں گہری خاموشی دو نفوس کی موجودگی کا احساس ہی نہ دلاتی۔ دونوں اپنی اپنی تخیلاتی دنیا میں آباد رہتے اس کے ناروا سلوک کے متعلق رعنا نے ایک لفظ نہ پوچھا تھا اور نہ کچھ کہا تھا اس کی خاموشی نے اسے شرم سے ہمکنار کر دیا تھا۔

ابرار نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ ہکا بکا ہوتی رہ گئی تھی اس کی وفا، صبر و استقلال کا خدا نے کس طرح ساتھ دیا تھا۔ جتنا شکر ادا کرتی کم تھا اس کی حسام سے کوئی ناراضگی نہیں تھی مگر اب اسے خود ہی اس کی جانب بڑھنا تھا یہ انا کی جنگ نہیں تھی ازدواجی رشتوں میں انا نام کی چیز نہیں ہوتی۔

——*

وہ کچھ دنوں کے لئے امی کے ہاں آگئی۔

شادی کے بعد دوسرا دن تھا اس نے اور نبیلہ نے مل کر تمام بھولی بھٹکی یادوں کو پھر سے تازگی بخش دی۔ وہی پکوڑے اور ہری مرچوں کی چٹنی وہی جھولوں پر بیٹھ کر درختوں کو چھونا بارش میں نہانا اور اونچے سروں میں ڈیک سننا گھر کی رونق زندہ ہو گئی تھی۔

اس سارے سیٹ اپ سے حسام تھک چکا تھا اس کے جذباتی قدم نے اسے سب سے الگ کر دیا تھا اب تو مارگریٹ کی یاد بھی قصہ پارینہ بننے کو تھی۔

اور شاید جذباتی محبتیں ایسی ہی ہوتی ہیں ایک دم سے اٹھیں اور غبار کی مانند بیٹھتی گئیں دودھ کے ابال کی طرح۔

وہ باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی بہت بدل گیا تھا اس نے ماں سے معافی مانگی اور ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دیا اور انہوں نے دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

"جاؤ بیٹا اس کو مناؤ جو تمہاری زندگی کی ساتھی ہے۔"

"کیا وہ مان جائے گی۔" اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔

"ہاں! ثابت قدمی سے اپنی جگہ کھڑے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے امی آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔" اس نے ماں کی گود میں منہ چھپا لیا۔

"مائیں اپنے بچوں کی خطائیں معاف ہی کرتی ہیں کبھی ان کا برا نہیں چاہتیں اور سنو ایک بات کا فیصلہ کرکے اس تک جانا' آئندہ تم اس قسم کی حرکت نہیں کرو گے' بے شک باوفا عورتوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں مگر شدت غم سے کبھی کبھی یہ دل پھٹ بھی جایا کرتے ہیں۔"

اس نے اس بات کو دل پر لکھ لیا ویسے بھی اب وہ بہت بدل چکا تھا اپنی جذباتیت کا گلا خود اپنے ہاتھوں گھونٹ دیا تھا۔

"آپی۔۔۔ آپی۔۔۔ حسام بھائی آئے ہیں۔" وہ جو دریچے میں گم سم خاموش بیٹھی تھی چونک گئی آج کچھ بھی کرنے کا موڈ نہ تھا اس لئے دریچے سے لگی بھیگتی رہی اور بہت کچھ سوچتی رہی نبیلہ کی آواز نے چونکا دیا۔ یک دم پلٹی نبیلہ حسام کو دروازے میں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ حسام کی چہکتی آواز کانوں میں اتر گئی۔

"موسم کا تقاضا ہے پکوڑے شکوڑے بناؤ۔" اسے دیکھ کر حسام خاموش ہو گیا۔

"مجھے اندر آنے کی اجازت مل سکتی ہے۔"

"ایک شرط پر۔" رمنا نے کوئی لحاظ نہیں کیا۔

"حکم سرکار۔" حسام نے کان پکڑ لئے۔

"زندگی کا نیا سفر وفا' یقین' خلوص' اعتماد' کے سہارے شروع کریں گے اپنے اندر سے جذباتیت کو نکال دیں دو کشتیوں کا مسافر ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے اگر میں بھی اپنی کشتی کا رخ موڑ لوں پھر۔۔۔؟"

"بندہ معافی کا طلبگار ہے۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ہر جگہ صبر و استقامت نہیں چل سکتا۔" اس نے رخ پھیر لیا۔ باہر بارش یک دم ہی تیز ہو گئی تیز بوچھاڑ نے اسے بھگو دیا غیر محسوس انداز میں حسام اس کے بالکل پیچھے کھڑا ہو گیا تیز بوچھاڑ نے اسے بھی بھگو دیا۔

"باخدا' خدا کو حاضر ناظر جان کر سارے سبق پڑھ کر آیا ہوں اور سارے جذباتی راستوں سے گزر کر صرف یہ سیکھا اور سمجھا ہے کہ سب آتے جاتے موسم ہوتے ہیں' زمانہ وہ ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ٹھہر جاتا ہے زندگی اتنی بے کار نہیں کہ اسے یوں گزارا جائے اور میں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ میرا عملی دور شروع ہو چکا ہے فی الحال خواب دیکھنا بند کر دوں جو ہے اس پر قناعت کروں۔"

اس کی اتنی لمبی تقریر پر وہ بے ساختہ ہنسی۔

حسام بڑے دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا اس نے پہلے بے یقینی سے اسے گھورا پھر بے ساختہ ہنس دی۔

"اور کنول اس کے متعلق کیا خیال ہے۔"

"وہ!" اس نے دھیرے سے سر کھجایا۔

"تمہاری دوست ہے منع کر دینا کہ مجھے فون کر کے غلط ملط پٹیاں نہ پڑھایا کرے۔"

وہ شرارت سے ہنس دیا۔

"اور اگر آئندہ شکایت ملی۔" اس نے باز پرس کی۔

"جو مزاج یار میں آئے۔" حسام نے ذرا سا جھک کر سر تسلیم خم کیا وہ جھک کر پیچھے ہٹی۔

"اصل بات تو یہ تھی کہ اس کے صبر و استقلال اور ثابت قدمی نے اس کی خوشیاں لوٹا دی تھیں' اگر وہ بھی عام سی لڑکیوں کی طرح چیخ و پکار کرتی تو اس کی منزل آسان ہو سکتی تھی بھلا۔۔۔"

"اور سنو۔۔۔!" وہ اس کے شانوں پر جھکا۔

"میں اپنے دل سے جذباتیت کو تو نکال سکتا ہوں جذبات کو نہیں' آخر ہمیں بھی تو۔۔۔" رمنا نے دلکش ہو کر اسے دیکھا اور محجوب ہو کر پلکیں جھکا لیں اب کے تیز بوچھاڑ نے انہیں ایک ساتھ بھگو دیا۔

رُخ چوہدری

[illegible]

ناولٹ

نیہا اور شہوار آپس میں چچازاد بہنیں تھیں ان کے والدین ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ شہوار اور نیہا میں بہت دوستی تھی۔ نیہا کے بھائی زوہیب سے شہوار کی منگنی ہو گئی تھی لیکن نیہا کو تو ایک ہی لگن، ایک ہی جنون تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ جب اس کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

قیصر بزنس کے سلسلے میں پاکستان آیا تھا۔ اس نے ایک تقریب میں نیہا کو دیکھا تو دل ہار بیٹھا۔ اپنی ما کے سامنے اظہار مدعا کیا تو وہ نیہا کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ قیصر کے والد شاہنواز خان کو پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ قیصر کے لیے انہوں نے جو لڑکی منتخب کر رکھی ہے قیصر کی شادی اسی سے ہوگی۔ لیکن جب انہیں پتا چلا کہ قیصر کی پسند نیہا ہے تو وہ فوراً رضامند ہو گئے۔ نیہا شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن شاہنواز خان نے اس قدر اصرار کیا، دوسرے گھر والوں کو بھی رشتہ بہت پسند آیا تھا۔ اسے مجبوراً رضامند ہونا پڑا۔ گھر والوں کا ارادہ تھا کہ منگنی ہو جاتی جب نیہا ڈاکٹر بن جائے گی تو شادی کر دیں گے۔ لیکن منگنی کی تقریب میں شاہنواز خان نے نکاح کے لیے کہہ دیا۔ اور نکاح کے فوراً بعد وہ اڑ گئے کہ رخصتی بھی ابھی ہوگی چونکہ نکاح ہو چکا تھا۔ اس لیے گھر والے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ نیہا رخصت کر دی گئی۔

قیصر جب حجلہ عروسی میں جانے لگا تو شاہنواز خان نے کہا کہ قیصر طلاق نامے پر سائن کر دے۔ قیصر چکرا کر رہ گیا لیکن باپ کی حکم عدولی نہ کر سکا۔ اس نے نیہا کو طلاق دے دی۔ تب شاہنواز خان نے بتایا کہ نیہا کے والد نے برسوں پہلے ان کو جیل بھجوایا تھا۔ ان کے والد اور بہن اس صدمے سے وفات پا گئے تھے۔ نیہا کو طلاق دلوا کر انہوں نے اس کا انتقام لیا ہے۔ نیہا یہ داغ لے کر گھر واپس آ گئی۔
عائشہ کالج میں لیکچرار تھی۔ اس کی بہن اور بہنوئی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی بیٹی دیبا کو عائشہ نے ہی پالا تھا۔ عائشہ خود بھی ایک بڑی جائیداد کی مالک تھی، اور دیبا کے نام بھی بہت سی جائیداد تھی۔ زبیر عائشہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن دیبا، زبیر کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لیے عائشہ پریشان تھی کہ وہ زبیر کو کیا جواب دے۔ خود زبیر بھی دیبا کو شدید ناپسند کرتا تھا۔

آٹھویں قسط

"لگتا ہے راشد دادا کو پھر غصہ آیا ہوا ہے۔ یار! کیا چیز ہے یہ اور کیا سمجھتا تھا خود کو۔ ہر وقت غصے میں تنا رہتا ہے۔"

راشد ان کا کلاس فیلو تھا اور کسی بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور اسی زعم میں وہ کسی دوسرے کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔

"یار! لینڈ کروزر میں گھومتا ہے۔ ملازم ساتھ ہوتے ہیں۔ ہرے نیلے نوٹوں سے جیب بھری رہتی ہے تو پھر۔۔۔ خیر آؤ۔ ذرا حال احوال پوچھیں ورنہ تو یہ آج چھوٹے کا بنا دے گا قیمہ۔۔۔" احمر اٹھ کھڑا ہوا تو تنویر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"احمر! اس بندے کو اچھی طرح جانتے ہو ناں۔ اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ ہو گا چھوٹے کا بھی قصور۔" تنویر کترا رہا تھا راشد کے منہ لگنے سے۔

"غریب ہمیشہ بے قصور ہی پٹتا ہے۔ کوئی قصور ہو یا نہیں۔ چھوٹے یار! آؤ۔ تحمل سے بات کرنے میں کیا ہرج ہے۔ اچھا چلو تم جاؤ۔ میں آتا ہوں۔۔۔"

احمر اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھا تو تنویر بھی کھڑا ہو گیا۔

"اب میں اتنا بھی بے غیرت نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ دوں چلو۔"

"ذلیل کمینے! تم نے یہ حرکت کی کیسے کہ میرا آرڈر روک کر کے دوسرے کو پہلے لا دیا اور۔۔۔"

"ان کی تو خالی چائے تھی جی اور آپ کا آرڈر بڑا تھا اور تیار ہو رہا ہے جی اس لیے۔"

"بکواس بند کر۔" راشد نے اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔

"مظلوم اور بے بس پر طاقت کا مظاہرہ بہادری کے زمرے میں نہیں آتا اور یہ تو بچہ ہے۔" احمر نے چھوٹے پر اٹھا ہوا راشد کا ہاتھ پکڑا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"تم سے مطلب۔۔۔؟" راشد اسے گھورنے لگا۔

"مظلوم کی حمایت کا مطلب صرف انسانی ہمدردی ہوتا ہے، ویسے اس کا قصور کیا ہے۔۔۔؟" احمر نے بارہ تیرہ سالہ چھوٹے رفیق کو اپنی طرف کر کے پوچھا۔

"جب میں نے جلدی لانے کو کہا تھا تو اس نے پہلے اس کو چائے لا کر دے دی وہ بھی چوکیدار کو۔" اپنی حیثیت کا غرور اور دوسرے کی کمتری کا احساس چہرے پر رعونت کی سختی بن کر اتر آیا۔

"دیکھو راشد! کوئی انسان دولت کے زیادہ یا کم ہونے سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہو جاتا۔ یوں بھی درس گاہ، عبادت گاہ، قبرستان ایسی جگہیں ہیں جہاں بڑے چھوٹے کی تخصیص نہیں ہوتی۔ اور پھر بھی جب چھوٹا کہہ رہا ہے کہ تمہارا آرڈر بڑا ہے۔ اس کے تیار ہونے

میں وقت لگے گا تو ایک غریب بندہ اتنی دیر میں چائے کا ایک کپ بھی نہیں پی سکتا؟ طاقت کا بے جا استعمال بری بات ہے۔ یار! کول ڈاؤن۔۔۔" احمر نے آہستگی سے اس کا ہاتھ نیچے کیا اور شانہ تھپتھپا کر اسے ٹھنڈا کیا تو وہ جز گیا۔

"تم اگر غریبوں کے حقوق کے اتنے بڑے علم بردار ہو تو ان سے کہو تمیز سیکھیں یا تم سکھاؤ ان کو تمیز۔۔۔"

"جس دن یہ واقعی تم سے بدتمیزی کرے گا ناں تو میں اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا کیوں چھوٹے۔۔۔" احمر نے مسکرا کر چھوٹے کے شانے پر ہاتھ مارا جس کی نظروں میں احمر کی آج بہت عزت بڑھ گئی تھی۔

"آپ جان سے مار دیتا احمر بھائی۔۔۔" چھوٹے نے جاں نثارانہ انداز میں احمر کو دیکھا۔

"چلو پھر راشد بھائی کے لئے اور ہمارے لئے دوستانہ سی اچھی سی چائے لاؤ اور ساتھ پیٹیز بھی۔ چلو شاباش۔۔۔ چلو آؤ یار راشد کول ڈاؤن یار بیٹھو۔۔۔"

"آپ بیٹھو راشد بھائی! میں ابھی۔۔۔"

"او شٹ اپ! آ گیا مجھے راشد بھائی کہنے والا۔ اوقات میں رہو ہاں۔" راشد نے حقارت سے چھوٹے کو گھورا پھر ایک تیز نگاہ احمر اور تنویر پر ڈال کر میز کو ٹھوکر مار کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"احمر بھیا! آپ آ گئے شکر ہے خدا کا ورنہ تو آج یہ مجھے مار دیتا۔۔۔" چھوٹے پر ابھی بھی خوف کے اثرات باقی تھے۔

"ارے چھوٹے! ہم نہ بھی ہوتے تو کیا ہوتا۔ خدا تو ہوتا ہے ناں انسان کا محافظ۔ چلو اب چائے لاؤ۔ اچھا ایسا کرو۔ چائے وہاں لے آنا۔۔۔"

بات کرتے کرتے احمر کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں، جہاں سے نیہا ارم اور نائلہ آ رہی تھیں۔ شوخ سی چمک سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

"ہیلو گرلز کیسی ہو ارم۔۔۔؟" احمر نے ایک گہری نگاہ نیہا پر ڈالی۔ میز پر فائل رکھی اور ارم کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"اوہ! شکر ہے احمر! تم مل گئے۔۔۔" نائلہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"ہاں میں تو گیا میں گم ہو گیا تھا۔۔۔ اور کس قدر بدتمیز ہو تم لوگ کہ گمشدگی کا اشتہار بھی نہیں دیا اور وہاں میں خود کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب تم نے بتایا کہ میں مل گیا ہوں۔ شکر ہے خدا کا۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں شوخیاں رقصاں تھیں۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے' وہ میری یک لا۔ نیہا کو چاہیے۔۔۔" اس نے شوخی سے نیہا کو دیکھا جو اس کو بری طرح نظر انداز کئے کتاب کھولے بیٹھی تھی۔

"کبھی تو سیریس ہو جایا کرو احمر۔۔۔"

"سیریس۔۔۔ ارے میں تو شروع سے دیکھتے ہی سیریس ہو گیا تھا مگر۔۔۔"

احمر نے ذرا سا جھک کر نیہا کو دیکھا تو اسی وقت اس نے بھی دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں شوخیاں رقصاں تھیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر کتاب بند کر کے بیگ میں رکھ لی اور چائے پینے لگی۔ بے اعتنائی کا تیر سیدھا دل پر لگا مگر وہ ہنس کر سیدھا ہو گیا اور ارم سے بات کرنے لگا۔

"آں۔۔۔ آں یہ کیا کر رہی ہو نائلہ۔۔۔؟" احمر نے نائلہ کو بیگ سے پیسے نکالتے دیکھ کر کہا۔

"یہ جو کچھ ٹھونسا ہے مفت نہیں تھا۔۔۔ نہ ہی کینٹین والوں سے رشتہ داری ہوئی ہے کہ مفت میں۔۔۔"

"رکو۔۔۔ رکو۔ آج کیا دن ہے بھلا۔۔۔؟" احمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے دیکھا پھر کن انکھیوں سے نیہا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جمعرات ہے۔۔۔" ارم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہو تو تمہیں پتا نہیں کہ جمعرات خیرات کا دن ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کی چائے جناب احمر کی جانب سے۔۔۔" احمر نے شوخی سے نیہا کو دیکھا جو اس کی اس بات پر اندر ہی اندر کھول اٹھی تھی۔

"کیپ دا چینج Keep the change۔۔۔" نیہا نے بیگ سے دس روپے نکالے اور اپنی چائے کے

پیسے اس کی طرف اچھال دیئے۔ اس کا انداز اس قدر حقارت آمیز، لہجہ اتنا سخت تھا کہ کچھ دیر کے لیے خوشگوار ماحول پر سناٹا سا چھا گیا۔ احمر کے چہرے پر سختی سی آ گئی۔

"مس نیہا احمد! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ آپ جنگل میں نہیں ہیں۔ اب آپ انسانوں میں آ گئی ہیں۔ لہٰذا انسانوں کے انداز اختیار کیجئے۔"

احمر نے اس کا نوٹ پھاڑ کر اسی پر اچھالا اور تیزی سے کیفے ٹیریا سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر کے لیے وہ سن سی ہو گئی اور نائلہ ارم کے سامنے شرمندہ بھی۔

"نیہا! مائنڈ نہ کرنا مگر احمر کے ساتھ تمہارا یہ رویہ مناسب نہیں۔۔۔ وہ دل کا صاف اور اچھا لڑکا ہے۔ وہ یہ سب مذاق میں کرتا ہے ورنہ کسی کی دل آزاری اس کا مقصد نہیں ہوتا۔۔۔"

ارم احمر کی عدم موجودگی میں اس کا دفاع کر رہی تھی تو وہ چپ چاپ اسے دیکھ کر رہ گئی۔۔۔ مگر نجانے کیا بات تھی کہ احمر کو دیکھتے ہی اسے غصہ آ جاتا تھا۔

*_*_*

"سوچ یار! تنویر کوئی ترکیب سوچ۔۔۔ کس بندے کو یہاں وہاں کیا جائے۔"

احمر مستقل ٹہل ٹہل کر سوچ رہا تھا اور جب سوچ کی دعوت اس نے تنویر کو دی تو اس نے تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔

"گھاس وہ تجھے ڈالتی نہیں اور موصوف مرے جا رہے ہیں ان کے بیچ میں جانے کے لیے۔"

"اس لیے کہ اسے معلوم ہے میں گھاس نہیں کھاتا۔۔۔ مجھے ہر حال میں اس کے بیچ میں جانا ہے۔۔۔

چلو آؤ۔۔۔ سر منیر سے بات کرتے ہیں وہ تو انچارج بھی ہیں۔۔۔"

احمر نے کتاب تنویر سے لے کر الگ رکھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

"کیا کر رہے ہو یار! پڑھنے دو Substage آ رہی ہے۔ مجھے بہت پڑھنا ہے۔ مارکس کم آنے لگے ہیں۔۔۔"

"او چھوڑ یار! پاس تو۔۔۔ تو نے ہر حال میں ہونا ہے۔ میری نقل کر کے۔۔۔ چلو تو میرے ساتھ۔۔۔"

اور پھر تنویر کو گھسیٹتا ہوا منیر صاحب کے پاس لے آیا، وہ کھانا کھانے ہی لگے تھے۔

"آؤ بھئی بچو! کیسے آنا ہوا۔۔۔؟" منیر صاحب نے پلیٹ اپنے سامنے کھسکائی۔

"سر! آپ بھی ہوسٹل کا کھانا کھاتے ہیں۔۔۔"

تنویر اور احمر نے ندیدوں کی طرح ان کے کھانے کو دیکھا۔

"ظاہر ہے یہاں رہتا ہوں تو کھانا بھی یہاں کھاؤں گا، کیوں۔۔۔"

"یہی تو کہہ رہے ہیں سر کہ کاش آپ کا کوئی گھر ہوتا۔۔۔ گھر والی ہوتی۔۔۔ کھانا خود بنا کر کھلاتی۔۔۔ سب سے بڑھ کر فائدہ تو ہمارا ہوتا سر کہ اگر آپ ہماری بات نہ مانتے تو ہم آپ کی شکایت کر کے آپ کو ٹھیک کرواتے۔۔۔ مگر سر! اب تو آپ کچھ بھی کر لیں۔ ہم آپ کی کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔۔۔"

احمر نے باقاعدہ رونی صورت بنائی تو سر گھورنے لگے۔

"احمر میاں! میں کھانا کھانے لگا ہوں۔ ایسی شکل بناؤ گے تو اندر کا بھی باہر آ جائے گا۔۔۔ کہو۔۔۔ کس لیے آئے ہو۔۔۔" سر نے کہا تو وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

"کام تو خاص نہیں سر! وہ ذرا ایک بندہ یہاں سے وہاں کرنا ہے۔۔۔"

"کیا مطلب ہے۔ مجھے کرائے کا غنڈا سمجھا ہوا ہے۔ بندہ یہاں سے وہاں کرنا ہے۔۔۔"

منیر صاحب اس کی بات سمجھ نہ سکے تو ڈپٹ کر بولے۔ تو وہ گڑبڑا گیا۔ تنویر کا مشورہ تھا کہ بھاگ چلو مگر وہ جما رہا۔

"نہیں۔۔۔ سر کرائے کا تو نہیں۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔"

تب اس نے بھاگتی ہوئی مردانہ ہمت کو پکڑا اور ساری بات کہہ دی۔

"دو سال گزر جانے کے بعد تمہیں بیچ بدلنے کا

خیال کیسے آیا۔۔۔"

سر نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے مشکوک سی نگاہ اس پر ڈالی۔ تو وہ لاجواب سا ہو کر سر کھجانے لگا۔

"سر! وہ کشش۔۔۔ ہی اب آئی ہے۔ میرا مطلب ہے سر کہ بس آپ کچھ کر دیں۔ سمجھ لیں کہ کسی نے میری قابلیت اور میرے اختیارات کو چیلنج کیا ہے۔"

"احمق نہ بنو احمر! تم مستقبل کے ڈاکٹر ہو۔۔۔ فلمی ہیرو نہیں کہ اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ جاؤ جا کر ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ پچھلی دفعہ تمہارے نمبر کم آئے تھے۔"

سر منیر نے بری طرح جھاڑ دیا۔

"سر! نمبروں کی بات نہ کریں۔ میں آپ کو دس نمبری بن۔۔۔ اوہو! میرا مطلب ہے کہ خدا کے فضل سے میں بہت محنت کروں گا اور اچھے مارکس لاؤں گا۔ بس آپ میرا یہ کام کر دیں۔"

احمر جیسے شریر اور کھلنڈرے لڑکے کے اس مطالبے میں شوخی کے ساتھ سنجیدگی بھی تھی۔ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ اور کچھ دیر دیکھتے رہے۔

"سر معاملہ کیا ہے؟ کہیں سیاست میں تو نہیں پڑ گئے۔ اگر ایسا ہے تو۔۔۔"

"نو۔۔۔ نو۔۔۔ سر! سیاست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سیاست اور میں دو مختلف چیزیں ہیں۔۔۔ میری تو زندگی کا نصب العین ہی محبت ہے۔ میرا پیغام بھی محبت ہے اور اس بیچ میں جانے کا سبب بھی محبت ہے۔ میرا مطلب ہے سر کہ۔۔۔"

وہ روانی میں زبان سے پھسل جانے جملے سے شرمندہ سا ہو کر کان کھجانے لگا تو سر منیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سمجھ گئے۔

"دیکھو احمر! یہ انتہائی بچکانہ اور احمقانہ سی ضد ہے تمہاری اور یوں بھی اصول کے خلاف بات ہے۔"

"سر! آپ تو انچارج ہیں ان تمام۔۔۔"

"ہاں تو تب ہی کہہ رہا ہوں کہ یہ اصول کی بات ہے۔"

"سر پلیز۔۔۔" احمر نے رونی صورت بنائی۔

"اچھا بابا جاؤ میری طرف سے صرف اس صورت میں اجازت ہے کہ اگر کوئی اسے بیچ کا بندہ والنٹری۔۔۔ تمہاری بات مان جائے۔ دوسری صورت میں یہ اصول کے منافی بات ہے۔۔۔ بھائی چارے میں کوئی مان جائے تو الگ بات ہے۔"

"او کے۔۔۔ سر تھینک یو سر۔۔۔ تھینک یو آپ جینئس۔۔۔ سر آپ کے بچے جینئس سر بچے۔۔۔ اور سر! ہم بھی تو آپ کے بچے ہیں ناں۔۔۔ جیتے رہیں پھولیں پھلیں۔"

وہ خوشی میں اوٹ پٹانگ باتیں کرتا چلا گیا تو سر منیر کتنی ہی دیر محظوظ ہوتے رہے۔ ان کو واقعی اپنے اسٹوڈنٹ اپنی اولاد کی طرح پیارے تھے۔

*_*_*

نیہا نے گھر میں قدم رکھا تو ڈرائننگ روم سے باتوں کی آواز پر وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے بہت تھکن ہو رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ بھابھی کی سہیلیاں آئی ہوں گی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بعض تو آتی ہی اس کے لئے تھیں۔ کسی کا بھائی ڈاکٹر ہے۔۔۔ کسی کا بھائی ایم بی اے ہے تو کسی کا دیور امریکہ میں پڑھ رہا ہے اور اس کی آئیڈیل لڑکی کے سانچے میں نیہا ڈھل جاتی ہے اس لئے۔

"ہونہہ خود غرض لوگ۔۔۔ اپنی پسند کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس کو ہم پسند کر رہے ہیں اس کی بھی کوئی پسند کوئی آئیڈیل ہو سکتا ہے۔ بھابھی بھی کہہ کیوں نہیں دیتیں۔۔۔ کہ۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ماضی کی اندھیری وادی کی طرف نکل گئی۔ ایک خوبرو شخص قیصر جو چند لمحوں کے لئے اس کے سر کے تاج کی حیثیت سے اس کی زندگی میں آیا اور۔۔۔ اس کی شفاف بے داغ پیشانی پر طلاق کا بدنما دھبا لگا کر نجانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ وہ تو اس دھند میں نجانے کب تک بھٹکتی کہ نوی پوی نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔

"ارے پھپھو! وہاں مہمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ یہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہیں۔ اٹھئے ناں۔"

"نہیں وہ اتنا بلا رہے ہیں چلئے۔۔۔۔"
دونوں بچوں نے ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ چڑ گئی۔
"کیا مشکل ہے لوبی؟ بھائی سے کہہ دو کہ مجھے کسی مہمان سے نہیں ملنا۔ آجاتا ہے اٹھ کر روزانہ کوئی نہ کوئی۔"
"ارے پھپھو! بری بات ہے۔ مہمانوں کو یوں نہیں کہتے۔ اٹھیے شاباش۔"
"ہوی! اوبی! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بالکل کسی مہمان سے ملنے کا جی نہیں چاہ رہا۔" اس نے ذرا غصے سے کہا اور پھر لیٹ گئی۔
"اچھا بھئی۔ اگر مہمانوں سے نہیں ملنا تو مہمان واپس چلے جاتے ہیں۔"
اس آواز پر نمہا نے چونک کر دیکھا تو سامنے امی‘ ذوہیب شہوار اور حارث کھڑے تھے۔
"امی جان۔" وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ جدائی کی اتنی گھڑیوں کو اس نے نمکین پانی کے سمندر میں بہا دیا۔
"امی! میں کس قدر اداس تھی اور یہ آپ لوگوں نے بتایا کیوں نہیں آنے کا۔" وہ شہوار سے مل کر شکوہ کر رہی تھی۔
"جو مزا سرپرائز دینے میں ہے‘ وہ اطلاع میں کہاں کیسی ہو تم نمہا۔۔۔؟"
ذوہیب نے بڑوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔
"ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔۔۔۔" حارث نے اس کے سر پر چپت لگا کر متوجہ کیا تو وہ اس کی طرف گھوم گئی۔
"آپ راہوں میں کیوں؟ آپ تو سر آنکھوں پر۔" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

*_*_*

ان لوگوں کے آجانے سے دن بہت رنگین ہو گئے تھے۔ نمہا کو یوں کالج آتے جاتے اور زندگی کی طرف لوٹتے دیکھ کر عذرا بیگم بے حد خوش تھیں۔
"خدایا میں گناہ گار تیری ذات پاک کا شکر ادا نہیں کر سکتی کہ میری بیٹی پھر لوٹا دی تو نے۔ ماشاء اللہ اب تو صحت بھی اچھی ہے نمہا کی۔"
عذرا بیگم نے لان میں ذوہیب کی کسی بات پر بے ساختہ ہنستی ہوئی نمہا کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔
"امی جان ماشاء اللہ نمہا۔۔۔ تو بالکل پہلے جیسی ہو گئی ہے۔ بس ذرا بھی گزارے لمحے کی یاد کا ناخن چبھ جاتی ہے تو بے قرار ہو جاتی ہے۔ لیکن انشاء اللہ کچھ دنوں میں بالکل بھول جائے گی۔ ویسے امی جان اس کے تو کئی رشتے بھی آچکے ہیں مگر میں نے منع کر دیا ہے۔ کہ آپ سے مشورہ کئے بغیر میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔"
انیقہ نے لگے ہاتھوں نمہا کے آنے والے پرپوزلز کے بارے میں بتا دیا۔
"ٹھیک ہے بیٹی! رشتہ تو کرنا ہی ہے اس کا‘ مگر میں کچھ اور سوچ رہی ہوں اپنا حارث ہے ناں۔۔۔؟"
"امی جان! حارث کا تو اس کی کزن کے ساتھ طے ہے۔"
"ہے نہیں تھا۔ حارث تو خیر شروع ہی سے اتنا تیار نہیں تھا۔ وہ تو ان دونوں بہنوں کی خواہش تھی۔ اس لئے بات کر لی مگر سچ بات یہ تھی کہ لڑکی لڑکا قطعی تیار نہیں تھے۔ بلکہ لڑکی اپنے کسی اور کزن کو پسند کرتی تھی۔ کھل کر سامنے آئی تو دونوں بہنوں نے اچھے طریقے سے ایک دوسرے سے معذرت کر لی۔ اب تو میرے خیال میں صبا کی شادی بھی ہو گئی ہو گی۔"
"اچھا یہ تو بڑی عجیب بات بتائی آپ نے امی جان۔" انیقہ کو اس خبر سے جہاں حیرت ہوئی تھی‘ وہاں اطمینان بھی کہ نمہا کا مسئلہ بھی حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔
"ہاں میں نے۔۔۔ تو تب ہی ارادہ کر لیا تھا کہ اب اپنی بچی کو گھر ہی میں رکھوں گی۔ خدا نے چاہا تو حارث اور نمہا کی شادی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی لئے سب ہوا ہو اب تو ہرگز اپنی بیٹی کا رشتہ باہر نہیں کروں گی۔"

کیا پالیا ہے میں نے پہلے باہر کر کے۔ دھبہ لگوا لیا اپنی معصوم بچی کی پیشانی پہ۔"
عذرا بیگم تو اب بڑی خوش اور مطمئن تھیں جب سے حارث کی بات وہاں سے ختم ہوئی تھی۔
"امی جان! چچی جان اور چچا جان نے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے۔"
"ہاں کیوں نہیں جیسے ہی وہاں بات ختم ہوئی۔ وحید نے کہہ دیا کہ اب نیہا ہی ان کی بہو بنے گی۔ وحید تو خیر پہلے ہی یہ چاہتے تھے مگر بیگم کا جھکاؤ اپنی بہن کی طرف تھا تو وہ بھی چپ ہو گئے اور ہماری بدنصیبی کہ نیہا کا ادھر ہو گیا۔"
"چلیں امی! چھوڑیں گزری باتیں۔ اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ آئندہ زندگی نجانے کیسے گزرتی۔ اب حارث ہے۔ اتنا اچھا لڑکا ہے اور پھر گھر کی بات گھر ہی میں رہ جائے گی۔ آپ نے عاصم سے بات کر لی۔"
"ہاں۔ ہاں آتے ہی کر لی تھی۔ وہ بھی بے حد خوش ہوا ہے۔"
"لیکن میں نیہا کا سوچ رہی ہوں۔ وہ مان جائے گی۔"
انیقہ کو نجانے کیوں یقین تھا کہ نیہا حارث کے لیے قطعی تیار نہیں ہو گی۔
"کیوں نہیں مانے گی۔ ارے بھئی فرسٹ کزن ہے۔ ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ایسے واقعہ کے بعد تو حارث ہی اس کا دوست، ہمراز ساتھی ثابت ہو سکتا ہے پھر کیسے نہیں مانے گی۔"
"اچھا امی جان! اگر میرے خیال میں ابھی نیہا کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اسے دل لگا کر پڑھ لینے دیں پھر دیکھی جائے گی۔ گھر کی تو بات ہے۔"
"ہاں ہم سب نے یہ ہی فیصلہ کیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ امن سکون کے ساتھ میری بچی کو منزل نصیب فرمائے۔"

"آمین..." انیقہ نے صدق دل سے آمین کہا۔

*_*_*

"ہو بھی یہ تو اچھی نہیں۔ اسی لیے میں کہوں کہ حارث صاحب ہیرو کیوں بنے ہوئے ہیں ویسے رسم کے وقت تو صبا بڑی خوش تھی..." نمہا کو اس خبر سے واقعی دکھ ہوا تھا۔

"کہاں خوش تھی۔ بناوٹی مسکراہٹ تھی۔ بس موقع پر بھرم رکھ لیا تھا اور جب عباد آیا آسٹریلیا سے تو یہ بھرم بھی ختم ہو گیا اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ حارث سے نہیں عباد سے شادی کرے گی اور جب حارث بھائی کو پتا چلا تو انہوں نے خود ہی انکار کر دیا۔"

شہوار نے ساری تفصیل بتائی تو نمہا اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف چپ چاپ بیٹھے حارث کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بغور اسے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو..." حارث مسکرا پڑا۔

"تم نے واقعی دل سے انکار کیا تھا..." وہ اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔

"ہاں بھئی جس دل کی گلیوں میں اس کا گزر ہی نہیں تھا تو پھر اس بادِ صبا کے لیے دروازہ بند کرنا کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ یوں بھی وہ دونوں آپس میں انوالو تھے تو میں دیوار کیوں بنتا۔ شادی سمجھوتے کے بجائے خوشی سے ہو تو زیادہ اچھی گزرتی ہے اور یہاں تو نہ وہ خوش تھی اور نہ میں یہ تو اچھا ہوا کہ پہلے ہی بات ختم ہو گئی ورنہ بعد میں پچھتاوے رہ جاتے ہیں..."

حارث کے لہجے کی سچائی اور یقین نمہا کو مطمئن کر رہا تھا۔

"واقعی..." اس نے شوخ سی بے یقینی سے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگا۔

"تم تو اچھی طرح جانتی ہو نمہا کہ میں دل پھینک قسم کا آدمی تو ہوں نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم بھائی بہن کی قسمت میں کچھ وفا ہی کم ہے۔"

حارث نے بلکے سے طنزیہ لہجے میں کہہ کر زوہیب کی طرف دیکھا جو جب سے آیا تھا کئی بار بے چینی سے عالیہ کو فون کر چکا تھا اور وہ گھر پر ملی نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ فون کر رہا تھا۔

"ہیلو جی... مس عالیہ سے بات ہو جائے گی..."

لائن ملنے پر زوہیب نے بے چینی سے کہا تو وہ دونوں لڑکیاں بری طرح چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"کون ہے یہ عالیہ...؟" نمہا نے آہستگی سے شہوار سے پوچھا۔ وہ اشارے سے خاموش رہنے اور انتظار کرنے کا کہہ کر زوہیب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی میں ان کا کلاس فیلو ہوں اور آج کل اسلام آباد آیا ہوا ہوں۔ جی بہتر میں ہولڈ کرتا ہوں..."

وہ اس وقت اتنا گم تھا کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ تینوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

"شکر ہے عالیہ! آپ فون پر آئیں تو... کیا میں کون ہوں واہ کیا بات ہے بھئی کہ میں جب سے آیا ہوں فون کر رہا ہوں اور محترمہ نے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے..."

زوہیب بڑے پیار اور مان بھرے انداز میں شکوہ کر رہا تھا۔ شہوار کے چہرے پر آئی سختی اور خفگی کے تاثر سے نمہا الجھ سی گئی۔

"او اچھا زوہیب آپ ہیں... کیسے ہیں..." عالیہ کے لہجے میں کوئی گرم جوشی یا کسی خاص خوشی کا تاثر نہیں تھا۔

"جناب یہ بتائیں کہ ملاقات میں پہل کون کرے گا۔ آپ آئیں گی یا میں آجاؤں...؟" زوہیب کو نجانے اس سے ملنے کی کیا بے چینی تھی۔

"ملاقات...؟" عالیہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ نجانے کیوں اسے زوہیب جیسے اچھے اور ذہین لڑکے کا یوں کھیل ہونے والا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

"نہیں تو یہاں خود مہمان ہوں... ایڈریس آپ کے پاس ہے... آپ آجائیں... آنا چاہیں تو..." اس نے خاصی بے دلی سے کہا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے آپ چائے بنائیں۔ میں آرہا ہوں..." وہ خوشی سے بولا۔

"صرف آپ... میرا مطلب ہے۔ آپ کے وہ کزن حارث نہیں آئے اسلام آباد..."

"حارث ہاں حارث آیا ہے مگر تمہیں تو پتا ہے'

اس میں ایک خرابی ہے۔ تو م بے زاری کی۔" زوہیب نے مڑ کر حارث کو دیکھا جو اپنا نام آنے پر چونک کر متوجہ ہو گیا تھا۔

"کتنی عجیب بات ہے۔ کچھ لوگوں کی خرابیاں، خامیاں بھی ان پر سوٹ کرتی ہیں اور ان کی شخصیت کو مزید وقار بخشتی ہیں۔"

"ہاں۔ ہیلو عالیہ! آواز نہیں آ رہی۔"

اس کی بات کا کچھ حصہ ہی زوہیب کی سمجھ میں آیا۔ لائن میں کھڑکھڑ کی وجہ سے بقیہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"یہ سمجھ میں نہ آنے سے بہتر ہے۔" عالیہ نے ریسیور رکھ دیا۔

زوہیب ریسیور رکھ کر پلٹا تو شہوار کی نظروں میں خفگی، نیہا کی نظروں میں سوال اور حارث کے انداز میں تلخی تھی اور اپنی کچھ دیر پہلے والی حرکت پر شرمندہ سا ہو گیا۔

"یہ عالیہ صاحبہ کی کیا کہانی ہے۔؟"

نیہا کمر پر ہاتھ رکھے خبر لینے والے انداز میں زوہیب کے سامنے کھڑی تھی۔

"کہانی کیا ہے بھئی دماغ خراب ہے۔ کلاس فیلو ہے ہماری۔ پوچھ لو حارث سے۔ اچھی قابل لڑکی ہے۔ اتفاق سے وہ بھی اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے اس نے فون نمبر دیا تو بات کرلی۔ یہ کہانی ہے۔"

زوہیب نے شہوار کو دیکھتے ہوئے کھوکھلی سی صفائی پیش کی۔

"اور اس کہانی کا اہم پہلو یہ ہے نیہا کہ زوہیب تو یہاں آنا ہی نہیں چاہتے تھے مگر اب پتا چلا کہ اچانک اسلام آباد آنے کا پروگرام کیوں بن گیا زوہیب کم از کم میرے سامنے تو بات نہ کرتے۔ میرا بھرم ہی رہ جاتا۔"

شہوار حساس سی لڑکی تھی اور لڑکیاں تو ایک بار دل کے سنگھاسن پر جس کو بٹھا لیتی ہیں والدین جس سے تعلق کی ڈور جوڑ دیتے ہیں اسی کی ہو رہتی ہیں اور پھر اس نے تو زوہیب کو چاہا تھا پھر اسے آئین وفا کیسے توڑنے دیتی۔ وہ ضبط نہ کرسکی۔ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"بھائی! یہ سب کیا ہے۔؟" نیہا تو پریشان ہی ہو گئی۔

"کچھ بھی نہیں شہوار جہالت کا ثبوت دے رہی ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ نیہا کو قطعی یقین نہیں آیا۔ حارث نے گہرا سانس لیا اور ایک نظر زوہیب پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

"ہونہہ! ایک یہ موصوف خود کو خواہ مخواہ ہی ہیرو سمجھ رہے ہیں۔ پاگل ہیں دونوں بہن بھائی۔"

زوہیب نے غصے سے کشن دور پھینکا۔

"زوہیب! یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ میں تو سب کو محبت کی وادی میں ایک دوسرے کے لیے جان دینے والی چاہت کو فضا میں چھوڑ کر آئی تھی پھر نفرت کا عفریت کہاں سے آگیا۔ کس نے ہماری محبتوں کی فصیل میں دراڑ ڈال دی۔ کون ہے وہ زوہیب؟ شہوار تو تمہارا جنون تھی۔"

"تھی کیا ہے۔ شہوار غلط سمجھ رہی ہے۔ سمجھاؤ اس کو اور یہ تم اتنی سیریس کیوں ہو رہی ہو۔ تم مجھے، اپنے بھائی کو نہیں جانتی ہو۔" زوہیب اس صورت حال سے خود بھی پریشان ہو گیا۔

"پھر۔ پھر بھائی ایسا کیا ہو گیا ہے۔ شہوار کی آنکھوں میں آئے آنسو بے معنی نہیں تھے۔ حارث کا انداز، اس کا رویہ اس کی نظر۔"

"کچھ بھی نہیں لگا۔ جاؤ ان احمقوں کو سمجھاؤ اور پروگرام بناؤ عالیہ بے حد اچھی اور قابل لڑکی ہے۔ وہ ہمارا انتظار کرے گی۔ دیکھو نیہا! تم میری بہن ہو ناں۔ مجھے تو غلط نہیں سمجھتیں ناں شہوار کا تو رشتہ ہی ایسا ہے کہ وہ شک کرسکتی ہے مگر تمہیں اور حارث کو ہرگز شک نہیں کرنا چاہیے۔"

"اس کو خفا تم نے کیا ہے۔ خود ہی مناؤ جا کر۔"

نیہا نے یہ ذمہ داری بھی اس پر ڈالی تو وہ سر کھجاتا ہوا آگے بڑھ گیا' اور نیہا لان میں چلی گئی جہاں حارث بچوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

"بھئی آج تو ہم بھی کرکٹ کھیلیں گے۔"

نیہا نے پوپی کے ہاتھ سے بیٹ لے کر سنبھالا۔

آج کل وہ بڑی خوش تھی اور بچوں کے ساتھ ہر کھیل میں شریک ہو جاتی تو وہ خوش ہو جاتے۔ اپنی پھپھو میں یہ خوشگوار تبدیلی ان کو بہت بھلی لگتی تھی۔

"حارث! اچھے تو تم ہی باؤلنگ کراتا۔ یہ نومی کا بچہ اتنی تیز بال پھینکتا ہے۔ سیدھا کنپٹی کا نشانہ لیتا ہے۔"

نیہا نے بال حارث کی طرف اچھالی تو اپنی باؤلنگ کی توہین پر نومی کا موڈ آف ہو گیا۔ تب حارث نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔

"نومی! تم کنپٹی کا نشانہ لیتے تھے ناں۔ ہم کو دیکھو۔ آنکھ کا نشانہ لیتے ہیں۔"

اور پھر حارث نے آہستگی سے بال نیہا کی طرف اچھالی تو بال اس کی ناک پر لگی۔

"ٹھہرو ذرا حارث کے بچے میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم۔ پومی آؤ پکڑو چاچو کو۔" اور پھر نیہا اور پومی حارث کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ کتنے عرصے بعد میں یہ خوشگوار ہنگامہ ہوا تھا۔ عذرا بیگم اور انیقہ بھی وہیں آ گئیں۔

"ماشاء اللہ۔ چشم بد دور خدا میری بچی کی ہنسی کو دوام بخشے۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں دونوں حارث اور نیہا کیوں بہو۔؟" انہوں نے اپنی بات کی تائید کے لیے انیقہ کو دیکھا۔

"جی امی جان کیوں نہیں۔ ماشاء اللہ اب تو نیہا بہت خوش رہنے لگی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے زندگی کی تمام خوشیاں دے۔"

"آمین۔ آمین۔" عذرا بیگم کے دل کی گہرائیوں سے آمین کی آواز آئی۔

"تھمو تو حارث کے بچے۔ میری ناک سرخ ہو گئی ہے۔ تمہیں بخشوں گی تو نہیں۔" بھاگتے بھاگتے سانس پھول گئی تھی مگر نیہا اور پومی' حارث کے پیچھے بھاگ رہی تھے اور اس بار اسے نجانے کس چیز سے ٹھوکر لگی تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ قریب تھا کہ وہ گرتی کسی نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ اس نے چکراتے سر کے ساتھ تھامنے والے کو دیکھا تو وہ احمر تھا جو قدرت کی طرف سے اس حسین اتفاق پر خوش اور شوخ ہو رہا تھا۔

"دیکھو لو خدا کی مہربانی بھی تمہیں کچھ کر لیتا ہوں' کبھی تمہاری گیند کو۔" وہ شوخ لہجہ سوچ کر رہ گیا۔ یوں نیہا کے چہرے پر ناگوار تاثر دیکھ کر اس نے بھی برا سا منہ بنا لیا۔

"لڑکیوں کو دھیان سے رہنا چاہیے۔ نجانے کیا ہو گیا ہے آج کل کی لڑکیوں کو۔ ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرتی پھرتی ہیں۔ اب جو بھلا میں نہ تھام لیتا تو دن میں تارے نظر آجاتے شکر کریں۔ چاند نے تھام لیا۔"

وہ ڈانٹنے والے انداز کہہ رہا تھا اور وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر دوپٹہ درست کرنے لگی۔

"ارے انکل! آپ اتنے دنوں بعد کیوں آئے ہیں۔ ہم تو اداس ہو گئے تھے۔" دونوں بچے آکر اس سے لپٹ گئے۔

"تو بیٹا! آپ لوگوں نے کون سا یاد کیا تھا۔؟" اس نے بھی دھیرے سے شکوہ کر دیا نیہا کو دیکھتے ہوئے۔

"کیوں یاد نہیں کیا۔ انکل! ہم نے تو کئی بار پھپھو سے کہا تھا کہ آپ کو میسج دیں کہ ہم اداس ہیں۔ پھپھو نے دیا نہیں تھا۔"

دونوں بچوں نے احمر کے بعد شاکی نظروں سے نیہا کو دیکھا جو نظر چرا گئی کیونکہ دونوں بچوں نے بار بار کہا تھا مگر وہ کیسے اس کو کہتی کہ ہمارے گھر آؤ۔

"بھئی بچو! آپ کی پھپھو پیغام کی اہمیت کو سمجھتی کہاں ہیں۔ رہی بات دینے کی تو نفرت حقارت اور لعن طعن کے سوا یہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتیں۔ اچھا وے کیسے ہو آپ لوگ۔؟ بڑے خوش لگ رہے ہو۔"

"انکل! کراچی سے دادی جان' شہوار پھپھو اور دونوں چاچو آئے ہوئے ہیں۔" بچوں نے اپنی خوشی کا سبب بتایا تو احمر نے قدرے فاصلے پر نیہا اور حارث کو دیکھا۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

"ارے واہ بھئی۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ آئے ہوئے ہیں پھر اب ہمارا کیا کام ہے۔ میں چلتا ہوں۔" احمر واپس پلٹا تو دونوں بچے اس سے لپٹ

گئے۔

"نہیں انکل! آپ تو سب سے زیادہ اچھے ہیں۔۔۔"

"واقعی ذرا زور سے یہ ہی بات کہو۔۔۔" اس نے جھک کر دونوں بچوں کو پیار کر لیا اور نبہا کو سنانے کے لئے کہا۔

"ارے احمر! آؤ بھی۔ بڑے دنوں میں آئے۔۔" انیقہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ بھی ان ہی کی طرف آ گیا۔

"آداب! بھابھی کیسی ہیں۔۔" دونوں بچے اس کے دائیں بائیں ہاتھ پکڑ کر کھڑے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے۔ تم کہاں رہے۔۔۔ ہم نے تو تمہیں بہت مس کیا ہے۔ بچے تو ہر روز اپنی پھپھو کو کہتے تھے کہ احمر انکل کو کہہ دیں کہ ہم اُداس ہیں آ جائیں۔"

"بس! بھابھی! مجھے ایک بھی مسیج نہیں ملا ورنہ میں ضرور آتا۔ ویسے مجھے یہ آ کر احساس ہوا ہے۔ آپ لوگ بھی مجھے چاہتے ہیں۔۔۔ میری چاہتیں یک طرفہ نہیں ہیں۔۔۔" اس نے نبہا کو قریب آتے دیکھ کر کہا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی عذرا بیگم کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے برابر ہی حارث آ بیٹھا۔

"امی جان! یہ احمر ہیں میرا بہت پیارا سا بھائی بہت اچھا بچہ ہے اور نبہا کا کلاس فیلو بھی ہے۔۔" انیقہ نے خاص طور پر اس کا نبہا کا کلاس فیلو کہا تو احمر نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھ کر اندر آ گئی۔

"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ۔۔؟" احمر نے قدرے جھک کر عذرا بیگم کو سلام کیا تو انہوں نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا۔

"جیتے رہو میاں! یہ تعارف تو رسم ہی ٹھہری ورنہ تو بچے ہر وقت احمر انکل کی اس طرح گردان کرتے تھے کہ بن تعارف کے میں پہچان گئی ہوں۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ میرے بچوں کے ساتھ اتنی محبت کرتے ہو۔۔"

"محبت تو آنٹی میں اور بھی لوگوں سے کرتا ہوں مگر محبت کا جواب صرف بچے ہی دیتے ہیں۔۔۔" احمر نے زوہیب اور شہوار کے درمیان چلتی ہوئی نبہا کو دیکھ کر کہا تو اس بار بھی اس نے ناگوار سا تاثر دیا اک سرد سی لہر احمر کے اندر اتر گئی۔ پھر احمر کا تعارف سب سے ہوا۔ سب ہی خوش ہوئے تھے اس سے مل کر۔

"اچھا تو یہ ہیں ہمارے بچوں کے احمر انکل۔۔۔ اور ہماری نبہا کے کلاس فیلو بھی۔۔۔" زوہیب نے بڑی خوش دلی سے اس سے مصافحہ کیا۔

"مس نبہا کا کلاس فیلو ہونا تو اتفاقیہ مجبوری ہے۔ ویسے یہاں میں اپنے ان ننھے منے دوستوں سے ملنے آتا ہوں۔۔۔" احمر نے بھی نبہا کی بے رخی کا بدلہ لے لیا۔

"بہر حال ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آپ آتے ہیں اور ان سے کھیلتے ہیں دل بہلا رہتا ہے ان کا۔ اور پڑھائی کے علاوہ کیا کرتے ہیں آپ۔۔۔؟"

"جی پڑھائی کے علاوہ موٹر مکینک ہوں۔۔"

"جی موٹر مکینک۔۔۔" حارث کے سوال پر احمر نے بے ساختہ کہا تو شہوار نے حیرت سے احمر کو دیکھا۔ اتنا خوبرو، اسمارٹ بندہ اور مالی حیثیت بھی شخصیت سے ظاہر ہو رہی تھی پھر موٹر مکینک کیسے ہو سکتا ہے۔

"جی میں کوئی باقاعدہ موٹر مکینک نہیں ہوں۔ یوں ہی کبھی کبھار سر راہ کوئی گاڑی خراب ہو جائے تو ٹھیک کر دیا کرتا ہوں۔۔۔ کیوں بھابھی۔۔؟" احمر نے انیقہ کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

"یہ شریر ہماری گاڑی کا کہہ رہا ہے۔ اتفاق سے ہماری گاڑی ایک جگہ بند ہو گئی۔ میں اور نبہا تھے یہ بیچارا گزر رہا تھا اس نے ٹھیک کی تو ہم گھر آئے ویسے احمر! مبارک ہو۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں نئی گاڑی دے دی ہے۔۔"

"ارے واہ مبارک ہو پھر تو کوئی میٹھی سی چیز ہونی چاہئے۔۔۔" اس نے قریب کھڑے نوی کو چوم لیا۔۔۔ اور پھر وہ اتنی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے چھا سا گیا۔ خوبرو سا یہ لڑکا سب ہی کو پسند آیا تھا۔

"اچھا جی اب اجازت۔۔۔ ہوسٹل گیٹ بند ہو گیا تو

چور دروازے سے جانا پڑے گا اور ہوسٹل کا سڑا ہوا کھانا گرم ہو کر اتنا بدمزا ہو جاتا ہے کہ۔۔۔"

"بیٹھو یار! کھانا کھا کر جانا۔" زوہیب اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے لگا اور احمر جو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ زوہیب کی بات پر مڑ کر اسے دیکھنے لگا تو پہلی نظر نیہا کے ناگوار چہرے پر پڑی تو فوری طور پر دو باتیں ذہن میں آئیں۔ اول تو یہ کہ مائنڈ کر کے چلا جائے مگر دوسری یہ کہ اس کا تو فائدہ نہیں احمر یار کسی کو کیا پتا ہوگا کہ تم خفا ہو کر گئے ہو۔ بہتر ہے کہ محترمہ کو جلایا جائے۔ اک شوخ سی چمک آگئی تھی اس سوچ کی صورت میں وہ بیٹھ گیا۔

"اچھا تو یہ ٹھیک ہے۔ یوں بھی بھابھی کھانا بے حد لذیذ بناتی ہیں۔ آج تو خوب کھاؤں گا۔۔۔"

کوئی جان بھی نہ سکا کہ وہ کس کو جلانے کی خاطر یہ باتیں کر رہا ہے۔

"واہ بھابھی! کیا بات ہے آپ کے ہاتھ کی۔ اب تو میں روز ہی کھانا کھانے آجایا کروں گا۔۔۔" اس نے بے زاری سے نیہا پر نگہ ڈالی اور طلب نہ ہونے کے باوجود کباب پلیٹ میں رکھ لیا۔

"بھابھی! کباب تو ایسے بنائے ہیں کہ جی چاہتا ہے جیب میں چھپا کر لے جاؤں۔"

"ارے بھئی، چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یوں ہی لے جاؤ ویسے یہ کباب تمہاری کلاس فیلو نے بنائے ہیں۔"

انیقہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو احمر نے ہاتھ وہیں روک لیا اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر کباب واپس رکھ دیا۔ بولا کچھ نہیں۔ باقی سب اپنے اپنے کھانے میں مصروف رہے۔

"ویسے احمر! عام طور پر تو کلاس فیلوز آپس میں خوب باتیں کرتے ہیں مگر تم دونوں نے تو اب تک ایک دوسرے سے ایک بات بھی نہیں کی نہ ہی اس تعلق کو ظاہر کیا ہے جبکہ کچھ کلاس فیلوز تو۔۔۔"

حارث کے لہجے میں چھپا طنز زوہیب سمجھ گیا تھا مگر وہ اسے اہمیت ہی کب دے رہا تھا۔

"ارے حارث بھائی! یہ تو محض اتفاق ہے کہ ہم کلاس فیلو بن گئے ورنہ تو میں بھابھی اور بچوں کو جانتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ کلاس فیلو ہیں بہرحال یہ بتائیں کہ کل آپ کا کیا پروگرام ہے۔"

وہ بے نیاز لہجے میں اسے نظرانداز کر رہا تھا تو پہلی بار نیہا کو اس کا یوں لاتعلق اچھا نہیں لگا۔ مگر وہ کچھ بھی ظاہر کیے بغیر برتن اٹھا کر رکھتی رہی۔

"کل تو ہم لوگ کہیں جا رہے ہیں۔۔۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے کل ہم اور پروگرام بنائیں گے۔ مری چلیں گے۔ سنو فالنگ ہونے والی ہے بڑا لطف آئے گا اور اس دفعہ تو اور بھی مزا آئے گا آپ لوگوں کے ساتھ۔۔۔"

"ضرور کیوں نہیں۔۔۔" اور پھر احمر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ بعد میں کتنی ہی دیر احمر موضوع گفتگو بنا رہا تو نیہا چڑ کر وہاں سے اٹھ کر باہر آگئی۔ ساتھ ہی شہوار بھی آگئی۔

دونوں لان میں ٹہلنے لگیں۔ بھیگی چاندنی کا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ نرم اور نم گھاس پر چلتے ہوئے انہوں نے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں، چاند کی ہمراہی میں کبھی ہنس پڑتیں اور کبھی سنجیدہ ہو جاتیں۔

"نیہا! تم ابھی کہہ رہی تھیں ناں تمام مرد ایک سے ہوتے ہیں تو کیا زوہیب بھی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں شہوار! زوہیب تمہیں شدت سے چاہتا ہے۔ میں بھائی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ تمہاری چاہت کی کتنی گہرائی تک اترا ہوا ہے کہ۔۔۔"

"نیہا! وہم میرے قدم اکھاڑتا ہے مگر محبت کا یقین تھام لیتا ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔"

"شہوار! وہم بے وجود ہوتے ہیں۔ محض ہیولا ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے اختراع شدہ ورنہ تو ان کا کوئی وجود کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بس اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو۔ یہ تعلق اسی کی پاک ذات نے جوڑا ہے تو اس کی پاک ذات نگہبان بھی ہے۔" نیہا نے شہوار کو بڑے اچھے لفظوں میں سمجھایا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا نیہا! کہ اس لڑکی عالیہ

میں ہے کیا جو زوہیب اس سے اس قدر متاثر ہے۔۔۔"
"عالیہ عجیب کیا چیز ہیں دیکھ لیں گے کل جا کر۔ زوہیب نے کل شام کو تیار رہنے کو کہا ہے۔"

۔۔*

اگلے روز شام کو وہ لوگ عالیہ کے پاس موجود تھے۔ سفید لباس میں سادہ سی پروقار لڑکی ایک ساتھ ہی نیہا اور شہوار کو پسند آ گئی اور کتنی عجیب بات تھی کہ شہوار جو اسے اپنی رقیب سمجھ بیٹھی تھی۔ ڈھیروں شکوے شکایات تھیں۔ اس سے ملی تو لگا جیسے کوئی شکوہ نہ ہو۔ حسد کی تپش ختم سی ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری رنگت اور بات کرنے کے انداز سے وہ دونوں متاثر ہو گئی تھیں تو مخالف صنف تو پھر کمزور دل ہوتی ہے' سب ہی آپس میں گھل مل گئے تھے۔ البتہ حارث چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ عالیہ کتنی بار اسے دیکھ چکی ہے۔ عالیہ کے دو اور کزنز آ گئے تھے۔

"اچھا پھر اب جبکہ ہم سب جمع ہیں تو کوئی پروگرام بناتے ہیں۔" عالیہ کے کزن ساجد نے کہا۔

"جی ہاں ہم بھی چاہتے ہیں۔ تفریح کے دنوں کو یادگار انداز میں گزاریں' اس طرح کا ملاپ اتفاق اور خوش قسمتی سے ہوتا ہے۔"

اور پھر زوہیب اور ساجد پروگرام بناتے رہے' نیہا اور شہوار بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں تو عالیہ آہستگی سے اٹھ کر حارث کے پاس آ گئی۔

"حارث! آپ الگ تھلک ہی رہتے ہیں چپ چاپ سے۔" وہ صوفے پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تو حارث نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اتنی اچھی سی لڑکی کو کون پسند نہ کرے گا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں۔ زوہیب نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھ میں یہ ہی خرابی ہے۔ آدم بے زاری کی؟۔" حارث کی نظریں دور بیٹھے ہنستے زوہیب پر تھیں۔ لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"برائی بڑی ہو یا چھوٹی۔ برائی برائی ہوتی ہے مگر کچھ لوگوں پر سوٹ کر جاتی ہیں ان کی برائیاں اور آپ بھی۔۔۔" اور پھر وہ بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئی تو حارث کو لگا جیسے اس کی مہک اس کے پاس رہ گئی ہو۔

پھر اس نے سر جھٹک دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ زوہیب کے سامنے نگاہ نیچی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ درمیان میں اس کی اپنی معصوم بہن کی خوشیاں تھیں۔

"عالیہ۔ عالیہ ارے بھئی' تمہارے مہمان آئے کہ نہیں۔ ہمارا پروگرام بھی خراب ہو رہا ہے اور۔۔۔"

احمر بولتا ہوا اندر آ گیا تو حیرت سے سب اس کو اور وہ سب کو دیکھنے لگا۔

"اوہ تو یہ یہاں بھی۔۔۔" نیہا نے برا سا منہ بنایا' شہوار نے ہاتھ دبا کر چپ رہنے کی تاکید کی۔

"احمر! تم یہاں۔۔۔؟" زوہیب اور حارث ایک ساتھ احمر کی طرف بڑھے۔

"آپ یہاں کیسے احمر صاحب۔۔۔؟" شہوار نے مسکرا کر پوچھا تو وہ اس کی طرف گھوم گیا۔ برابر ہی نیہا کھڑی تھی۔ احمر نے اس پر نظر ڈالی۔

"آپ کے چہرے پر جو تحریر لکھی ہے ناں کہ میں کسی گھٹیا فلم کا گھٹیا سا ہیرو ہوں کہ جہاں آپ ہوں وہیں پہنچ جاؤں۔۔۔ تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ فلمی سے اتفاقات ضرور ہو رہے ہیں۔ عالیہ اور میں آپس میں فرسٹ کزنز ہیں اور جس گھر میں ہم کھڑے ہیں۔ یہ ہماری مشترکہ سگی خالہ کا گھر ہے۔ عالیہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کچھ مہمان آنے والے ہیں اور میں اس لئے آیا تھا کہ اگر اس کے مہمان آ کے جا چکے ہوں تو اس کو آپ لوگوں کے ہاں لے کر جاؤں گا۔۔۔ اب مجھے کیا معلوم تھا ہماری منزل ایک ہی ہے۔۔۔"

ساری تفصیل بتا کر احمر نے ایک نگاہ نیہا پر ڈالی جس کے چہرے پر اس کے۔۔۔ سچائی کی چمک اور یقین کی ملائمت آ چکی تھی تو اک تسکین آمیز سا احساس احمر کے اندر تک اتر گیا۔

"واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔۔۔ احمر بھائی! یہ زوہیب اور حارث میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت قابل لوگ ہیں۔۔۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا کلاس فیلو ہیں۔۔۔" عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

"ہاں مگر میں یہ جھوٹ کیسے بولوں کہ یہ بہت ذہین اور قابل آدمی ہیں۔" احمر کی آنکھوں میں شوخیاں تھیں اس نے کن انکھیوں سے دیکھا سب کے ساتھ وہ بھی اس کی بات پر مسکرا دی تھی۔

"بھئی یہاں تو کلاس فیلو برادری بیٹھی ہے۔ ہم چلتے ہیں۔" ساجد اٹھ کھڑا ہوا تو احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ ان کا فون آنا ہے یا کرنا ہے۔" احمر نے "ان" پر زور ڈالا تو ساجد کھسیانا سا ہو گیا کیونکہ وہ جا بھی اسی لئے رہا تھا۔ حنا اس کی منگیتر تھی اور وہ اسی کو فون کرنے جا رہا تھا۔

"یو نائی۔۔۔" ساجد کھسیانا سا ہو کر اس کے شانے پر مکا مارتا ہوا نکل گیا۔ اور پھر وہ سب کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ سیر و تفریح کے پروگرام بناتے رہے۔

"اچھا اب اجازت چاہیں گے عالیہ! کیونکہ امی کہہ رہی تھیں یہاں آ کر تم لوگوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ خود انجوائے کرتے پھرتے ہو۔ بچے الگ خفا ہوں گے۔" وہ سب کھڑے ہو گئے۔

"عالیہ! ہمیں آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

شہوار نے واقعی دل سے کہا تو ڈھیر سارا سکون زوہیب کے اندر اتر گیا۔

"عالیہ! بعض لوگوں کی شخصیت میں ایسی کوئی بات ہوتی ہے ایسا سحر ہوتا ہے کہ ہر کسی کو اپنا بنا لیتے ہیں اور آپ بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہیں۔۔۔"

"کاش میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا جو دوسروں کو اپنا بنا لیتے ہیں۔۔۔" نیہا کی بات پر احمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا سب مسکرا دیئے۔

*_*_*

"دیبا! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا جن لوگوں نے ہمیں دھوکا دیا۔ تمہیں اغوا کرنے کی انتہائی گھٹیا اور پیچ حرکت کی اور تم پھر بھی۔۔۔ پھر بھی ان پر اعتماد کر رہی ہو۔ کیا جادو کر دیا ہے ان باپ بیٹے نے تم پر۔۔۔"

دیبا کی بات پر جہاں ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔ زبیر کی رگیں غصے سے پھٹ جانے کی حد تک تن گئی تھیں۔ عائشہ غصے سے پاگل ہو گئی مگر وہ اپنے مضبوط ارادوں اور فیصلے پر چٹان بنی کھڑی تھی۔

"محبت اور اعتماد سے بڑا کوئی جادو نہیں ہوتا خالہ جانی! اس ڈرامے کے بعد تو مجھے ان لوگوں پر اندھا اعتماد ہو گیا ہے! دکھ اس بات کا ہے کہ آپ اتنی سمجھ دار ہونے کے باوجود دھوکا کھا رہی ہیں۔ برباد ہونے کا فیصلہ کر چکی ہیں تو۔ تو میں آپ کے ساتھ اپنی بربادی نہیں کر سکتی۔ میرے خدا کے بعد انکل قریشی اور شہباز ہی میرے سرپرست ہیں میں اس شخص پر قطعی اعتماد نہیں کر سکتی انکل! ایک بار میرے ابو نے خدا اور رسول کے بعد آپ کو مختار اور میرا سرپرست بنایا تھا آج میں خود آپ کو یہ ذمہ داری دے رہی ہوں۔ یہ میری امانت ہے آپ کے پاس۔۔۔"

پورے اعتماد کے ساتھ اس نے فائل قریشی صاحب کے ہاتھ میں دے دی۔ تو انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے فائل پکڑ لی ایک نظر اس پر ڈالی وہ کل کی ننھی سی بچی جب اس کے والدین خدا کو پیارے ہوئے تھے تو سال بھر کی تھی جس کو گود میں لے کر وہ شدت سے روئے تھے آج خود اپنی ذمہ داری ان کو دے رہی تھی پھر انہوں نے عائشہ کی طرف دیکھا جس کا بس اگر چلتا تو دیبا کو مار ڈالتی۔ زبیر کے اندر تو طوفان اٹھ رہے تھے مگر چہرہ سرد، خشک اور بے تاثر تھا۔ دیبا نے ایک حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"انکل! مجھے اب اپنی خالہ جانی پر اور ان کے شوہر پر بالکل اعتماد نہیں۔ یہ شخص۔۔۔"

"دیبا میں تمہاری جان نکال دوں گی احسان فراموش لڑکی! یہ صلہ دیا ہے تم نے مجھے میری قربانیوں کا۔ زبیر میرے شوہر ہیں۔ تمہاری جرات کہ ان سے گستاخی کرو۔۔۔"

عائشہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ اس نے دیبا پر ہاتھ اٹھایا مگر زبیر نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

"ناں۔۔۔ ناں عائشہ! وہ تو بچی ہے، نا سمجھ ہے، تم کیوں بچی بن رہی ہو اور پھر تم سب کچھ جانتے ہوئے اس پر ہاتھ کیوں اٹھا رہی ہو اس میں اس کا قصور بھی

کیا ہے۔ او کے بے بی جیسے تمہاری مرضی۔ اب تم بالغ ہو اگر سمجھتی ہو کہ تم اپنے بارے میں اچھا اور بہتر فیصلہ کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ہم تم پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کریں گے۔ رائٹ تمہیں اگر اپنے ابو کے ان دوست پر اتنا ہی اعتماد ہے تو کوئی بات نہیں لیکن سیبلی یہ نہ سمجھنا کہ ہم تم سے لاپروا ہو گئے ہیں۔ اینی ٹائم تم ہمارے پاس آسکتی ہو۔ رہی جائیداد کی بات تو مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ قریشی بھائی کے پاس اختیارات رہیں۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو بیمار آدمی ہوں' اپنی بے شمار جائیداد سنبھال سکتا تو۔۔۔ قریشی بھائی یہ عائشہ کی فائلیں بھی آپ ہی سنبھالیں۔ یہ لیجیے۔"

"زبیر۔۔۔"

"زبیر! آپ یہ کیا کر رہے ہیں اگر اس نا سمجھ کو ان لوگوں نے شیشے میں اتار لیا ہے تو کیا ہوا لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں اور میرا سب کچھ آپ کا ہے' اور تم۔۔۔" عائشہ تیور اکر دیبا کی طرف پلٹی تو اس نے غصے سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

"تم دیکھ لو گی دیبا۔ خوب بدلہ دیا ہے تم نے میری محبتوں کا خدمتوں کا' احسانات کا' مجھے کیا خبر تھی کہ تم میری اپنی ہو کر مجھے ہی غیروں کے سامنے رسوا کرو گی اور میرے اس شوہر کو ذلیل کرو گی جس نے تمہیں ان کے غنڈوں سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچایا' اتنی چاہت اور محبت دیتے ہیں اور تم یہ صلہ دے رہی ہو نا سمجھ لڑکی! اچھا تو اپنے دوست دشمن کو۔"

وقت اور حالات نے ایک دوسرے پر جان دینے والی خالہ بھانجی کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

"نا سمجھ کون ہے خالہ جانی! یہ تو وقت بتائے گا انشاء اللہ۔"

دیبا نے عائشہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اپنی اس جان دینے والی خالہ سے گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی' اور اب وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی' اس نے حقارت بھری ایک نگاہ زبیر پر ڈالی جس کے چہرے پر اذیت ناک تاثرات ابھرنے لگے تھے اور وہ دائیں ہاتھ سے سینہ مسل رہا تھا۔

"ہونہہ اداکار۔" دیبا نے نفرت سے سوچا اور قریشی صاحب کے قریب چلی گئی

"عائشہ! کم آن چھوڑو ان باتوں کو' موت زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ دولت جائیداد نجانے کس کا مقدر ہوتے ہیں۔ کون استعمال کرتا ہے' اولاد اگر گستاخ ہو جائے تو اسے پیار سے سمجھانا چاہیے نہ کہ اسے کاٹ کر پھینک دینا چاہیے آؤ دیبا' چلو بچی گھر چلتے ہیں' گھر کی باتیں باہر نہیں آنی چاہئیں چلو شاباش۔"

زبیر نے آگے بڑھ کر دیبا کو شانے سے تھاما تو اس نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کی یہ حرکت عائشہ کو مزید کھولا گئی۔

"آپ لوگ جایئے۔ میں یہاں ٹھہرنا چاہتی ہوں جب آنا ہو گا صفدر بابا کو فون کروں گی۔ وہ آ کر لے جائیں گے مجھے۔" دیبا نے پر اعتماد لہجے میں کہا' وہ نہ تو زبیر سے خوفزدہ تھی اور نہ ہی عائشہ کے ساتھ اس قسم کے رویئے پر کسی قسم کے ملال کی جھلک تھی۔ اور یہ ہی بات عائشہ کو تپا جاتی تھی۔

"دیکھا۔ دیکھا اس احسان فراموش کا حال کہ جان دینے والی ماں جیسی خالہ کے مقابلے میں اسے ارے غیروں پر اعتماد ہے نوکروں پر اعتماد ہے۔"

عائشہ کا بس چلتا تو وہ دیبا کا گلا دبا دیتی۔

"اس لئے خالہ جانی کہ یہ ہی میرے سچے دوست اور ہمدرد ہیں' کاش۔۔۔ کاش خالہ جانی میں بھی آپ کو ڈوبنے سے بچا سکتی۔ کاش۔۔۔ آپ کا خدا ہی محافظ ہے بس۔"

"زبیر۔۔۔ زبیر چلیے کیا سوچ رہے ہیں آپ' اس سے زیادہ میں اپنی اور آپ کی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی۔" عائشہ نے زبیر کو گھسیٹا

"عائشہ! جذباتی نہ ہو' وہ بچی ہے اور۔"

"بھاڑ میں گئی بچی۔" چھوٹے سے جملے کا یہ تیر سید ھا دیبا کے نازک دل میں پیوست ہو گیا۔ گرم گرم ابلتے پانی سے رخساروں کی نرم جلد جل گئی اس نے آنسوؤں کی دھند میں عائشہ کو زبیر کا ہاتھ پکڑے باہر جاتے دیکھا اور پلٹ کر قریشی صاحب کے ساتھ لگ کر

شدت سے رو پڑی' وہ اسے ساتھ لگا کر پیار کرنے لگے۔

"ہوں نا... نہیں بولنا چاہیے تھا بیٹا کچھ بھی سہی' وہ تمہاری خالہ ہے۔"

"یہ نہیں تھیں انکل' آپ نے ان کو دیکھا تھا' اس مکار اداکار کی باتوں میں آ کر مجھے کیا کہہ گئی ہیں انہوں نے کاٹ پھینکا ہے مجھے' انکل' خالہ جانی ڈوب رہی ہیں' ان کو بچالیں' انکل پلیز کچھ کریں۔ وہ بندہ ان کو مار دے گا' اغوا کے اس ڈرامے نے اس مکار آدمی کا پردہ چاک کردیا ہے انکل' میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور آنکھوں سے دیکھا ہے مگر خالہ جانی کو کیسے بتاؤں' وہ دیوانی ہوگئی ہیں۔ انکل' میری خالہ جانی کو بچالیں۔" وہ روئے گئی۔

"دیبا بیٹے! جہاں تک میرے اختیارات تھے' میں نے استعمال کیے اور سرتوڑ کوشش کی مگر بیٹا جب انسانی کوشش کے پتوار ٹوٹ کر بہہ جاتے ہیں ناں تو خود کو خدا کے سپرد کردیتا ہے اور ہم بھی طوفان میں گھری عائشہ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے ضرور بچالے گا۔ تم اپنے رویے پر غور کرو' تمہیں بہرحال وہیں رہنا ہے ان ہی کے ساتھ۔"

دیبا کو قریشی صاحب سے اپنے ابو جیسی خوشبو آئی تھی۔ اس کی بات پر انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ کتنی کم سن تھی لیکن کتنی ذہین تھی یہ بچی اور کتنے دکھ دیکھ لیے تھے اس نے کیسے حالات میں گھر گئی تھی۔

"اس گھر میں آنا' رہنا تمہارا حق ہے بیٹی! مگر حالات نے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں اپنا حق بھی استعمال نہیں کرسکتا۔"

"تو انکل! آپ مجھے اس دوراہے پر تنہا چھوڑ دیں گے۔" وہ سسک پڑی۔

"بیٹا! کوئی انسان تنہا نہیں ہوتا' خدا ساتھ ہوتا ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"صاحب! بی بی کا ڈرائیور آگیا ہے۔" ملازم کی آواز پر دونوں نے چونک کر دیکھا دیبا نے چہرہ صاف کرلیا۔

"بابا سے کہو' میں ابھی آتی ہوں' انکل وہ شہباز کہاں ہیں۔"

دیبا شہباز کو دیکھنا چاہتی تھی ماسی نے جو کچھ اسے بتایا تھا اس سے اسے بہت تکلیف ہوئی تھی اور وہ شہباز سے ملنا چاہتی تھی۔

"وہ اپنے کمرے میں ہے بیٹا۔" انہوں نے بتایا تو وہ شہباز کے کمرے کی طرف آگئی۔

اور شہباز جو زخموں سے چور تھا۔ غصے اور نفرت کی آگ میں جل رہا تھا۔ دیبا کے الفاظ ٹھنڈی پھوار کی صورت اسے پرسکون کرگئے' اس کو تو زخم بھی بھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے' دیبا کے اعتماد نے اسے اپنی نگاہوں میں گرنے سے بچالیا تھا' اسے تو اب یہ زخم عزیز ہوگئے تھے جن کے لگنے سے اسے دیبا کے دل میں اپنی حیثیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

وہ دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ رضوان اور شہباز کی نظریں ایک ساتھ اس پر اٹھیں اس نے شرمندہ سا ہو کر آنے کی اجازت چاہی۔

"آئیں ناں پلیز دیبا۔" رضوان ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا دیبا آہستگی سے شہباز کے بیڈ کے قریب آگئی۔ اسے بہت ندامت ہو رہی تھی کہ اس کی وجہ سے ان دونوں کو ایسے حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

"آپ کیسے ہیں۔" اس نے نظریں جھکا کر آہستگی سے کہا۔

"الحمدللہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں' ہاں خوشی ہے تو اس بات کی کہ تم نے عائشہ باجی کی طرح مجھے غلط نہیں سمجھا' اگر تم بھی مجھ پر شک کرتیں تو شاید یہ زخم میری موت بن جاتے اور میں اپنی نظروں میں گر جاتا۔"

اس کی بات پر دیبا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"دل میں رہنے والے کبھی نظروں سے نہیں گرا کرتے۔"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور شہباز اس کے آنے اور جانے کے مسحور کن احساس کے

ساتھ اس کی بات کی لطافتوں میں کھو گیا۔

۔۔۔۔*

"بہت احسان کیا ہے آپ کے بھائی صاحب نے یہ سب بے کار فائلیں آپ کے حوالے کر کے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیجیے۔" زبیر نے فائلیں اٹھا کر عائشہ کے سامنے پٹخیں تو کچھ دیر کے لیے عائشہ کو بھی غصہ آگیا۔ "کیا چاہتا ہے یہ شخص۔

"کیوں زبیر اب کیا ہو گیا ہے؟۔"

"اس میں آپ کے والد صاحب کی تحریر ہے کہ جب تک قریشی آپ کو اجازت نہ دے' آپ اپنی جائیداد استعمال نہیں کر سکتیں اور وہ بڈھا ناگ مر کر بھی اتھارٹی لیٹر نہیں دے گا۔"

زبیر جو فائلیں مل جانے پر بہت خوش تھا' اس پابندی پر سیخ پا ہو گیا اور عائشہ کو بھی اس بات پر غصہ آگیا۔

"زبیر! آپ فکر نہ کریں میں قریشی بھائی سے مختار نامہ لے آؤں گی۔"

"بس رہنے دو' تم کیا کرو گی' قریشی بھائی جائیداد پر ناگ بن کر بیٹھا ہوا ہے' لڑکی کو الگ پٹی پڑھا رکھی ہے۔ اسے ذرا لحاظ نہیں ہمارا' ادھر میں ہوں کہ اپنی بیمار جان کے ساتھ تم لوگوں کو حق دلوانا چاہتا ہوں' یہ کم بخت درد بھی جان لے کر چھوڑے گا۔" زبیر نے پھر سینہ تھام لیا۔

"زبیر! خدا کے لیے خود کو سنبھالیں' میں اس مکار انسان کی عیاری سمجھ گئی ہوں۔ اہم پتا اس نے اپنے پاس رکھا ہے' نجانے کیا مقصد ہے اس کا آپ فکر نہ کریں میں اب دیکھ لیتی ہوں اس قریشی کو' بہت ہو گیا لحاظ۔"

اور عائشہ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنا ذاتی زیور اور کچھ جائیداد جو اس نے بعد میں بنائی تھی وہ سب زبیر کے نام کر کے فائل اس کے حوالے کر دی۔ ماسی سکینہ اور دیبا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں اور اب وہ قریشی صاحب کے سامنے مختار نامے کے لیے کھڑی تھی۔

"عائشہ! میری بچی! آشیاں نہ جلاؤ کہ کبھی لوٹنا تمہاری مجبوری بن جائے تو آگ کا سمندر تمہیں مجبور کرنا پڑے اور۔۔۔"

"مجھے فضول دلائل سے نہ بہلائیں قریشی صاحب! اس جائیداد سے اگر آپ کا کوئی تعلق نہیں کوئی مقصد نہیں تو پھر اس کو استعمال کرنے کا حق دیں' مجھے مختار نامہ لکھ کر دیں۔"

وہ بد تمیزی پر اتر آئی تو وہ بھی سخت ہو گئے۔

"دیکھو عائشہ بی بی! وہ جائیداد تمہاری تھی میں نے کاغذات تمہارے حوالے کر دیے۔ میری مرضی پر میرا حق ہے۔ میرا اختیار ہے میں مختار نامہ لکھ کر دوں نہ دوں یہ میری مرضی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے قریشی صاحب! میں تو چاہتی تھی کہ پرانے تعلقات باقی رہیں لیکن آپ ایسا نہیں چاہتے تو دیکھا جائے گا پھر۔" وہ غصے میں پرس اٹھا کر آگے بڑھ گئی

"پرانے تعلقات' عزت' محبت' وفاداری' تم نے باقی چھوڑا ہی کیا ہے۔"

اک ٹیس سی ان کے بیمار دل کو تڑپا گئی۔

"اوہو کم آن جاناں اگر بدمعاشی نہیں مانا تو نہ سہی ہم نے تو لحاظ کیا جب اسے ہی عزت راس نہیں تو پھر چوڑیاں تو ہم نے بھی نہیں پہن رکھیں ناں۔"

زبیر کے زہریلے لہجے کی تلخی اس کے چہرے پر آگئی' اس کی نظروں کے سامنے دیبا تھی جو ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر دیبا کو دیکھتا رہا تو عائشہ نے ٹوک دیا۔

"یہ آپ دیبا کو ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"ہوں..." وہ چونک کر اس کی طرف مڑا۔ "یہی کہ کتنی بڑی اور کتنی حسین ہوگئی ہے ہماری بے بی۔"

اس کی دیبا کے لئے یہ نظریں' یہ انداز' عائشہ کو اچھا نہیں لگا اور زبیر نے اس کی سوچ پڑھ لی۔

"دیکھو ناں کتنی بڑی ہوگئی ہے اور قریشی کے ہاں آنا جانا مناسب نہیں' خیر میں یہ دیکھ لوں گا جان تم فکر نہ کرو' ذرا ٹیرس پر جارہا ہوں' چائے وہیں بھیج دینا۔"

اک پراسرار قسم کی سوچ کی چمک آنکھوں میں لیے مہمل سی باتیں کرتا ہوا اٹھ کر ٹیرس پر آگیا۔ عائشہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی پھر سر جھٹک کر خود چائے بنانے چل دی حالانکہ اب تک اماں سکینہ ہی سارے کام کرتی تھیں مگر زبیر کی فرمائش پر وہ اس کے تمام کام کیا کرتی تھی۔ وہ چلی گئی تو زبیر موبائل پر باتیں کرنے لگا۔

"نہیں یار! ایک ہی حل ہے اس مسئلے کا کہ باپ بیٹے کو فارغ کردیا جائے' ارے نہیں عائشہ بیگم تو مٹھی میں ہیں۔ البتہ یہ جو چھٹانک بھر کی لڑکی ہے ناں۔ بہرحال جب یہ حمایتی ہی نہ رہیں گے تو دیکھ لوں گا' اس دیبا کو بھی' ہاں ہاں... مرے کیوں جارہے ہو' مالک تو بن جانے دو' پھر مل بانٹ کر ہی کھائیں گے اپنے دھندے میں تو دھوکہ دہی چلتی ہی نہیں۔"

"تو تم عائشہ کو ان لوگوں سے متنفر کرنے میں کامیاب ہوگئے ہو۔"

"ارے ایسا ویسا' عائشہ تو پوری کی پوری کھوٹی چونی کی طرح جیب میں ہے خیر کھوٹی تو نہیں' اس کی ذاتی جائیداد جو اب اس نے میرے نام کی ہے اتنی ہے کہ باقی کی نند بھی ملے تو مزے ہوجائیں گے۔"

"اور چھوٹی بیگم کا کیا سوچا ہے۔"

"ہائے۔ ہائے اظہر! وہ تو آفت قیامت ہے' یار! وہ تو بن جائیداد کے بھی مل جائے تو زندگی کا مقصد پورا ہوجائے' کیا چیز ہے' کیا بات ہے اس کے وقار میں کیا کشش ہے' اس کی ہر ادا میں۔ اس کی نفرت میں' بس اب وہ میرے دل کی ملکہ ہے۔"

"اور عائشہ۔"

"کم آن اظہر وہ تو جس مقصد کے لئے استعمال کی گئی' وہ پورا ہو ہی گیا' اچھا خیر چھوڑو میرے رقیب شہباز اور اس کے باپ کو ٹھکانے لگانا اب تمہارا کام ہے۔"

"تم فکر ہی مت کرو' مگر 'ففٹی ففٹی' والا وعدہ نہ بھولنا۔"

"ناممکن' اچھا اوکے۔ لگتا ہے عائشہ آرہی ہے۔"

زبیر نے جلدی سے فون بند کرکے پیچھے دیکھا تو اماں سکینہ جلدی سے پلٹ رہی تھیں۔ زبیر غصے سے پاگل ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ اماں نے ساری باتیں سن لیں۔

"تم بڈھی خبردار جو ایک لفظ بھی بتایا ہو۔" اس نے اماں کے بال پکڑ لیے۔

"م... م... میں نے کچھ سنا نہیں صاحب کچھ۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" زبیر نے بڑی بے دردی سے اماں سکینہ کو سیڑھیوں سے دھکا دے دیا اور وہ گرتی چلی گئیں۔

--*

"ہیلو۔ قریشی صاحب سے بات ہوسکتی ہے۔" بات کرنے والا اجنبی تھا۔

"جی میں بات کررہا ہوں۔" وہ اندر سے گھبرا گئے۔

"بری خبر ہے قریشی صاحب! آپ کے بیٹے شہباز کو قتل کردیا گیا ہے۔"

"کیا...؟"

(باقی آئندہ)

تحریم حسن کو گھر میں پیار سے رانی کہا جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں آنرز فائنل کی طالبہ تھی۔ اس کا نکاح بچپن میں ہی شاہ زیب حسن سے ہو چکا تھا۔ شاہ زیب حسن تحریم کے چچازاد تھے۔

ان کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ان کے ننھیال والوں اور والدہ نے انہیں تحریم سے بدظن کر دیا تھا لیکن جب شاہ زیب نے یونیورسٹی میں تحریم حسن کو دیکھا تو پہلی ہی ملاقات میں اس سے متاثر ہو گئے، اور انہیں جب پتا چلا کہ تحریم ہی ان کی منکوحہ ہے تو انہوں نے اسے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ شاہ زیب کی والدہ کسی صورت تحریم کو بہو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔

تحریم کے والد نے شاہ زیب کو ان کی تمام جائیداد سونپ دی تھی، جبکہ ان کے ماموں وسیم الرحمن نے بہن بھانجے کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔

تحریم شاہ زیب سے بظاہر سخت متنفر تھی، لیکن پکنک کے موقع پر جب شاہ زیب کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تو اس کے سارے جذبے عیاں ہو گئے۔ اس نے شاہ زیب کو صاف صاف بتا دیا کہ جب تک ان کی والدہ راضی نہیں ہوں گی۔ وہ انہیں قبول نہیں کرے گی۔

۲۹

انتیسویں قسط

وہ ریسیور پھینک کر پلٹا۔

"کچھ کیجیے شاہد بھائی' خدا کے لیے کچھ تو کیجیے مگر جلدی کیجیے۔!" اس نے انہیں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"تم اسے اٹھا کر لاؤ' میں گاڑی نکالتا ہوں۔" شاہد عجلت میں دروازے کی سمت بڑھے۔

جو لفافہ انہوں نے اٹھایا تھا' بدستور ان کے ہاتھ میں ہی تھا واپس ڈالنے کے بجائے دیکھے بغیر یونہی توڑ موڑ کر جیب میں ٹھونس لیا۔

وہ سب ہی کچھ اس طرح حواس باختہ ہوئے تھے کہ گھر میں موجود گاڑیوں کو بھی فراموش کر بیٹھے۔

"ارے ہاں' بھائی جان کی گاڑی تو خاصی بڑی ہے با آسانی لے جا سکیں گے۔ اماں آپ کسی بیگ میں پانی کی بوتل اور گلاس بھی ڈال لیجیے۔" رفعت کے اڑے ہوئے ہوش بھی مائل بہ بحالی ہوئے۔

ڈاکٹر رفیق کا ہاتھ اب بھی رانی کی نبض پر تھا اور نظر رسٹ واچ پر۔

"تو ابھی تک No any Change کوئی امپروومنٹ نہیں ہے۔" آصف کے قریب آنے پر سر کو منفی جنبش دیتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

وہ سب بڑی تیزی سے ہاسپٹل پہنچے تھے۔

آصف صرف کالج ہی کی حد تک نہیں' ہاسپٹل کی حدود میں بھی بے حد مقبول تھا۔

یوں بھی اس کی ڈیوٹیز آج کل اسی شعبے میں لگ رہی تھیں۔
"ڈاکٹر آصف کی بہن آئی ہے ایمرجنسی میں۔"
پورے شعبے میں کھلبلی سی مچ گئی۔
جونیئرز، سینئرز ہی نہیں، سارا پیرامیڈیکل اسٹاف بھی دوڑ پڑا۔
آدھے گھنٹے کے اندر اس کے اساتذہ بھی سب جمع ہو گئے۔
غرض یہاں سے وہاں تک اوپر نیچے ہر طرف ہل چل مچ گئی تھی۔
ہر شخص بے حد مستعد اور فعال دکھائی دینے لگا۔
رانی کو سیدھا آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔
رفعت اور اتالی کو باہر ہی رک جانا پڑا۔
گلاس سیپریشنز پر مشتمل کاریڈور میں موجود آصف اور شاہد بھائی کو شیشے کی دیوار کے اس پار وہ مشینوں میں جکڑی، ڈاکٹرز کی مکمل توجہ اور مسلسل جدوجہد کا مرکز بنی صاف نظر آ رہی تھی۔
آصف زاہداری کی دیوار سے پشت ٹکائے بالکل خاموش کھڑا ایک ٹک رانی کی صورت تک رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں پیروں کی جان ہی نکل گئی ہو۔ قوت گویائی بھی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔
آگے سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر رضوان نے اس کے شانے پر حوصلہ افزا قسم کی تھپکی دی۔
اس نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔
ان کے چہرے پر وہی بے حد مانوس قسم کی پر اعتماد مسکراہٹ جگمگائی۔
اور پھر جیسے سارے بند ٹوٹ گئے وہ بے اختیار ان سے لپٹ کر ان کے شانے پر سر ٹکا کر بلک بلک کر رو دیا۔
"ہمت پکڑیں آصف، حوصلہ رکھیں۔ آپ تو خود بھی قریب قریب مکمل ڈاکٹر بن چکے ہیں، کسی بات سے ناواقف تو نہیں ہیں۔" وہ اسے دھیرے دھیرے تسلیاں دیتے سمجھاتے اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ شاہد بھائی نے گردن گھما کر دیکھا ضرور لیکن اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی۔
انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی پتھر ہو چکے ہیں۔ سرد اور بے جان۔
ان کے لب تو خاموش تھے لیکن روح مسلسل دعا گو اور دل خدا کے حضور سجدہ ریز۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے سر، میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، میری بہن تو بہت صحت مند تھی۔ کبھی کسی معمولی سی تکلیف میں بھی مبتلا نہیں ہوئی پھر یہ اچانک کیا ہوا ہے؟"
آصف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر گزرے۔
"یہ اٹیک کنڈیشن اب بھی نہیں ہے۔ اٹ از ناٹ سم کائنڈ آف ڈزیز اور ناٹ اینی ہارٹ پرابلم بٹ۔۔۔"
"بلڈ پریشر لو (Low) ہو گیا ہے، خطرناک حد تک، کیس سیریس ضرور ہے لیکن مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ آپ خود کو سنبھالیے خود نگرانی کیجئے۔ ریزاپ ہو جائے گا انشاء اللہ۔"
"اسے ریزاپ ہونا چاہیے سر، مجھے ہر قیمت پر اپنی بہن چاہیے آپ کچھ کیجئے لیکن اسے بچا لیجئے ورنہ میں بھی زندہ نہیں رہوں گا، آپ میری زندگی لے لیں مگر انہیں زندہ رہنا ہو گا۔"
وہ اس وقت صرف اور صرف ایک بھائی تھا اور بس۔
"کوشش کرنا بندوں کا کام ہے لیکن باقی سارا اختیار تو اس کے ہاتھ میں ہے، ہم سب کو مل کر ہی جدوجہد کرنی ہے اپنی تمام تر اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ اگلے چھتیس گھنٹے خطرناک ہیں ان کے لیے، بارہ گھنٹے کے اندر اندر ہوش آ گیا تو سمجھو خطرہ بالکل ختم ہو گیا تم تو خود ڈاکٹر ہو، عام لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو کیپ اپ یور سیلف ای

انہوں نے پھر اس کے شانے پر تھپکی دی۔
تک تسلیاں دیتے رہے۔
"خدا سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے ہمیشہ آؤ خود دیکھو۔ کارڈیو گرام (E.C.G) ریسپریشن ہارٹ لنگز سارے ٹیسٹ کلیئر آرہے ہیں۔ وہ جو بیٹ مس ہو رہی تھی وہ بھی اب نہیں ہے پلز ریٹ تھوڑا ڈسٹرب ہے۔ وہ بہتر ہو جائے گا انشاء اللہ بی پی مزید گرنے سے تو روک لیا گیا ہے مگر کولسٹمنٹ ہو گیا ہے۔ اسے اوپر جانا ہے۔"
اسے ساتھ لیے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتے دھیمے لیکن مضبوط قدموں سے مشینوں میں جکڑی رانی کے بستر تک گئے۔
ہسپتال کے بہترین دماغ اس کے گرد موجود اسے زندگی کی جانب لوٹانے کی سعی میں مصروف نظر آرہے تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی اس کی صورت تکتا رہا۔ وہ جو اس وقت زندگی کے سارے جھنجھٹوں جھگڑوں سے بے نیاز ان سب کی کیفیتوں اور احساسات سے بے خبر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔
وہ گھٹنوں کے بل فرش پر ٹکا تھا اور اس کی پٹی پر سر ٹکا کر گویا اپنی سدھ بدھ بھی کھو بیٹھا' ڈاکٹر اسد نے آگے بڑھ کر سنبھالنا چاہا مگر پروفیسر خالد اور سرجن رحمان نے بیک وقت ہاتھ اٹھا کر انہیں ہر قسم کے اقدام سے باز رکھا۔
اس کے بے آواز آنسو رانی کا بستر بھگوتے رہے۔

——*

"تم مجھے شاہ زیب کے پاس لے چلو افتخار۔" انہوں نے بھتیجے کو سامنے پاتے ہی ہاتھ تھام کر پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔
"ضرور لے چلوں گا پھپھو مگر پہلے آپ ٹھیک تو ہوں' یہ ڈاکٹرز آپ کو یہاں سے نکلنے کی اجازت تو دیں نا۔" وہ دھیرے سے ان کے بیڈ پر ہی ٹک گئے۔
"میں اب ٹھیک نہیں ہو سکتی' بس تم مجھے یہاں سے لے چلو' میں ایک دفعہ اس کی شکل تو دیکھ لوں مرنے سے پہلے اس کے سامنے یہ اقرار تو کر سکوں کہ ہاں میں ہی غلطی پر تھی۔" ان کی آنکھوں نے پھر برسنا شروع کر دیا۔
"کیسی باتیں کرتی ہیں خالہ بی' کچھ نہیں ہوا ہے آپ کو' بس تھوڑی تھکن ہے' انشاء اللہ یہ وقتی کیفیت ہے' بہت جلد اچھی ہو جائیں گی آپ۔" ثوبیہ نے ان کے بازو پر اپنا حنائی ہاتھ رکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔
"ہاں اور کیا' ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی انشاء اللہ' تیزی کے ساتھ رہیے گا' اپنے ہاتھوں سے اس کے سر پر سہرا سجائیں گی۔ اس کی دلہن گھر میں لائیں گی۔" میلہ آپی نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح بہلاوے دیئے۔
"ہائے یہ کچھ اچھا تو نہیں کیا مجھلے بھائی نے میرے ساتھ' میرا کلیجہ شق کیوں نہیں ہو جاتا' میں کیسے مان لوں کیسے کہوں کہ دنیا میں کوئی رشتہ قابل اعتبار نہیں رہا؟"
انہوں نے افتخار کا ہاتھ چھوڑ کر ثوبیہ کا خوبصورت بیل بوٹوں سے سجا مہندی کی خوشبو سے رچا بسا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا۔
"سچ کہتے تھے اقرام رشتے تعلق' خون کے یا گوشت پوست کے نہیں دل کے ہوتے ہیں جن کے آگے ساری دنیا کی نعمتیں' دولت' ثروت' جاہ و حشم سب بے حقیقت ہو جاتا ہے۔"
یا پھر غرض کے ہوتے ہیں' جس کے سامنے کسی رشتے ناتے' کسی خلوص' چاہت کی کوئی اہمیت' کوئی حیثیت حقیقت نہیں رہتی۔ تم بھی تو میری بھانجی ہو' میری جان' میرے بھتیجا بھتیجی ہو۔ جو اپنی ساری خوشیاں' سارے دکھ پریشانیاں بھول کر یوں میری بانہی سے لگے بیٹھے ہو۔ مجھے بتاؤ تو سہی کیا اس نے سچ مچ مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے؟ میری صورت

دیکھنے کا بھی روادار نہیں رہا ہے۔"
"نہیں پھپھو! ایسی کوئی بات نہیں ہے اس کا غالباً" ٹیلی فون خراب ہو گیا ہے میں اس سے رابطہ نہیں کر پا رہا ہوں۔" وہ نظر چرا گئے تھے۔
"مجھے بہلاؤ نہیں۔ اس طرح کے بہانے کیوں بناتے ہو' جو اصل حقیقت ہے۔ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے۔ رابطے کی کوئی ایک ہی صورت تو نہیں ہوتی۔" وہ پھر رونے لگیں۔
"خدا کی قسم پھپھو! میں آپ کو بہلا نہیں رہا۔ اس کے دوستوں میں سے صرف ایک ہی کا نمبر میرے پاس ہے۔ آپ یقین کریں جیسے ہی اسے علم ہو گا اطلاع ملے گی۔ وہ پہلی فلائیٹ سے آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ نہیں تو آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ میں خود بکنگ کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سیٹیں کنفرم ہوتے ہی میں اور سیہ آپ کو خود کراچی لے چلیں گے۔ مگر پہلے آپ سفر کے قابل تو ہوں۔"
"میں بھی چلوں گی افتخار میرا ٹکٹ ضرور بنوانا' ذرا شیزی کے کان کھینچوں گی جا کر۔ کبھی یوں بھی کوئی بے خبر ہوتا ہے۔" سہیلہ آپی نے پھرمان اور محبت کا احساس دلایا۔
وہ بھلا وہ انہیں یہ کیسے بتا دیتے کہ نجمی نے انہیں آج ہی یہ اطلاع دی ہے کہ وہ اپنے فلیٹ میں موجود ہی نہیں ہیں۔ پچھلے دو تین روز سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔"
یہ بن کر تو شاید ان کا دل ہی بند ہو جاتا' وہ اچھی طرح جانتی تھیں اسلام آباد جانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے اور اس بات پر تو کبھی ہرگز یقین نہ کرتیں کہ وہ اسلام آباد ہی میں ہوں گے۔ امریکہ روانہ نہیں ہوئے ہر چند کہ وہ سہیلہ آپی کو آگاہ کر چکے تھے۔
"میں نے کنفرم کر لیا ہے۔ ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں اس کا نام بھی شامل ہے جب تک تمام معاملات کلیئر نہ ہوں' اصل صورت حال سامنے نہ آئے شامل تفتیش تو انہیں بھی کیا جائے گا۔ لیکن یہ بات صالحہ پھپھو کے علم میں نہیں لائی جا سکتی۔"
وہ جو خدشہ ان سب کو پریشان کئے ہوئے تھا وہ افتخار کے ولیمے کے دوسرے ہی دن کسی زلزلے کی مانند سامنے آیا تھا' شدید قسم کا طوفان تھا' جس نے ان سب کو جڑ بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا تھا وہ سب کچھ جو بڑی رازداری' بہت احتیاط سے کیا گیا تھا۔ اچانک ہی اظہر من الشمس ہو گیا تھا۔
فرح کو فاروق اعوان نے مصدقہ اطلاعات کے ساتھ میکے واپس بھیج دیا تھا جن کے بارے میں وہ اس روز افتخار سے بڑا واضح قسم کا اظہار خیال کر چکے تھے۔
اور جو افتخار نے گھر کے ذمہ دار مردوں اور بڑی پھوپھی جان کے علاوہ کسی اور کے علم میں قطعی نہیں آنے دیا تھا فرح کی سسرال والے نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی بھی معاملے میں وسیم الرحمٰن کے ساتھ نتھی کئے جائیں۔ وہ خاصے اثر و رسوخ والے لوگ تھے اور اب وہ بہتی گنگا اپنا رخ بدل چکی تھی۔ جس میں انہوں نے بھی ہاتھ دھونے کی کوشش کی تھی۔
اور کیونکہ یہ شادی بھی اثاثوں کی تحقیقات کے سلسلے میں حقائق تک پہنچنے کا ایک موثر ذریعہ قرار پا سکتی تھی بے شمار گواہیوں کے ساتھ۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ فرح کا اپنے باپ کے گھر میں رہنا زیادہ بہتر ہے تاکہ وہ اپنی لاعلمی کو معتبر قرار دے سکیں۔
گاڑی کی واپسی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اور دوسری ایسی تمام اشیاء بھی فرح کے ساتھ ہی واپس لوٹا دی گئی تھیں۔ جن کی برآمدگی کا کوئی امکان کسی قسم کا ثبوت بن کر ان کے لئے خطرہ کا موجب بن سکتا تھا اور میاں وسیم الرحمٰن اپنے شریک کار گروپ آف انڈسٹریز کے دیگر مالکان کے تعاون سے جعلی ویزے اور پاسپورٹ کے ذریعے

راتوں رات ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
جس کا علم ان کے بیوی بچوں کے علاوہ باقی تمام اہل خانہ کو دوسرے روز فرح کو اس سارے ساز و سامان کے ساتھ موجود اور انہیں موجود نہ پا کر ہوا تھا کہ اب منجھلی تائی اماں کے لئے اس اتنی بڑی بات کو چھپا لینا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔
زبردست قسم کے دھماکے کے ساتھ گویا سب ہی کچھ سامنے آ گیا تھا۔
وہ سب تو عزت بچانے اور معاملات کو جو ذمہ دار ہے' صرف اس کی حد تک محدود رکھنے کی فکر اور تگ و دو میں لگ گئے تھے۔

اور صالحہ بیگم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہاسپٹلائز کرنا پڑا۔
منجھلی تائی اماں کو اب بالکل چپ لگ گئی تھی۔ ان کا وہ سارا تیہا اور تنتنا صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا
سچ کہا ہے کسی نے رام تیری لیلا نیاری' اس دنیا کے بھی کیسے کیسے اور کتنے رنگ ہیں۔ کوئی نہیں جان سکتا وقت پڑنے پر تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے' کل کے وہ یار غار' آج کس قدر اجنبی ٹھہرے!

......*

شاہ زیب ویزا ہی کے سلسلے میں اسلام آباد گئے تھے۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ امریکہ کا چکر لگا چکے تھے اس لیے ویزہ سیکشن ہونے میں تو کوئی وقت نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ لفافہ انہوں نے ویزا ہاتھ میں آجانے کے بعد ہی تحریم حسن کے نام روانہ کیا تھا۔
لیکن اسلام آباد میں ہی انہیں مختلف ذرائع سے علم ہو گیا تھا کہ وسیم الرحمٰن صاحب پوری طرح زور پر آچکے ہیں۔ اور بہت جلد اس پورے گروپ آف انڈسٹریز کے خلاف باضابطہ کارروائی کا آغاز ہو جائے گا۔
اصل مسئلہ یہ تھا کہ بیشتر معاملات میں فرنٹ مین کے فرائض انہوں ہی نے انجام دیئے تھے۔
شاہ زیب نے سوچا تھا لاہور کا چکر لگالیں لیکن پھر دل آمادہ نہیں ہوا اور انہوں نے سیدھے کراچی کا رخ کیا۔ شاہ زیب نے فوری طور پر افتخار سے رابطہ کی کوشش کی تھی۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔
"تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے' میں بیہ اور سیلہ آپی' صالحہ پھپھو کو لے کر تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں کل کسی بھی وقت کی فلائیٹ سے۔ انشاءاللہ تفصیل ملاقات پر بتاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا' تم فلائیٹ روانہ ہونے سے پہلے مجھے رنگ ضرور کر دینا۔ ایرپورٹ پر ملوں گا انشاءاللہ۔"

انہوں نے اپنے اضطراب پر قابو پانے کے لئے خود کو مصروف رکھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن طبیعت اندر سے کچھ عجیب بے چینی کا شکار تھی۔
دھیان پلٹ پلٹ کر تایا جان کے گھر کی طرف جاتا رہا۔
پتا نہیں کیا صورت حال بنی ہوگی۔ کیا تاثرات ہوں گے ان سب کے میرے اس اقدام پر۔
اور تحریم حسن؟ کیا سچ مچ مطمئن ہو گئی ہوگی۔
وہ مجھے قبول کرنا' میری زندگی میں شامل ہونا نہیں چاہتی۔
وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اپنے اندر ہونے والے اس جمع تفریق کے سلسلے کو روک نہیں پا رہے تھے۔

......*

سب سے پہلے ہاسپٹل پہنچنے والے سیفی تھے۔ ان کی شکل دیکھ کر شاہد بھائی کے دل کو تقویت کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی۔

"یہ نروس بریک ڈاؤن ہے شدید قسم کا ڈپریشن اور ٹینشن لیکن اس طرح اچانک اس حد تک ڈاؤن ہو جانے کی فوری وجہ کیا بنی ہے؟ ہوا کیا تھا؟"

رانی کی تشویش ناک حالت کو دیکھ کر سیفی پریشانی کے ساتھ ہی سخت ترین الجھن کا شکار بھی ہوئے۔

"فوری وجہ؟" اب شاہد بھائی کو اس لفافے کا دھیان آیا جو انہوں نے اسفل کی ٹھوکر کے تعاقب میں قالین پر سے اٹھایا تھا۔

"مسز تحریم شاہ زیب حسن مگر یہ تو بند ہے۔ کھولا ہی نہیں گیا۔" انہوں نے الجھے انداز میں زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اسے چاک کیا۔

وہ طلاق تفویض کے کاغذات تھے شاہ زیب نے طلاق کا حق تحریم انجم کی طرف منتقل کیا تھا۔

"اف میرے خدا! میرے خیال میں یہ لفافہ کسی شدید غلط فہمی کی صورت اس ابنارملٹی کا سبب بنا ہے سیفی؟"

"کیا۔۔۔؟ کیا مطلب؟؟" تاسف کے بوجھ سے ڈوبتی آواز پر سیفی نے چونک کر شاہد بھائی کی شکل دیکھی۔ اور ہاتھ بڑھا کر کاغذات تھام لیے۔

اس کے ساتھ ایک خاصا تفصیلی خط بھی تھا۔

تحریم حسن۔۔۔!

جان کہوں یا روح؟

تم میری جرأت تخاطب پر کتنی ہی ناراض کیوں نہ ہو یہ سچ ہے کہ میری زندگی کی آس ہو تم۔!

تمہیں یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا' تم میری ہو۔ میرے نام' میری زندگی سے منسلک ہو چکی ہو' اور اب ہمیشہ صرف اور صرف میری ہی رہو گی۔ مجھ سے دور رہ کر بھی یہ بندھن جو بابا جان کی خواہش پر قائم ہوا' اب ٹوٹ نہیں سکتا۔ میں وہ کسی صورت' کسی قیمت پر اور کسی حالت میں بھی نہیں ہونے دوں گا۔ جس کی طرف تم نے اشارہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ جو پہلے کبھی صرف ہمارے بزرگوں کا تھا۔ اب میرا بھی ہے۔

میں اپنے اس دعوے' اس وعدے پر آج بھی قائم ہوں۔ میں تمہیں خود طلاق نہیں دوں گا' مگر بات ساری یہ ہے کہ یہ رشتے' یہ تعلق' یہ بندھن جو دلوں کے ہوا کرتے ہیں' نہ تو زبردستی قائم ہوتے ہیں اور نہ ہی زبردستی قائم کرائے یا رکھے جا سکتے ہیں۔

میں اپنے دعوے میں مخلص تھا۔ مخلص ہوں اور ہمیشہ مخلص ہی رہوں گا۔ لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ میں تمہیں مجبور کرنا یا رکھنا نہیں چاہتا۔ چاہت میں کیا دنیاداری؟ عشق میں کیسی مجبوری؟

اور تم نے مجھ سے کہا تھا' کسی مرحوم کی خواہش کی نسبت زندہ لوگوں کے عزائم زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ہو گا وہی جو آپ کی امی جان چاہیں گی۔ پھر جس راہ چلنا نہیں اس کے کوس کیا گننا؟ آپ بھی وہی کیجیے جو آپ کی والدہ محترمہ چاہتی ہیں۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہے' اور۔ اگر آپ چاہیں تو میں اجازت نامہ لکھ دینے کو بھی تیار ہوں۔ ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے۔

(حالانکہ ان کی خواہش کی تکمیل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تکمیل ساری زندگی نہیں ہو سکتی۔!)

اور یہ کہ۔ آپ بہت خوش فہم انسان ہیں اور خوش فہمی انسان کو حقائق کا ادراک نہیں ہونے دیتی۔

(یہ بالکل سچ ہے تب ہی تو ہم ان کی سنگینی سے واقف نہیں ہوتے!)

اور یہ کہ' میرے یا آپ کے نزدیک اس نام نہاد بندھن کی کوئی اہمیت نہ سہی (ہر چند کہ تمہیں میرے متعلق اتنی قطعیت سے یہ فیصلہ کر لینے کا کوئی حق نہیں تھا) لیکن میرے ابو بہر حال اپنے عزیز اکلوتے بھائی آغا جان مرحوم کی اس قسم کے اسیر ہیں۔ جو آخر وقت میں اس بندھن کو قائم کرتے وقت انہوں نے دلائی تھی۔ کہ وہ کسی حال میں بھی

اسے ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اور یہ یقین میں دلا سکتی ہوں کہ اس کی موجودگی آپ کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ آپ حقیقت پسند بلکہ حقیقت شناس بنیے' اسی میں آپ کی فلاح ہے۔"

میں نے تمہارا یہ مشورہ قبول کرلیا ہے حالانکہ تم نہیں جانتیں۔ حقیقت پسند یا حقیقت شناس ہونا تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں' اصل چیز تو حقیقت کو ایز اٹ از As it is تسلیم کرلینا ہوتا ہے۔ وہ زہر جو ہم نے اتار لیا۔ لیکن تم اس کا حال کیا جانو؟۔

تم میرا ساتھ قبول کرنا نہیں چاہتیں۔ اور تایا جان کا کہنا ہے کہ یہ زندگی کے معاملات ہیں' ایسے مسائل کسی موہوم سی آس یا امید پر حل نہیں کیے جاتے۔ زندگی کا سفر کتنا طویل ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا' اور اب وہ مزید کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ اگر کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو پھر وہ راستہ اپنا لینا چاہیے جو بہتری کی سمت لے جائے!

اور مزید یہ کہ ان کے خیال میں میرے پاس بھی بہت زیادہ وقت نہیں ہے اور وہ بھی خود کو مزید انتظار کی پوزیشن میں نہیں پا رہے۔ متبادل تو دونوں ہی طرف موجود ہیں۔ (حالانکہ مجھ سے متعلق ان کا یہ خیال بھی قطعی غلط ہے۔ میری طرف تو کوئی متبادل نہ پہلے کبھی تھا' اور نہ ہی تمام عمر ہو سکے گا۔ کبھی کوئی اپنی روح کو بدل کر بھی زندگی پا سکا ہے؟ دل بدلنے کے تجربے تو شاید پھر بھی کامیاب رہے ہوں گے۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ سیفی تمہارے لئے ایک بہتر متبادل ثابت ہو جائیں' جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے وہ بے حد مخلص' بے لوث محبت کرنے والے اور بہت حساس انسان ہیں۔ تایا جان کے کہنے کے مطابق رضوانہ خالہ نے ان سے فون پر تفصیلی گفتگو کی ہے ان کے بقول سیفی ماشاءاللہ خود کو سٹیبلش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں اور رضوانہ ایک مدت سے اس مسئلے کے حل کے لئے کوشاں رہی ہیں۔ اور اب میں بھی اسے لمبے عرصے تک کے لیے التوا میں رکھنے کا حامی نہیں ہوں۔"

ہاں تحریم حسن! اگر بات صرف اسی کی حد تک ہوتی تو میں سہہ لیتا سہہ ہی رہا تھا اور شاید کوئی راہ نکال لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا' لیکن خیر۔ بہرحال.....

جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں اور میری کوئی خطا نہیں' اسے شاید ایسے ہی ہونا تھا۔

اور میں نے تم سے آخری بات یہی کہی تھی کہ میں امریکا جانے کے انتظامات کر رہا ہوں لیکن جانے سے پہلے اس معاملے کو آخری شکل دینی ضروری ہے' میں یہاں سے کوئی حتمی فیصلہ کر کے' فیصلہ کن قدم اٹھا کر جاؤں گا' اور اب یہ فیصلہ وہی ہو گا جو تم چاہتی ہو یا چاہو گی۔

سو فیصلہ تو مجھے کرنا ہی تھا۔ آج مجھے "ویزا" مل گیا اور یہ بھی عجیب حسن اتفاق یا سفارت خانے کی عنایت ہے کہ انہوں نے ملٹی پل ویزا' کا اجرا کیا ہے۔

ہاں تو تحریم حسن! میں روانہ ہونے سے پہلے بغیر کسی دباؤ اور جبر کے اپنی مرضی سے طلاق تفویض کی صورت یہ حق تمہیں منتقل کر رہا ہوں۔ تاکہ تم جب چاہو' برضا و رغبت اپنی خوشی سے' اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں جو چاہو فیصلہ کر سکو!

اور میری دعا ہے تایا جان اور نانی جان کی خواہش کی تکمیل کی صورت میں تم سیف الحسن کے ساتھ ایک بہت خوش و خرم اور بہترین زندگی گزارو۔

جو زندگی میں کبھی مانگی تھیں اپنے لیے
وہ تمام دعائیں تمہارے نام کرتا ہوں

شاہ زیب حسن

جو تمام تر تمہارا ہو کر بھی تم تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہی رہا

خط کے اختتام تک آتے آتے سیفی کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

شاہد بھائی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے انگوٹھے اور انگلیوں کی مدد سے پیشانی دبائے غالباً آنسوؤں کے ابال کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان دونوں نے وہ خط بیک وقت شانے سے شانہ ملا کر اکٹھے ہی پڑھا تھا۔

"تائی لارڈ' یہ کیا کر گزرے ہیں احتشام ماموں۔" سیفی شدید قسم کے احساس جرم اور پشیمانی کی زد میں آ گئے۔ ان کا جی چاہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوڑتے ہوئے جائیں اور شاہ زیب حسن کو جھنجوڑ کر کہیں کہ یہ سب بزرگوں کی باتیں ہیں جس کے بیچ میں میں کہیں موجود نہیں ہوں۔

تم بھی مجھے یوں بنیاد بنا کر کوئی فیصلہ کر لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

میں نے تو اپنے تمام جذبے خود اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھے تھے پھر تمہیں یہ حق کس نے دے دیا۔ کہ تم مجھے یوں بے نقاب کرنے کی کوشش کرو؟۔

مگر وہ اس وقت قطعی بے بس تھے۔

رفعت انالی کے پاس سے اٹھ کر کچھ آگے بڑھی۔ تو ان لوگوں پر نظر پڑ گئی اور دونوں کو یوں ششدر کھڑے دیکھ کر وہ بڑی پھرتی سے ان کی طرف آئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کیا ہے یہ؟۔" اس نے سیفی کے ہاتھ میں تھامے کاغذات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سیفی نے خط والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے باقی تمام اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"نہیں سیفی! دے دو یہ بھی۔ ان تمام لوگوں کے علم میں آنا چاہیے کہ کیا ہوا ہے 'کیا بیتی ہے ان دونوں کے بیچ۔" شاہد بھائی کے لہجے میں حد درجے شکستگی اتر آئی۔

"لیکن لفافہ تو تم نے ابھی کھولا ہے 'اس کا مطلب ہے اس نے تو یہ خط پڑھا ہی نہیں۔"

سیفی نے وہ بھی رفعت کو تھماتے ہوئے شاہد بھائی کی شکل دیکھی۔

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ لفافہ ہی کوئی بہت بڑی غلط فہمی بنا ہے 'میں آصف کو بلاتا ہوں۔" وہ ادھر بڑھے تھے۔

"ہائے میرے اللہ! اسی یقین نے تو اسے اس حال کو پہنچایا ہے سیفی بھائی! وہ تو بڑے وثوق سے کہتی رہی تھی کہ شاہ زیب کوئی قدم اٹھا ہی نہیں سکتے۔ کاش اس نے یہ خط پڑھ لیا ہوتا' دیکھ تو لیتی' یہ تو اس کے یقین کی جیت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اسے طلاق نہیں دے سکتے۔" رفعت کے آنسوؤں کو ایک نئی راہ مل گئی۔ اس کے لئے تو کچھ بھی نیا نہیں تھا اس خط میں۔

"اچھا اب آپ بالکل خاموش رہیے گا۔ آصف کے سامنے قطعی کچھ نہیں کہیں گی بلکہ ایسا کریں۔ آپ واپس انالی کے پاس چلی جائیں۔ ان کی بھی حالت اچھی نہیں ہے۔ انہیں اکیلا مت چھوڑیے۔" سیفی نے دھیرے سے ہدایت کی۔

اور سارے پیپرز اس کے ہاتھ سے لے کر پھر سے لفافے میں ڈال دیئے۔

رفعت نے ان کی شکل دیکھی۔ چہرے پر سے آنسوؤں کے نشان صاف کرتی واپس پلٹ گئی کہ یہ حوصلہ تو خود اس میں بھی نہیں تھا۔

"یہ بے ہوش کیسے ہوئی تھی؟۔" آصف کے قریب آنے پر سیفی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"وہ میں... ہاں یہ لفافہ کیا ہے اس میں؟۔" اس نے وہ سیفی کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔

"اسے چھوڑو تم یہ بتاؤ... ہوا کیا تھا؟۔"

"میں کالج سے واپس آیا تھا.....۔" آصف نے بالتفصیل دہرایا۔

"میں نے لفافہ ان کی گود میں پھینکا ان کے پوچھنے پر کہ کیا ہے یہ، میں نے کہا شاہ زیب بھائی نے طلاق کے کاغذات بھجوائے ہیں غالباً" اس کے بعد آگے کچھ دیکھنے، کہنے سننے کی قوت ہی نہیں آئی۔"
"یہ تم نے کیا کیا احمق انسان؟ کم از کم دیکھ تو لیتے۔" شاہد بھائی کے ضبط نے بھی ساتھ چھوڑ ہی دیا۔
"میں نے کہا بھی تھا تم سے، میری ایک بات یاد رکھنا آصف کہ بچپن کے ان رشتوں کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہوتی ہیں، پھر بھی تم نے دھیان نہیں کیا، کوئی توجہ نہیں دی۔" وہ خود پر قابو پانے کے لئے دوسری طرف مڑ کر کئی قدم آگے بڑھ گئے۔
"کیا۔؟ کیا مطلب ہے۔؟" اس نے کچھ ہونق ہو کر انہیں دیکھا۔
"تم نے بہت برا کیا آصف! یہ طلاق نامہ نہیں ہے۔" سیفی نے دھیرے سے کہا۔
"پھر۔؟ کیا ہے یہ۔" آصف نے مزید وحشت زدہ ہو کر سیفی کی شکل دیکھی۔
"دیکھ لو۔ کیا ہے؟" انہوں نے آہستگی سے وہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"اف میرے خدا!؟ تو انہیں اس حال کو پہنچانے والا میں خود ہوں۔"
وہ بری طرح لڑکھڑایا۔ لفافہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اگر سیفی سنبھال نہ لیتے تو خود بھی گرا ہوتا۔ شاہد بھائی تیزی سے پلٹ کر ان کی طرف آئے تھے۔

--*

اس ساری ضرب تقسیم سے گھبرا کر تھک ہار کر بالآخر شاہ زیب نے رفعت کے نمبر ڈائل کیے رانی کا رد عمل وہ صرف اسی سے معلوم کر سکتے تھے۔
"جی گھر پر تو اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔" فون ریسیو کرنے والی کوئی ملازمہ تھی۔
"اس کا مطلب ہے حالات معمول پر ہیں۔" وہ قدرے مایوس ہوئے۔
"کہاں گئے ہیں؟"
"ہسپتال میں ہیں جی۔"
"ہاسپٹل میں؟ کون تمام لوگ؟ کیوں؟" وہ بری طرح چونکے۔
"جی، وہ ادھر والے گھر میں، جو رانی بی بی ہوتی ہیں۔ ان کی کچھ طبیعت خراب ہو گئی ہے، ان ہی کے ساتھ ہیں سب لوگ۔"
"رانی بی بی کی کیا طبیعت خراب ہو گئی ہے؟" ان کے حواس کو شدید جھٹکا لگا۔
عجلت اور پے در پے کئی سوال کرنے پر بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر انہوں نے تایا جان کی طرف کا نمبر ملایا۔ فون اٹھانے والی زینو تھی۔
"بہت سخت طبیعت خراب ہوئی ہے بڑے بھیا! وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔"
اس نے ان کی آواز سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔
"پتا نہیں جی، صرف آصف بھیا ہی تھے ان کے پاس اس وقت۔"
اور پھر جو کچھ تفصیل اس نے بتائی وہ ان کے حواس پر سچ مچ بجلی بن کر گری تھی۔
اس قسم کا اور اتنا شدید رد عمل ہو گا۔ یہ تو ان کے تصور کے کسی دور افتادہ گوشے میں بھی کہیں موجود نہیں تھا۔ زینو نے کسی خط کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا، انہوں نے گھما پھرا کر بے شمار سوال کیے لیکن وہ سچ مچ وجہ کی طرف سے بے خبر تھی۔
اور اب شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔
حواس بالکل معطل ہو کر رہ گئے تھے۔

"تم نے ٹکٹ تو بنوا لیے افتخار! لیکن صالحہ اس حالت میں بھی ہے کہ جہاز کا سفر کر سکے۔" پھپھو بیگم کو سخت تشویش ہوئی۔
"میں نے ڈاکٹرز سے مشورہ کرنے کے بعد ہی بکنگ کرائی ہے پھپھو بیگم! آپ فکر نہ کریں۔ شاہ زیب کے پاس پہنچ کر یہ بالکل ریلیکس ہو جائیں گی۔ مجھے یقین ہے۔" افتخار مطمئن تھے۔
"چلو جیسی تمہاری مرضی' لیکن بہتر یہی تھا کہ تم شاہ زیب کو یہاں بلا لیتے۔" پھوپی جان کا تردد بھی کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔
"نہیں۔ شاہ زیب کا یہاں آنا تو قطعی نامناسب ہے۔ میرے خیال میں بھی صالحہ ہی کا جانا زیادہ بہتر رہے گا۔" بڑی تائی اماں فوراً بولی تھیں۔
"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں پھوپی جان! میں ساتھ جا تو رہی ہوں' سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا انشاءاللہ۔ جب شاہ زیب خود اپنے مکان میں رہ رہے ہیں تو پھر کسی مشکل کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے اور ڈاکٹرز کی بھی کوئی کمی تو نہیں ہے وہاں بھی۔" سیلہ آپی نے تسلی دی۔
"چلو خدا جو کچھ کرے بہتر ہی کرے۔ پتا نہیں اور کیا کچھ سامنے آنے والا ہے۔ میرا دم تو مستقل ہولوں پر ہی رہنے لگا ہے اب۔" پھوپی جان نے ٹھنڈی سانس لی۔
"پتا نہیں کس کی ہائے پڑی ہے' خدا تمہیں بخشے مجھلے بھائی جیسا کچھ تم نے کیا ہے' سر اٹھانے کے قابل نہیں رکھا۔" پھپھو بیگم پھر تلملائی تھیں۔ وہ ان کے لیے کوئی برا کلمہ بھی تو نہیں نکال سکتی تھیں کہ وہ ان کا اپنا خون' سگے بھائی تھے۔
"جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب جو کچھ سامنے آئے گا۔ انشاءاللہ بہتر ہی ہو گا۔ بس آپ یہ دعا کرتی رہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح غلط میں تمیز اور درست فیصلے کرنے کی توفیق عطا کر دے۔" افتخار نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
دونوں پھپھیوں کے ساتھ ہی ان کی امی نے بھی خاصے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔
مگر وہ سیلہ آپی سے مخاطب ہو گئے تھے۔

*_*_*

رانی کی بے ہوشی کو ساڑھے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ حالت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز نے مزید دواؤں کے استعمال کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا' مشینی مدد بدستور جاری تھی۔ اور مسنونہ' ڈاکٹرز کی نگرانی بھی' سب ہی ڈیوٹی روم میں موجود تھے۔

اور اب تو روبی' عمران وغیرہ کے علاوہ آصف کے اور بہت سے کولیگ بھی جمع ہو گئے تھے' سراپے پر چھائے ہوئے مکمل سناٹے کے ساتھ بالکل چپ احتشام حسن کچھ عجیب سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔ اس مختصر سی جگہ میں ٹہل ٹہل کر ان کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں لیکن اندر کا اضطراب بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ ریحانہ بیگم تو جیسے کسی پتھر کی مورت میں ڈھل گئی تھیں۔ بالکل ساکت اور خاموش۔ آنکھوں کے سامنے دنیا لٹ رہی تھی۔ عمر بھر کی کمائی ڈوب رہی تھی۔ اور وہ تماشائی بنے رہنے پر مجبور تھیں۔
ارم بھابھی اور رفعت کا رو رو کر برا حال تھا۔
انا بی نے مستقل جائے نماز سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ سجدے سے سر اٹھانے کو تیار ہی نہیں تھیں۔
صفیہ چچی اور ماہی جان کبھی نوافل ادا کرنے لگتیں۔ کبھی قرآن شریف کھول کر بیٹھ جاتیں۔
عرفان چچا' عثمان ماموں' فیضان' عمران بھائی وغیرہ کبھی اس دیوار سے ٹیک لگا لیتے' کبھی اس ستون سے ٹک جاتے۔
ایک گھنٹے کے اندر اندر یکے بعد دیگرے سب ہی ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ اور اب کوئی وہاں سے ہلنے کو بھی تیار

نہیں تھا' بھوک پیاس سے بے نیاز' وہ سب پیوستہ لب' ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے بغیر ایک دوسرے کی دعاؤں بنے' اللہ کی رضا کے منتظر تھے۔

وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اور ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے دوڑتی گھڑی کی سوئیاں ان سب کے اعصابی دباؤ میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔

ٹھہرے ہوئے یہ لمحے گزر کیوں نہیں جاتے۔

آصف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی زندگی دے کر اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا لیتا۔

اقرار گئے' انکار گئے' ہم ہار گئے
جینے کے سب آثار گئے ہم ہار گئے
کچھ یادیں اس کی بیچ سمندر ڈوب گئیں
کچھ سپنے اپنے رہ اس پار گئے ہم ہار گئے
اک عمر رہے ہیں جیت سے بے پروا لیکن
جب جیتنا چاہا جیون وار گئے ہم ہار گئے

شاہ زیب بالکل بے جان اور تھکے ہارے قدموں سے سیڑھیاں طے کرتے اوپر آئے۔

اسی وقت آصف بھی گلاس ڈور کھول کر باہر آیا۔ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر اس کے اندر صدمے' غصے اور بے بسی کا ایک عجیب ابال سا اٹھا تھا۔

"میری بہن کی اس حالت کا ذمہ دار یہ شخص ہے۔" ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی لمحے بھر کو اس کا ذہن جیسے جنون کی حدوں کو چھو گیا۔

"کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے۔" وہ بڑی پھرتی سے ان کے مقابل آیا۔

"تم نے میری بہن کی زندگی ختم کر دی' بے رحم' سنگدل انسان' جی چاہتا ہے قتل کر دوں تمہیں۔" اس نے ان کے شانے پکڑ کر بری طرح جھنجوڑ دیا۔

"ارے رے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے؟" عمران بھائی بڑی تیزی سے ان کے درمیان آئے۔

"پاگل ہو گئے ہو آصف' یہ کیا کر رہے ہو تم۔" دوسری طرف سے شاہد بھائی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کیا احمقانہ حرکتیں کرتے ہو' غلطی شاہ زیب کی تو نہیں ہے بیٹے۔" عثمان ماموں نے اس کی اعصاب شکنی اور ذہنی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

اور آصف جیسے جھٹکے سے حواسوں میں واپس آیا۔

"شاذے بھائی۔" وہ تڑپ کر عثمان ماموں کی گرفت سے نکلا تھا۔

"ہاں شاذے بھائی! یچ کہہ رہے ہیں ماموں جان' غلطی آپ کی نہیں ہے' قصور تو سارا میرا ہے۔ میرے ایک غیر ذمہ دارانہ' غیر محتاط جملے نے یہ صورت حال پیدا کی ہے۔" دوسرے ہی لمحے وہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔

"آپ ہی انہیں اس طوفان سے نکال سکتے تھے۔ جس میں وہ مستقل گھری ہوئی تھیں۔ مگر آپ نے بہت دیر کر دی شاذے بھائی! بہت دیر کر دی۔ اگر رانی آپا کو کچھ ہوا تو میں بھی جان دے دوں گا۔ میں انہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ نہیں جانے دوں گا۔" اس نے اپنا سر ان کے شانے پر پٹخ دیا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ کہیں نہیں جا سکتیں۔ ہم سب مل کر اللہ تعالیٰ سے ان کی زندگی مانگیں گے انہیں زندہ رہنا ہوگا ہماری خاطر' وہ رب رحیم انہیں زندگی ضرور دے گا کہ خدا نہ تو ظالم ہے اور نہ ہی بے رحم۔" شاہ زیب

کے اندر اُبلتے کھولتے لاوے نے بھی جیسے راہ پالی۔
اپنی اپنی جگہ منجمد ہو جانے والے بالکل ساکت و صامت کھڑے لوگوں کے جسموں میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے احتشام حسن ہی ست روی سے قدم اٹھاتے ان دونوں کی طرف آئے۔
"اس طرح حوصلہ ہار دینے سے بھی کیا حاصل ہے بیٹا۔" انہوں نے بیک وقت دونوں کو بازو کے حلقے میں لیا تھا۔
"کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں۔ اور مقدر پر کسی کا زور نہیں' ہوتا وہی ہے جو قدرت کرنا چاہتی ہے۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی طرح ہو گا جس طرح وہ قادر مطلق چاہے گا۔ ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنا ہے اور استقامت کے ساتھ جھیلنا ہے کہ یہ تقدیر کے فیصلے ہیں اور ان سے مفر ممکن نہیں ہے۔" ان کے بھاری گمبھیر لہجے میں کسی گہرے سمندر کی سطح کی مانند ایک گونہ سکون کی کیفیت تھی۔ اندر کے اس اضطراب کا شائبہ تک نہیں تھا۔ انہوں نے آہستگی سے دونوں کو الگ کیا تھا۔
"نہیں ابو! یہ مت کہیے۔ غلطیاں تو ہم خود کرتے ہیں اور الزام تقدیر کو دیتے ہیں۔ کیوں؟ یہ ہماری ہی خطاؤں کی سزا ہے پھر اسے ہم مقدر کا نام کیوں دیں۔؟" وہ تڑپ کر باپ کی طرف مڑا۔
"ہوش کرو آصف! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" شاہد بھائی نے آگے بڑھ کر سنبھالنا چاہا۔
"آصف۔" پیچھے سے امی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
"تم تو اپنے حواس قائم رکھو بیٹے! یا رانی کے ساتھ ہی تمہیں بھی۔" ان کا ضبط ایکدم ہی ساتھ چھوڑ گیا۔
"نہیں امی نہیں' میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ ہی کے پاس رہوں گا لیکن مجھے بتائیے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟۔' کیوں ہو رہا ہے؟" وہ تو کچھ اس طرح بکھرا تھا اس وقت' کسی طرح بھی خود کو سمیٹ نہیں پا رہا تھا۔
"تم ادھر آؤ' حد سے زیادہ جذباتی ہو رہے ہو' اس طرح سے صورت حال کچھ بدل جائے گی کیا؟۔"
فیضان بھائی اور رومی اسے گھسیٹ کر دوسری طرف لے گئے۔
"مجھے معاف کر دیجیے تایا جان۔" شاہ زیب سسک کر ان کے گلے لگے تھے۔
"کس بات کی معافی بیٹا! تمہیں تو کسی نے کوئی الزام نہیں دیا کوئی کسی کے قصور کا تعین نہیں کر سکتا' سچ کہہ رہے ہیں تمہارے تایا جان۔ بس دعا کرو' خدا اسے زندگی دے دیں۔ وہ کر دے۔ جو میری بچی کے حق میں بہتر ہو۔"
انہوں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام کر پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ اور پھر اسی طرف پلٹ گئی تھیں۔ جہاں سے اٹھ کر آئی تھیں۔
شاہد بھائی نے شاہ زیب کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔
وہ رانی کو دیکھنے کے لئے شیشے کے اس کیبن کی طرف بڑھ گئے جہاں اب سیفی اٹینڈنٹ کے طور پر اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔
وہ تو اس وقت سارے زمانے سے بے نیاز تھی۔
"میں جانتا تھا تحریم حسن کہ تم مجھ سے بچھڑ کر جی نہیں سکو گی' تب ہی تو میں نے یہ اختیار تمہیں دینا چاہا تھا۔ تم اپنے جذبوں سے ہار کر بھی مجھ پر اعتبار نہ کر سکیں۔
کاش مجھے یہ اندازہ ہو جاتا کہ تم جو بظاہر مجھے اتنی مضبوط نظر آ رہی ہو۔ اندر سے اس قدر خوفزدہ ہو' اتنی کمزور پڑ چکی ہو؟
میں تمہیں کسی آزمائش میں تو نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف تمہارے اندر احساس جگانا چاہتا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تمہارے احساسات اس قدر نازک آبگینوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔"
ان کے اندر سے امنڈنے والی طغیانیوں میں وہ رنجیدہ سا مگر انتہائی پر سکون چہرہ ڈوب ڈوب کر ابھرتا اور ابھر ابھر کر

ڈوبتا رہا۔
وہ اپنی آنکھوں کی برسات سے خود بھی بے خبر تھے۔
تیزی سے گزرتے ہوئے وقت نے اب ڈاکٹر خالد اور ڈاکٹر رحمٰن کی تشویش میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔
"اصل میں اعصاب پر دباؤ بہت زیادہ ہے؟ انہیں ریلیکس ہونا چاہیے اور دوا میں استعمال کرنے میں رسک ہے اتنے عرصے میں کچھ تو پرسکون ہونا چاہیے تھا۔ مگر۔۔۔؟" ڈاکٹر خالد سیفی کی شکل دیکھ کر خاموش ہو رہے تھے۔
اس وقت دوا سے کہیں زیادہ دعا کی ضرورت ہے' میرا خیال ہے انٹروینس انجکشن دے کر دیکھیں۔ کوئی سلائیٹ قسم کی چینج بھی اگر آ گئی ہے تو۔۔۔" وہ دونوں ڈسکس کرتے واپس ریٹائرنگ روم کی طرف بڑھ گئے" آصف نے سیفی کی شکل دیکھی۔ وہ نظر چرا گئے اس نے پلٹ کر رانی کی طرف دیکھا۔
خاموشی سے باہر آیا۔ امی جان کے ہاتھ سے قرآن شریف لیا۔
اور اسی طرح چپ چاپ واپس پلٹ گیا۔
وہ سب بوکھلا کر اس کے پیچھے بڑھے تھے۔ سیفی نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔ شاہد بھائی نے اندر جا کر تازہ ترین صورت حال دیکھی۔
وہ سب ہی وقفے وقفے سے اندر کا چکر تو لگا ہی رہے تھے۔
آصف رانی کے سیدھے ہاتھ پر سرہانے کی طرف رخ کیے اس کی کلائی تھامے قرآن شریف کھولے بیٹھا تھا۔
بتدریج اس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔
سورہ رحمان کی آیات "اور اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز تو جیسے دل سے نکل رہی تھی۔ بار بار قرآن شریف اس کی نظروں میں دھندلا جاتا۔
لیکن پڑھنے کے تسلسل اور رفتار میں کمی نہیں آ رہی تھی۔
ان سب کی پریشانی' اور بے یقینی کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سیفی تسلی کی خاطر باہر آ گئے تھے۔
دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار کو ظاہر کرنے والی مشین کی آواز اور گراف سے خفیف سی تبدیلی کا اظہار ہوا۔
رانی کو محسوس ہوا جیسے کوئی دور سے پکار رہا ہے۔
اس کے حواس میں تحریک ہوئی۔ آہستہ آہستہ آواز صاف ہوتی گئی۔
اس کی سماعتوں کا احساس جاگا کوئی قرآن شریف پڑھ رہا ہے' بے حد خوش الحانی سے'
اسے ایک انجانی سی مقناطیسی کشش محسوس ہوئی جیسے رفتہ رفتہ اس آواز کے ذریعے اس میں طاقت آ رہی ہو۔
اس کے احساسات بیدار ہو رہے تھے۔ قوت بڑھ رہی تھی۔
آصف پڑھتے پڑھتے کبھی پلز مانیٹر پر اور کبھی رانی کی صورت پر نظر ڈال لیتا تھا۔
اچانک اسے محسوس ہوا پلز مانیٹر کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔
اس کا حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔ رندھے گلے سے نکلتی آواز بار بار بالکل بھرا جاتی تھی۔ مگر ایک پکار کی سی کیفیت تھی۔
"اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"
اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ آواز کی سمت دیکھا۔
آصف اس کی عزیز ترین ہستی کا چہرہ اس سے صرف تھوڑے فاصلے پر تھا۔
"ہاں یہ میرے اسی عزیز از جان کی آواز ہے۔"
نظروں نے سماعتوں کو پہچان کرائی اور روح میں تقویت بن کر اتر گئی۔
آصف نے سورہ مکمل کر کے رانی کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔
آصف کے ہاتھ کانپ گئے۔
"رانی آپا؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔
رانی کی آنکھوں میں پہچان اور چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ جاگی۔
آصف قرآن شریف اس کے سرہانے بستر پر ہی چھوڑ کر تیزی سے باہر بھاگا۔
"سر۔ ہوش آگیا۔ رانی آپا کو ہوش آگیا ہے سر۔"
اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی تھی۔
وہ سب بیک وقت اس کے بستر کی سمت دوڑ پڑے۔
واقعی اسے مکمل ہوش آگیا تھا۔
ڈاکٹرز نے مکمل چیک اپ کیا۔ فوری طور پر پے در پے دو انجکشن دیے گئے۔ ڈاکٹر خالد اور سرجن رحمٰن کے نزدیک تو معجزہ ہوا تھا اس وقت آدھے گھنٹے کے اندر اندر۔
پورے آٹھ گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں، جو جہاں تھا وہیں سجدہ میں چلا گیا۔ ان لوگوں کی خوشی قابل دید تھی۔
احتشام حسن کی آنکھوں نے اپنے تمام ٹھہرے ہوئے آنسو اس خوشخبری کے ملنے پر بہائے۔ عرفان چچا نے وہیں سے فراست صاحب کو ٹیلی فون کر کے صبح سب سے پہلے کام کے طور پر مزید بکروں کے صدقے کی ہدایت دی تھیں۔
شاہد بھائی شاہ زیب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے تھے۔
اسے تمام لوگوں سے ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔
"لیکن بیک وقت نہیں، ایک وقت میں صرف ایک شخص.....!
اس بات کا دھیان رکھیے گا کسی بھی قسم کا جذباتی تغیر ان کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے ابھی پوری طرح کنٹرول اور بحال نہیں ہوئے ہیں ان کے اعصاب۔
بہتر یہی ہے کہ کم سے کم لوگ ان کے پاس جائیں۔"
ڈاکٹرز نے خاص طور پر ہدایت کی تھی۔
صرف رانی ہی نہیں جیسے وہ سب بھی اس کے ساتھ ہی ہوش میں آئے تھے۔ وہ چپ ٹوٹ کر ایک مسرت بھری دھیمی دھیمی چہکار میں تبدیل ہوگئی تھی۔ ان سب کے لبوں کی مہریں اور ذہنوں کا جمود بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سب سے پہلے اس کے پاس جانے والی امی تھیں۔
رانی ایک دم سے بے تاب ہوئی لیکن ابھی مشینوں کی بندش پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بھی بدستور ڈرپ میں جکڑا ہوا تھا۔
"نہیں رونا دھونا بالکل نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہو چکی ہیں اب آپ۔" سیفی نے اس کے سر پر تھپکی دی۔
امی نے جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا، بے تحاشا پیار کرتی رہیں۔ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ سیفی انہیں تھام . . لے گئے۔
ڈاکٹر ہونے کے ناتے انہیں اور آصف کو بہت سارے ایڈوانٹیج حاصل ہو گئے تھے۔ انہیں اہل خانہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا ہر قسم کی پابندیوں سے بھی قطعی مستثنیٰ تھے۔
"دہشت پگلی، رونے کی کیا بات ہے۔ اب جلدی سے ٹھیک ہو جائے گی ہماری بیٹی بس صبح تک ہم گھر لے چلیں گے انشاء اللہ" ابو نے چھلکتی آنکھوں، رندھے گلے کے ساتھ اس کے گال تھپتھپائے۔ اس کے آنسو صاف کیے۔
یکے بعد دیگرے مختلف لوگ اس کے پاس جاتے اور باہر آتے رہے۔ سب اکٹھے ایک ہی جگہ جمع ہو کر ڈسکس

کر رہے تھے۔ اس کی کیفیات دہرا رہے تھے۔ سیفی کی نظروں نے شاہ زیب کو تلاش کیا۔
وہ سب سے الگ تھلگ ریلنگ پر بازو ٹکائے تنہا کھڑے سیڑھیوں سے نیچے دیکھ رہے تھے۔
"شازے۔"

"ہوں؟" سیفی کی دھیمی سی پکار پر چونک کر متوجہ ہوئے۔
"ایک بات کہوں، مائنڈ تو نہیں کرو گے۔" سیفی کے انداز میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بجائے خود اعتمادی تھی۔
"کہو! میرے پاس اب کسی کی کوئی بھی بات مائنڈ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔" انہوں نے گہرا طویل سانس لیا۔
"تمہارا اس وقت رانی کے سامنے آنا اس کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ شازے وہ تمام باتوں سے لاعلم ہے جس طوفان، جس بحران سے گزری ہے، بہت ممکن ہے تمہاری یہاں موجودگی اسے دوبارہ اسی کیفیت میں دھکیل دے یا پھر اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین صورت حال کی طرف۔"
"نہیں۔ میں نے پہلے بھی ایسا کچھ نہیں چاہا تھا سیفی۔" انہوں نے بے اختیار ان کا بازو تھام لیا۔
"اور میں اب بھی یہ نہیں چاہوں گا، میں تو اسے ڈپریشن اور ٹینشن سے نکالنا چاہتا تھا یہ صورت حال تو میرے تصور کے کسی دور افتادہ گوشے میں بھی کہیں موجود نہیں تھی وہ تو جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔
سیفی چپ چاپ ان کی شکل دیکھتے رہے۔
"دیکھو شازے! جو فیصلہ تم کر چکے ہو۔ صرف فیصلہ ہی نہیں انتظامات بھی ظاہر ہے تمہیں اس پر عمل بھی کرنا ہے۔" انہوں نے خاصے توقف کے بعد پھر بات شروع کی۔
"تو پھر اس کو اتنی مہلت ضرور دے دو کہ وہ خود کو سمیٹ سکے خود کسی فیصلے پر اپنی گرفت مضبوط کر سکے۔ اسے ذہنی طور پر سنبھلنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہیے تاکہ فیصلے کی گھڑی اس کی گرفت میں آ سکے۔" خاموشی کا ایک طویل لمحہ پھر ان کے درمیان آ ٹھہرا۔
"میرا خیال ہے۔ تم میری بات لفظوں میں ڈھلے بغیر بھی بہت اچھی طرح سمجھ رہے ہو شازے۔" یہ توقف خود سیفی کے لئے بھی اعصاب شکن ہی تھا۔
"سمجھ رہا ہوں۔" شاہ زیب کے شکستہ لہجے میں دل کرچی کرچی ہوا تھا۔ انہوں نے سر اونچا کر کے چھت بنے آخری سرے تک نظر دوڑائی۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو سیف الحسن میں فیصلہ کر کے بھی بے اختیار ہی ہوں کہ فیصلے کی اس گھڑی پر بھی میری گرفت مضبوط نہیں ہو سکی ہے، مجھے صرف اور صرف وقت کے دھارے پر چلنا ہے۔ کہ میں مزاحمت کے تمام حقوق، سارے حوصلے کھو چکا ہوں، بے بس ہوں تنہا ہوں اور لاکھ چاہتے ہوئے اپنی تمام تر کوشش کے باوجود فیصلے کی گھڑی پر گرفت کر لینے سے قاصر۔!"
"تھینک یو، سیفی! مجھے اس کی حالت سے باخبر رکھنے کی کوشش کرنا۔" انہوں نے اسی ہارے ہوئے سے انداز میں مصافحہ کیا۔
سیفی اپنے اندر بے انتہا اضطراب سمیٹے، چپ ساکت کھڑے ان کے تھکے تھکے درماندہ قدموں کو لفٹ کی سمت بڑھتا دیکھتے رہے۔
"سیفی! یہ شاہ زیب چلے گئے؟؟؟" پیچھے سے ان کے شانے پر گرفت کرنے والے شاہد بھائی تھے۔
"ہوں؟۔ ہاں!۔" سیفی چونک کر ان کی طرف مڑے۔

(آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا۔
" جب کوئی حاجت مند سائل سوال کرے تو اس کی سفارش کرو کہ تم کو سفارش کا ثواب ملے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے جو حکم چاہتا ہے اجاری فرماتا ہے۔"
(بخاری۔ مسلم۔ مشکوٰۃ۔ حیٰوۃ المسلمین)

صائمہ بشیر۔ لاہور

نفس

صہیب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر دو فرشتوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو گئی۔ ایک نے کہا۔
" میں دنیا میں جا رہا ہوں تاکہ فلاں مچھلی کو ماہی گیر کے دام میں پھنسا آؤں کہ فلاں یہودی کو اس کی بڑی خواہش ہو رہی ہے۔"
دوسرے نے کہا۔ " میں بھی جا رہا ہوں اور مجھے اس پیالے کو زمین پر گرانا ہے جسے لوگ فلاں عابد کی خواہش کے مطابق روغن سے بھر کر اس کے پاس لا رہے ہیں۔"

صائمہ صولت اسلم۔ بہاولپور

وجہ

ایک روز مشہور موسیقار آرنلڈ شوبرگ کا ایک دوست اس سے ملنے کسی دوسرے شہر سے آیا۔ آرنلڈ دوست کو لے کر ٹہلنے نکلا۔ دوست نے دیکھا کہ محلے کے بچے بڑے احترام سے آرنلڈ کو سلام کر رہے ہیں۔ اس نے تعجب سے کہا۔
" کمال ہے، یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ تم بہت مشہور ہو، مگر تمہیں تو بچے تک جانتے ہیں۔"
آرنلڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
" مگر اس کی اصل وجہ میرا بیٹا ہے جو شہر کی فٹ بال ٹیم کا ہاف بیک ہے۔"

صائمہ سلیم۔ فردوس کالونی کراچی

بقدرِ ظرف

ایک شخص ایک ایسے بزرگ کے پاس پہنچا جو اسمِ اعظم جانتے تھے۔ اور ان سے درخواست کی کہ مجھے اسمِ اعظم سکھا دیں۔ اس بزرگ نے کہا۔
" شہر سے باہر دروازے پر جا کر بیٹھ جاؤ اور وہاں جو کچھ نظر آئے اسے غور سے دیکھنا اور پھر مجھے آ کر بتانا۔"
وہ شخص جو اسمِ اعظم سیکھنے کی نیت سے حاضر ہوا تھا۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شہر کے باہر دروازے پر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ ایک ضعیف شخص اپنے گدھے پر لکڑیاں لاد کر شہر لا رہا ہے۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو ایک سپاہی نے اس شخص سے لکڑیاں چھین لیں اور اسے مارا بھی۔ وہ شخص واپس آ گیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بزرگ نے پوچھا۔
" اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تم اسمِ اعظم جانتے تو کیا کرتے؟"
اس شخص نے جھٹ کہا۔ " میں اس سپاہی کی ہلاکت کی دعا کرتا۔"
بزرگ نے کہا۔ " وہ لکڑیاں لانے والا ضعیف بوڑھا۔ میرا مرشد ہے۔ میں نے اسی سے اسمِ اعظم سیکھا ہے۔ جب اس نے خود اس سپاہی کی ہلاکت نہیں چاہی تو تم کون ہوتے ہو ایسا کرنے والے۔ جاؤ تم اسمِ اعظم

سیکھنے کے قابل نہیں ہو۔"
سعدیہ عصمت۔ دھریمہ

منہ بولتی ڈائری

ایک اخبار کے ایڈیٹر اور رپورٹر میں ایک واقعے کی تاریخ کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ آخر میں رپورٹر نے کہا۔
"اس واقعے کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے۔ میری ڈائری اس بات کا ثبوت پیش کرے گی۔"

رپورٹر نے اپنی ڈائری کھولی۔ ایک صفحہ نکالا اور ڈائری ایڈیٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"لو خود پڑھ لو۔"

ایڈیٹر نے پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا۔ اس میں لکھا تھا: ایڈیٹر مجھ سے کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے لیکن وہ الو کا پٹھا حرامی اس قدر جھوٹا ہے کہ خدا کی پناہ۔"

مجبوری

ایک پلازہ کے ایک فلیٹ میں آتشزدگی کی اطلاع پر فائر بریگیڈ کا عملہ پہنچا۔ عمارت میں بجلی بند ہو چکی تھی۔ تاریک راہ داری میں ایک سینیئر فائر مین نے زیرِ تربیت فائر مین کو ہدایت کی۔
"دیوار کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتے رہو اور جہاں دروازہ ملے اسے کھول کر مجھے اطلاع دو۔"
فائر مین نے کچھ دیر بعد اندھیرے میں چیخ کر اطلاع دی۔
"دروازہ مل گیا ہے اور میں نے اسے کھول لیا ہے۔"
سینیئر فائر مین نے جلدی جلدی موٹا پائپ کھینچ کر اس تک پہنچایا اور ہدایت کی: "پانی ڈالو۔"
"یہاں پانی نہیں ڈالا جا سکتا۔" زیرِ تربیت فائر مین کی آواز ابھری۔
"کیوں؟" سینیئر فائر مین نے جھنجلا کر پوچھا۔

"یہ فریج کا دروازہ ہے۔" قدرے مایوسی سے جواب ملا۔
عظمیٰ۔ فوزیہ۔ کراچی

مختصر مختصر

- جھوٹ بولنے کے لیے شرمندہ ہونے کا حوصلہ چاہیے۔
- تماشا بننے والا برابر کا لطف لے تو مزاح ہے ورنہ طنز ہے۔
- حساس آدمی زیادہ دیر زیادتی سہہ سکتا ہے نہ کر سکتا ہے۔
- لوگوں کی چالاکی ہمارا اتنا جی نہیں جلاتی جتنا ان کی حماقت۔
- میرے لیے وہی بادشاہ ہے جس کا مجھ پر احسان ہے۔

عمارہ بتول۔ کبیر والا

آئے نہ پھر

خوابوں کی دیکھ بھال میں آنکھیں اجڑ گئیں
تنہائیوں کی دھوپ نے چہرے جلا دیے
لفظوں کے جوڑنے میں عبارت بکھر چلی
آئینے ڈھونڈنے میں کئی عکس کھو گئے
آئے نہ پھر وہ لوٹ کے اک بار جو گئے
عظمیٰ۔ صائمہ۔ کورنگی کراچی

جواہر پارے

- علم دل کو اس طرح زندہ کرتا ہے جیسے کہ بارش زمین کو۔ (حکیم لقمان)
- زندگی دوسرے سے ادھار نہیں لی جاتی۔ اسے خود ہی اپنے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ (علامہ اقبال)
- بغیر سوچے سمجھے تقلید کرنا کمزور دماغ کی عادت ہے۔ (برنارڈ شاہ)
- ایک ہی پتھر سے دوبارہ ٹھوکر کھانا بے وقوفی اور بدنامی کی بات ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

۲۵ اکتوبر ۹۷ء کو ماہنامہ "کرن" کے بانی، ہم سب کے پیارے محمود بابر فیصل (مرحوم) کی چوتھی برسی ہے، اُن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اُن کی یادیں اور دیگر خصوصی تحریریں اس شمارے میں شامل کی جا رہی ہیں۔

- ★ ڈرامہ سیریل "انہونی" کے فیصل" قاضی اکبر" سے شاہین رشید کی ملاقات۔
- ★ مزاح نگاری میں منفرد نام" اطہر شاہ خان" ریحانہ علی احمد کے سوالات کی زد میں۔
- ★ "خواب باتیں کریں" ذکیہ اسلم کا دلچسپ سلسلہ۔
- ★ "کچن کارنر" میں آپ کی میزبان" فرح سجاد راؤ"
- ★ "بہتی چاندنی کا سکوت" ناہید چودھری کا سلسلے وار ناول۔
- ★ افشاں آفریدی کا سلسلے وار ناول" رنگ، خوشبو، ہوا بادل"
- ★ معروف مصنفہ ثمرہ بخاری کا مکمل ناول" عمرِ گزشتہ کی صدائیں"
- ★ شگفتہ بھٹی اور عالیہ حرا کے طویل و دلکش ناولٹ۔
- ★ نگہت عبداللہ، شاہین ملک، رُخ چودھری، سعدیہ عزیز آفریدی، میمونہ خورشید، فوزیہ یاسمین اور فریحہ ظہیر کے افسانے۔

اور

- ★ مستقل انعامی سلسلے۔

مفت

صاف ستھرا گھر اور خوبصورت آرائش و زیبائش مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے، اور یہ سلیقہ مند خواتین کی پہچان ہے۔ آپ بھی خود کو سلیقہ مند خواتین کی صف میں شامل کر سکتی ہیں۔ اسی سلیقے کے موضوع پر کرن کتاب" گھر سجائیے" اس شمارے کے ہمراہ مُفت پیشِ خدمت ہے۔

"کرن" کا اکتوبر کا شمارہ آج ہی خرید لیں"

(سرور)
سیدہ عابدہ عروج۔ جھنگ صدر

تجسس

مقدمے کی سماعت آخری مراحل میں تھی۔ ملزم نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے وکیل صفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔

جج صاحب ناگواری سے بولے۔ "پولیس نے تمہیں جیولرز کی دکان میں ڈاکا ڈالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ دکاندار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔ زیورات تمہارے قبضے سے برآمد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تم اٹھارہ مرتبہ کے سزا یافتہ ہو۔ تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا وکیل تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔" ملزم نے جواب دیا۔

ثمینہ اصغر بٹ۔ گکھڑ منڈی

سنہرے موتی

☆ گالی کا جواب نہ دو کہ کبوتر کوے کی بولی نہیں بول سکتا۔
(فیثا غورث)

☆ میں نے حسن کی تعریف تو بہت سنی ہے لیکن آج تک حسن دیکھا نہیں۔
(ہٹلر)

☆ زندگی بغیر محنت کے مصیبت اور بغیر عقل کے حیوانیت ہے۔
(حکیم بطلیموس)

☆ عقل کی حد ہو سکتی ہے لیکن بے عقلی کی نہیں۔
(ایمرسن)

☆ کامیابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے۔
(ایمرسن)

☆ محبت آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھی جاتی ہے۔
(شیکسپیئر)

فرزانہ نذر۔ گجرات

ایک سوال دس جواب

☆ "تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ پورے بیس منٹ لیٹ۔"
"سر! میں دسویں منزل کی کھڑکی سے گر گیا تھا۔"
"جھوٹ مت بولو، دس منزلیں گرنے میں بیس منٹ نہیں لگتے۔"

☆ "تم دیر سے کیوں آئے ہو؟"
"سر! میری نانی کا انتقال ہو گیا تھا۔"
"اچھا آئندہ خیال رکھنا۔ دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

☆ "تم دیر سے کیوں آئے ہو؟"
"سر! بس نہیں مل رہی تھی۔"
"اسی لیے کہتا ہوں کہ دفتر جانے کے لیے رات ہی سے جوتیں ڈھونڈ لیا کرو۔"

☆ "تم دیر سے کیوں آئے؟"
"سر! آج میری منگنی تھی۔"
"دفتر سے باہر ہونے والے حادثات کی کمپنی ذمے دار نہیں۔"

☆ "تم دیر سے کیوں آئے؟"
"سر! میں سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا۔"
"اس قسم کے ذاتی کام دفتری اوقات کے بعد کیا کرو۔"

☆ "تم دیر سے کیوں آئے؟"
"سر! میں ساس سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔"
"تم مجھے رشوت دینا چاہتے ہو؟"

☆ "تم دیر سے کیوں آئے؟"
"سر! میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"
"اسی لیے کہتا ہوں ہوش میں رہا کرو۔"

جبینہ، ربیعہ۔ کوٹلی نجابت

خواتین کی ڈائری

ارم زیب کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر قمر جمیل کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے

میں مورنی تیرے عشق کی ہوں، میں تیرے پیار کی ناگن ہوں
میں پائل تیرے پاؤں کی ہوں، میں تیرے ہاتھ کا کنگن ہوں

میں چاند ہوں تیرے گالوں کا، میں شعلہ تیرے بالوں کا
میں تیرے وصل کی ہنسی ہوں، میں تیرے ہجر کی جا انجن ہوں

میں پنچھی تیری شاخوں کا، میں کوئل تیرے باغوں کی
میں سورج تیرے سائے کا، میں تیری ذات کا آنگن ہوں

میں تیرے پیار میں زندہ تھی، میں تیرے پیار میں مرتی ہوں
میں تیرے برہ کی ماری ہوں، میں اپنی جان کی دشمن ہوں

تو چاہے مجھ سے پیار کرے، تو چاہے مجھ کو زہر بھی دے
میں تیرے شہر کی واسی ہوں، میں تیرے خواب کی جوگن ہوں

بارش لانے والے بادل، ہولی کھیلتے رہتے ہیں
جس پر رنگ بکھیرے پیتم ہیں وہ اجلا دامن ہوں

سندس میر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منیر نیازی کی یہ خوبصورت نظم مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔

میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں

شام کا وقت ہے دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہے
میں کیسی دعاؤں کو یاد کروں
میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں
میرے دل میں بہت بے اثر دعائیں ہیں
بہت دعاؤں کے بجائے میرے دل میں
ایک دعا ہوتی تو اچھا ہوتا۔

نوید قدیر تمنا کی ڈائری سے
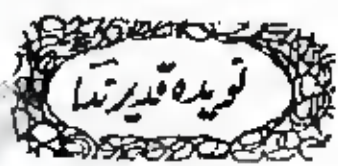
میری ڈائری میں تحریر سعد اللہ شاہ کی ایک خوبصورت سی غزل جو کہ مجھے بے حد اچھی لگتی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی نذر کرتی ہوں۔

تم نے یہ کیسا رابطہ رکھا
نہ ملے ہو نہ فاصلہ رکھا

نہیں چاہا کسی کو تیرے سوا
تم نے ہم کو بھی پارسا رکھا

پھول کھلتے ہی کھل گئیں آنکھیں
کس نے خوشبو میں سانحہ رکھا

تو نہ رسوا ہو اس لیے ہم نے
اپنی چاہت پہ دائرہ رکھا

جھوٹ بولا تو عمر بھر بولا
تم نے اس میں بھی ضابطہ رکھا

کوئی دیکھے یہ سادگی اپنی
پھول یادوں کا اک سجا رکھا

سعد اُلجھا رہا مگر اُس نے
تجھ سے ملنے کا راستہ رکھا

سمیرا صدیقی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر روشی گیلانی کی ایک غزل آپ سب کی نذر

جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے
اُس کے لیے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے

دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے

کچھ تجھ کو محبت پہ یقین تھا نہ وفا پر
کچھ دُکھ میری تقدیر میں لکھا بھی بہت تھا

بینائی اندھیروں سے بھلا کیسے بچاتا
اک شخص تیرے ہجر میں جاگا بھی بہت ہے

وہ اور ہیں جو چھوڑ کے تجھے دیکھنا چاہیں
مجھ کو تو میرے خواب کی دُنیا بھی بہت ہے

کردار سے محروم تھا یہ شہر تو اس نے
ہم کو در و دیوار پہ لکھا بھی بہت ہے

نکہت بہار کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سید عارف کی یہ خوبصورت غزل جو مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

اب دل میں چھلکتے ہوئے جذبے نہیں ملتے
اُجڑے ہوئے گلشن میں پرندے نہیں ملتے

کیوں چپکے سے وہ لوگ اُتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے

اغراض کے بندوں سے نہ اخلاص طلب کر
صحرا میں گھنے پیڑوں کے سائے نہیں ملتے

وہ جھوٹ کا خوگر تو صداقت مرا مسلک
دونوں کے مزاج اور دل سے نہیں ملتے

برہم ہے کہ اس کو میری خودداری سے
اپنے لیے تعظیم کے سجدے نہیں ملتے

جو زخم دیے اس نے وہ غنیمت ہیں کہ عارف
ہر شخص کو یہ قیمتی تحفے نہیں ملتے

صدف حمید کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر حبیب جالب کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

دل والو کیوں دل سی دولت یوں بے کار لٹاتے ہو
کیوں اس اندھیاری بستی میں پیار کی جوت جگاتے ہو

تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
پھر ان گلیوں میں جاتے ہو پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

سُندر کلیو! کومل پھولو! یہ تو بتاؤ یہ تو کہو!
آخر تم میں کیا جادو ہے کیوں من میں بس جاتے ہو

یہ موسم رِم جھم کا موسم یہ برکھا یہ مست فضا
ایسے میں آؤ تو جانیں ایسے میں کب آتے ہو

ہم سے روٹھ کے جانے والو! اتنا بھید بتا جاؤ
کیوں نت راتوں کو سپنوں میں آتے ہو من جاتے ہو

چاند ستاروں کے جھرمٹ میں پھولوں کی مسکاہٹ میں
تم چھپ چھپ کر ہنستے ہو تم روپ کا مان بڑھاتے ہو

نادرہ خاتون

ثمینہ سید ——— پاک پتن شریف

ہم پچھلے بارہ سال سے آپ کے تینوں شمارے، کرن، شعاع، خواتین پڑھ رہے ہیں۔ میں نے بی۔ اے کیا ہوا ہے۔ ایک مقامی اسکول میں سی۔ ٹی ٹیچر ہوں۔ میرا نام ثمینہ سید ہے۔ اور میں لاہور کے ایک ماہنامے ——— میں پچھلے دو سال سے لکھ رہی ہوں ملازمت کے باعث کم کم لکھتی ہوں۔ دو سال میں میرے چار ناولٹ چھپ چکے ہیں۔ یاسمین نشاط اسے ——— باقاعدگی سے خریدتی ہیں جو پہلے اس میں لکھتی بھی رہی ہیں۔ میرا ناولٹ "محبت ایسا دریا ہے" ایک دکھ نے رلا دیا۔ اور بہار زیتون کی آہٹیں پڑھ کر یاسمین نشاط نے خوب تعریفی کلمات لکھے۔ مگر کیا نا مزہ بھی میری شدید خواہش ہے کہ آپ لوگوں سے ربط استوار ہو۔

ج۔ ثمینہ بہن، خط لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا خط شائع کر رہے ہیں۔ آپ افسانہ بھجوا دیں، قابلِ اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہو گا۔ اچھی تحریروں کے لیے تو ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔

حنا ——— لاہور

ہمارے نام "سلسلے میں ایک خط میں ایک معزز بہن نے رفعت سراج کو ماہ نور کی شادی پاشا سے کر دینے کی فرمائش کی ہے۔ یہ فرمائش سے زیادہ چھینا ہے۔ ہم لڑکیاں جانے کیوں کچے رنگوں کی دھنک کو آنچل سمجھ لیتی ہیں۔ فیصلہ ہم رفعت صاحبہ پر چھوڑتے ہیں۔ ان کا ہر ناول اور افسانہ میں ہمیشہ شوق سے پڑھتی رہی ہوں۔ "طائر لاہوتی" جیسے خوبصورت ناول کو شروع کرنے کا شکریہ۔ ناولٹ میں "میری دوستی تیرے نام ہو" بیگم بیوی اور بیچارہ، منزل نہ کھونا بھی اچھے تھے۔ "اس کا رعب میں" آپ طویل اور بور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کو اب اختتام پذیر ہونا چاہیے۔ افسانوں میں۔ "اک عمر کا حاصل" ہمیں اپنی والدہ کی کہانی لگی۔ اور اسی لیے بالخصوص انہیں پڑھائی بھی، "ناول" سے نام جڑا رہا ہوں یہ تصنیف کچھ جلدی میں لکھی۔ زنیرہ کے ابو ہی لوٹے اور نہ ہی صفو کے انجام کا علم ہوا۔ کم از کم اتنی حسینہ فیملی کو کچھ تو سبق ملتا۔ شاہد آفریدی کی باتیں اچھی تھیں مگر ان کے گھر میں کیا کوئی خاص بات ہے۔ باقی سب سلسلے بھی اچھے تھے۔

سبین نظام ——— راولپنڈی

مجھے نگہت عبداللہ بہت پسند ہیں بلکہ سچ تو اور بھی سب اچھا ہیں۔ کئی ناول اور افسانے لکھے ہوتے ہیں کہ واقعی دل کو لگیں۔ لیکن نگہت جی کی کیا بات ہے۔ وہ واقعی زبردست ہیں۔ میں انہیں بہت پسند کرتی ہوں۔

بشریٰ لقنوز ——— لاہور

میں ایف۔ اے کر چکی ہوں۔ اور قرآن مجید ترجمہ کے ساتھ پڑھ رہی ہوں اس کے ساتھ لاہور میں اسلامک ویلفیئر انسٹیٹیوٹ میں کورس کر رہی ہوں۔ جب آپ میرا خط پڑھ رہی ہوں گی اس وقت تک ختم ہو چکا ہو گا کیونکہ دو ماہ کا تھا جس مسئلے کی طرف آپ کی توجہ کروانی ہے۔ وہ یہ کہ خواتین ڈائجسٹ کے لیے لکھا جاتا ہے اور اس میں خواتین کے مسائل ہوتے ہیں۔ اگر آپ شریعت کے مطابق خواتین کے مسائل کے بارے میں بتائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ جن کے بارے میں آپ کی توجہ دلانا چاہ رہی ہوں۔ وہ یہ مسائل ہیں۔ جیسے ایک عورت کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے وہ ایک ماں، بیٹی، بیوی، بہن ہے تو شریعت کے مطابق کس طرح زندگی گزار سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ نساء، سورۃ احزاب، سورۃ نور، سورۃ تحریم، سورۃ طلاق ان میں ایک عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ اور شادی سے پہلے کس طرح زندگی گزارنے کا حکم ہوا ہے۔ ایک عورت کا یا سب خاندان کے لوگوں کا میت کی وراثت میں کیا حصہ ہے۔ حق مہر کے بارے میں اور اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں۔ دوسری بات یہ کہ رائٹرز کو بھی چاہیے وہ ان مسائل کو شریعت کے مطابق اپنی کہانیوں میں لکھیں۔ تیسری بات آپ کی توجہ ٹائٹل کی طرف کروانی ہے کیا یہ بہت کمزوری ہے کہ یہ شمارے خواتین کے ہیں تو ان پر تصویریں بھی خواتین کی ہی ہونی چاہئیں۔

نزہت ہاشمی ——— سندھلیانوالی

رفعت سراج صاحبہ کے لگتا ہے دماغ میں کمپیوٹر فٹ ہے جو کہ شے سے "طائر لاہوتی" ناول شروع کر دیا۔

واہ ریبا کا کردار زبردست ہے۔ اس دفعہ تو جمال صاحب

کی گود میں، انڈے ہی ڈالتی رہی۔ بہرا حال، بہت مبارکباد دیجیے گا رفعت صاحبہ کو۔ رخ چوہدری صاحبہ کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ بہرحال "شہباز" بیچارے کو اتنا چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ رخ صاحبہ سے گزارش ہے کہ اپنے کرداروں پر اتنا تشدد مت کیا کریں۔ کراچی پہلے ہی دہشت گردی کی لپیٹ میں رہتا ہے۔ زبیر کا کردار بہت منفی ہے۔ خیر اچھا جا رہا ہے "شکستِ شب"۔ پتا نہیں شیطان کی آنت کی طرح بھول بھلیوں میں گم ہو چکا ہے۔ پلیز فریدہ اشفاق جی آپ کے ان کو ملوا دیجیے۔ باقی تمام ناولٹ اچھے ہیں۔ خاص طور پر "منزل نہ کھونا" افشاں آفریدی نے کمال کا لکھا۔ افسانے بھی تمام بس سو سو ہیں۔ مگر نزہت شبانہ حیدر صاحبہ نے اچھا لکھا۔ (عشق آسان ۔ تھا) باقی شاہدہ آفریدی کی باتیں اچھی لگیں۔ ڈاکٹر فیاض صاحب کا انٹرویو اچھا تھا۔ خاص طور پر عدنان صاحب کا "نفسیاتی ازدواجی" انہیں بہت اچھا جا رہا ہے کئی لڑکیاں راہِ راست پر آچکی ہیں۔ خدا سب کو نیکی کی توفیق دے آمین۔

شبانہ اشرف ———— گوجرانوالہ

ٹائٹل بس سو سو تھا۔ شاہدہ آفریدی کا انٹرویو دے کر آپ نے ہمیں بہت بڑا سرپرائز دیا۔ ان کی نماز پڑھنے کی عادت ہمیں بہت پسند آئی۔

افشاں آفریدی اور نزہت شبانہ حیدر کے افسانے اچھے تھے۔ نمرہ بخاری کا ناول پڑھ کر مزا آگیا۔ "شکستِ شب" کی نئی قسط آنے تک ہم بھول بھلیوں میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس میں فلاسفی بہت زیادہ ہے۔ رخ چوہدری نے چھوٹی سی کہانی کو لانگ ہیلے کی شکل دے دی ہے۔ خیر بھی وہ ہیں کرکٹرز کی تعریفیں بھی دیا کریں۔ رفعت آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ ریا کے بھائی اور کزنز کے ناموں میں "ظ" بہت نمایاں ہے جیسے اظہار، ظہیر، مظہر، مظاہر وغیرہ وغیرہ۔ دنیا میں اور بھی تو کتنے نام ہیں۔ وہ کیوں نہیں رکھے پلیز وجہ ضرور بتائیں۔

ریحانہ علی ———— کلورکوٹ

افشاں آفریدی نے "منزل نہ کھونا" میں عشیر کو بہت خود پسند دکھایا۔ ہمارے معاشرے پر تو ویسے ہی مرد کی اجارہ داری ہے۔ آپ لوگ تو اس کا ساتھ نہ دیں۔ نگہت سیما کی منفرد تحریر "میری روشنی تیرے نام ہو" میں مرد کی محبت کو معتبر کر دیا۔ ویسے نگہت جی اب تک ہر قربانی تو عورت کا فرض تھی۔ پھر بھی ایک خوبصورت اور منفرد تحریر تھی کافی عرصے سے فارحہ ارشد لاپتا ہیں۔ ان کی بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔ ضرور بتائیے۔

طاہرہ حسین ———— جڑانوالہ

اس ماہ کے خواتین ڈائجسٹ کا ٹائٹل سادہ سا اچھا لگا سلسلے وار دونوں ناول اچھے تھے۔ اور جناب شاہ زیب حسن کی ریچھ لینے تو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ خدا خیر کرے اب تو اگلے خواتین کا شدت سے انتظار ہے۔ باقی افسانے اور ناولٹ معمول کی طرح اچھے تھے اور جناب یہ کوکب بخاری کا ریسٹ نالم بہت ادھورا ہو گیا ہے۔ اب ان کو جگائیں، ہم ان کی تحریر کے شدت سے منتظر ہیں۔

اسماء انصاری ———— ملتان

میری پسندیدہ رائٹرز میں خواتین اور شعاع میں لکھنے والی تقریباً سب رائٹرز کا نام شامل ہے مگر عنیزہ سید، مایا ملک، نگہت عبداللہ، نمرہ بخاری، شازیہ چودھری اور آسیہ مرزا کا نام فیورٹ رائٹرز کی فہرست پر سب سے اوپر ہے۔ میں نے عنیزہ سید کا سب سے پہلا ناول جو پڑھا تھا وہ تھا "اشتباہِ خرد و نظر" بس وہ دن اور آج کا دن جہاں بھی ان کی کوئی تحریر نظر آتی ہے، میں سب کام چھوڑ کر اسے پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔

سمیرا علی ———— نوشہرہ

ستمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ لیکن ایک چیز نے ہمیں بہت مایوس کیا۔ وہ تھا فوزیہ کا مکمل ناول "بے نام جفا کی نا بول پڑ رہی"، پرانا اور بور ٹاپک، ظالم رشتے دار اور ہیرو کو بیوقوف بناتے ہوئے ترقی دے رہی ہوئی، کرتب بن جانے والی ہیروئن۔ خیر اس کی کسر نگہت سیما کے ناولٹ "میری روشنی تیرے نام ہو" نے پوری کر دی۔ واقعی محبت ہر غرض سے پاک ہوتی ہے یہ لینے کا نہیں بلکہ دینے کا نام ہے۔ عالیہ بخاری اور افشاں آفریدی کے ناولٹ بھی بس ٹھیک ٹھاک تھے۔ افسانے البتہ ہمیں چاروں کے چاروں پسند آئے۔ خاص کر "کھیل میں" پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

اب میرا خیال ہے میں آپ کو خط لکھنے کی اصل وجہ بھی بتا دوں۔ اصل وجہ خواتین ڈائجسٹ کا سرورق ہے آپ سے ہماری نہایت ہی مؤدبانہ گزارش ہے کہ خط کے لیے اس اجنبی حسینہ کا نام بتا کر ہماری الجھن دور کریں۔ کیا یہ سعدیہ امام ہیں؟ یا ذرا ماہل دو پل میں نادیہ خان کی بننے والی بڑی بہن بن کر کھڑی ہوتی ہے وہ ہے

ج: سمیرا بہن! آپ کی بھابی کا کہنا صحیح ہے۔ ستمبر کا ٹائٹل عندلیب اقبال کی تصویر تھی۔ جنہوں نے پل دو پل میں نادیہ خان کی بڑی بہن کا رول کیا۔

فائزہ کومل شریف ———— ٹنڈو محمد خان

رفعت جی نے اس بار بھی بلاشبہ بے حد خوبصورت ناول کا آغاز کیا: "طاشر لاہرتی" اس کی پہلی قسط پڑھ کر ہی اندازہ

ہو گیا تھا کہ یہ بھی یقیناً "دل دیا دہلیز" کی طرح دلچسپ اور بے حد پیارا ہو گا۔ ظاہر ہے یہی ہماری فیورٹ رائٹر کے قلم سے جو تخلیق ہو رہا ہے۔ رفعت بی کو میری طرف سے ایک بار پھر ڈھیروں ڈھیر مبارک ہو۔ ویسے میرے خط لکھنے کی ایک خاص وجہ بھی ہے اس سے قبل بھی میں اس بارے میں لکھ چکی ہوں۔ ۲۵ اکتوبر ایک ایسا دن جو ہم باوجود کوشش کے بھی نہیں بھلا سکتے۔ جب بھی یہ پچیس اکتوبر آتی ہے نئے سرے سے یادوں کے گہرے زخم چھوڑ جاتی ہے۔ اس دن ہم سے ایک نہایت عزیز ہستی جدا ہو گئی اور ہم اس کے لیے جتنے بھی آنسو بہائیں کم ہیں۔ ذوالقرنین بھائی واقعی ایک اچھے رحم دل، ملنسار اور سچے انسان تھے۔ ان کی تعریف میں جتنے الفاظ کہے جائیں کم ہیں۔ بے شک اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے گو کہ میں کبھی ان سے ملی نہیں تھی لیکن بغیر ملے ہی جانتے کیوں وہ ہمیں اپنے سگے بھائیوں کی مانند لگتے تھے۔ میں جناب محمود بابر صاحب کے اس غم میں برابر کی شریک ہوں اللہ تعالیٰ محمود بابر فیصل صاحب کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ارم خان ——— جہلم

میں آپ کا رسالہ "خواتین ڈائجسٹ" گزشتہ پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ شعاع اور خواتین ڈائجسٹ مجھے بہت پسند ہیں۔ اور اس بات پہ بہت خوشی ہے کہ یہ پہلے سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ اللہ سے ان کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔ مزید خوشی کی بات کہ شاہد آفریدی کا انٹرویو تھا۔ باجی پلیز اس میں کرکٹر عامر سہیل اور ثقلین مشتاق کا انٹرویو شائع کریں۔ رفعت چوہدری کا ناولٹ "اس کار فت میں" اچھا ہے لیکن بہت طوالت اختیار کر گیا ہے۔ باقی کہانیوں میں فرح بخاری ٹاپ پہ رہیں افشاں آفریدی، نزہت شبانہ حیدر اور شکیلہ شاد کی کہانیاں اچھے موضوعات پر تھیں۔

سیدہ عابدہ عروج ——— جھنگ صدر

کیسی ہیں آپ؟ ستمبر ۱۴ء کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ سب سے پہلے رفعت سراج کا ناول پڑھا "طاہر لاہوتی" خوبصورت موڑ پر آرہا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے "مضر الدین کا" اور کرتی کیا خوب سفر نامہ لاتی ہیں۔ پڑھ کر بہت انجوائے کیا۔ عالیہ بخاری کا ناولٹ "بیگم ہوں! اور بے چارہ" پڑھا اچھی کاوش تھی۔ میرے خیال میں عالیہ بخاری بھی کب بخاری کی بہن ہیں۔ ضرور بتائیے گا۔ فرح بخاری کا مکمل ناول "بے نام جفا کی راہوں پر" اچھا تو تھا لیکن حقیقت سے کچھ دور لگا۔ فرح جی کے لیے مشورہ ہے کہ آپ مزاح پر زیادہ توجہ دیں تو بہتر ہے۔ عابدہ روف کو کافی عرصے بعد پڑھنا اچھا لگا۔ اس بار صائمہ غلام نبی نے "خبریں دیں" میں لول دو کر پڑھا جیز جا کر پیش

کیا چونکہ ظاہر ہے پسند نہیں آیا۔ انٹرویو میں شاہد آفریدی اور ڈاکٹر فیاض سے ملاقات پسند آئی۔ شاہین رشید کے انٹرویو کرنے کا انداز بے حد اچھا ہے۔

ج۔ عابدہ بہن خط لکھنے کا شکریہ۔ عالیہ بخاری، بھاگ کب بخاری کی بہن نہیں۔

نازیہ اسلم ——— چشتیاں

مجھے رفعت سراج کا ناول "طاہر لاہوتی" بہت پسند ہے ماہ نور اور پاشا کی شادی ہو جائے کیا ہی اچھی بات ہے۔ ستمبر کے ناولوں میں فرح بخاری کا ناول بے نام جفا کی راہوں پر ——— سب سے بازی لے گیا افشاں آفریدی کا ناولٹ منزل نہ کھونا اور رفعت چوہدری کا ناولٹ اس کار محبت میں ۳ اس میں اس دفعہ رہا لیے شروا نے سب کو حیران کر دیا اور شاہد آفریدی کا انٹرویو پسند آیا خاص کر اس کا تصویر بنوانے کا اسٹائل بہت پسند آیا۔ عدنان بھائی بہت اچھے مشورے دیتے ہیں سب کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔ خدا ان کو اس کا اجر دے۔

صائمہ ریاض ——— اٹک شہر

ستمبر کا شمارہ ملا عندلیب عامر اقبال کو سرورق پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی عندلیب کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں ہم ان کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ ابن انشاء کا "ایک دن ڈاکٹر کے ہاں" پڑھ کر حقیقتاً لطف آیا۔ "میری روشنی تیرے نام" کا ہیرو کافی بزدل دکھایا گیا ہے جس نے یہ کیا کہ محبت پہ ہر بار ایک شخص ہی قربان ہو جائے یہ تو طے ہے کہ ایمان پاپا کو وکاء سے محبت نہیں تھی وہ بھی اپر کلاس کی ان لڑکیوں کی صف میں شامل تھی جو ہر پسندیدہ چیز یا انسان کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہتی ہیں۔ "اس کار محبت میں" "عمر" کا کردار کافی مسخرہ ٹائپ کا دکھایا گیا ہے۔ جس کی حرکتیں ایک موبرک لڑکی کو واقعی غصہ دلا سکتی ہیں۔ دیسا تو اپنی خالہ سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ نکلی۔

زخمی گل ——— لغاری

یہ ایک صاف ستھرا رسالہ ہے اس لیے میرے گھر والوں کو اور مجھے پسند ہے سب رائٹرز اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن میری گزارش ہے کہ میمونہ خورشید علی بھی ہر ماہ ناولٹ لکھا کریں۔ رفعت بی کو مشورہ ہے کہ پاشا کو ہی ہیرو رکھیں۔ کہانی میں رفعت جی کا "طاہر لاہوتی" نے مجھے خط لکھنے پہ مجبور کیا۔ "شہر یاراں، دل دیا دہلیز" بھی اچھا تھا لیکن "طاہر لاہوتی" نئی منفرد اور اچھوتی تحریر ہے۔ پاشا کا کردار جاندار ہے۔ اسے کہانی میں مزید جگہ دیں باقی کہانیوں میں فرح بخاری کی کہانی کافی عرصے بعد پڑھنے کو ملی۔ نگہت سیما اور عالیہ بخاری کی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ کافی عرصے سے کہانیاں یکسانیت کا شکار ہو گئی ہیں پلیز آپ توجہ دیں۔

★

عجائب خانہ کے محبوب

نبیل سے باتیں

شاہین رشید

۱۔ مجھے نبیل کہتے ہیں۔
۲۔ اصلی نام؟
ندیم ظفر
۳۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
ندیم۔ اور اب تو نبیل بھی کہنے لگے ہیں۔
۴۔ سن پیدائش اور جائے پیدائش؟
یکم ستمبر ۱۹۶۲ء / ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
۵۔ میرا قد (بغیر ہیل کے)؟
ہیل تو لڑکیاں پہنتی ہیں۔ ویسے میرا قد چھ فٹ ہے۔
۶۔ بہن بھائیوں کی تعداد / میرا نمبر؟
ہم پانچ بھائی ہیں۔ اور ہماری ایک بہن ہے۔ میرا نمبر پانچواں ہے اسی لیے میں گھر بھر کا چہیتا اور لاڈلا ہوں۔
۷۔ میرا ستارہ؟
سنبلہ (VIRGO)
۸۔ تعلیمی قابلیت؟
ایم۔ اے۔
۹۔ شادی کب ہوگی؟
غیب کا علم خدا کو معلوم ہے۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں انسان کو کچھ پتا نہیں ہوتا۔
۱۰۔ آئیڈیل کیا ہے؟
آئیڈیل بنانا بے وقوفی ہے کیونکہ کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ پرفیکٹ صرف اللہ کی ذات ہے۔ آئیڈیل کے پیچھے بھاگنا بے وقوفی ہے۔
۱۱۔ ٹی وی پہ متعارف کرانے کا سہرا؟
لاہور ٹی وی کے پروڈیوسر عبدالعزیز کے سر پہ سہرا جاتا ہے۔
۱۲۔ ٹی وی پہ پہلا پروگرام؟
پنجابی کھیل توں جانی۔
۱۳۔ وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟
خدا کا شکر ہے کہ میرا پہلا ہی سیریل ناظرین نے پسند کیا۔ اور اس کا نام تھا "دن" اس کے پروڈیوسر ایوب خاور تھے جو میرے استاد بھی ہیں۔ سیریل "دھواں" نے مجھے ایسی شناخت دی کہ اب یہی سیریل میرا حوالہ بن گیا ہے۔
۱۴۔ میرا ناکام ترین پروگرام؟
ناظرین کی نظر میں شاید کوئی ہو لیکن میری نظر میں کوئی نہیں ہے۔
۱۵۔ کس خاتون فنکارہ کے ساتھ کام کرنے کو جی چاہتا ہے؟
جولیا رابرٹس۔
۱۶۔ پسندیدہ کیپٹر؟
اللہ درجات بلند کرے مجھے دلدار پرویز بھٹی بہت پسند تھے۔
۱۷۔ پسندیدہ نیوز کاسٹر؟
مجھے خبریں سننے سے مطلب ہوتا ہے اس لیے کوئی خاص پسند نہیں ہے۔
۱۸۔ مجھے یاد ہے اب تک؟
چھوڑیں۔ یہ مصرعہ ٹھیک ہے کہ یاد ماضی عذاب ہے یارب۔

۱۹۔ زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بس پُرخلوص لوگوں کی
کمی محسوس ہوتی ہے۔
۲۰۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں؟۔
اپنے ملک میں فرقہ وارانہ تعصب دیکھ کر۔ خدا
ہمارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔
۲۱۔ میرا مشن ہے کہ؟۔
کراچی پاکستانی قوم اپنی قوم کے لیے اچھا سوچیں
اور اس ملک کے تمام رنگ مل جل کر باہم محبت سے
ساتھ رہیں۔
۲۲۔ کیا عشق کے بغیر زندگی نامکمل ہے؟۔
عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد
۲۳۔ ایک سوال جو بار بار کیا جاتا ہے؟۔
کہ آپ اداکاری کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟۔
۲۴۔ میں معاف کر دیتا ہوں؟۔
میں جس کو بھی معاف کرتا ہوں سچے دل سے
کرتا ہوں۔
۲۵۔ مجھے رحم آتا ہے؟۔

۲۵۔ مجھے رحم آتا ہے؟۔
حسد کرنے والوں پہ
۲۶۔ ایک نغمہ جو میں اکثر گنگناتا ہوں؟۔
مائیں نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا
حال نی۔
۲۷۔ آٹوگراف بک میں کیا لکھتا ہوں؟۔
BE HAPPY
۲۸۔ میری آئیڈیل شخصیت؟۔
عمران خان اور اشفاق احمد۔
۲۹۔ اگر میں قومی اسمبلی کا ممبر ہوتا تو؟۔
تو پھر یقیناً "لوٹا" ہوتا۔
۳۰۔ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی کس چیز کی
طلب ہوتی ہے؟۔
گریپ فروٹ کی۔

۳۱۔ آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو کیا کرتا ہوں؟۔
کرنا کیا ہے چپ کر کے دوبارہ سو جاتا ہوں۔
۳۲۔ جب ڈپریشن ہوتا ہے تو کیا کرتا ہوں؟۔
یقین کریں جی!۔ میں کامیڈی کرتا ہوں۔
۳۳۔ پسندیدہ مشروب؟۔
اورنج جوس۔
۳۴۔ پسندیدہ کھانا؟۔
سبزی گوشت۔
۳۵۔ ناپسندیدہ کھانا؟۔
اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرتا۔
۳۶۔ پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا
جائزہ لیتا ہوں؟۔
شخصیت کے لباس کا اور اس کی گفتگو کا۔
۳۷۔ میرے نزدیک سائنس کی بہترین ایجاد؟۔
فیکس مشین۔
۳۸۔ مجھے غصہ آتا ہے؟۔
منافقت کرنے والوں پر۔
۳۹۔ ایک وہم جو مجھے پریشان کرتا ہے؟۔
کہ کہیں مجھ سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو
گئی ہو۔
۴۰۔ حکومت پاکستان اگر کوئی عہدہ دینا چاہے تو
کون سا عہدہ قبول کروں گا؟۔
ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ مجھے تو اپنی جان
عزیز ہے
۴۱۔ بڑھاپا کیسے گزاروں گا؟۔
جیسے جوانی گزار رہا ہوں۔
۴۲۔ زندگی کا کوئی لمحہ جس کا تصور آج بھی خوفزدہ
کر دیتا ہے؟۔
اپنے والد کی موت کی خبر۔
۴۳۔ میرا قیمتی اثاثہ؟۔
میری پیاری ماں۔
۴۴۔ ایک شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟۔
میرے والد مرحوم۔

۴۵۔ کبھی ایک جگہ سے دو مرتبہ دھوکا کھایا؟۔
انجانے میں دھوکا نہیں کھایا بلکہ جان بوجھ کر ایک ساتھی سے کئی مرتبہ دھوکا کھایا۔
۴۶۔ اگر مجھے ویران جگہ بھیجا جائے تو کس شخصیت کو ساتھ لے جانا پسند کروں گا؟۔
اپنے لنکار دوست تسنیم ذکی کو۔ کیونکہ وہ مجھے ہنسانے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔
۴۷۔ مجھے مزا آتا ہے؟۔
اپنے ساتھی لنکار تنزیرا عجاز کو تنگ کر کے۔
۴۸۔ پسندیدہ کھلاڑی؟۔
پہلے بھی عمران تھے اور اب بھی۔
۴۹۔ پسندیدہ کھیل؟۔
بیڈمنٹن اور کرکٹ۔
۵۰۔ پسندیدہ موسم؟۔
بے شک مجھے سردی کا موسم اچھا لگتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ انسان کے اندر کا موسم اچھا ہو تو ہر موسم اچھا لگتا ہے۔
۵۱۔ غصے کے وقت کیا کرتا ہوں؟۔
میرے نزدیک تو غصے کو قابو میں رکھنے کا بہترین طریقہ خاموشی ہے اور میں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔
۵۲۔ بارہ مہینوں میں کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟۔
ظاہر ہے ہر شخص کو وہی مہینہ اچھا لگتا ہے جس سے اس کی کوئی یاد وابستہ ہو۔ ستمبر کا مہینہ مجھے اچھا لگتا ہے کیونکہ یہ میری پیدائش کا مہینہ ہے۔
۵۳۔ ایک خواب نیند والا جو سچ ثابت ہوا ہو؟۔
خواب کہاں سچ ثابت ہوتے ہیں۔
۵۴۔ اپنی ہی ایک عادت جو مجھے بہت پسند ہے؟۔
عزت کرنا اور عزت کروانا۔
۵۵۔ آئینہ دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے؟۔
میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔
۵۶۔ کس جانور سے خوف آتا ہے؟۔
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں
۵۷۔ چوبیس گھنٹوں میں کون سا وقت اچھا لگتا ہے؟۔
شام کا۔
۵۸۔ طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت تھی؟۔
جغرافیہ۔
۵۹۔ کسی ملک کی سربراہی کا موقع ملے تو میرا انتخاب کون سا ملک ہوگا؟۔
صرف اور صرف پاکستان۔
۶۰۔ زندگی کا وہ لمحہ جس نے میری زندگی بدل دی؟۔
جب میں نے سوچا کہ مجھے کچھ کر کے دکھانا ہے۔
۶۱۔ پسندیدہ اخبار؟۔
جس میں میری تعریف لکھی ہو۔ کیونکہ تعریف ہر انسان کی کمزوری ہے۔
۶۲۔ پسندیدہ میگزین؟۔
وہ جس میں میری تصاویر چھپی ہوئی ہیں۔
۶۳۔ پسندیدہ صحافی؟۔
طاہر سرور میر۔
۶۴۔ اپنے بارے میں ایک جملہ جسے سننے کے لیے کان منتظر ہوں؟۔
ہر وہ جملہ جس میں مجھ پر تنقید ہو مگر اس میں اصلاح کا پہلو ضرور ہو۔
۶۵۔ میری زندگی کا خوبصورت ترین دن؟۔
زندگی بہت مختصر مگر خوبصورت دین ہے خدا کی۔ اس لیے ہر دن خوبصورت سمجھ کر اور خوبصورت بنا کر گزارتا ہوں۔
۶۶۔ ایک دعا جو بروقت پوری ہوئی ہو؟۔
اللہ کا شکر ہے میری ہر دعا پوری ہوتی ہے۔
۶۷۔ میری کس عادت سے گھر والے بے زار رہتے ہیں؟۔
ایک ہی عادت بری ہے۔ مجھے دیر تک سونے

کی عادت ہے۔
۶۸۔ میں بھول جاتا ہوں؟۔
کسی سے اچھائی کر کے۔
۶۹۔ کس شخصیت کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہوں؟۔
اپنی ماں کی خاطر۔
۷۰۔ میرا پسندیدہ شعر؟۔
زندگی ایک سلگتی سی چتا ہے ساحر
شعلہ بنتی ہے نہ یہ بجھ کر دھواں ہوتی ہے
۷۱۔ کون سی چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟۔
شاعری۔
۷۲۔ پسندیدہ رشتہ؟۔
ماں کا۔
۷۳۔ پسندیدہ ذریعہ اظہار؟۔
شعر۔
۷۴۔ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی کسے دیکھنا پسند کرتا ہوں؟۔
اپنی ماں کو۔
۷۵۔ جب تنہا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے؟۔
تنہا؟ میرے دوست مجھے تنہا نہیں چھوڑتے۔
۷۶۔ غم کو محفوظ کرنے کا بہترین ذریعہ؟۔
عزیزوں میں تقسیم کردو۔
۷۷۔ شدید تھکان کے باوجود کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں؟۔
سرسبز علاقے میں۔
۷۸۔ مجھے افسوس ہوتا ہے؟۔
اُن لوگوں پر جو پاکستان میں رہ کر پاکستان کے لیے برا سوچتے ہیں۔
۷۹۔ انسان کے سر میں غرور کب سماتا ہے؟۔
جب اُسے یہ یاد نہیں رہتا کہ دنیا فانی ہے۔
۸۰۔ اگر ایک دن پہلے مجھے خدانخواستہ اپنی موت کا علم ہو جائے تو؟۔
تو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ موت
بھی ایک زندگی ہے۔
۸۱۔ زندگی کی ایک خواہش جس کے پورا ہونے تک میں زندہ رہنا چاہتا ہوں؟۔
میں خواہشات کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہتا۔
۸۲۔ کون سے سفر سے خوف آتا ہے؟۔
جہاز کے سفر سے۔
۸۳۔ پسندیدہ پھل؟۔
انار۔
۸۴۔ پسندیدہ پھول؟۔
نرگس۔
۸۵۔ پسندیدہ خوشبو؟۔
OBSESSION
۸۶۔ ایک کارنامہ جو انجام دینے کو جی چاہتا ہے؟۔
جی تو چاہتا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دوں۔
۸۷۔ زندگی کے وہ دن جو میں چاہتا ہوں کہ لوٹ آئیں؟۔
میرا بچپن۔
۸۸۔ کوئی سواری جسے استعمال کرنے سے پیدل چلنا بہتر سمجھتا ہوں؟۔
موٹر سائیکل۔
۸۹۔ اگر میری ملاقات شیطان سے ہو جائے تو؟۔
تو اُسے پیٹ کر بھاگ جاؤں گا۔
۹۰۔ چودھویں کا چاند دیکھ کر میں سوچتا ہوں؟۔
ے چاندنی راتوں میں تیرا حسن دیکھوں چپ رہا
بس اسی صورت میری آنکھوں میں بینائی رہی
۹۱۔ پسندیدہ سواری؟۔
کار۔
۹۲۔ پسندیدہ لوک فنکار؟۔
نصرت فتح علی خان مرحوم۔ اور عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی۔
۹۳۔ پسندیدہ تہوار؟۔
عید کا۔

جویریہ جلیل سے ملاقات

شاہین رشید

جس کثرت کے ساتھ پروڈیوسرز میں اضافہ ہو رہا ہے اور پرائیویٹ پروڈکشن کی بھرمار ہو رہی ہے اس کثرت سے اچھے فنکاروں میں اضافہ نہیں ہو رہا۔

"انہونی" میں زیادہ تر فنکار نئے ہیں اسی لیے اسے دیکھنے میں مزا بھی آ رہا ہے۔ جویریہ جلیل "انہونی" کا ہی ایک کردار ہیں وہ بڑی خود اعتمادی سے پرفارم کر رہی ہیں۔ جویریہ جلیل ایک باصلاحیت فنکارہ ہیں۔ "انہونی" ان کا پہلا ڈراما سیریل ہے مگر اتفاق دیکھیں کہ اس سیریل کے آن ایر آنے سے پہلے ہائے جیدی اور ایک لونگ پلے "عمر قید" آن ایر آ چکا ہے لیکن بہرحال ڈراموں میں متعارف کرانے کا کریڈٹ "انہونی" کے پروڈیوسر قیصر خان کو ہی جائے گا۔

"جویریہ! آج کل ہم تمہیں ہائے جیدی اور انہونی

ہیں دیکھ رہے ہیں۔ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہو اور بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"شکریہ۔ میرا ایک ڈراما 'عمر قید' چلا تھا اس میں بھی میں بہت اچھی لگی تھی۔"

"یہ بتاؤ کہ معروف آرٹسٹ راشدہ یعقوب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"راشدہ یعقوب میری امی کی کزن ہیں اور اس لحاظ سے وہ میری خالہ ہیں۔"

"تم بتا رہی ہو کہ 'عمر قید' میں تمہارا رول بہت اچھا تھا اور ایک بڑی عمر کے شخص کی بیوی کا رول تم نے کیا تھا۔ انہونی میں بھی تم نے بیوی کا رول کیا ہے۔ کیا بات ہے کہ ابتدا سے ہی تمہارے حصے میں ایسے رول آ رہے ہیں؟"

"اب یہ تو پروڈیوسر کی مرضی ہے کہ وہ کس قسم کا رول دیتا ہے۔ ہمیں تو جو رول ملیں گے ہم تو ظاہر ہے کریں گے۔"

"کرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوتی؟"

"رومینٹک رول اور بیوی والے رول کرنے میں دشواری بھی ہوتی ہے اور جھجک بھی آتی ہے مگر کیا کریں کرنا پڑتا ہے۔ ایسے سین کرتے وقت مجھے ہنسی آجاتی ہے۔"

"انہونی میں قیصر خان نے تم سے بہت اچھے طریقے سے کام لیا ہے۔ تم نے قیصر خان کو کیسا پایا؟"

"قیصر خان بہت اچھے پروڈیوسر ہیں اور ان کے ساتھ کام کرکے بہت مزا آیا۔ اور ویسے بھی مجھے اس فیلڈ میں آکر اور کام کرکے اچھا لگا۔"

"ٹی وی پہ متعارف کس نے کروایا؟"

"مجھے ناہید حسن زیدی (پروڈیوسر کراچی ٹی وی) نے متعارف کرایا اور انہوں نے بھی بحیثیت نعت خواں کے مجھے متعارف کرایا اور میری چھ نعتیں ریکارڈ کیں جو کہ آن ایئر بھی آئیں۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ سنہ ۱۹۹۲ء کی بات ہے اور میری ایک نعت جس میں لڑکیاں دف بجاتی ہیں، ابھی بھی کبھی کبھار ٹی وی سے دکھائی جاتی ہے۔"

"تم بتا رہی ہو کہ تم ۹۲ء سے اس فیلڈ میں ہو تو یہ بتاؤ کہ اب تک کیا کیا کر چکی ہو؟ مگر اس سے پہلے اس سوال کا جواب دو کہ 'ہائے جیدی' میں تمہارے کام میں وہ پختگی نہیں ہے جو انہونی میں ہے اور اسکرین پہ تم اچھی بھی نہیں لگ رہیں۔"

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہائے جیدی میں مرکزی رول روبی نیازی کر رہی ہیں اور میرا چونکہ مرکزی رول نہیں ہے اس لیے نہ میں اسکرین پہ نظر آ رہی ہوں اور نہ ہی میرا رول ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ منظور قریشی نے مجھے فون کیا تھا کہ آپ اس سیریل میں کام کریں لہٰذا میں نے کر لیا۔ ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ کامیڈی تو مجھے آتی ہی نہیں ہے۔ لائٹ کامیڈی تو چل جاتی ہے مگر ہائے جیدی میں تو مجھے بہت ہی بے وقوف دکھایا گیا ہے۔ بس کامیڈی کر لیتی ہوں مگر کس طرح یہ نہیں معلوم۔ یقین کریں کہ میرے گھر والے بھی یہ پروگرام نہیں دیکھتے۔"

"اب میرے اس سوال کا جواب دو کہ ۹۲ء میں تم ٹی وی پہ متعارف ہوئیں کیا کیا کر چکی ہو؟"

"میں نے ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک ٹی وی پہ کام کیا اور پھر کام کرنا چھوڑ دیا اور جو تین سال میں نے کام کیا وہ نعتیں تھیں، 'رنگ ترنگ'، 'یہ جہاں' اور ایک دو دستاویزی فلموں میں کام کیا تھا اور اب ۹۷ء میں میں نے کام دوبارہ شروع کیا ہے اور ۹۵ء تک جو کام کیا وہ ناہید باجی کے ہی پروگرام تھے۔"

"ناہید حسن زیدی سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟"

"یہ سمجھ لیں کہ ناہید باجی میری بہن بھی ہیں۔ میری امی جیسی بھی ہیں، پھوپھو اور خالہ جیسی بھی ہیں۔ ناہید باجی ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور وہ بہت عرصے سے ٹی وی پر کام کر رہی تھیں۔ اچانک انہیں ایک دن نہ جانے کیا خیال آیا کہ کہنے لگیں کہ نعتیں پڑھو گی۔ میں نے کہا کہاں سے کہنے لگیں ٹی وی

پڑھتی میں نے کہا جیسے آپ کہیں۔ پھر وہ پی ٹی وی اسٹیشن لے گئیں۔ میری نعتیں ریکارڈ کیں اور پھر ہم گھر آ گئے۔ پہلے تو میں ناہید باجی کے ہی پروگراموں میں کام کرتی تھی اور کسی سے ساتھ کام کرنے کی گھر والوں کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ پھر ایک دن یعنی ۵ ۰ ۰ کے بعد گیپ دے کر ایک دن ہم پریس کلب گئے۔ تو وہاں قیصر خان صاحب نے مجھے دیکھا اور کہا کہ آپ ڈراموں میں کام کریں گی تو میں نے کہا کہ مجھے گھر کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ کہنے لگے اجازت ہم لے لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بابا سے بات کی۔ بابا کو اُن کی باتیں اچھی لگیں لہٰذا بابا نے کام کرنے کی اجازت دے دی۔"

"کس رائٹر اور پروڈیوسر کے ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"کسی ایک کا نام نہیں لوں گی۔ اس طرح دوسروں کا دل بُرا ہوگا اور ویسے بھی میں یہ دیکھتی ہوں کہ کہانی کیا ہے۔ کہانی اچھی ہونی چاہیے خواہ لکھنے والا کوئی بھی ہو۔"

"ویسے اس فیلڈ میں کیا کشش ہے؟"

"میرے خیال میں شہرت کے علاوہ کوئی کشش نہیں ہے۔ شہرت کا نشہ کسی دوسرے نشے سے کم نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک پیسے کی بات ہے تو پیسہ تو کہیں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو اگر اچھی جاب مل جائے تو اچھا پیسہ کمایا جا سکتا ہے مگر شہرت تو ظاہر ہے ٹی وی سے ہی مل سکتی ہے۔"

"اب کچھ نجی زندگی کے بارے میں باتیں ہو جائیں لیکن پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ۔"

"میں ۹ جون ۱۹۸۵ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے ہیں اور ہماری زبان سرائیکی ہے۔ یوں تو میں نے بہت اسکول بدلے لیکن میٹرک میں نے سپر ماڈل اکیڈمی کریم آباد سے کیا۔ انٹر تک سائنس پڑھی اور اب ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کر رہی ہوں۔ میں کچھ بھول رہی ہوں۔ چھٹی اور ساتویں کلاس سپر ماڈل اکیڈمی میں پڑھی اور میٹرک ابراہیم علی بھائی اسکول سے کیا اور آج کل میں بھٹائی انسٹی ٹیوٹ میں ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کر رہی ہوں۔"

"انٹر تک تم نے سائنس پڑھی پھر لائن تبدیل کرنے کی کیا وجہ تھی؟"

"میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں انجینئر بنوں والدین ہی کیا بلکہ سب بڑوں کی خواہش تھی کہ میں سول انجینئر بنوں۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ والدین کو بچوں کا رجحان ضرور دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اپنی مرضی نہیں تھوپنی چاہیے۔ میں نے کہا مجھے آرٹس لینا ہے۔ کہا کہ سائنس لو۔ شکر ہے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ کالج میں داخلہ لیا اور پری انجینئرنگ لی۔ مجھے اس لائن سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ والدین کے دباؤ میں آ کر پڑھے جا رہی تھی مگر کب تک۔ آخر ایک دن میں نے کہہ دیا کہ میں مزید انجینئرنگ نہیں پڑھ سکتی۔ مجھے تو ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا شوق ہے فائن آرٹ انہیں پسند نہیں تھا لہٰذا اس فیلڈ کے لیے وہ راضی ہو گئے۔ اب سب مجھے کہتے ہیں کہ جب انجینئرنگ نہیں پڑھنی تھی تو کیوں لی تھی۔ کیا والدین کے ڈر سے پڑھ رہی تھیں۔ تو میں نے کہا کہ ڈرتے اُن سے ہیں جن سے کوئی خطرہ ہو۔ میں والدین سے ڈرتی نہیں ہوں بلکہ مجھے تو اُن کی عزت عزیز ہے اور اُن کی عزت کی خاطر ہی میں نے انٹر تک سائنس پڑھی۔ بچوں کا جہاں رجحان ہو اُسے اُسی طرف جانا چاہیے۔ اب اگر کوئی نقصان ہوگا تو اس کی ذمے داری میری ہی ہوگی۔"

"یہ بتاؤ بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"ہم تین بہنیں ہیں اور دو بھائی ہیں۔ میرا نمبر پہلا ہے۔"

"بچپن کیسا گزرا؟"

"بہت اچھا گزرا۔ مجھے بچپن کے دن بہت یاد آتے ہیں اور میں اکثر اپنے بچپن کے دن یاد کرتی ہوں۔"

"تمہارا بچپن کون سا گزر گیا ہے؟"

"امی بھی یہی کہتی ہیں کہ اب تم بچپن سے باہر آ جاؤ۔ ہائے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے۔ بچپن کے مزے یہ تھے کہ گھومتے پھرتے تھے جب دل چاہتا تھا باہر نکل جاتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔ اب ذرا باہر نکل جاؤ۔ امی فوراً آواز دیتی ہیں چلو اندر آؤ۔"

"شادی کے کب ارادے ہیں۔ اور آئیڈیل کیا ہے؟"

"ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ ابھی مجھے پڑھنا ہے اور آئیڈیل کوئی نہیں ہے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی کو آئیڈیل بنانے کے بجائے خود کسی کا آئیڈیل بننا چاہیے۔ اور اگر آئیڈیل مل بھی جائے اور وہ اگر توقعات پہ پورا نہ اترے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی کو آزمائے بغیر اس کے آئیڈیل ہونے کا پتا نہیں چلتا۔"

"کچن سے لگاؤ ہے؟"

"جی بالکل لگاؤ ہے اور خود میں بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ میری امی نے اور میری دادی نے مجھے سب کچھ سکھایا ہے۔ مگر امی مجھے کچھ کرنے نہیں دیتیں لیکن جب کبھی وہ پنجاب جاتی ہیں تو میں ہی کچن سنبھالتی ہوں۔ امی کہتی ہیں کہ اپنے گھر جا کر تو کرنا ہی ہے جب تک ہمارے پاس ہو عیش کرلو۔"

"مزاج کی کیسی ہو؟"

"بہت اچھی ہوں۔ مگر غصہ بھی آتا ہے اور ان لوگوں پہ زیادہ غصہ آتا ہے۔ جو جھوٹ بولتے ہیں۔ اول تو مجھے زیادہ غصہ نہیں آتا اور جب آتا ہے تو زبردست طریقے سے آتا ہے۔ چنانچہ یا تو میں روتی ہوں یا پھر چیزیں توڑتی ہوں۔ اور اپنے غصے کی وجہ سے گھر والوں کا بہت نقصان کیا ہے میں نے۔"

"تم بتا رہی تھیں کہ تمہیں موسیقی سے لگاؤ ہے تو کس قسم کی موسیقی تمہیں پسند ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں پاپ میوزک اچھی لگتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں میوزک اچھا لگتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ میوزک تو میوزک ہے جس حالت میں بھی ہو اچھی لگتی ہے۔ ہاں اگر مجھے گلوکاری کا چانس دیا جائے تو پھر میں سلو میوزک گانے کو ناپسند کروں گی۔"

"گھریلو کاموں میں کون سے کاموں سے دلچسپی ہے؟"

"ایک تو گھر کی سیٹنگ کرنے میں مزا آتا ہے اور نئی ڈش پکانے سے دلچسپی ہے۔ نئے کھانے پکانے میں لطف آتا ہے۔"

"گھر آئے مہمان کیسے لگتے ہیں؟"

"مہمانوں کی آمد اچھی لگتی ہے۔ اگر مہمان رحمت بن کر آئیں تو بہت اچھے لگتے ہیں اور زحمت بن کر آنے والوں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔"

"اس فیلڈ میں کس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے"

"میری شدت سے خواہش ہے کہ میں انور مقصود صاحب کے ساتھ کام کروں اور خدا کا شکر ہے کہ میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ ڈراما انتظار میں میں نے انور مقصود کے ساتھ کام کیا ہے۔"

"کس قسم کے لوگ ناپسند ہیں؟"

"خود غرض اور خوشامد کرنے والے لوگ مجھے بالکل ناپسند ہیں۔"

"مردوں اور خواتین میں کون سی خصوصیات اچھی لگتی ہیں؟"

"مرد اکڑ قسم کے اچھے لگتے ہیں۔ ڈبو قسم کے قطعی اچھے نہیں لگتے اور خواتین وہ اچھی لگتی ہیں جو اِدھر کی بات اُدھر نہ کریں۔"

"تمہاری کوئی عادت۔ جو گھر والوں کو پسند نہ ہو؟"

"میں ہر وقت اپنی دوستوں سے فون پر باتیں کرتی رہتی ہوں اور تیز آواز میں گانے سنتی ہوں۔ بس ان دو عادتوں سے گھر والے گھبراتے ہیں۔"

جویریہ جلیل اس فیلڈ میں نووارد ہے مگر باصلاحیت ہے۔ جویریہ کی صورت میں پی ٹی وی کو ایک اچھی فنکارہ مل گئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پروڈیوسر اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

خبریں وغیرہ

سائرہ غلام نبی

آلو

سونالی باندرے کو لوگ "آلو" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ہر اس فلم میکر نے سائن کر رکھا ہے جس کی فلموں کو تاپ کی ہیروئنوں نے انکار کر دیا ہے۔ اس بارے میں سونالی کہتی ہے۔

"میں اپنے اس نئے نام کو پسند کرتی ہوں کیونکہ آلو میری پسندیدہ سبزی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ میں ڈیمانڈ میں ہوں۔"

دعویٰ

شلپا شیٹھی کا دعویٰ ہے کہ۔

"میں دیگر لڑکیوں کی طرح اپنی عمر کبھی نہیں چھپاؤں گی۔ بات یہ ہے کہ جب میں لوگوں کو اپنی اصل عمر بتاتی ہوں تو لوگ یقین نہیں کرتے۔ میرا لمبا قد اور چھریرا بدن مجھے اپنی عمر سے بڑا ظاہر کرتا ہے۔ ویسے اس حوالے سے میں دیکھا پہ رشک کرتی ہوں۔ آج بھی اس نے اپنے سامنے کی پیدا ہونے والی لڑکیوں کو شرمندہ کیا ہوا ہے۔"

کمائی

کاجول اپنی کمائی کہاں خرچ کرتی ہے کیونکہ اس کی توجہ کپڑوں اور زیورات پر نہیں نظر آتی۔ اس بارے میں اس کا کہنا ہے۔

"میں کتابوں اور میوزک پہ پیسے خرچ کرتی ہوں اور جو پیسے بچ جاتے ہیں وہ بینک میں لکھ دیتی ہوں تاکہ برسات کے دنوں میں خرچ کر سکوں۔ مجھے بارش کا موسم بہت پسند ہے۔"

آپریشن

پچھلے دنوں وسیم اکرم کا لندن کے ایک اسپتال میں بائیں کندھے کا آپریشن ہوا ہے۔ بہت دنوں سے ان کے ہاتھ میں تکلیف تھی۔ اس سیزن میں وہ بالکل بولنگ نہیں کرا سکے۔ ان کے بازو کا آپریشن کر دیا گیا ہے۔ ان کی اہلیہ نے بتایا ہے کہ ابھی ایک اور آپریشن کیا جائے گا

ذمے داری

سیف علی خان کہتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ لوگ مجھ سے میری ماں جیسی اداکاری کی توقع رکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ لوگوں نے میری فلم "عاشق آوارہ" کو پسند کیا۔ شادی نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب مجھے بجلی اور گیس کے بلوں سے آگاہ ہونا پڑتا ہے۔ ذمے داری پڑتی ہے تو انسان خود ہی بدل جاتا ہے۔ میری ازدواجی زندگی بے حد مستحکم ہے۔ ہم لوگ اکثر کبھی کھانا کھانے اور کبھی سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں شادی ذرا مشکل تو ہے مگر لوگ توجہ دیں تو ساری زندگی کا لطف اس میں موجود ہے۔ امرتا ضرورت سے زیادہ منہ پھٹ اور زبان دراز واقع ہوئی تھی لیکن میرے کہے بغیر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا ہے۔ شادی سے قبل صرف ایک لڑکی کے ساتھ میری جذباتی وابستگی ہوئی تھی لیکن طویل فاصلوں کی وجہ سے ملن کامیاب نہ ہو سکا۔

آئیڈیل

شاہد آفریدی آج کل سب کے آئیڈیل ہیں۔ وہ اپنے آئیڈیل کے بارے میں کہتے ہیں۔
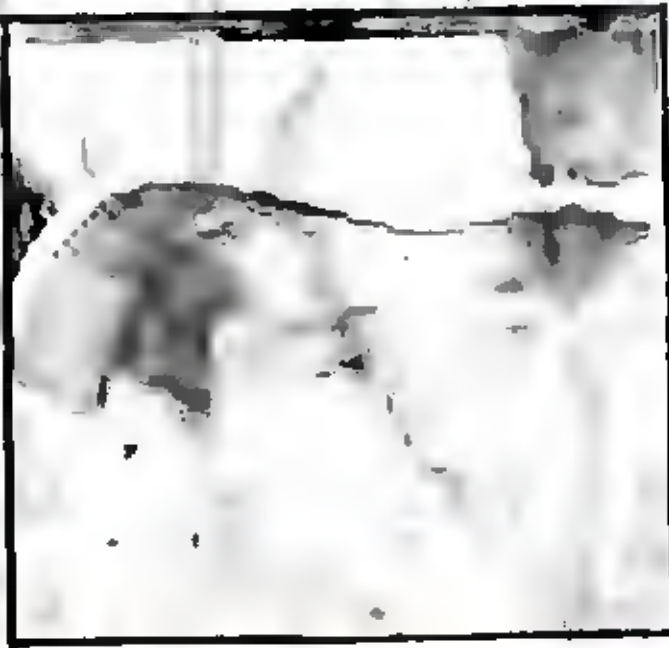
سو شکار

معین خان اپنے ریکارڈ بنانے کے بارے میں کہتے ہیں۔

"ریکارڈ بنانے پر گھر والے تحفے تحائف تو نہیں دیتے لیکن مبارک باد ضرور دیتے ہیں۔ جب کوئی کارنامہ سرانجام دے کر گھر پہنچتے ہیں تو سب گھر والے مبارکبادیں دیتے ہیں۔ جب میں نے ون ڈے کرکٹ میں کم میچوں میں سو شکار کرنے کا ورلڈ ریکارڈ برابر کیا، اس بارے میں بھی مجھے گھر آ کر پتا چلا کہ میں نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ جب میں گھر آیا تو میری والدہ نے بتایا کہ تم نے ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اس دن گھر والے میری کئی پسندیدہ ڈشیں بناتے ہیں۔

جب میں نے کرکٹ کھیلنی شروع کی تو اس وقت عمران خان میرے آئیڈیل کرکٹر تھے۔ ہر لحاظ سے وہ مجھے پسند تھے۔ موجودہ دور کے کھلاڑیوں میں چار کھلاڑی ایسے ہیں جن کو بیٹنگ کرتے دیکھنا میں بہت پسند کرتا ہوں خصوصاً ون ڈے کرکٹ میں یہ چار کھلاڑی سچن ٹنڈولکر، مارک وا، برائن لارا اور سعید انور ہیں۔"

کام کرنے کی عادت

جاوید میانداد اپنے بچپن کے بارے میں کہتے ہیں۔
"یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں کرتا۔ مجھے بچپن سے ہی لوگوں کے کام کرنے کی عادت تھی۔ محلے کے لوگوں کے گھروں کے کام تک کر دیا کرتا تھا۔ کسی کو سبزی منگانی ہے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس نے مجھے کہا اور میں نے بھاگ کر سبزی لا دی۔ کسی کو پان کی ضرورت ہے۔ میں نے فوراً اسے پان لا دیا۔ اس طرح محلے بھر میں، میں لوگوں کے کام کرنے کے لیے مشہور تھا۔ لوگ مجھے پیار بھی بہت کرتے تھے اور دعائیں بھی دیتے تھے۔"

[illegible] حسین

[illegible] رام گوپال ورما شلپا کو زار پر مر مٹا ہے۔ یوں بھی رامو ہر حسین لڑکی پر مر مٹتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رامو اور نیشا انیسر اس وقت ملے جب فلم 100 کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک اتفاقیہ ملاقات نے کام کر دکھایا۔ رامو نے یہ بھی بتایا کہ اس ملاقات کے بعد ہی اس نے اس کی چند فلمیں دیکھیں اور یہ بھی اعتراف کیا کہ نیشا غضب کی حسین لڑکی ہے۔ جہاں حسن ہوتا ہے وہاں رامو ہوتا ہے دل و جان سے۔ اس سلسلے میں رام گوپال ورما کہتا ہے۔
"آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کا دیوانہ ہوں۔ مجھے تو سیدھے وقت کا کرکی جسم بھی اچھا لگتا ہے۔ میں نے اسے کہے کی [illegible] دیکھا ہے۔ وہ بہت زبردست لگتی ہے۔"

پہلی نظر

ماہ مسعود ری کا کہنا ہے کہ جو اسے پہلی نظر میں متاثر کر سکتا ہے۔ اس میں گریگوری پیک جیسا چارم، سلویسٹر اسٹیلون جیسا مضبوط جسم اور کینی راجرز جیسی مضبوط آواز ہونی چاہیے۔ بس صرف اتنا ہی کافی ہے کیونکہ میں اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔

ساڑھی کی واپسی

ماضی کی اداکارہ نادرہ کہتی ہے۔

گزشتہ دنوں میں نے اپنی سب سے زیادہ خوبصورت ساڑھی تمنا کے لیے دے دی۔ جس کی پروڈیوسر پوجا بھٹ اور ڈائریکٹر اس کا باپ مہیش بھٹ تھا۔ فلم اب مکمل ہو کر ریلیز بھی ہو چکی ہے۔ اب کوئی بھی نہیں جانتا کہ میری سب سے زیادہ پسندیدہ ساڑھی اس وقت کہاں ہے۔ مہیش بھٹ سے لے کر اس کا پورا خاندان اور یونٹ والے بھی نہیں۔ یا تو وہ ملتے ہی

نہیں یا جھوٹ بول دیتے ہیں۔ پوجا بھٹ کو فون کریں تو اس کی جواب دینے والی مشین تامل زبان میں ایک لمبی سی گالی دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے ایک بڑی رقم کا نقصان کر لیا۔ اس کی تو مجھے پروا نہیں، میں نے طے کر لیا ہے کہ میں کسی بھی قیمت پر وہ ساڑھی واپس لے کر رہوں گی۔"

ایوارڈ یافتہ

جس طرح شبانہ اعظمی دنیا بھر کے ایوارڈ وصول کر رہی ہے تو اس کا شوہر جاوید اختر بھی اس سے پیچھے نہیں ہے۔ جاوید "اک لڑکی کو دیکھا" سے شہرت کی بلندیوں پر موجود ہے۔ اور اب اسے ایک پاکستانی فلم بچا گھر کے گانے تحریر کرنے کے لیے سائن کر لیا ہے۔ اس فلم میں شبانہ کے مقابل ندیم کام کریں گے۔ اور اس کی شوٹنگ پاکستان، بھارت، سری لنکا اور دبئی میں ہوگی۔ اس کا اسکرپٹ گلزار نے لکھا ہے۔

بلقیس بھٹی

میری بیاض سے

نجمہ یاسمین بھٹی ———— اوکاڑہ

ٹوٹ کر بکھرا تو رگِ دجاں کی حدوں میں سمٹا
چن کر بکھرا تو سمٹا نہ گیا تیرے بعد
یہ الگ بات کہ افشاء نہ ہوا تجھ پہ ورنہ
کتنا محسوس کیا میں نے تجھے تیرے بعد

زبیدہ کنول ———— حویلی لکھا

تمام عمر جیے اور کچھ نہ کر پائے!
کسی کے ہو کے رہے اور نہ اپنا کر پائے
زمانہ اس کے حوالے سے یاد کرتا ہے
کہ جس سے اپنے ستارے کبھی نہ مل پائے

عمرانہ بتول ———— کبیروالا

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
دُکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا

عظمیٰ بتول ———— ملتان

تم ترکِ تعلق کا کسی سے ذکر نہ کرنا
میں لوگوں سے کہہ دوں گا فرصت نہیں ملتی

عزالہ ذکی ———— جتوئی

اس میں شامل ہے میرے محنت کی تاریکی بھی
تم سیاہ رنگ جو پہنو گے تو یاد آؤں گا
اب تو پیاسا شک میں ہونٹوں سے چرا لیتا ہوں
ہاتھ سے خود انہیں پونچھو گے تو یاد آؤں گا

ساجدہ زبیدہ ———— ویروالہ

شدید دُکھ تھا اگرچہ تیری جدائی کا
سوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا
... حال کو چھو آئے
... ب نارسائی کا

شہرت زری شاہ ———— کراچی

وہ بارش میں بھیگنا وہ ڈھونڈ لینے کی خواہش!
وہ ہاتھ ہاتھوں میں ڈالنا وہ سپنے سارے کدھر گئے
کبھی چھپنا پیڑ کی آڑ میں کسی کے ڈھونڈ لینے کی طلب
نہ پلٹ کے آئیں گے کبھی کہ وہ کارواں گزر گئے

ورِحنا ———— میانوالی

بہت بلند تھے انا کے بعد کے پہاڑ بھی
میں بار بار آ کے تیری راہ سے پلٹ گیا

جبینہ روبینہ ———— کوٹلی بخاہت

آنکھوں میں کچھ خواب سجے ہیں رات گئے
میرے گھر میں پھول کھلے ہیں رات گئے
چاند سے کرنیں، پھول سے نرم لمحوں میں
اس کو میں نے خط لکھے ہیں رات گئے

فرزانہ سہیل ———— میاں چنوں

محبت سے جو خالی ہوں وہ گھر اچھے نہیں لگتے
مکاں اچھے نہیں لگتے، بستر اچھے نہیں لگتے
وہ پودے جن کی مٹی میں جڑیں گہری نہیں ہوتیں
ان پیڑوں پہ میری جاں ثمر اچھے نہیں لگتے

شابانہ بلوچ ———— خان پور

وقت کی آنچ پہ پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
قہقہے ٹوٹ کے آنسوؤں میں بکھر جاتے ہیں
کون کسی کو یاد رکھتا ہے عمر بھر کے لیے
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

ایس کے ارم ———— ڈی جی خان

ہم نے صدیوں ہوا کے تھپیڑوں کو سہنے یہ روکا مگر
لگ گئے جانے کہاں تک چلے سلسلے، زندگی تھک گئی
تیرگی کے پروں سے اڑنے اور تم چھو مُوں پر گئے
دیکھنے اک بار تو مُڑ کے دیکھو ذرا زندگی تھک گئی

فریدہ قدیر ندا ــــــــــ اسلام آباد

ہمارے بعد چلی رسم دوستی کہ نہیں
ہوا کی زد پہ کوئی شمع پھر جلی کہ نہیں
دیارِ ہجر سے آئے ہو کچھ کہو محسن
کہ شامِ غم بھی کسی موڑ پہ ملی کہ نہیں

صائمہ نذیر ــــــــــ کراچی

تم لاکھ چھپاؤ چہرے سے احساس ہماری چاہت کا
دل جب بھی تمہارا دھڑکا ہے آواز یہاں تک آئی ہے

بلقیس فاطمہ ــــــــــ کبیر والا

کتنا دلنشین سا لگتا ہے
بے ارادہ تجھے دیکھی کرنا
کتنا مشکل ہے اُن کے لیے
سارے ماحول کی نفی کرنا

تہمینہ ــــــــــ مظفر

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں
بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

مس ناز گل ــــــــــ حیدر آباد

پیڑ کے سائے میں بیٹھا ہوں مگر جانتا ہوں
شاخ سے ٹوٹتے پتے کا جدا ہو جانا

نرجس خاتون ــــــــــ گجرات

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

نوشین کرن خان ــــــــــ گجرات

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا بتاؤ کیسا لگا
تم اگلے زخم کو چھوڑو یہ کہو کیسا لگا
عجب سوال کیا آندھیوں نے پتوں سے
شجر سے ٹوٹ کے گرنا بتاؤ کیسا لگا

فوزیہ ثمر ــــــــــ گجرات

اس دل کے جنداتا توں میں اک موسم ہے برساتوں کا
اک صحرا صحرا ہجر کی راتوں کا اک جنگل وصل کے خوابوں کا
اس چودھویں رات کے سائے میں جب آخری بار ملے تھے ہم
یہ دل پاگل کب بھولتا ہے وہ باغ سفید گلابوں کا

عمرانہ اسحاق ــــــــــ فیصل آباد

وہ کون لوگ تھے اُن کا پتا تو کرنا
میرے لہو میں نہا کر جنہیں نکھرنا تھا

سمیرا لطیف ــــــــــ بصیر محل

کل تھکے ہارے پرندوں نے نصیحت کی مجھے
شام ڈھل جائے تو محسن تم بھی گھر جایا کرو

عرفانہ خواجہ ــــــــــ جتوئی

ہم فرہاد سے تھے پر محسن اس کو راہ پرائے ہیں!
ہم نے اس کے پتھر دل سے پیار کی نہر نکالی ہے

عالیہ تصور رفیق ــــــــــ سرگودھا

عمر ساری راہ کے پتھر ہٹاتے کٹ گئی
زخم میرے ہاتھ میں اک سعی لاحاصل کے ہیں

زخمی گل ــــــــــ لغاری

جل اُٹھتے ہیں یادوں کی منڈیروں پہ شام
جو خواب بچا لایا تھا جلتے ہوئے گھر سے

شاہدہ عزیز سحر ــــــــــ مینروڈا سندھ

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پر کہہ دو کہیں ان سے
جو دامن پر نہیں گرتا وہ آنسو دل پہ گرتا ہے

ثمینہ اصغر بٹ ــــــــــ گکھڑ منڈی

ہم ایسے سادہ لوگوں کو ازل سے ایک عادت ہے
ہم اپنے گھر سے بڑھ کر دل میں وسعت مانگ لیتے ہیں
ہمیں لاعلم رکھتے ہیں ہمیشہ اپنے بارے میں
وہ ہم سے ساری باتوں کی وضاحت مانگ لیتے ہیں

ریحانہ علی ــــــــــ شکور کوٹ

موسم کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں اس کے عہد
اس پر یہ ضد کہ اس پر کرو اعتبار بھی
باہر سے مطمئن تھا کھلی جھیل کی طرح
لیکن وہ اپنی تہہ میں رہا بے قرار بھی

سعیدہ حسن ــــــــــ کھاریاں

اس دفعہ تو بارشیں رکتی نہیں ہیں دوستو
ہم نے کیا آنسو پیے کہ سارے موسم رو پڑے

اسماء انصاری ــــــــــ ملتان

دو چار دن اور ہے خوابوں کا سلسلہ
پھر حشر تک رہے گا عذابوں کا سلسلہ

ذوالقرنین

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں اپریل ۱۹۸۲ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

خالدہ رفیق ـــــ سمہ سٹہ

س۔ نین جی! یہ والدین ہمارے پیار میں دیوار کیوں بن جاتے ہیں؟

ج۔ اس لیے کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔

س۔ نین جی! اگر میرے والدین میری شادی میری پسند سے نہ کریں تو میں کیا کروں۔ خودکشی؟

ج۔ میری مانو تو ابھی جلدی سے کر لو۔ کیونکہ تمہارے والدین تمہاری شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔

فوزیہ روبی ـــــ ڈیرہ اسماعیل خان

س۔ کیا اب بھی عورت کو نازک چیزوں سے تشبیہ دینا مناسب ہے۔ اس دور میں تو عورت مرد سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی ہے۔؟

ج۔ کتنے ہاتھ۔؟

ریحانہ غلام حسین ـــــ گکھڑ منڈی

س۔ اے پرنس انکل! رات خواب میں میں نے آپ کو گدھے کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا اور آپ کہہ رہے تھے کہ میں اس لیے خواتین کی محفل میں نہیں شکل دکھاتا کہ کہیں وہ مجھے گدھا نہ سمجھ بیٹھیں؟

ج۔ پھر پتا ہے کیا ہوا۔ گدھے نے دولتی کر لے کے ایکشن میں اٹھائی اور مجھے جھکا رہنا پڑا۔

شہناز پروین ہاشمی ـــــ کراچی

س۔ بھیا! اگر کسی شمارے میں سب بہنیں آپ سے ایک ہی طرح کے سوال کریں تو آپ کیا کریں گے؟

ج۔ دلیلیہ ہی سہ ماہلیہ۔ بیٹھ لیں اس دن تو مسلسل پیش کیے اپنا سر۔

راشدہ حاکم علی ـــــ ماتلی

س۔ کبھی آپ کی ملاقات ابلیس سے ہوئی؟

ج۔ کبھی سے کیا مراد؟ کب نہیں ہوتی۔ رات رات بھر شطرنج کی بازی جمی رہتی ہے۔

فرحت حاکم علی ـــــ ماتلی

س۔ لوگوں کو آپ کی آنکھیں پسند ہیں جبکہ مجھے تو آپ کی ناک بہت پسند ہے۔ آخر کیا وجہ ہے؟

ج۔ ہر وقت بہتی جو رہتی ہے۔

لال پری ______ جہلم

س۔ میاں بیوی سیر کو جائیں تو بچہ کسے اٹھانا چاہیے؟

ج۔ اے لال پری، ذرا ہوش کے ناخن لو۔ میاں بیوی سیر کو جا رہے ہیں، بچہ اٹھانے نہیں۔

کوثر بلقیس ______ بہاول نگر

س۔ میری سہیلی آپ کو خط لکھتے وقت پتا نہیں کیوں شرمائی سی رہتی ہے......

ج۔ اس لیے کہ وہ بے چاری ان پڑھ ہے۔

سیدہ افشاں انجم افشی ______ اسلامیہ کالونی

س۔ میں نے دیکھا دو خواتین ایک جگہ بالکل خاموش بیٹھی تھیں بھلا کیوں؟

ج۔ دونوں ایک خاوند کی بیوی تھیں۔

فرزانہ انور بخشی ______ لاہور

س۔ ویسے راز کی بات ہے، آپ اس محفل میں بچ نہیں رہے۔ ذوقی بھیا کو واپس بھیج دیں۔ ایک فریادی کی فریاد؟

ج۔ تمہاری فریاد سن لی گئی ہے۔ فریادی کا حشر اور اپنے انجام پر پوچھ لو۔

عارف رفیق ______ سیالکوٹ

س۔ سنو اب تم آئے ہو تو ذرا سیالکوٹ کے لوگوں کا خاص خیال رکھنا۔ یہ ذوقی نے تو ہم کو بہت تنگ کیا ہے۔ امید ہے تم ایسا نہیں کرو گے؟

ج۔ میں نے پڑھ لیا۔ اور گروہ برائیاں تیری۔ وہ دکان اپنی بڑھا گئے جن سے ہوئی تھیں برائیاں میری۔

نسرین کنول ______ کراچی

س۔ اگر آپ کو پاگل خانے کا انچارج بنا دیا جائے تو؟

ج۔ امید ہے تم پہلے فارغ ہو جاؤ گی؟

فرزانہ گل ______ حیدر آباد

س۔ ذوقی جی، سنا ہے، تیری محفل میں آج رت جگا ہے؟

ج۔ صرف آج ہی؟

عمرانہ رشید ______ کراچی

س۔ کیوں بھئی پیارے گوگلو کیا حال چال ہیں؟

ج۔ گوگلو اب ٹھیک ہے۔ چوسنی کی جگہ منہ میں سگریٹ لینی شروع کر دی ہے۔

راحت افزا نگہت ______ ڈیرہ غازی خان

س۔ جب شادی ہوتی ہے لڑکی کے ہاتھ پیلے کرتے ہیں۔ لڑکے کا کیا کرتے ہیں؟

ج۔ بیڑا غرق۔

فوزیہ روبی ______ ڈیرہ اسماعیل خان

س۔ اپنی تصویر میں تو تم کسی ورکشاپ کے چھوٹے لگ رہے ہوتے ہو؟

ج۔ درست کہا مگر ورکشاپ کے چھوٹوں کے پانے کے نمبر بھی ہوتے ہیں۔ وہ نہیں بتائے تم نے۔

رخشندہ اینڈ نجمہ مجید ______ لیاقت آباد

س۔ شعر کا جواب شعر سے۔

تیرے انداز تغافل کا سہارا لے کر
تیری نفرت نہ بدل دوں تو میرا نام نہیں

ج۔ ہائے واہ رے آپ کا نام کیا ہے؟

فرزانہ کوثر فری ______ روہڑی سندھ

س۔ با ادب با ملاحظہ ہوشیار کہ مابدولت کی سواری آپ کے جگمگاتے شہر میں آ رہی ہے۔ کیوں ڈر گئے نا؟

ج۔ بی بی، روہڑی سے کراچی آنے کا آپ نے اپنی سواری کا کیا کرایہ دیا بھلا؟

روبی خانم چوہدری ______ ایبٹ آباد

س۔ بھیا! یہ خواتین ڈائجسٹ کی خواتین آپ کو انکل کیوں کہتی ہیں جبکہ مطالعہ کرنے والی چھوٹی تو نہیں ہوتیں؟

ج۔ انہیں میری عمر کا صحیح اندازہ ہے۔

قمر سیمی زیدی ______ ملیر سٹی

س۔ آپ اتنے دن کہاں تھے؟

ج۔ ہم سو رہے تھے۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ اماں مار رہی تھیں؟